رنگارنگ کہانیوں سے آراستہ دلچسپ جریدہ

ماہنامہ

نئے افق

کراچی

aanchalpk.com aanchalnovel.com

پبلشر مشتاق احمد قریشی پرنٹر جمیل حسن مطبوعہ ابن حسن پرنٹنگ ... کراچی
دفتر کا پتا: 7 فرید چیمبرز عبداللہ ہارون روڈ ...

خط وکتابت کا پتہ: ”آنچل“ پوسٹ بکس نمبر 75 کراچی 74200 فون: 021-35620771/2
فیکس: 021-35620773 ایک از مطبوعات نئے افق پبلی کیشنز۔ ای میل info@aanchal.com.pk

گفتگو

اقبال بھٹی

> ''حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میری امت تہتر فرقوں میں تقسیم ہو جائے گی' سب کے سب جہنم میں جائیں گے سوائے ایک امت کے۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے پوچھا یارسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) وہ کون سی امت ہے؟ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا جس پر میں اور میرے صحابہ ہیں۔'' (الترمذی' وابوداؤد واحمد)

عزیزان محترم...... سلامت باشد۔

نومبر کا شمارہ حاضر ہے۔ جس وقت ہم یہ سطور تحریر کر رہے ہیں باہر سورج آگ برسا رہا ہے صبح کے وقت ہی درجہ حرارت 39 ڈگری تک جا پہنچا ہے اللہ ہمارے حال پر رحم کرے، ادھر طاہر صاحب کا حکم ہے کہ کاپیاں جلد سے جلد دی جائیں تاکہ پرنٹنگ کا عمل شروع ہو سکے طاہر صاحب کی خوبی یہ ہے کہ پرچے کی تاخیر کسی صورت برداشت نہیں کرتے خواہ کتنا بھی نقصان ہو جائے وہ قارئین تک پرچہ بروقت پہنچانے کی روایت برقرار رکھتے ہیں سو ان کے حکم کے آگے سر جھکاتے ہوئے ہم نے بہت سی کہانیوں کو ڈراپ کر دیا تاکہ پرچہ بروقت تیار ہو سکے لہٰذا جن قارئین کی کہانیاں اور خطوط شامل نہیں ہو سکے ان سے معذرت وہ مائنڈ نہ کریں۔

ہمارے قارئین کی اکثریت نے سلسلے وار کہانی مرشد جسے ساحر جمیل سید تحریر کر رہے ہیں خاصا پسند کیا ہر پل کروٹ بدلتی یہ کہانی آگے بھی دلچسپ موڑ لے گی اور آپ کے دل موہ لے گی۔ مریم جہانگیر کے طویل اور دلچسپ ناول حصار کی دوسری اور آخری قسط شامل اشاعت ہے جن قارئین نے اسے پسند کیا ان کا شکریہ اس ماہ سے نوجوان قلم کار فارس مغل کا ناول ''ہمجان'' شروع کیا جا رہا ہے تین اقساط پر مشتمل، یہ ناول آپ کو بہت پسند آئے گا فارس مغل کا انداز تحریر آپ کو دیگر لکھنے والوں سے یکسر مختلف محسوس ہوگا پڑھ کر اپنی رائے سے ضرور نوازیے گا محترمہ زرین قمر نے انگریزی ناول کے تراجم کا محاذ خوب سنبھالا ہوا ہے وہ بڑی عرق ریزی کے ساتھ نئے افق کے قارئین کے لیے انگریزی ناول کا انتخاب کرتی ہیں اور پھر انتہائی خوب صورتی سے اسے اردو کے قالب میں ڈھالتی ہیں کہ پڑھنے والا ان کی تحریر کے حسن میں کھو کر رہ جاتا ہے اس شمارے میں ان کا ناول اندھیرے کے مسافر شامل ہے، جو آپ کو خاصا پسند آئے گا پڑھ کر اپنی رائے ضرور دیجیے گا۔

عمر فاروق ارشد...... فورٹ عباس۔ السلام علیکم ورحمتہ اللہ۔ امید کرتا ہوں کہ [illegible] گے اکتوبر کا نئے افق کافی دیر سے ملا بہر حال خوشی ہوئی کہ مل تو گیا، ورنہ جس طرح بک اسٹال [illegible] دکھا رہے تھے میں تو سوچ چکا تھا کہ دکان کا شٹر گرا کر ان کی چھٹی لگا دوں مگر پھر نئے افق [illegible] خلاف معمول کچھ ماٹھا تھا، اگر خاتون کو پیلے کی بجائے کالا جوڑا پہنایا جاتا تو شاید [illegible] ہوئے بڑے قریشی صاحب کی دستک اس سے پہلے کالم کی صورت میں بھی [illegible] پڑھ کر اچھا

لگا وطن دشمنوں کی کارستانیوں اور سیاست دانوں [illegible] ہیں اللہ تعالیٰ ارض وطن کو ہر قسم کی سازشوں سے محفوظ [illegible] مہربان جھٹکا لگا ہائے بلیک لسٹ ہونے کا بھی اپنا ہی ایک مزہ ہوتا ہے [illegible] ابھرتے ہوئے ہر مظلوم آہ کیا کچھ طے کر کے ایک تبصرہ لکھتے ہیں [illegible] جب ایڈیٹر کی میز پر پہنچ کر غائب ہو جائے تو پھر جو دکھ ہوتا ہے [illegible] اپنے ساتھی موجود تھے بہت اچھا لگا دستگیر شہزاد صاحب صدارت کی کرسی پر [illegible] تھے اور کافی قصے میں لگ رہے تھے ارے بھائی آپ کیوں اس طرح اپنی توانائیاں کھپا رہے ہیں تنقید کرنے والے تو خوامخواہ کہہ دیتے ہیں آپ صرف اپنا کام کرتے رہیے اللہ مزید کامیابیوں سے نوازے، ریاض بٹ صاحب عزت افزائی کا شکریہ آپ کی کہانیاں اب واقعی نیا موڑ لے رہی ہیں امید ہے کہ آئندہ مزید نئے آئیڈیا لے کر آئیں گے کچھ قارئین اب بھی مجید جائی کو صلواتیں سنانے کا سلسلہ جاری رکھے ہوئے ہیں ان سے میری گزارش ہے کہ خود کو ضائع مت کریں جو کچھ ہونا تھا وہ ہو چکا اب اگر آپ کو امید ہے کہ موصوف کوئی معافی مانگ کر بڑے پن کا ثبوت دیں گے تو یہ آپ کی بھول ہے صائمہ نور صاحبہ جائز تنقید کیا کریں ناجائز تنقید کر کے کسی کو موقع مت دیں کہ کوئی آپ کو بھی پرسنل لیول تک آ کر مخاطب کرے مسکان ظفر پر آپ کی تنقید بہت ہی بھدے اور بھونڈے انداز میں کی گئی ہے مسکان ظفر نئے افق کی مسلسل قاری ہے اور یہ حق رکھتی ہیں کہ اپنی رائے کا اظہار کرنے کے لیے ہر ماہ تشریف لائیں یا پورے ایک سال بعد اس سے آپ کی صحت پر کوئی فرق نہیں پڑنا چاہیے جو بات ان کو اچھی نہیں لگی انہوں نے ادارے کو خط لکھ کر اپنی رائے سے آگاہ کر دیا آپ کیچڑ اچھالنا اور زہر نگلنا جیسے الفاظ استعمال کر کے مجھے یہ سوچنے پر مجبور کر رہی ہیں کہ آپ خود کس قبیل سے ہیں ابھی جمعہ جمعہ آٹھ دن ہوئے ہیں آپ کو تبصرہ کرتے ہوئے جبکہ مسکان ظفر ایک ادیب کی بیٹی ہے اور ادب سے ان کا تعلق بہت پرانا ہے براہ کرم ذاتی تنقید سے پرہیز کیا کریں آپ کے اکثر تبصروں میں یہی کچھ ہوتا ہے ابتدائی صفحات پر ایکس ون اپنے اختتام کو پہنچا زرین قمر صاحبہ نے ترجمہ کرنے کا حق ادا کیا ناول کا انجام واقعی چونکا دینے والا تھا امین صدر الدین ہمیشہ دلچسپ اور منفرد موضوع پر لکھتے ہیں پچھلے دنوں میں نے ان کو سوشل میڈیا پر ڈھونڈ نکالا ماشاء اللہ نفیس انسان ہیں اللہ صحت والی زندگی دے ان کی کہانیوں میں مجھے بیدی اور پریم چند کے افسانوں کی جھلک دکھائی دیتی ہے خلیل جبار اچھی رپورٹنگ کرنے کے ساتھ اسے کہانی کی صورت میں ڈھال کر کمال کر دیتے ہیں اس دفعہ ناکام پلان نے خاصا متاثر کیا، کہانی کا تانا بانا بالکل کسی جاسوسی ناول جیسا تھا اور انجام بھی چونکا دینے والا تھا سلسلے وار ناولز میں مرشد ٹاپ پر جا رہا ہے ہر قسط ایک نئی سنسنی خیزی لیے ہوتی ہے اور دل کی دھڑکنیں زیر و زبر کرتی جاتی ہے اللہ کرے زور قلم اور زیادہ اپنا فیورٹ ناول ایک سو سولہ چاند کی راتیں اس دفعہ نہیں پڑھ سکا کیونکہ اسے پڑھنے کے لیے مجھے مکمل پرسکون ماحول کی تلاش ہوتی ہے تاکہ پوری طرح لطف اندوز ہوا جا سکے ایکشن تھرل اور رومان کس خوبی کے ساتھ یکجا کر دیا ہے عشنا صاحبہ نے اور رومان بھی ایسا جو جنسیت سے کوسوں دور کمال ہے واقعی مریم جہانگیر کو پہلے بھی تھوڑا بہت پڑھ رکھا ہے بہر حال ناول کا پہلا حصہ پڑھا ہے ابھی اپنی رائے محفوظ رکھنا چاہتا ہوں ان شاء اللہ ناول کے اختتام کے بعد اس پر بھرپور تبصرہ کروں گا لیکن اتنا ضرور کہوں گا کہ ویلڈن مریم جی، اب کچھ بات کرتے ہیں گوشہ ابن صفی کی ابن صفی کو میں نے بہت پڑھا ہے اور میری بڑی خواہش تھی کہ ان پر آرٹیکل لکھوں لیکن میری بدقسمتی کہ سید عادل اسد صاحب کا فیس بک گروپ بڑی دیر سے میری نظروں میں آیا جب میں نے اسے جوائن کیا تو یہ سیزن ختم ہو چکا تھا بہر حال میں ابن صفی کے تمام متوالوں کو نسخہ کے طور پر عادل بھائی کا یہ گروپ تجویز کروں گا۔ اس دفعہ میرے

کافی دوستوں کے آرٹیکلز شامل ہیں جن میں سیف خان، اعتزاز وصلی اور لبنیٰ رضوان نمایاں ہیں، میں ان سب کو مبارکباد پیش کرتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ نئے افق کے ساتھ اب وہ اپنا تعلق قائم رکھیں گے تمام دوستوں کے لیے نیک تمنائیں، والسلام۔

پرنس افضل شاہین...... بہاولنگر۔ اس بار اکتوبر کا شمارہ 24 ستمبر کو ہی مل گیا سرورق کی حسینہ دیکھ کر ہمارے ہونٹوں پر یہ شعر مچلنے لگا۔

پھر اس کے بعد تو آنکھوں میں بس گیا وہ شخص
اگرچہ ہم نے اسے بے دلی سے دیکھا تھا

دستک میں انکل جی میاں صاحب کو پڑھ بھار[illegible] تھے کہ عدلیہ کے فیصلے کو تسلیم کریں اور اسے بدنام نہ کریں اور دشمن کا آلہ کار نہ بنیں انکل جی مجھے نہیں لگتا [illegible] آپ کی سچی اور کھری باتوں کو سیریس لیں گے انہوں نے کرنی اپنی ہے اور گڑھے میں گرتا ہے پھر لوگ [illegible] کے اور میاں صاحب پھر ہر کسی سے پوچھتے پھریں گے کہ مجھے کیوں نکالا۔ اقرا [illegible] اللہ کے ایک اور بابرکت نام الجبار کے بارے میں اس نام کی فضیلت بیان فرمار[illegible] شاندار ہے گفتگو میں بھٹی صاحب ایک زبردست ناول حصار کے بارے میں فرمار ہے تھے [illegible] افق کے قارئین کے لیے شروع کررہی ہیں اور اس کا پہلا حصہ شامل اشاعت ہے ناول [illegible] ہی اپنے پڑھنے والوں کو اپنے حصار میں لے لیا ہے دوسری خوش خبری آپ نے یہ دی ہے [illegible] ماہ سے فارس مغل کا تین حصوں پر مشتمل ناول ہمجان شامل اشاعت ہوگا دستگیر شہزاد نے اپنے خط میں بہت ہی شاندار الفاظ تحریر کیے ہیں ان کا خط واقعی شاندار تھا امید ہے وہ آئندہ بھی نئے افق میں لکھتے رہیں گے صائمہ نور مجھے اور میری بیگم کو دعائیں دینے کا بہت بہت شکریہ ریاض بٹ صاحب میرے شعر کے جواب میں زبردست شعر تحریر فرمانے کا بہت شکریہ میرا تبصرہ پسند فرمانے کا بہت شکریہ بارش علی سمیر میرا تبصرہ پسند فرمانے کا شکریہ، ریاض حسین قمر آپ کا کلام پسند آیا تو تعریف کیے بغیر نہیں رہ سکا ایم حسن نظامی میرا خط پسند فرمانے کا شکریہ اللہ تعالیٰ آپ کی ہمشیرہ کو جنت میں جگہ دے اور آپ سب لواحقین کو صبر جمیل عطا فرمائے آمین، خواجہ حسین میرے خط نئے افق کی رونق بڑھاتے ہیں یہ شعر آپ کا حسن نظر ہے عبدالجبار رومی انصاری آپ کے خط کے شروع کا شعر لاجواب ہوتا ہے میرا خط پسند فرمانے کا بہت شکریہ، تقریباً تمام ہی کہانیاں زبردست رہیں ذوق آگہی میں سپاس گل غلام فاطمہ، مہوش نورین خوش بوئے سخن میں قمر آسی مریم ناز، فرح بھٹو، ناہید اختر بلوچ، چھائے رہے، اگر ہو سکے میرا پچھلا خط (جو کہ شائع نہیں ہو سکا) وہ اور یہ خط اکٹھے کر کے شائع فرمادیجیے گا آپ کی بہت بہت مہربانی ہوگی اجازت دیں اللہ حافظ۔

عبدالجبار رومی انصاری...... لاہور۔

میری آنکھوں میں دیکھ کیسا حزن و ملال ہے
دل شکستہ نہیں ہوں پھر بھی میرا حوصلہ کمال ہے
تخیل پرواز ہوں میں تو یہ بھی اک انداز ہے
حسن دوشیزگی بھی میرا بے مثال ہے

ہوئے تم دوست جس کے یہ جس کے دوست ہوئے ہیں ان کے ساتھ ناتہ ہونے پر یہ اہل مسلم کا درد نہیں جان سکتے تو یہ کشمیری مسلمانوں کے ساتھ ہمدردی کیونکر کر سکتے ہیں بس ایک بیان کی حد تک اور یہ تو ہم اخلاقی اور سفارتی سطح تک کشمیریوں کی حمایت کررہے ہیں کاش کہ عملی طور اپنے مسلمان بھائیوں، بہنوں، بیٹیوں، بچوں کو انڈیا کے ظلم و ستم سے آزادی بھی دلوائیں کشمیر ہماری شہ رگ ہے اور یہ شہ رگ ہی ہم ستر سالوں سے آزاد نہیں کرا سکے اقوام متحدہ کی تو بات کرنا ہی بے سود ہے اس ادارے میں مسلمانوں کی کوئی شنوائی نہیں ہے وہ صرف یہود و نصاریٰ و ہنود کے مفاد میں ہے اور مسلمانوں پر ظلم کا تماشہ دیکھنے کو ہے چین ہمارا دوست ہے تو ہماری حمایت بھی کرتا ہے اس کے کردار کو سراہتے ہیں اور مولانا مسعود اظہر لشکر طیبہ کے نہیں جیش محمد کے سربراہ ہیں دوسری طرف روہنگیائی مسلمانوں پر جو ظلم ہو رہا ہے اس پر بھی کوئی عملی اقدام نظر نہیں آ رہا میانمار حکومت ہٹ دھرمی اور ظلم و ستم ڈھانے کی مثالیں قائم کررہی ہے مسلم ملکوں کو چاہیے انہیں روکے اور مظلوم مسلمانوں کو بچانے میں کردار ادا کرے۔ گفتگو میں دستگیر شہزاد کا دفاعی خط ب[illegible]نگی کا علمبردار تھا لفظوں کی جادوگری میں بہت کچھ کہہ گئے ہیں سمجھنے والے سمجھ جاتے ہیں باقی انداز بہت اچھا لگا مجید احمد جائی نے طویل بحث میں پڑنے سے گریز کیا اور کروٹ بدل لی بہت اچھا لگا تبصرہ عمدہ رہا صائمہ نور نے بھی اچھا لکھا ثابت قدمی سے انسان ڈٹا رہے تو اسے کوئی بھی نہیں ہرا سکتا ریاض بٹ کے خوب صورت تبصرے میں خوب صورت [illegible] کے جواب میں کہوں گا۔

رخ تابندہ کی جھلک کی بھی تاب کر
یہ حسن فریفتہ ہے جب چھیڑے آداب کر

علی اصغر انصاری کا آگہی بھرا تبصرہ عمدہ رہا لیجیے بارش علی سمیر آپ نے یاد کیا تو ہم نے بھی خود کو تیرے روبرو کیا انکل ریاض حسین قمر کا بھرپور تبصرہ اچھا رہا اسی طرح حسن نظامی انکل نے بھی خوب صورت گفتگو کی حسین خواجہ کا تبصرہ بھی خوب رہا، اقرا میں الجبار کی خوب صورت تشریح نے دل میں گھر کر لیا اللہ تعالیٰ ہم پر رحم فرمائے اور عمل نیک کی توفیق دے۔ ایکس ون میں ابنارمل قسم کے جافری کو جتنا بچایا جاتا وہ اتنا ہی دشمنوں کے چنگل میں پھنستا اور آخرکار مارا ہی گیا جبکہ ریٹائرڈ فوجی اپنے مقصد میں کامیاب لوٹتا ہے چور سپاہی کی طرح آگے پیچھے بھاگتے کرداروں کی کہانی ایکس ون اچھی رہی خلیل جبار کی تحریر بھی عمدہ لگی آسان زندگی کے چکر میں صائمہ سہیلی نے فرہاد کا چراغ گل کیا تو ساتھ اپنے دوستوں کی بربادی بھی لے کر آئی لوگ ایسے پیار محبت کا غلط استعمال کرتے ہیں تو برائی کے انجام کو دعوت دیتے ہیں ناکام پلان سے مثبت اور اچھا پلان کرلیں تو زندگی بھی کامیاب ہو جائے بے نور قندیل نے کہاں انڈیا سے سفر شروع کیا اور پرخار راستوں سے پاکستان میں بھی کہیں روشنی نہ کر سکی اگر روشنی کی بھی تو شیراز جیسی کچی اور ظالم بنیاد نے وفا نہ کی اس کے بعد معاشرے کے ظلم و ستم نے اس بے نور قندیل کو ادھیڑ کر رکھ دیا سلمیٰ کی دکھ بھری کہانی نے دکھی کر دیا پراسرار جنگل سے شجاعت علی تو مار کھا کے بحفاظت نکل آیا اور گلنار کا پیار مکمل ہوا البتہ اسے مارنے والے حاکم خان اور منشیات فروش اپنے انجام کو پہنچے ریاض بٹ کی تحریر اچھی لگی واہ اس دفعہ تو محترمہ عشنا کوثر سردار نے پنجابی ماہیے سنا کر سماں ہی باندھ دیا بہت اچھے لگے اور امید ہے خوشنما بھی اس بندھن میں بندھ جائے گی لگ تو ایسا ہی رہا ہے ٹرین میں عین کی ثابت قدمی خوب رہی اور تیمور بھی آن ملا مگر ٹرین ابھی بھی پاکستان نہیں پہنچی کوئی میرے حصار میں کوئی تیرے حصار میں ہے ماہ روز جس کو حصار سمجھتی تھی اس سے بھی عدم تحفظ کا احساس ہوا خوبصورت لفظوں سے گندھی مریم جہانگیر کی تحریر حصار زبردست رہی حجاب کی بھرپور مزاحمت اور ثابت قدمی نے ہاشو اور نزہت بیگم کی ایک نہ چلنے دی اور اس غلیظ ماحول میں حجاب کو حسن آرا کی صورت شفیق سایہ میسر آ گیا مرشد اچھی جارہی ہے۔

مجید احمد جائی...... ملتان شریف مزاج گرامی! اُمید کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے خاص کرم و فضل سے خوشگوار زندگی سے لطف اندوز ہوتے ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ حق سچ سننے اور حق سچ کہنے کی توفیق عطا کرتا رہے۔ صحت کی

بادشاہی کے ساتھ انصاف کرنے والا بنائے۔ حق تلفی سے بچائے اور ضرورت مندوں کا سہارا بننے کی توفیق دیتا رہے آمین ثم آمین! ماہنامہ نئے اُفق حسب عادت اور حسب منشاء بروقت مل گیا۔ سرورق جاذب نظر ہے اور دل کش بھی۔ دستک میں نامور اور سینئر کالم نگار جناب مشتاق احمد قریشی صاحب بجا فرمارہے ہیں اور جب نومبر کا شمارہ ہماری دسترس میں آئے گا میاں نواز شریف پھر سے اپنی پارٹی کے صدر بن چکے ہوں گے اور نااہلی سے اہل ہوکر پھر سے وزیراعظم بننے کے خواب بھی دیکھ رہے ہوں گے۔ قصہ مختصر اللہ تعالیٰ ہمارے وطن اور ہماری ہر طرف سے ہر طرح کی حفاظت فرمائے آمین! گفتگو کا آغاز حدیث مبارکہ سے ہوا اللہ تعالیٰ ہمیں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اسوہ حسنہ پر عمل پیرا ہونے کی توفیق دے آمین! محترمہ مریم جہانگیر کا طویل ناول بطور خاص نئے افق کے قارئین کے لیے لکھا گیا، بڑی خوش آئندہ بات ہے اور یہ خوشی کی خبر بھی لگے ہاتھوں سنائی گئی کہ اگلے ماہ سے فارس مغل کا ناول ''ہم جان'' پڑھنے کو ملے گا۔ خوشیوں کے موسم میں خوشی بھری خبر اچھی لگی لیکن گفتگو کی پُررونق محفل کی رونقیں اب ماند پڑتی جاتیں رہی۔ دستگیر شہزاد صاحب نے بہترین انداز تحریر میں کنویں کے مینڈکوں کو جواب دیا ہے۔ چور مچائے شور کے مصدق ان کا کام ہی یہی ہے۔ عمل سے قاصر لوگ صرف واویلا ہی کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اقبال بھٹی صاحب کو جزائے خیر عطا فرمائے، میرے خط کا کچومر بنادیا۔ تین صفحات پر مشتمل دلائل سے مزین خط کا یہی حال کرنا تھا تو شائع ہی نہ کرتے۔ آپ جس منصب پر فائز ہیں وہاں مساوات اور انصاف کا پورا پورا خیال رکھا جاتا ہے۔ یقیناً آپ پورا پورا خیال رکھتے ہی ہیں لیکن سابقہ مہینے اور اس ماہ میں چند معتبر لکھاریوں نے ادب سے ہٹ کر، میری ذات کو تنقید کا نشانہ بنایا جس سے میری دل آزاری ہوئی۔ میں بھی انسان ہوں اور گوشت پوست کا دل رکھتا ہوں۔ تنقید برائے اصلاح کریں تو سر آنکھوں پر لیکن اگر اپنی تحریروں سے حسد، کینہ پروری اور ذاتی دُشمنی کو فروغ دیں تو زیادتی ہے قارئین کے لیے بھی اور ادارے کے لیے۔ ادارہ کو اس چیز کا خیال ضرور رکھنا چاہیے۔ ریاض بٹ صاحب کیسے ہیں۔ سدا خوش رہیں اب ہم کتابوں میں ملیں گے، میرا پرانا نمبر آن ہی ہے رابطہ کیجئے گا۔ رہے نام اللہ کا۔ علی اصغر انصاری صاحب محبتوں کا بہت شکریہ، کوئی بھی دودھ کا دُھلا نہیں ہے۔ ریاض حسین قمر صاحب کیسے ہیں، آپ کا حکم سر آنکھوں پر، مسکان ظفر بھٹی کا کوئی وجود نہیں ہے، ایک ہی شخص نام بدل کر خط لکھتا ہے عبدالجبار رومی کہاں مصروف رہتے ہو آپ کی حاضری کم کم ہوتی ہے۔ اقراء پڑھ کر اپنے رب تعالیٰ کی عطا کردہ نعمتوں کا شکریہ ادا کیا۔ ایکس ون کا خوبصورت اختتام ہوا۔ پُراسرار جنگل اس بار کہانی خوب اسراریت بھری تھی۔ آخر تک تجسس قائم رہا۔ واقعات اور جملوں کی بنت اعلیٰ تھی۔ بہت خوب۔ بے نور قندیل بہت اعلیٰ اور نہلے پہ دہلا نے کمال ہی کردیا۔ پولیس جو ہر عام شہری کو لوٹنے پر تلی ہے اور اپنے کوٹے پورے کرتے ہیں۔ سلمان نے ٹھیک کیا۔ سیانے سچ ہی تو کہتے ہیں لینے کے دینے پڑ جاتے ہیں۔ عمدہ کہانی۔ گوشہ ابن صفی کمال کا تھا۔ کیا ہی اچھا ہوتا ابن صفی نمبر نکالا جاتا۔ حصار کا آغاز اچھا رہا۔ ناکام پلان نے بھی حیرت میں مبتلا کیا۔ ہیرو کون لاجواب تحریر تھی۔ مرشد قسط نمبر چار خوب رہی۔ ایک سو سولہ چاند کی راتیں بہتر سے بہترین ہوتا جارہا ہے۔ ذوق آگہی اور خوشبوئے سخن حسب روایت اچھے رہے۔

صائمہ نور......ملتان۔ آداب! اُمید کرتی ہوں ہنستے مسکراتے اور صحت بھری زندگی بسر کررہے ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ خوشیوں اور مسرتوں سے مالا مال فرمائے۔ ماہ اکتوبر کا نئے اُفق اپنی تمام تر رعنائیوں سے مزین بہت جلد مل گیا۔ یہ نئے افق کا ہی خاصا ہے کہ یکم سے پندرہ دن پہلے ہی مل جاتا ہے۔ اللہ کرے یہ روایت جاری وساری رہے آمین۔ یہ سطور لکھ رہی ہوں تو محرم الحرام خیر خیرت سے گزر گیا ہے۔ الحمدللہ کوئی بُری خبر، کوئی سانحہ نہیں ہوا۔ دستک میں انکل مشتاق احمد قریشی صاحب گہرا تجزیہ کررہے ہیں اور سیاسی اتار چڑھاؤ پر گہری نظر رکھے ہوئے ہیں۔ گفتگو کی

...مل ...ں ...گیر شہزاد صدارت کی کرسی پر جلوہ گر ہیں اور چوٹ دار جملوں سے کچھ کہا بھی نہیں اور سب کچھ کہہ بھی گئے ... ... مطلوب سے مزین خوبصورت خط۔ عقل والوں کے لئے اللہ تعالیٰ نے نشانیاں رکھی ہیں اور گدھوں پر لاکھوں ... ...ی جائیں ان کو عقل نہیں آتی۔ مجید احمد جائی کا نام اس بار ''اجید احمد جائی'' لکھا گیا۔ توجہ دیا کریں۔ مجھے ... شائع کرنے کا شکریہ۔ ریاض بٹ آپ کی دعاؤں پر آمین کہتی ہوں۔ اللہ تعالیٰ سلامت رکھے آمین۔ اس بار ... ...کل میں تمام راز ہی اُگل دیئے گئے ہیں۔ اگلی تفتیش کہاں سے ہوگی۔ دیہاتی کلچر کو اجاگر کریں کس طرح ... دیہاتی لوگوں کو اور دیہاتی چھوٹی چھوٹی باتوں کو انا کا مسئلہ بنا کر کورٹ کچہریوں کا رُخ کرتے ہیں اور اپنی جمع ...لی اور جائیداد تک ختم کر بیٹھتے ہیں پلے کچھ نہیں پڑتا۔ آپ کا تعلق دیہات سے ہے آپ بخوبی جانتے ہیں، ان ...وضوعات کو اپنی تفتیش کا حصہ بنائیں۔ علی اصغر انصاری بھائی گروپ بندی کبھی کسی کی نہیں ہوئی، آج جس کے ساتھ آپ ہیں کل کو یہی آپ کے دُشمن ہوں گے، بارش علی سمیر شکر کریں اللہ تعالیٰ نے انسان کو خلیفہ بنایا ہے، اگر مکمل اختیار انسان کو نہیں دیا۔ ریاض حسین قمر بھائی کیسے ہیں؟ اللہ تعالیٰ آپ کو خوشیوں بھری زندگی عطا کیے رکھے آمین ایم حسن نظامی کا خط پیارا ہے۔ عبدالجبار رومی انصاری بہت شکریہ۔ سلامت رہیں۔ اقراء ہر بار کی طرح لاجواب ہے۔ ایکس ون آپی زرین قمر نے کمال کردیا، ہیرو کون امین صدرالدین بھایانی صاحب دیار غیر میں بیٹھ کر اچھی کہانیاں تخلیق کررہے ہیں، ناکام پلان خلیل جبار ہر بار عمدہ تحریر لاتے ہیں۔ بے نور قندیل، سلیم اختر کا دورانیہ غیر حاضری طوالت پکڑتی جارہی ہے، کم کم نظر آتے ہیں۔ پُراسرار جنگل نے اس بار تمام ریکارڈ توڑ دیئے۔ نہلے پہ دہلا نے کمال کردیا۔ پولیس والوں کے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا کہ ایک عام لڑکا ان کو اس طرح پھنسا دے گا اور پورا عملہ نوکری سے ہاتھ دھو بیٹھے گا۔ حصار کا آغاز اچھا رہا۔ گوشہ ابن صفی نے متاثر کیا۔ چاہنے والوں نے اپنے تاثرات سے آگاہ کیا۔ ہوسکے تو ابن صفی کی کہانیاں پھر سے یاد رفتگان کے طور پر شائع کی جائیں۔ مرشد بہترین جارہا ہے، ذوق آگہی اور خوش بوئے سخن معیاری ہیں۔

محمد رفاقت......واہ کینٹ۔ محترم اقبال بھٹی صاحب السلام علیکم جناب گفتگو میں شرکت کررہا ہوں امید ہے آپ کی تمام ٹیم نئے افق کی خدا تعالیٰ کے فضل وکرم سے خیر خیریت سے ہوگی اللہ تعالیٰ آپ کو اور آپ کی تمام ٹیم کو صحت تندرستی کے ساتھ خوش وخرم رکھے، آمین۔ محترم جناب مشتاق احمد قریشی نے بھی کیا خوب تحریر پیش کی ہے کوئی تو ہے اس کی تعریف نہ کی جائے یہ ہو نہیں سکتا محترم مشتاق احمد قریشی صاحب نے جس طرح پاکستان کے حالات کی عکاسی کی ہے اس سے تمام پاکستانی لوگ اپنی جگہ سوچیں تو ان کو آج کے پاکستان کی تصویر نظر آئے گی محترم ریاض بٹ صاحب نے میری تعریف کردی بھائی ہم کہاں اس قابل ہیں لکھنا تو کوئی آپ سے سیکھے جناب حسین خواجہ صاحب کا تبصرہ پڑھا بہت خوب جناب اچھا ہی نہیں بلکہ بہت اچھا تبصرہ ہے میری طرف سے مبارک باد قبول ہو صائمہ نور، مجید احمد جائی صاحب اور محترم ریاض حسین قمر صاحب آپ کے خط بہت ہی اچھے ہیں اور میری خط پسند کرنے کا بہت بہت شکریہ آتے ہیں کہانیوں کی طرف تو جناب ریاض بٹ صاحب کی حاضری لگی ہوئی ہے اور کہانی نفس کے قیدی بہت شاندار ہے جناب آپ کو مبارک ہو لگاتار آپ نئے افق میں شائع ہورہے ہو یہ ایک ریکارڈ ہے اس کے لیے الگ سے مبارک باد قبول ہو تلخ یادیں، محترم خلیل جبار صاحب، بھوتوں کی جیل محترم دستگیر شہزاد صاحب کی اجڑ تا عشق، قرۃ العین سکندر صاحبہ کی جامن کا درخت رابعہ امجد صاحبہ کی بہت اچھی کہانیاں تھیں اور ایکس ون اور مرشد زرین قمر صاحبہ ساحر جمیل سید صاحب کی مدتوں یاد رکھی جانے والی تحریریں ہیں اور نئے افق کی جان تھیں میری طرف سے مبارک باد قبول ہو، محترم اقبال بھٹی صاحب آپ درست ہی کہتے ہیں جو لوگ بھی تبصرہ کریں وہ دوسروں کا

خیال رکھیں تاکہ کسی کی بھی دل آزاری نہ ہو ایک غلط لفظ سے کیا سے کیا بات بن جاتی ہے لوگوں کے خیالات ہی ان تبصروں سے معلوم ہوتے ہیں ہمیں ہر حال میں دوسروں کا خیال رکھنا چاہیے عائشہ بٹ کی رسالے میں کمی محسوس ہوئی اس دفعہ بہت ہی اچھا رسالہ پڑھنے کو ملا اور رسالہ جلد ہی مل گیا جس کے لیے میں آپ کا اور آپ کے ادارے کا شکر گزار ہوں اللہ تعالیٰ آپ کو اچھی صحت دے اور آپ کا رسالہ دن دگنی رات چوگنی ترقی کرے میری کہانیاں ضرور شائع کریں بس صرف آپ سے اتنا ہی کہنا ہے ہمیں بھی آپ اپنی دعاؤں میں یاد رکھیں آپ کا بہت بہت شکریہ، اجازت ان شاء اللہ اگلے ماہ زندگی رہی تو پھر شامل ہوں گا۔

ریاض بٹ...... حسن ابدال۔ السلام علیکم، ماہ اکتوبر کا شمارہ حیرت انگیز طور پر 20 ستمبر کو ہی مل گیا بہت مہربانی اور نوازش بروقت پرچہ بھیجنے کی اس بار سرورق بہت ہی دیدہ زیب سندر اور منفرد لگا ویل ڈن اس بار مشتاق احمد قریشی صاحب دستک میں جو حقیقت بیان کررہے ہیں جو آئینہ دکھا رہے ہیں وہ وقت کی آواز ہے لیکن بات وہی ہے کہ نقار خانے میں طوطی کی کون سنتا ہے بہر حال اس میں ہمارے عوام کا بھی برابر کا ہاتھ ہے لاہور کے ضمنی انتخاب کا نتیجہ سب کے سامنے ہے ان کو یہ کہنے کا موقع مل گیا ہے کہ ہم عوام کی عدالت سے سرخرو ہوئے ہیں بہر حال اس موقع پر ہماری عقل نے بروقت کام کیا اور ہم اس موضوع پر مزید بحث کو فضول سمجھتے ہوئے خطوط کی محفل میں پہنچے پہلا خط ہے جناب دستگیر شہزاد کا اپنے خط میں دستگیر صاحب نام نہاد نقادوں کو آئینہ دکھاتے نظر آئے یہ تو صرف تنقید برائے تنقید ہی کرتے ہیں دو رسالوں میں ایک ہی کہانی شائع ہونے کے متعلق جو وجہ انہوں نے بیان کی ہے اس سے میں مکمل طور پر اتفاق کرتا ہوں اب بات ہو جائے جناب مجید احمد جائی صاحب سے بھائی آپ کے سوالوں کے جواب تو کافی حد تک میری اس ماہ کی تفتیشی کہانی پراسرار جنگل میں آپ کو مل جائیں گے لیکن کچھ باتوں کا جواب بلکہ وضاحت میں خود ہی کر دیتا ہوں کوئی کہانی کسی کو پسند نہ آنا ایک الگ بات ہے کیونکہ ظاہر ہے جب گھر میں ہانڈی پکتی ہے تو وہ سب کی پسند کی نہیں ہوتی بہر حال جہاں تک غلطیوں کی بات ہے تو غلطی کا امکان ہر جگہ ہوتا ہے کمپوزنگ کرنے والے بھی انسان ہی ہوتے ہیں اور لکھاری بھی ایک انسان ہوتا ہے باقی رہی بات گھر میں درندہ پالنے کی تو گاؤں دیہات تو میں یہ بات کوئی عجوبہ نہیں کھلی فضا، کھلے گھر اور شوق ہوتا ہے بھیڑیے کی خصلت اور فطرت سے شاید آپ واقف نہیں ہیں، بکریوں پر حملہ کرنا اس کی فطرت میں شامل ہے باقی کام اس نے زخمی ہونے کے بعد کیا تھا باقی اس بات کی وضاحت کہ انہوں نے بچایا کیوں نہیں، تو ایسے حالات میں انسان کے ہاتھ پاؤں پھول جاتے ہیں پھر نذیر کے ساتھ تو ایک لڑکی بھی تھی جو بے ہوش ہوگئی تھی بہر حال آپ کا تبصرہ سر آنکھوں پر خوش رہیں مجید احمد جائی کے بعد خط ہے صائمہ نور بہن کا بہن یہ جان کر خوشی ہوئی کہ حسن ابدال سے آپ کی یادیں وابستہ ہیں یادیں تو پیتل کے برتن کی طرح ہوتی ہیں اگر ان کو مانجھتے رہو تو یہ نکھری رہتی ہیں ورنہ وقت ان پر کائی جما دیتا ہے میری تفتیشی کہانی پسند کرنے کا شکریہ بہن میری بیٹی ملتان میں بیاہی ہوئی ہے علی اصغر انصاری کیسی ہو آپ کا تبصرہ بھی اچھا ہے بارش علی سمیر مہر اتبصرہ پسند کرنے کا شکریہ پیارے بھائی ریاض حسین قمر دکھ سکھ تو زندگی کے ساتھی ہیں جیون ساتھی کا خلا تو [illegible] بات پورا نہیں ہوتا لیکن صبر کے علاوہ کوئی چارہ بھی تو نہیں ہوتا آپ کا تبصرہ بڑا مدلل اور خوب صورت ہوتا [illegible] سے کہ آپ میری تفتیشی کہانی سب سے پہلے پڑھتے ہیں میرا سیروں خون بڑھ جاتا ہے اللہ آپ [illegible] اور حسب معمول میری کہانی نفس کے قیدی پسند کرنے کا بے حد شکریہ یہ بات بھی سچ ہے کہ [illegible] جانے یا کرسی حاصل کرنے کے لیے ایک دوسرے کے اوپر کیچڑ اچھالتے ہیں انہیں عوام اور [illegible] کوئی غرض نہیں عبدالجبار رومی انصاری، میری تفتیشی کہانی نفس کے قیدی پسند کرنے [illegible] بھی آپ کو اچھا لگا

جس کے لیے مزید شکریہ اور مہربانی آپ کا تبصرہ بھی خوب ہے لو جی خطوط تو ختم ہوئے اس بار کافی ریگولر بھائیوں اور بہنوں کے خطوط غائب تھے خدارا جلدی لوٹ آئیے آپ کے بغیر یہ محفل سونی سونی ہے اقرا میں طاہر قریشی صاحب ایمان افروز تحریر لے کر آئے ویل ڈن اب بڑھتے ہیں کہانیوں کی طرف زرین قمر کی ایکس ون کا انجام بہت ونڈرفل ہے اب ان کی اگلی کہانی کا انتظار رہے گا امین صدر الدین بھایانی کی کہانی ہیرو کون ایک اچھی اور لبوں پر مسکراہٹ بکھیرنے والی ہے یہ تو ان کا خاص انداز ہے اللہ کرے زور قلم اور زیادہ خلیل جبار صاحب اس بار بھی ایک اچھی اور سبق آموز کہانی ناکام پلان لے کر آئے صائمہ کو لالچ نے کہیں کا نہیں رکھا اس نے یہ تو سوچا ہی نہیں کہ اس کے اور فرہاد کے تعلقات کا فرہاد کے گھر والوں کو پتا ہے بہر حال اچھے مستقبل کا خواب دیکھنا کوئی بری بات نہیں لیکن اس کو شارٹ کٹ یا غلط طریقے سے حاصل کرنا ایسے ہی انجام سے دوچار کرتا ہے بے نور قندیل سلیم اختر صاحب کی ایک ایسی کہانی ہے جس کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے دنیا میں ایسے بھی ہوتا ہے ویل ڈن آپ کی کہانیاں دل کو چھوتی ہیں عارف شیخ کی مختصر کہانی بھی کمال کی ہے واقعی سیر کو سوا سیر مل گیا تھا اب بڑھتے ہیں گوشہ ابن صفی کی طرف اس سلسلے میں حافظ ابوبکر، سید فہد حسینی، عالیہ چوہدری، عبدالودود عامر، حمزہ رمضان، ظہیر شیخ، اعتزاز سلیم وصلی، لقمان احمد اعوان، اصفینہ ناز، مریم کاشف، فرحان خان، کوثر اسلام، جوہر عباس، لبنیٰ رضوان، وریشہ عبدالجلیل، روشی خان، شائب شیخ، شمعون علی چوہدری، حمیرہ ثاقب، اسماعیل بن محمد، ابن آس، داور عزیز، احتشام شاہ، سیدہ ذکیہ، ثناء اللہ خان احسن، سیف خان، سیدہ عطیہ حنا، عرفان نجمی کانپوری نے اپنی اپنی محبت، عقیدت، یادداشت اور اشعار کا سہارا لے کر خوب سے خوب تر لکھا اور اپنے جذبات اور احساسات صفحہ قرطاس پر بکھیرے میرے خیال میں اگر ان لوگوں کی تعریف نہ کی جائے تو زیادتی اور کوتاہی ہوگی پڑھی لکھی اور اردو ادب پڑھنے والی قوم میں اسی طرح اپنے محسن اردو کو خراج تحسین پیش کرتی ہیں اور ادارہ بھی اس بات پر تعریف کا مستحق ہے لیکن ادارے سے ایک شکایت بہر حال بنتی ہے کہ انہوں نے شمارہ ماہ ستمبر اور ماہ اکتوبر کو ابن صفی نمبر نہیں دیا میری بھی بڑی خواہش تھی (جیسا کہ ایک قاری) نے بھی لکھا ہے کہ میں جناب ابن صفی قابل صد احترام استاد کو بندہ ناچیز خراج تحسین پیش کرتا لیکن اپنی کم مائیگی کے ہاتھوں مجبور ہو گیا کیونکہ میرے قلم میں وہ الفاظ نہیں جن سے میں ان کے فن کی تعریف کر سکوں ان کے اردو ادب پر اور ہم جیسے طفل مکتب لکھاریوں پر احسانات کا ذکر کرسکوں ان کا اردو ادب میں جو مقام ہے اس کو بیان کرنے کے لیے واقعی الفاظ کا قحط ہے میرے پاس۔

تعریف کیا کروں میں ان کی اے ریاض
ان کا ہے مقام اونچا ہیں لفظ کمیاب

اب اجازت اگلے ماہ ان شاء اللہ ملاقات ہوگی۔

ایم حسن نظامی...... قبولہ شریف۔ قابل قدر بھٹی صاحب آداب سلام عقیدت۔ امید ہے افق قبیلہ کے بھی احباب بخیریت ہوں گے اکتوبر کا پرچہ بدلتے موسم کی نوید لیے جلوہ گر ہوا مشتاق احمد قریشی، اقبال بھٹی اور طاہر قریشی کے علاوہ پوری ٹیم نے اسے سجانے سنوارنے میں اہم کردار ادا کیا تبھی روز بروز اس میں نمایاں نکھار رونما ہو رہا ہے۔ سر مشتاق احمد صاحب بھی پاکستانیوں کے دلوں پر پرزور دستک دیتے نظر نواز ہوئے جو بلاشبہ معیاری اور معقول تقرات اور عمدہ گفتگو کی عکاسی پائیں۔ دستگیر شہزاد نے لفظوں، محاوروں اور تشبیہات سے اپنی گفتگو کو چار چاند لگا دیے تبھی کرسی صدارت کے حقدار ٹھہرے، بہن صائمہ نور، ریاض بٹ، علی اصغر انصاری، بارش علی سمیر، ریاض حسین قمر، خواجہ حسین اور عبدالجبار رومی سبھی ساتھیوں نے پرچے پر اور ایک دوسرے کے دکھ سکھ میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور

ہر کسی کی گفتگو پر اثر ٹھہری مگر بہت سے احباب اس محفل میں غیر حاضر پائے میری سبھی سے گزارش ہے کہ واپس لوٹ آئیں اس بزم کو ویران و سنسان نہ ہونے دیں۔ طاہر بھائی نے خداوند کریم کے نام کی فضیلت اور تشریح بے حد عمدہ گی اور پر اثر فقرات سے کی جس سے من کے بھی جذبے معطر ہو گئے، میگزین کی پہلی تحریر زرین قمر صاحبہ کے حصہ میں آئی انہوں نے اپنی قابلیت لفظوں، فقروں کے اچھوتے روپ میں بھرپور اجاگر کی اور غدار کی سزا موت ٹھہری۔ امین صدر الدین بھایانی کی عمدہ سوچ بھی منفرد ٹھہری اور تحریر معیاری پائی خلیل جبار کی کورٹ رپورٹ زندگی کے تجی رویوں اور خوب صورت پلاٹ کا احاطہ کرتی پائی عشنا کوثر سردار اور سلیم اختر دونوں کی تحریریں لاجواب پائیں ویلڈن جی، ریاض بٹ بھی وسیع و عریض الفاظ رکھتے ہیں ان کے من کی ڈکشنری کے لفظ ان کے سامنے ہاتھ باندھے انتظار میں سر نگوں کھڑے مسکرا رہے ہوتے ہیں اور اپنے استعمال کی باری پہ جیسے فخر محسوس کرتے ہیں۔ مریم جہانگیر کے حصار کا پہلا حصہ بے حد اچھا لگا اسرئی کے کردار پہ حیرت ہوئی نہلے پر دہلا بھی اچھی رہی۔ ابن صفی کے بارے میں بھی ساتھیوں نے خوب صورت پیراگراف میں عمدہ باتوں سے اچھی محفل سجائی اردو ادب میں ان کی خدمات مدتوں یاد رکھی جائیں گی ایسے نامور اور معروف لوگ صدیوں بعد پیدا ہوا کرتے ہیں اور تاریخ کے اوراق پر سنہرے حروف بن کر سدا چمکتے رہتے ہیں ذوق آگہی میں بھی ساتھیوں کے خوب صورت تاثرات اور منفرد تجزیے اچھے لگے خوش بوئے سخن کی شاعری دل کو بھاگئی۔ ساحر جمیل سید کے ناول کی چوتھی کڑی اچھوتے اور منفرد مقام پر پائی ساتھیوں اشکوں کی جھڑی آسمان سے ہی نہیں آنکھوں سے بھی برستی ہے اور رونے کے لیے آنکھ ہی نہیں دل بھی ہوتا ہے اور دل بے سبب نہیں روتا کبھی یاد زخم بن کر دھڑکنوں پر دستک دیتی ہے تو ایک ایک کر کے یادوں کے دریچوں سے چمکتی ریت صاف ہونے لگتی ہے دھندلائے مناظر جیتے جاگتے کردار بن کر آنکھوں کے سامنے لہرانے لگتے ہیں پھر نگاہوں سے اشک ٹوٹ ٹوٹ کر گرنے لگتے ہیں مگر ملنا اور بچھڑنا دنیا کی ریت ہی نہیں ایک اٹل حقیقت بھی ہے کوئی دو پل کے لیے بھی یا پھر عمر بھر آخر ایک روز تو جدا ہونا ہی پڑتا ہے نا میں نہایت افسوس سے لکھ رہا ہوں کہ میری ماں جیسی عظیم ہستی بڑی ہمشیرہ مجھے بیکراں تنہائیاں اور ویرانیاں سونپ کر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اپنے خالق حقیقی سے جا ملیں۔ انا للہ وانا علیہ راجعون۔ سبھی احباب سے ان کی بخشش کی دعا کی اپیل ہے خداوند کریم انہیں جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے اور لواحقین کو صبر جمیل عطا فرمائے، آمین۔

ریاض حسین قمر...... منگلا ڈیم۔ مدیر محترم جناب اقبال بھٹی صاحب سلام شوق امید ہے مزاج گرامی بخیر ہوں گے نئے افق اکتوبر کا شمارہ بر وقت مل گیا تھا سرورق اس بار سادہ مگر خوب صورت ہے رب کریم اپنے حبیب ﷺ کے صدقے جناب مصور صاحب کے ہاتھ میں مزید صفائی لائے آمین۔ دستک میں جناب مشتاق احمد قریشی صاحب نے جس طرح بہت کڑوا سچ بیان کیا ہے وہ قابل تعریف ہے میں یہاں عرض کرتا چلوں کہ نام نہاد اقوام متحدہ (یو این او) دراصل بھارت کی لونڈی بڑی بڑی عالمی طاقتوں کی داشتہ اور تمام مسلمانوں کی کٹر دشمن ہے وہ بھلا مسئلہ کشمیر کو کیسے حل کرائے گی ان شاء اللہ اس پلید ادارے کا بھی سابقہ لیگ آف نیشنز جیسا انجام ہوگا مگر اس وقت تک یہ مسلمانوں کو بہت زیادہ نقصان پہنچا چکا ہوگا، رب لم یزل دور حاضر کے مسلم حکمرانوں کو عقل کے ناخن عطا فرمائے، آمین ثم آمین۔ گفتگو کے آغاز میں بیان کی گئی حدیث مبارکہ اس دور کے نوجوانوں کے لیے ایک ایسا سبق ہے جو نئی نسل کو ازبر ہو جانا چاہیے خطوط میں کرسی صدارت جناب دستگیر شہزاد کے حصے میں آئی ہے ان کا خط بڑا مدلل ہے انہوں نے اپنے مخصوص انداز میں ایک بات سمجھانے کی کوشش کی ہے وہ اس میں بہت حد تک کامیاب ہوئے ہیں جائی صاحب کا خط بھی کافی مدلل اور پر معنی ہے اللہ کرے زور قلم اور زیادہ بہن صائمہ نور صاحبہ نے جس پیارے

انداز میں مجھے یاد رکھا اور یاد کیا ہے اس کے لیے میں ان کا مشکور ہوں جناب ریاض بٹ صاحب ایسی انوکھی تفتیشی کہانی اور پیارے خط کے ساتھ تشریف لائے ہیں ریاض بھائی میرے تبصرے کو پسند فرمانے کا بہت بہت شکریہ ایم حسن نظامی صاحب خط پسند فرمانے کا شکریہ باقی خطوط بھی اپنی اپنی جگہ خوب ہیں، خوش بوئے سخن اور ذوق آگہی بہت ہی خوب ہیں اقرا میں جناب طاہر قریشی صاحب حسب معمول ایمان تازہ فرما رہے ہیں، مدیر محترم آخر میں کچھ گلا شکوہ ہے بندہ ناچیز نئے افق کا بہت ہی مخلص اور پرانا قاری ہے اس ناتے میرا گلہ کرنا حق بنتا ہے میں نے دو دفعہ جوابی لفافہ بھیج کر محترم نسیم سحر کا موبائل نمبر اور گھر کا پتا مانگا تھا مگر دونوں دفعہ ادارے کے کانوں پر جوں نہیں رینگی اور میرے جوابی لفافے ردی کی ٹوکری کی نذر کر دیے گئے جس کا مجھے بہت قلق ہے۔

(محترم ہمارے پاس نسیم سحر کا ایڈریس دستیاب نہیں اگر ہوتا تو ضرور ارسال کرتے)

محمد فرقان...... چکوال۔ آداب امید نہیں بلکہ یقین اور پکے وثوق سے کہہ رہا ہوں کہ تمام حاضرین محفل خیر و عافیت سے ہوں گے اور کیوں نہ ہوں، جن کے سر پر نئے افق کا سایہ تا ابد لہراتا رہے گا ستمبر کا پرچہ دیر سے ملا اس لیے تبصرہ نہ کر سکے، میں دسویں جماعت کا طالب علم ہوں، اس لیے سارا رسالہ نہیں پڑھ سکتا، ٹائم ملے تو سارا بھی پڑھ لیتا ہوں، اکتوبر کا شمارہ پچیس کو ملا سرورق پہ طائرانہ نگاہ دوڑائی تو دیکھا کہ پری نما مخلوق آئینہ میں پرتوئے جمال دیکھا رہی تھی، ریاض بٹ جی آپ میرا کیوں شکریہ ادا کرتے ہیں بلکہ ہم تو آپ کے شکر گزار ہیں کہ ہر ماہ اچھوتے پلاٹ کے ساتھ حاضری دیتے ہیں دستگیر شہزاد صاحب نے اپنے طویل خط میں حق کہا اور دو ٹوک کہا مجید احمد جائی نے بھی درست کہا کہ آدھا گلاس خالی ہے کہ بجائے آدھا گلاس بھرا ہوا ہے، پر اعتماد ہونا چاہیے اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے یہ تو صائمہ نور صاحبہ ہی بتائیں گی کیونکہ ہم نے تو اونٹ نہیں رکھے ہوئے اور جہاں تک محاورے کا تعلق ہے تو وہ وقت بتائے گا۔ علی اصغر انصاری جی آپ کی ہدایت کو مدنگاہ رکھتے ہوئے ہی مفصل خط لکھ رہا ہوں (خیر اتنا مفصل بھی نہیں) بارش علی سمیر ہماری پوسٹ اگر سپرہٹ ہے تو آپ کی بھی سو پرسے بھی اوپر ہے واہ جی واہ۔ ریاض حسین قمر بھی شریک بزم تھے عبدالجبار رومی انصاری نے بھی اچھا تبصرہ کیا عارف شیخ نے نہلے پہ دہلا میں دو صفحوں پر عقل مندی کا فلسفہ آشکار کیا، مریم جہانگیر نے حصار میں حقیقت سے قریب تر باتیں لکھیں اور بہت خوب بہت خوب لکھا، اس بار فن پارے نہیں تھے مگر ابن صفی کی بابت میں گفتگو فن پاروں سے کم نہیں تھی پلیز فن پاروں میں ہر بار پریم چند کی کہانی شامل کریں ستمبر کے شمارے میں ڈیرہ غازی خان سے انابیہ رحمان کے خوش بوئے سخن میں پیا نام کی غزل لکھی تھی جو خوب رہی، آئندہ بھی ایسی ہی غزلیں لکھتی رہا کریں امین صدر الدین بھایانی کے قلم سے ہیرو کون فٹ رہی، ریاض بٹ صاحب کی پر اسرار جنگل اس بار بھی سب پر سبقت لے گئی۔ اگلے ماہ تک لیے فی امان اللہ۔

ناقابل اشاعت کہانیاں:۔

زندگی ہے تو (قرۃ العین سکندر)، صلہ (عائشہ بٹ)، ابن آدم (اکرم اسلم)، چاچا کرمو (عائشہ بٹ)، چھوٹی پکار) (گل مہر)، پاگل (گل مہر)، حسین ناگن (معاویہ عزبرٹو)



اقراء

ترتیب: طاہر قریشی

المتکبر

(عظمت وبزرگی والا)

متکبر کے معنی ہیں' سربلند' عظمت کی آخری حد کو پہنچا ہوا' جس کے سامنے تمام مخلوقات حقیر ہوں' عظمت وجلال والا' اسم فاعل مفرد مرفوع تکبر مصدر (مدارک) ہر نامناسب صفت سے برتر (محلی) تکبر دو طرح کا ہوتا ہے۔ (۱) فی نفسہ کسی میں خوبیاں اور صفاتِ حسنہ سب سے زیادہ ہوں (۲) واقع میں تو صفاتِ حسنہ سے خالی ہو اور مدعی ہو کمال صفت کا' اول محمود ہے اور دوسرا مذموم ہے اس لئے پہلے معنی کے اعتبار سے متکبر اللہ تعالیٰ کی صفت ہے وہ محمود ہے۔ دوسرے معنی کا اطلاق کافر اور مغرور انسان پر ہوتا ہے' جو مذموم اور قبیح ہے۔ تکبر کی بدترین قسم یہ ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور فرمانبرداری سے سرکشی اختیار کرتے ہوئے خودسر بن جائے۔ بڑائی کا گھمنڈ کرنا دراصل اللہ کی بندگی سے منہ موڑنا اور شیطان کے پیچھے لگنا ہے غرور وتکبر' گھمنڈ' بڑائی یہ سب شیاطین کا کام ہے جس کا نتیجہ تنزلی' پستی ہے۔ بخلاف اس کے اللہ کے آگے جھکنا' اس کی بندگی واطاعت کرنا اور ثابت قدم رہنا' متقی و پرہیزگار رہنا ملکوتی عمل ہے جس کا نتیجہ ترقی وبلندی اور قربِ الٰہی ہے اور غرور وتکبر باعثِ ذلت ورسوائی ہے' اس لئے ہی قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ نے غرور وتکبر' گھمنڈ سے بچنے کی ہدایت فرمائی ہے جیسا کہ سورہ بنی اسرائیل میں ارشاد ہوا ہے۔

ولاتمش فی الارض مرحا انک لن تخرق الارض ولن تبلغ الجبال طولا۔

ترجمہ:۔ اور زمین پر اکڑ کر نہ چلو' کہ نہ تم زمین کو پھاڑ سکتے ہو اور نہ لمبائی میں پہاڑوں کو پہنچ سکتے ہو۔ (بنی اسرائیل۔ ۳۷)

اللہ تعالیٰ اہلِ ایمان کو ہدایت فرما رہا ہے کہ اے انسانو! جباروں متکبروں کی روش سے بچو [illegible] اللہ تعالیٰ کی یہ ہدایت انفرادی طرزِ عمل اور قومی رویوں' دلوں پر یکساں اثر انداز ہوتی ہے۔ اللہ کی ان ہدایات کا اثر تھا کہ خلافتِ راشدہ اور اسلامی مملکت کے گورنروں' سپہ سالاروں کی زندگی میں [illegible] برابر نہ گھمنڈ تھا نہ غرور وتکبر' صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین میں ایک سے ایک [illegible] تھے لیکن ان کی زندگی میں کسی بھی طرح' کسی بھی قسم سے نہ جباری کی جھلک تھی نہ کبریائی کی بو باس کا شائبہ تھا۔ یہاں تک کہ عین حالتِ جنگ میں بھی ان کی زبان سے کبھی غرور وفخر کی کوئی بات نہیں نکلتی تھی۔ ان کا طرزِ زندگی ان کی نشست وبرخاست' چال ڈھال' لباس' مکان' سواری' تمام بول چال اور برتاؤ وانکسار' تواضع' سب میں فقیری درویشی کی شان نمایاں پائی جاتی تھی۔ وہ کوئی ایسا کام کبھی نہیں کرتے تھے جس سے اللہ نے ناپسندیدگی کا اظہار کر دیا ہو۔ غرور وتکبر کو اللہ ناپسند فرماتا ہے۔ تمام بڑائی' تمام غرور وتکبر اللہ جلِ شانہٗ کی صفتِ عالی ہے' صرف اُسے ہی زیب دیتی ہے کسی اور کو ہرگز ہرگز نہیں اور جو لوگ غرور وگھمنڈ کرتے ہیں اللہ انہیں پسند نہیں کرتا جیسا کہ سورۃ الاعراف میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے۔

ترجمہ:۔ میں ایسے لوگوں کو اپنے احکام سے برگشتہ ہی رکھوں گا جو دنیا میں تکبر کرتے ہیں۔ (الاعراف۔ ۱۴۶)

تکبر کا مطلب ہے احکام الٰہی اور آیات الٰہی کے مقابلے میں اپنے آپ کو بڑا سمجھنا اور لوگوں کو حقیر گرداننا۔ بڑا بننا یا تکبر کرنا' قرآن مجید میں ان معنوں میں استعمال ہوتا ہے کہ بندہ اپنے آپ کو بندگی کے مقام سے بالاتر سمجھے اور احکام الٰہی کی پروانہ کرے' اور ایسا طرزِ عمل اختیار کرے گویا وہ اللہ کا بندہ نہیں اور نہ ہی اللہ تعالیٰ اس کا رب ہے۔ اس کی اس خودسری کی کوئی حقیقت ہی نہیں ہے کہ وہ اللہ کی اس زمین میں رہتے ہوئے اللہ کے احکام سے انحراف کرے اور اللہ کی بندگی کا اقرار نہ کرے۔ تکبر انسان کو زیبا نہیں۔ اللہ تعالیٰ تو خالق ومالک ہے اور انسان اس کی مخلوق ہے اور کوئی بھی مخلوق اپنے خالق کے مقابل کیسے آسکتی ہے۔ اسی لئے خالق کا مقابلہ کرنا' اس کے احکام نہ ماننا اور ان سے اعراض برتنا' انسان کے لئے کسی بھی طرح جائز نہیں ہے۔ اس لئے ہی آیتِ مبارکہ میں ارشاد ہوا ہے کہ میں ایسے لوگوں کو جو تکبر' گھمنڈ وغرور کرتے ہیں اپنے احکام سے دور ہی رکھوں گا کیونکہ انسانوں کا تکبر اللہ تبارک وتعالیٰ کو سخت ناپسند ہے۔ یہی ارشاد سورۂ یونس (۹۶۔۹۷) میں بھی ہوا ہے کہ ''جن پر تیرے رب کی بات ثابت ہوگئی' وہ ایمان نہیں لائیں گے۔ چاہے ان کے پاس ہر طرح کی نشانیاں آجائیں۔ حتیٰ کہ وہ دردناک عذاب دیکھ لیں۔''

آج ہم ہر جگہ اور ہر معاشرے میں حتیٰ کہ مسلمان معاشروں میں بھی بخوبی دیکھ سکتے ہیں کہ نیکی منہ چھپائے پھر رہی ہے اور بدی کو ہر کوئی لپک لپک کر اختیار کر رہا ہے۔ احکامِ الٰہی سے اعراض واجتناب کرنے والوں کی ایک عادت یا نفسیات یہ بھی ہے کہ وہ ہدایت کی بات کو اس طرح نہیں مانتے جس طرح گمراہی کی بات کے پیچھے دوڑ پڑتے ہیں۔ اسے فوراً اپنا لیتے ہیں۔

خواص: شیخ عبدالمجید مغربیؒ کا فرمانا ہے کہ جو شخص صالح اس ''اسم المتکبر'' کا ذکر کرے گا اس میں شائستگی اور اس کے کاموں میں باقاعدگی پیدا ہو جائے گی اور وہ عوام وخواص میں عزت وحرمت پائے گا۔ ۲۳۲ دوسو بتیس مرتبہ روزانہ ''المتکبر'' پڑھنے سے بزرگی وعزت حاصل ہوتی ہے۔

اندھیرے کے مسافر

زرین قمر

ان لوگوں کا قضیہ جو اپنے مذموم مقاصد کے حصول کے لیے انسانی زندگیوں کا خاتمہ ایک کھیل سمجھتے ہیں کہیں یہ لوگ معصوم لوگوں کو خودکش بمبار بناتے ہیں تو کہیں کسی کو قوموں کا رہنما بنا کر قوم کو ہی ختم کرنے کے درپے ہو جاتے ہیں۔

ایک دوشیزہ کی سرگزشت، وہ دشمنوں کو اپنا دوست سمجھ بیٹھی تھی

معروف ادیب DA Bali کے ناول کی تلخیص جسے زرین قمر نے اردو کے قالب میں ڈالا



اسٹور روم کا دروازہ ایک زوردار آواز کے ساتھ کھلا تھا اور اسٹور روم سے باہر آتی ہوئی ٹرالی سے کئی ڈبے باہر راہداری کے سفید فرش پر بکھر گئے تھے اسی شور سے کمرے میں لیٹی سمنتھا کی آنکھ کھل گئی تھی اس نے خواب آلود آنکھوں سے دروازے کی طرف دیکھا تھا اور اسے نائٹ ڈیوٹی پر موجود ڈاکٹر کا دھندلا سا چہرہ دکھائی دیا تھا۔

''آنے والے زخمیوں کی حالت ٹھیک نہیں ہے۔'' ڈاکٹر نے کہا اور سمنتھا بارلیٹ اپنے بیڈ سے اٹھ کر تیزی سے ایمرجنسی روم کی طرف دوڑی۔

''کیا ہوا ہے؟ اس نے قریب سے گزرتی ہوئی ایک نرس سے پوچھا۔

''نیویارک میں فائرنگ کا واقعہ ہوا ہے کئی زخمی آئے ہیں ابھی ابھی ایمبولینس زخمیوں کو لائی ہیں ایک زخمی کی حالت بہت نازک ہے۔''

سمنتھا تقریباً بھاگتی ہوئی استقبالیہ ڈیسک سے قریب سے گزرتی ایمرجنسی روم میں پہنچی تھی' جہاں خون اور پسینے کی بو پھیلی ہوئی تھی کئی بیڈز پر زخمی لیٹے ہوئے تھے جو کراہ رہے تھے' کچھ لوگوں کو آکسیجن لگائی جارہی تھی اور کچھ کو کارڈیک مانیٹرز...... کمرے میں مریضوں اور ڈاکٹروں کی آوازیں گونج رہی تھیں۔

''مجھے سسٹر ٹرے کی ضرورت ہے۔'' ایک ڈاکٹر نے کہا جو ایک مریض کے بیڈ کے قریب کھڑا تھا۔

''اس کا کیا مسئلہ ہے؟'' ایک سسٹر نے پوچھا۔

''اس کا بلڈ پریشر تیزی سے گر رہا ہے۔''

''اس کی آستین اوپر کرو بلکہ کاٹ دو۔'' ڈاکٹر نے کہا اور اسی وقت سمنتھا اور ٹیم کے ساتھ آگے بڑھی وہ دستانے پہنتی جارہی تھی وہ تیزی سے مریض کی طرف بڑھی۔

''یہ کون ہے؟'' سمنتھا نے قریب آتے ہوئے پوچھا۔

''یہ زخمی ہے اس کی عمر پچاس سال ہے اسے سینے اور گلے پر گولیاں لگی ہیں۔'' سسٹر نے کہا۔

''کچھ پتہ چلا کہ کیا ہوا ہے؟''

''ایک ہوٹل میں فائرنگ ہوئی ہے وہاں کچھ نوجوان ڈانس کرتی ہوئی لڑکیوں سے بدتمیزی پر اتر آئے تھے جس پر ہنگامہ ہوگیا اور پھر فائرنگ شروع ہوگئی کافی لوگوں کو گولیاں لگی ہیں۔''

''اس کا بلڈ ٹائپ کیا ہے؟'' سمنتھا نے زخمی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

''اے پوزیٹیو۔''

''بلڈ پریشر؟''

''وہ ویک ہے لیکن ایک جگہ رک گیا ہے۔''

''ٹھیک ہے۔'' سمنتھا نے زخمی کی گردن پر لگی گولی کے نشان کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

''زخم زیادہ گہرا نہیں ہے لیکن اس کے سینے اور گردن کا اسکین کرو اس کی سرجری کرنا ہوگی۔''

''یس ڈاکٹر بر لیٹ۔'' سسٹر نے کہا اور سمنتھا دوسرے زخمیوں کی طرف متوجہ ہوئی اس وقت تک کئی پولیس آفیسرز بھی وہاں آگئے تھے اور زخمیوں سے سوالات کر رہے تھے اچانک سمنتھا کی نظر ایمرجنسی ہال کی دیوار سے لگی ایک بوڑھی عورت پر پڑی جس کی گود میں ایک جوان لڑکی لیٹی تھی اس پر سفید چادر پڑی تھی جس پر خون کے دھبے تھے وہ شدید تکلیف سے کراہ رہی تھی۔ سمنتھا تیزی سے اس کی طرف بڑھی اس نے چادر ہٹا کر دیکھا تو اس کا دل دہل گیا اس لڑکی کے جسم پر جابجا زخموں کے نشان تھے جن سے خون بہہ رہا تھا اس کے ہاتھ رسی سے بندھے ہوئے تھے جنہیں ابھی تک کسی نے نہیں کھولا تھا۔ سمنتھا نے ایک ریزر سے اس کی رسی کاٹی اور سسٹر کی طرف مڑی۔

''جلدی کرو اس کی نس ڈھونڈو فوراً انجکشن دینا ہے پھر اس نے لڑکی کو انجکشن لگایا لیکن سرجری کا وقت نہیں تھا وہ جانتی تھی کہ وہ لڑکی زندہ نہیں بچے گی پھر بھی اس نے لڑکی کے کٹے ہوئے حصوں پر ٹانکے لگانا شروع کردیئے۔

''ڈاکٹر بر لیٹ مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔'' ڈاکٹر گبن جو وہاں موجود تھا اس نے سمنتھا کو آواز دی۔

''میرے زخمی کی حالت بہت نازک ہے سر۔'' سمنتھا نے ٹانکے لگاتے ہوئے کہا۔

''ڈاکٹر بر لیٹ میری بات سنو اور ابھی میرے پاس آؤ۔'' ڈاکٹر گبن نے کہا لیکن اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ زخمی لڑکی کو لگی ہوئی کارڈیک مونیٹر مشین کے اسکرین پر ایک فلیٹ لائن نظر آنے لگی اور اسی وقت قریب کھڑی

نرس نے دل کو جھٹکا لگانے والے پیڈلز اسے تھما دیئے۔

''کلیئر!''

لڑکی کا جسم تھوڑا اچھلا اور زخموں سے مزید خون باہر آیا۔ سمنتھا نے دوبارہ جھٹکا دیا لیکن کچھ نہیں ہوا سسٹر نے ایک اور انجکشن تیار کرلیا تھا اور سمنتھا نے وہ انجکشن لڑکی کو لگا دیا تھا وہ دعائیں مانگ رہی تھی کہ اس کا دل دھڑکنا شروع کردے لیکن ایسا نہیں ہوا تھا۔

کچھ دیر بعد وہ ڈاکٹر گبن کے آفس میں موجود تھی جہاں ان کے کارکردگی کے اور تعلیمی سرٹیفکیٹس کمرے کی دیواروں پر لگے تھے لیکن میڈیکل کی دنیا میں ان کے تجربے اور ان کی خدمات کے باوجود ان کے دل میں انسانوں سے ہمدردی کا جذبہ پیدا نہیں ہوا تھا وہ کسی کی مجبوری کو سمجھنے کے لیے تیار نہیں ہوتے تھے' اس وقت بھی وہ اپنی سیٹ پر بیٹھے غصے سے سمنتھا کی طرف دیکھ رہے تھے۔

''مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ میرے سکینڈ ایئر اسٹوڈنٹس میں سے تمہاری پرفارمنس سب سے زیادہ اچھی ہے لیکن اس ہاسپٹل میں ایسے لوگوں کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے جو اپنے سنیئرز کا حکم نہیں مانتے۔''

''سر جب آپ نے مجھے بلایا تو میں اس وقت ایک اور شدید زخمی کے ساتھ تھی میں کیا کرتی اسے مرنے کے لیے تنہا چھوڑ دیتی؟''

''وہ جب آئی تھی تب ہی مر چکی تھی۔''

''لیکن اس کی نبض چل رہی تھی' آپ نے مونیٹر کی آواز نہیں سنی تھی؟''

''نہیں' تم ہمیشہ کی طرح غلط تاویلیں دے رہی ہو اس کے زندہ رہنے کا کوئی چانس نہیں تھا۔''

''میں تاویلیں نہیں دے رہی جب میں نے اسے دیکھا تو وہ زندہ تھی۔''

''بحث مت کرو۔'' ڈاکٹر گبن نے میز پر مکا مارتے ہوئے کہا غصے کی شدت سے اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔

''میں نے یہ عہدہ سنبھالتے ہوئے قسم کھائی تھی کہ میں تمام مریضوں کو یکساں توجہ دوں گی ایسا نہیں ہوگا کہ صرف ان پر توجہ دوں جن کی دیکھ بھال کرنے سے میرا نام اور شہرت بڑھے۔''

''تم اس اسپتال سے جاسکتی ہو گیٹ آؤٹ۔'' ڈاکٹر گبن نے غصے سے دروازے کی طرف اشارہ کیا۔

❖......☆......❖

اسپتال سے باہر آنے کے بعد سمنتھا سڑک سے گزرنے والے مجمع کا حصہ بن گئی تھی لیکن اس بات سے بے خبر تھی کہ دور فٹ پاتھ پر کھڑا ایک شخص اسے بغور دیکھ رہا تھا' اس کے ہاتھ میں کیمرا تھا جو اس نے اٹھا کر سمنتھا کو فوکس کیا تھا وہ دل میں دعائیں مانگ رہا تھا کہ کاش سمنتھا اپنا چہرہ اوپر اٹھائے اس کی آنکھوں پر اسپیشل قسم کے سن گلاسس لگے تھے جن کی مدد سے اسے رات میں بھی منظر دن کی طرح صاف نظر آرہا تھا۔

''اوہ' اوپر دیکھو...... اوپر...... تم کیا سوچ رہی ہو؟''

اس نے دل ہی دل میں کہا اور کیمرے کے لینس میں اس کا امیج بڑا کرلیا اور پھر زوم کر کے صرف اس کے چہرے پر مرکوز کردیا اور پھر ملنے والے کسی اچانک موقع کا انتظار کرنے لگا اور پھر اچانک ہی سمنتھا نے اپنا سر اوپر اٹھایا تھا اور آگے بڑھی تھی۔

''بالکل اپنی ماں جیسی ہے۔'' اس شخص نے زیر لب کہا' کیمرے کے لینس میں اس کے گال پر پڑا ہوا زخم کا نشان صاف نظر آرہا تھا جس کی اس شخص کو تلاش تھی اور جو سمنتھا کی خاص نشانی بھی تھا اس شخص نے سمنتھا کی تصویر کھینچنے میں دیر نہیں کی تھی اس نے اپنے کان میں لگے آلے پر ڈبل ٹیپ کیا تھا اور وہاں سے اندھیرے کی جانب بڑھتے ہوئے بولا تھا۔

''یہ وہی ہے۔'' پھر وہ اندھیرے میں غائب ہوگیا تھا۔ سمنتھا اس سے بے خبر تھی اور ٹرین میں بیٹھنے کے لیے سب وے کی طرف جارہی تھی وہ سوچ رہی تھی کہ اگر اس کی نانی کو پتا چلا کہ اس نے اپنے غصے پر قابو نہیں کیا اور نیویارک جیسے شہر میں ایک بڑے اسپتال میں ملازمت کے موقع کو کھودیا۔ نانی کا خیال دل میں آتے ہی سمنتھا کو شدت سے احساس ہوا کہ وہ اپنی نانی سے کافی عرصے سے نہیں ملی ہے وہ کافی عرصے سے ان سے ملنے بھی نہیں گئی جبکہ وہ جانتی تھی کہ اس کی نانی ہوائی جہاز میں بیٹھنے سے گھبراتی ہیں۔ دس سال پہلے یہاں آئی تھی' شروع میں وہ ایک دوبار نانی سے ملنے گئی لیکن پھر اس کے ساتھ ہونے والے ناپسندیدہ تعلقات کی وجہ سے اس نے وہاں جانا

چھوڑ دیا اب اس کا گھر نیویارک ہی تھا۔ ہفتہ وار کالز اس کے اور نانی کے درمیان ایک رابطہ تھیں۔

گھر پہنچنے کے بعد سمنتھا نے آج کی ڈاک کے لفافے اٹھائے تھے اور کمرے کی لائٹس آن کی تھیں اور ہاتھ میں پکڑے ہوئے خطوں پر نظر ڈالی تھی ان میں سے ایک پر اس کی نظریں مرکوز ہوگئی تھیں' یہ خط مسٹر ایڈی نے بھیجا تھا جو اس کے شہر ونچسٹا میں ایک وکیل تھے اس کے دل میں اچانک خیال آیا کہ شاید اس کے والدین کی چھوڑی ہوئی جائیداد میں کوئی خاص چیز انہوں نے دریافت کی ہوگی تو اسے خط لکھا ہوگا اس نے لفافہ کھولا جس میں سے پانچ ہزار ڈالر کا ایک چیک برآمد ہوا جس پر سمنتھا کو بہت خوشی ہوئی' اللہ نے اسے نوازنے کے لیے کتنا مناسب وقت منتخب کیا تھا۔ آج ہی اس کی ملازمت ختم ہوئی تھی اور وہ رقم کے لیے پریشان تھی۔ یہ چیک دیکھ کر اسے بہت خوشی ہوئی تھی لیکن دوسرے ہی لمحے وہ خوشی تجسس میں تبدیل ہوگئی تھی چیک کے ساتھ ایک کاغذ اور تھا جس پر لکھا تھا۔ ''تمہاری نانی فوت ہوگئی ہیں فوراً پہنچو۔''

سمنتھا کو دوسرے ہی دن فلائیٹ سے روانہ ہونا تھا اس نے بہت کم وقت میں روانگی کی تیاری کی تھی اور صبح ہی ائر پورٹ پہنچ گئی تھی پھر فلائیٹ میں بیٹھنے کے بعد اس نے نیند کی گولیاں کھالی تھیں' فلائٹ لمبی تھی اور وہ کچھ وقت سکون سے گزارنا چاہتی تھی اس کے ساتھ ہونے والے پے درپے غم انگیز واقعات نے اسے پریشان کردیا تھا پہلے اسپتال سے نکالے جانا پھر نانی کی موت کی خبر اور اتنی ایمرجنسی میں روانگی وہ اپنی سیٹ پر بیٹھتے ہی نیند کی آغوش میں پہنچ گئی تھی۔

⟡......☆......⟡

اس کی نظریں جہاز کی کھڑکی کے شیشے پر جمی تھیں جس میں اسے اپنا عکس نظر آرہا تھا' وہ اس وقت پانچ سال کی تھی اس کی نانی کے ہاتھ میں بالوں میں لگائے جانے والے ہیئر بینڈ تھے براؤن' سرخ' پیلے اور گلابی' نانی نے اس کے لیے گلابی ہیئر بینڈ پسند کیا تھا ان کا خیال تھا کہ لڑکیوں کے لیے یہی کلر بہت اچھا رہتا ہے' وہ خوشی سے ناچ رہی تھی اسے اپنی فراک بہت اچھی لگ رہی تھی جو اس کی والدہ نے اس کے لیے بنائی تھی۔

''سمنتھا ڈانس بند کرو اور کھڑی ہوجاؤ تاکہ میں تمہیں یہ ہیئر بینڈ لگاسکوں۔'' نانی نے کہا پھر تیار ہوکر وہ نانی کے ساتھ ائرپورٹ گئی تھی جہاں اسے اپنے والدین کی آمد کا انتظار تھا۔

''تمہارے ڈیڈی تمہیں میرے پاس چھوڑ گئے تھے' تب تم بہت چھوٹی تھیں۔'' نانی نے اسے بتایا تھا۔

''کیا آپ کا مطلب ہے کہ میں کنساس میں پیدا ہوئی تھی؟'' سمنتھا نے پوچھا۔

''ہاں پیاری سیم۔'' نانی نے پیار سے کہا اور اسی وقت فضا میں اڑتا ہوا جہاز نظر آیا تھا۔

''دیکھو تمہارے ممی ڈیڈی آگئے۔'' نانی نے بڑی کھڑکی کے شیشے کی طرف اشارہ کیا' سمنتھا نے دیکھا جہاز نیچے آرہا تھا پھر اس کا رخ اس ہال کی طرف ہوگیا جہاں سمنتھا اور اس کی نانی بھی دوسرے لوگوں کے ساتھ موجود تھیں۔ فضا میں ایک شور بلند ہوا تھا لوگوں کی چیخیں سنائی دے رہی تھیں ہال کے سامنے لگا شیشہ زوردار آواز کے ساتھ ٹوٹا تھا اور اس کے ٹکڑے فضا میں دور دور تک پھیل گئے تھے ایمرجنسی سائرنوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں اور آگ بجھانے والی گاڑیاں تیزی سے جہاز کی طرف بڑھی تھیں اور آگ بجھانے لگی تھیں۔ سمنتھا کو بھی بازو اور گال پر شیشے لگے تھے اور خون بہہ کر اس کے لباس پر پھیل گیا تھا تب ہی سے اسے سرخ رنگ سے نفرت ہوگئی تھی اس روز اس کے والدین فوت ہوگئے تھے اور اس نے پھر خوف کی وجہ سے کبھی جہاز میں سفر نہیں کیا تھا۔

⟡......☆......⟡

جہاز کے کنساس پہنچنے پر اس کی لینڈنگ کے دوران سمنتھا کی آنکھ کھلی تھی اور اس نے آنکھیں کھول کر کھڑکی سے باہر دیکھا تھا یہ وہ جگہ تھی جہاں اس کی نانی نے اس کی پرورش کی تھی۔

وہ ٹیکسی لے کر ونچسٹا پہنچی تھی اور نانی کے گھر کے باہر ان کے وکیل ایڈی نے اس کا استقبال کیا تھا۔ ٹیکسی ڈرائیور نے ٹیکسی سے اس کے سوٹ کیس اتار کر نیچے رکھے تھے اور اس نے ٹیکسی کا کرایہ ادا کیا تھا۔ اس کی نانی کے ہاتھ کے لگائے ہوئے سرخ گلاب ایک کیاری میں بہار دکھا رہے تھے۔ اس نے ایک نظر لان پر ڈالی جہاں اس کی پسندیدہ

لکڑی کی بینچ اپنی جگہ موجود تھی جہاں بیٹھ کر اس نے بہت بار اپنی نانی کے ساتھ آئس کریم کھائی تھی اور یہی وہ جگہ تھی جہاں جو رابرٹ نے اسے زندگی کا پہلا بوسہ دیا تھا یہ خیال آتے ہی اس کے چہرے پر سرخی پھیل گئی تھی' ایڈی اسے گھر کی چابیاں دے کر پھر آنے کا کہہ کر چلا گیا تھا۔

سمنتھا نے لکڑی کا بڑا دروازہ کھولا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ ہر چیز اپنی جگہ موجود تھی' لکڑی کا فرنیچر' کھڑکیوں اور دروازوں پر پڑے ہوئے لیس دار پردے' گلدان' تصویریں' لیکن ڈرائنگ روم سے سبز قالین اٹھالیا گیا تھا۔ وہ سیڑھیاں چڑھ کر اوپری منزل میں گئی جہاں اس کا اپنا پسندیدہ کمرہ موجود تھا وہاں ہر چیز جوں کی توں موجود تھی نانی نے کچھ بھی تبدیل نہیں کیا تھا اسے یاد تھا وہاں اکثر اس کے دوست بھرے رہتے تھے اب بھی دیواروں پر اس کے لگائے ہوئے پوسٹرز موجود تھے۔ فٹ بال میچ' باسکٹ بال کے گیم اور ہر طرح کے اسپورٹس کے پوسٹرز سے دیواریں بھری تھیں اس نے اپنے آنسو پی لیے وہ بہت اداس تھی لیکن آنسو بہنے نہیں دیئے تھے اس نے اپنے سوٹ کیس اپنے بیڈ کے پاس رکھے اور تیزی سے واپس نیچے آگئی۔

اس کی نانی کے کمرے میں تھوڑی سی تبدیلی آئی تھی پھولوں والے پردوں کی جگہ کھڑکیوں پر سادے پردے آویزاں تھے گلدان میں سوکھے گلاب موجود تھے جن کی خوشبو کمرے میں پھیلی ہوئی تھی۔ وہ اپنی نانی کے بیڈ پر بیٹھ گئی وہ کافی دیر ان کے بارے میں سوچتی رہی تھی پھر اٹھ کر کچن میں گئی تھی وہ واحد جگہ تھی جو بالکل تبدیل ہوچکی تھی اسے نئے انداز میں سجایا گیا تھا اچانک اسے احساس ہوا کہ اس کی نانی اس کے بغیر تنہا زندگی گزار رہی تھیں اور انہیں اپنی بڑھتی ہوئی عمر اور کمزوری کے باوجود اپنے بہت سے کام تن تنہا ہی کرنا پڑتے ہوں گے یہ خیال آتے ہی سمنتھا کو شرمندگی کا احساس ہوا تھا۔

نئے ریفریجریٹر میں ڈاکٹر پیپر کی دواؤں کا نیا سیٹ رکھا تھا جو ایکسپائر ہوچکا تھا وہ واپس ڈرائنگ روم میں آگئی تھی' جہاں ایک الماری میں کتابوں کے درمیان کچھ البمز بھی رکھی تھیں اس نے وہ اٹھائیں اور صوفے پر آبیٹھی پھر وہ ان کی ورق گردانی کرتے ہوئے گزرے وقت کو یاد کرنے لگی تھی اور اس کی سسکیاں کمرے میں گونج رہی تھیں۔

''میں بالکل تنہا رہ گئی ہوں۔''

⟡......☆......⟡

اپنی نانی کی تدفین کے موقع پر سمنتھا اگلی صف میں موجود تھی وہ اداسی سے دور تک پھیلے سمندر کو دیکھ رہی تھی اسے یوں محسوس ہورہا تھا جیسے اس کی پشت پر موجود پرسا دینے والوں کی نظریں اس پر جمی ہوئی ہیں اور اس کے سامنے سلور کے ایک بکس میں اس کی نانی جلی ہوئی موجود تھیں اس کا دل بیٹھنے لگا اس نے اپنی زندگی میں بہت سی جلی ہوئی لاشیں دیکھی تھیں اور ان کی بو بھی سونگھی تھی لیکن اس وقت وہ بہت دلبرداشتہ تھی آخری رسومات کے وقت مسٹر ایڈی نے لاش کو بکس میں بند کروادیا تھا اس کی نانی کار کے حادثے میں فوت ہوئی تھیں ان کی کار ایک ٹرک سے ٹکرا کر شعلوں کی زد میں آگئی تھی اس حادثے کے بعد پولیس ڈپارٹمنٹ کو تحقیقات کرنا چاہیے تھی اسے افسوس تھا کہ وہ اپنی نانی سے آخری بار مل بھی نہیں سکی تھی لیکن اس میں اس کا ہی قصور تھا وہ ان سے پہلے ملنے آئی ہی نہیں تھی۔

''یہ آپ کے پسندیدہ گلاب ہیں اور میں آپ کے لیے لائی ہوں۔'' اس نے اپنے ہاتھوں میں پکڑے سرخ گلاب نانی کے تابوت پر ڈالتے ہوئے زیرلب کہا تھا اور سسک پڑی تھی۔ مسٹر ایڈی نے اسے سہارا دے کر مجمع سے دور کردیا تھا انہوں نے ہمیشہ اس کی فیملی کو سہارا دیا تھا۔ اس وقت بھی وہ اسے اس کی کار تک لے گئے تھے اور اسے بٹھانے کے لیے دروازہ کھولا تھا۔

''اس وقت ڈرامہ کررہی ہو کتنا اچھا ہوتا اگر تم سلویا کی زندگی میں آکر اس سے ملتیں؟'' اس کی نانی کی ایک پڑوسی دوست نے سمنتھا پر طنز کیا۔ ''تم خود کو اس کی نواسی کیسے کہتی ہو؟''

''مسز پال یہ بات کرنے کا یہ کوئی موقع نہیں ہے یہ باتیں کسی اور وقت کے لیے اٹھا رکھیں۔'' مسٹر ایڈی نے درمیان میں آتے ہوئے کہا اور مسز پال برا سامنہ بنا کر وہاں سے ہٹ گئی تھیں۔ سمنتھا کبھی بھی انہیں پسند نہیں کرتی تھی اور وہ یہی سوچتی تھی کہ اس کی نانی نے انہیں دوست کیوں بنایا تھا' مسٹر ایڈی ایک بار پھر تعزیت کرکے اسے کار میں بٹھا کر دروازہ بند کردیا تھا اور وہ ایک بار پھر تنہا

رہ گئی تھی۔ اس نے کھڑکی سے باہر جھانک کر دیکھا دو درخت کے سائے میں سیاہ کپڑوں میں ملبوس ایک شخص کھڑا تھا اس کی نظریں سمنتھا کی کار پر لگی تھیں اور گھر جاتے ہوئے سارے راستے سمنتھا سوچتی رہی تھی کہ وہ شخص کون تھا جو وہاں موجود تھا اس کا کوئی تعلق سمنتھا کی فیملی سے تھا؟ اس نے دن کے وقت سن گلاسس پہنے ہوئے تھے جبکہ آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے اور دھوپ کا نام ونشان نہیں تھا۔

''رکو۔'' اچانک اس نے ڈرائیور سے کہا وہ کچھ وقت اپنی گزری ہوئی یادوں کے ساتھ گزارنا چاہتی تھی۔

''میں بس چند منٹ میں آتی ہوں۔'' سمنتھا نے ڈرائیور سے کہا اور کار سے اتر کر درختوں کی طرف بڑھ گئی جہاں دو قبریں بنی ہوئی تھیں جو اس کے والدین کی قبریں تھیں وہ ان کے نزدیک سخت زمین پر دوزانو بیٹھ گئی۔

''ممی' ڈیڈی۔'' اس نے سسکی لی۔ ''بہت لمبا عرصہ گزر گیا ہے...... میں آپ کی اچھی بیٹی ثابت نہیں ہوئی کیونکہ میں آپ کی والدہ کا خیال نہیں رکھ سکی جیسے کہ مجھے رکھنا چاہیے تھا' میں جانتی ہوں اگر آپ زندہ ہوتے تو ان کا بہت خیال رکھتے۔'' پھر وہ رونے لگی تھی۔

''میں جانتی ہوں جو کچھ ہو چکا میں اسے تبدیل نہیں کرسکتی لیکن میں وعدہ کرتی ہوں میں یہ معلوم کرکے رہوں گی کہ میری نانی کو کس نے مارا اور انہیں قانون کے حوالے کروں گی چاہے اس کے لیے مجھے کتنی ہی مشکلات کا سامنا کیوں نہ کرنا پڑے۔'' اس نے اٹھتے ہوئے وعدہ کیا۔

⬥......☆......⬥

سراغرساں جو رابرٹ اپنے آفس میں میز پر رکھی فائل کی ورق گردانی میں مصروف تھا پنسل کے پیچھے لگی ربر اس کے منہ میں دبی تھی یہ اس کی بری عادت تھی وہ کچھ لکھنے کے دوران کبھی کبھی اپنی پنسل کی ربر منہ میں لے لیتا تھا اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ وہ بہت زیادہ سیریس کیسز پر کام کرتے ہوئے باآواز بلند خود کلامی سے بچ جاتا تھا اسے سمنتھا کی فیملی سے ہمدردی تھی اس فیملی نے بہت دکھ جھیلے تھے وہ تدفین کے موقع پر شرکت کرنا چاہتا تھا لیکن نہیں کرسکا تھا کیونکہ اسے پتہ تھا کہ سمنتھا بھی وہاں ہوگی اور نہ جانے کس انداز میں اس کا استقبال کرے اسے معلوم تھا کہ سمنتھا موڈی تھی اس کا رویہ پلک جھپکتے میں بدل جاتا تھا وہ اس موقع پر کوئی بدمزگی نہیں چاہتا تھا اس نے کام کرتے کرتے نظریں اوپر کیں اور وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ سمنتھا اس کے سامنے کھڑی تھی' اسے امید تو تھی کہ وہ اس سے ملنے ضرور آئے گی لیکن اتنی جلدی آئے گی اس کا اسے اندازہ نہیں تھا۔ اتنے عرصے بعد وہ پہلے سے بہت زیادہ خوبصورت ہوگئی تھی۔

جب وہ بچے تھے اور ہائی اسکول میں پڑھتے تھے تب بھی وہ خوبصورت تھی لیکن جو نے کبھی اس چیز کو محسوس نہیں کیا تھا اسے وہ جینز اور سادی شرٹ میں اچھی لگتی تھی جو نے سیم کو دیکھتے ہی فائل بند کردی اور سیدھا ہوکر بیٹھ گیا۔

''ہائے جو۔'' سیم نے کہا۔

''تمہیں دیکھ کر خوشی ہوئی سیم۔'' جو نے اپنی کرسی سے کھڑے ہوتے ہوئے کہا اور اس کے نزدیک آکر اس کی کمر کے گرد بانہیں ڈال کر اسے اپنے نزدیک کرلیا۔

''تمہاری نانی کا مجھے افسوس ہے۔'' جو نے کہا۔

''شکریہ۔'' سیم نے آہستگی سے کہا اور اس کی بانہوں سے نکل گئی۔

''میں آج تمہارے پاس آنے کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا۔''

''تو پھر آئے کیوں نہیں؟'' سیم نے حیرت سے کہا۔

''دراصل میں تمہیں......''

''پریشان کرنا نہیں چاہتا تھا۔'' سیم نے اس کی ادھوری بات مکمل کی۔

''دراصل میرے پاس اظہار کے لیے الفاظ نہیں تھے۔''

''خود کو دھوکا مت دو۔'' سیم نے کہا وہ جانتی تھی کہ جو اسے پسند کرتا ہے لیکن اس کی ملازمت نے اسے اپنے گرد حفاظتی خول چڑھانے کی تربیت دے دی ہے۔

''تم تو یہاں سے دور تھیں لیکن میں یہاں تھا چنانچہ اکثر نانی کے پاس جاتا رہتا تھا وہ مجھ سے اپنی فیملی جیسا ہی برتاؤ کرتی تھیں۔'' جو نے کہا۔

''کیا یہ سچ ہے؟''

''ہاں' بالکل سچ ہے۔'' جو نے کہا اور سمنتھا نے آنکھیں بند کرکے ایک گہری سانس لی ساتھ ہی اس نے

گال پر موجود زخم کے نشان کو آہستہ سے سہلایا تھا۔

''انہوں نے مجھے تمہارے بارے میں بتایا تھا کہ تم ان سے ملنے جاتے تھے دیکھو میں یہاں تم سے کوئی بحث کرنے کے لیے نہیں آئی ہوں۔'' سمنتھا نے کہا تو واپس اپنی سیٹ پر بیٹھ گیا۔

''تو پھر میں تمہارے لیے کیا کرسکتا ہوں۔'' اس نے پروفیشنل انداز میں کہا۔

''یہ فائل میری دادی کی ہے؟'' سمنتھا نے پوچھا اور فائل اٹھانے کے لیے ہاتھ بڑھایا لیکن جو نے اسے روک لیا۔

''یہ ٹھیک نہیں ہے۔'' اس نے سمنتھا سے کہا۔

''تم جانتے ہو میں ایک ڈاکٹر ہوں۔''

''ہاں میں جانتا ہوں ڈاکٹر بریلیٹ لیکن شاید تم نے کبھی فیملی یا فرینڈ کے کیس پر کام نہیں کیا ہوگا۔''

''ان کا تابوت بند کیوں تھا؟'' سمنتھا نے پوچھا۔

''اس کے لیے مسٹر ایڈی نے درخواست کی تھی۔'' جو نے جواب دیا اور سیم نے فائل چھوڑ دی پھر وہ ایک کرسی پر بیٹھ گئی تھی۔

''مجھے ایک بات بتاؤ' سچ بتانا۔'' سیم نے کہا۔

''میں کوشش کروں گا۔''

''کیا جو حادثہ میری نانی کو پیش آیا وہ واقعی محض دو گاڑیوں کے ٹکرانے کا سادا سا حادثہ تھا؟''

''ہاں...... دیکھنے سے تو ایسا ہی لگتا تھا...... کیوں؟''

''اگر ایسا ہے تو تم تحقیقات کس لیے کرر ہے ہو؟''

''سیم مجھ سے یہ کرنے کو کہا گیا ہے۔''

''کیا اس کیس میں FBI کے دلچسپی لینے کی کوئی وجہ ہے؟'' سیم نے پوچھا۔

''نہیں ان کے دلچسپی لینے کی کوئی وجہ نہیں۔'' جو نے حیرت سے کہا۔

''لیکن ان میں کچھ تمہارے دوست بھی ہیں...... ہیں نا؟'' سیم نے پوچھا۔

''ہاں...... لیکن بھلا اس سے تمہاری نانی کا کیا تعلق؟''

''آج نانی کی تدفین کے موقع پر وہاں ایک شخص تھا جو مجھے ایسا ہی لگا...... اور بس' میں نے سوچا شاید اس کو تم نے بھیجا ہوگا مجھ سے سوالات کرنے کے لیے لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔''

''ہوسکتا ہے کہ وہ تدفینی ادارے کے ساتھ ہو۔'' جو نے کہا۔

''ہوں...... ممکن ہے۔'' سیم نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ اسی وقت فون کی گھنٹی بجی اور جو نے ریسیور اٹھایا دوسری طرف سے اس کا چیف بول رہا تھا پھر اس نے تفصیل سے بات کی تھی اور جب ریسیور رکھا تھا تو سیم اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

''چیف کچھ گپ شپ کے موڈ میں تھا کیا تم کچھ اور پوچھنا چاہتی ہو؟'' جو نے کہا۔

''نہیں...... بس یونہی تم سے ملنے آگئی تھی۔''

''اگر اس کیس میں کوئی نئی بات معلوم ہوئی تو سب سے پہلے تم سے شیئر کروں گا۔''

''ٹھیک ہے جو۔''

''تمہیں دیکھ کر خوشی ہوئی سیم۔''

''مجھے بھی۔'' سیم نے کہا اور واپسی کے لیے مڑ گئی جو اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا وہ اس سے تنہائی میں ملنا چاہتا تھا پھر اس نے فیصلہ کیا کہ کل صبح وہ اپنے دوستوں سے رابطہ کرے گا جو اس کیس پر کام کرر ہے ہیں اور اگر اسے کوئی نئی خبر ملے گی تو وہ سیم سے مل کر اسے ڈنر پر مدعو کرے گا اور یوں اس کی ملاقات بھی اس کے بچپن کی ساتھی سے ہو جائے گی۔

⬥......☆......⬥

''اگر تم چاہو تو تمہیں اس گھر کی اچھی قیمت مل سکتی ہے۔'' مسٹر ایڈی نے سمنتھا کو مشورہ دیا اس طرح وہ اس کے خاندان سے وفاداریاں نبھار ہے تھے اور اپنی نانی کی جائیداد کو صحیح ڈھنگ سے فروخت کرکے مستقبل کی زندگی کو اچھے انداز میں گزارنے کا گر بتار ہے تھے جبکہ سمنتھا ذہنی طور پر اس کے لیے تیار نہیں تھی وہ اپنی نانی کی جائیداد فروخت کرکے واپس نیویارک نہیں جانا چاہتی تھی اگر وہ نانی کا گھر فروخت کردیتی تو اس کے پاس اپنا کوئی گھر نہیں تھا نیویارک میں اس کی ملازمت بھی ختم ہو چکی تھی اس کے علاوہ گھر اور جائیداد بیچنے کے بعد کنساس سے اس کا تعلق ٹوٹ جاتا جہاں اس کے والدین اور نانی کی یادیں تھیں مسٹر ایڈی اس بات سے واقف تھے وہ آہستہ آہستہ چلتے

ہوئے اس کے قریب رکھی کرسی پر آ بیٹھے اور انہوں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر ہمدردی سے اسے تھپکا بالکل ایسے جیسے نانی کرتی تھیں۔

''معافی چاہتا ہوں ڈیئر...... میرا خیال ہے آج کے لیے اتنا ہی کافی ہے تم جب تک چاہو یہاں رہ سکتی ہو اور میں باقی اسٹیٹ کی ذمہ داری نبھاتا رہوں گا جب تک تم مناسب وقت دیکھ کر یہاں سے جانے کا فیصلہ نہ کرلو اور پھر نیویارک میں جا کر اپنی میڈیکل کی ٹریننگ پوری کرنے کا فیصلہ کرو۔'' انہوں نے ایک ٹشو پیپر اس کی طرف بڑھایا کیونکہ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں۔

''مجھے نیویارک جانے کی اتنی جلدی نہیں ہے۔'' سمنتھا نے ان کے ہاتھ سے ٹشو لیتے ہوئے کہا۔

''دراصل سچی بات یہ ہے کہ وہاں میرے لیے کچھ مسائل ہیں لیکن وہ لوگ چھ ماہ تک میرا انتظار کرسکتے ہیں۔''

''اگر کوئی ایسا معاملہ ہو کہ میں ہینڈل کرلوں گا مجھے بتاؤ۔'' مسٹر ایڈی نے کہا۔

''نہیں...... ابھی میں نے خود کوئی فیصلہ نہیں کیا۔''

''میرا خیال ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ تم اپنی نانی کی موت کو حادثہ نہیں سمجھتیں اور قاتل تک پہنچنا چاہتی ہو۔''

''شاید یہی بات ہے۔'' سمنتھا نے اٹھتے ہوئے کہا وہ واپس گھر جانا چاہتی تھی۔

''اگر کہو تو میں اپنی بیوی سے رات کے کھانے پر تمہارے لیے انتظام کرنے کا کہوں کچھ وقت اچھا گزر جائے گا۔'' ایڈی نے پیش کش کی۔

''نہیں میں کچھ وقت تنہائی میں گزارنا چاہتی ہوں۔'' سمنتھا نے جواب دیا پھر وہ اس کے دفتر سے نکل گئی تھی واپسی پر وہ اپنی نانی اور والدین کی قبروں پر بھی گئی تھی اور اسے کچھ دیر کے لیے ایسا محسوس ہوا تھا جیسے وہ اپنی ماں کی بانہوں میں آ گئی ہو وہ دھیرے سے ماں کی قبر کے پاس بیٹھ گئی تھی۔

''کہنے کو میرے پاس کچھ نیا نہیں ہے میں کام کر رہی ہوں لیکن ابھی تک مجھے کوئی سراغ نہیں ملا ہے اور میری طرح پولیس کے پاس بھی کچھ نہیں ہے۔''

کچھ دیر وہاں بیٹھنے کے بعد وہ واپسی کے لیے کھڑی ہوگئی ہوائیں تیز چلنے لگی تھیں اور آسمان پر کالے کالے بادل چھا گئے تھے۔ بارش کی آمد آمد تھی واپس مڑتے ہوئے اچانک اس کی نظریں دور ایک درخت کے نیچے کھڑے ہوئے شخص پر پڑیں اور وہ چونک گئی۔

''ہوسکتا ہے کوئی میری طرح اپنے کسی عزیز کی قبر پر آیا ہو۔'' اس نے دل کو سمجھایا وہ تیزی سے اپنی کار میں آ بیٹھی تھی اور وہاں سے روانہ ہوگئی تھی وہ طوفان کی آمد سے پہلے گھر پہنچنا چاہتی تھی۔

☆

گھر پہنچنے کے بعد سمنتھا نے جیسے ہی دروازہ کھولا تھا ایک لفافہ اسے فرش پر پڑا ملا تھا جس پر موجود تحریر کو وہ پہچانتی تھی وہ جو کی تحریر تھی وہ دہاں آیا تھا اور سمنتھا اس سے ملنے سے محروم رہی تھی اس نے افسردگی کے ساتھ وہ لفافہ اٹھایا اور ڈرائنگ روم میں جا بیٹھی۔ اسے بچپن میں جو کے ساتھ گزارے ہوئے لمحات یاد آنے لگے وہ دونوں ہر وقت ساتھ رہتے تھے' جو سے اس کی بہت سی اچھی یادیں وابستہ تھیں وہ اسے پسند کرتی تھی لیکن تعلیمی سلسلے کی وجہ سے دور چلی گئی تھی اور کافی عرصے سے جو سے ملاقات نہیں ہوسکی تھی اس نے لفافہ کھولا اور اس میں موجود کاغذات کو میز پر ڈال دیا جو نے اس کی نانی کے کیس کے کاغذات کی فوٹو اسٹیٹ اسے فراہم کردی تھی وہ ایک ایک پیپر کا بغور جائزہ لینے لگی اسے دو تصویریں پریشان کر رہی تھیں جو اس کی نانی کے حادثے کی جگہ کی تھیں اور دونوں تصویروں میں ایک شخص موجود تھا جسے وہ پہچاننے کی کوشش کر رہی تھی لیکن ناکام رہی تھی تھک کر وہ بیڈ پر لیٹ گئی اور ایک کتاب کی ورق گردانی کرنے لگی اسے نیند نہیں آ رہی تھی اور طوفان تیز ہوگیا تھا اس نے تھک کر کتاب رکھ دی پھر کچھ ہی دیر گزری تھی ایک خیال اس کے ذہن میں کوندا تھا وہ چھلانگ لگا کر بیڈ سے اتری تھی اور ڈرائنگ روم میں جا کر پھر وہی دو تصویریں اٹھالی تھیں اس بار وہ میگنی فائن گلاس کی مدد سے انہیں دیکھ رہی تھی اور پھر اس کی ریڑھ کی ہڈی میں سنسنی سی پھیل گئی تھی جب اس نے ایک تصویر میں اسے جائے حادثہ کے پاس آگ لگے ٹرک کے پیچھے سے جھانکتے دیکھا تھا اس نے اس وقت بھی سن گلاسس لگائے ہوئے تھے اور دوسری تصویر میں وہ ٹوٹی ہوئی کار کے پاس موجود

''ہیلو مسٹر پراسرار۔'' سمنتھا نے سرگوشی میں کہا یہ وہی لما لے وہ دو بار قبرستان میں دیکھ چکی تھی اور اس کی شناخت کے بارے میں جاننا چاہتی تھی۔

☆

''جو تم سمجھتے کیوں نہیں' میں جو کہہ رہی ہوں وہ بالکل ٹھیک ہے میں پاگل نہیں ہوں۔'' سمنتھا زور زور سے بول رہی تھی وہ تصویر میں اس پراسرار شخص کو دیکھ کر جو کے دفتر پہنچ گئی تھی۔

''میری بات سنو سمنتھا۔'' جو اسے سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ ''شور مت کرو اگر چیف کو پتہ لگ گیا کہ میں نے تمہیں یہ تصویریں فراہم کی تھیں یا رپورٹ کی کاپی دی تھی تو میری نوکری بھی جاسکتی ہے میرے لیے مشکلات پیدا مت کرو میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ میں نے ایسا کیوں کیا؟''

''میں نہیں جانتی کہ میں تم سے یہ امید کیوں رکھتی ہوں کہ تم اس سلسلے میں میری مدد کرو گے؟'' اس نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔

''تمہیں رپورٹ میں درج کرنا چاہیے کہ یہی آدمی ٹھیک ایک ہفتے بعد نانی کی تدفین کے موقع پر موجود تھا۔''

''لیکن تم یقین سے کیسے کہہ سکتی ہو کہ یہ وہی آدمی ہے؟''

''دیکھو اس کے سیاہ بالوں میں صرف ایک لٹ براؤن ہے اور اس کا جبڑا چوکور ہے اس کی ناک دیکھو یوں لگتا ہے جیسے کبھی اس کی ناک کی ہڈی ٹوٹی تھی اور ہر وقت یہ دھوپ کا چشمہ کیوں لگاتا ہے چاہے دن ہو یا رات نانی کی تدفین پر بھی جب آسمان پر بادل چھائے تھے یہ دھوپ کا چشمہ لگائے ہوئے تھا اور حادثے کے وقت بھی جب اندھیرا چھا رہا تھا اس نے دھوپ کا چشمہ لگایا ہوا ہے تصویروں میں دیکھو۔'' سمنتھا نے تصویروں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''کیا تم اسے پہچان سکی ہو کون ہوسکتا ہے؟''

''اگر میں پہچانتی تو تمہارے پاس نہ آتی۔''

''میں جانتا ہوں اتنا بڑا صدمہ تم برداشت نہیں کرسکی ہو۔''

''تم میری بات نہیں سمجھو گے۔'' سمنتھا نے غصے سے کہا اور جو کی میز پر سے تمام کاغذ اور تصویریں جمع کر کے اپنے پرس میں رکھیں اور آفس سے نکل گئی تھی واپسی پر اس نے مسٹر ایڈی سے ملنے کا فیصلہ کیا اور پراسرار شخص کے بارے میں بھی وہ انہیں بتانا چاہتی تھی چنانچہ وہ ان کے دفتر پہنچ گئی لیکن دفتر میں داخل ہونے سے پہلے اس نے اپنے عقب میں ایک بار پھر اس شخص کی جھلک دیکھی تھی اور وہ تیزی سے دفتر میں داخل ہوگئی تھی۔ پھر جب اس نے مسٹر ایڈی کو اس کے بارے میں بتایا تھا تو انہوں نے اسے مشورہ دیا تھا کہ وہ اپنی سیکورٹی کے لیے کسی فرم کی خدمات لے لے اور اگر وہ چاہے تو مسٹر ایڈی بھی اس کے لیے سیکورٹی کا بندوبست کردیں گے انہوں نے ایک بار پھر اسے گھر فروخت کرنے کا مشورہ دیا تھا لیکن وہ انکار کرنے کے بعد ان کے دفتر سے بھی نکل گئی تھی اسے اس موقع پر شدت سے اپنے والدین کی یاد آ رہی تھی چنانچہ گھر جانے سے پہلے وہ قبرستان گئی تھی اور اپنی ماں کی قبر کے پاس بیٹھ کر ان سے باتیں کرتی رہی تھی پھر اس کی آنکھ لگ گئی تھی۔

جب اس کی آنکھ کھلی تو کافی دیر ہوچکی تھی وہ واپس کار میں آ بیٹھی کار میں بیٹھتے ہوئے اس نے بے دھیانی میں اپنی جیکٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا تو اس میں ایک پرچے کو محسوس کیا اسے یاد نہیں تھا کہ اس نے کوئی پرچہ جیب میں رکھا تھا اس نے نکال کر دیکھا وہ ایک چھوٹا سا پرچہ تھا اور اس پر لکھا تھا ''چابی تلاش کرو'' وہ حیران تھی کہ یہ پرچہ اس کی جیب میں کہاں سے آیا پھر نہ جانے کیوں اسے احساس ہونے لگا تھا کہ وہ وہاں پر تنہا نہیں تھی اس کے آس پاس کہیں وہ پراسرار شخص بھی موجود تھا اس نے تیزی سے کار آگے بڑھا دی تھی۔

اس واقعے کے بعد سمنتھا نے نانی کے گھر میں مختلف جگہوں پر چابی کی تلاش شروع کردی تھی اور پھر ایک دن ان کے جیولری بکس میں ایک چابی مل ہی گئی تھی جس پر ایک نمبر لکھا تھا 2386 وہ جانتی تھی کہ اس کی نانی کا اکاؤنٹ ایک مقامی بینک میں تھا اور وہیں ان کا لاکر بھی تھا اس نے اس اکاؤنٹ اور لاکر کو چیک کرنے کا پروگرام بنایا۔ اس مقصد کے لیے وہ مسٹر ایڈی سے ملی جنہوں نے اسے ایک

تصدیق نامہ بنا کر دیا جس کی رو سے وہ اپنی نانی کے لاکرز چیک کرسکتی تھی۔ بینک میں اسے کوئی مشکل پیش نہیں آئی ان کے لاکرز میں کچھ جیولری تھی اس کے علاوہ ایک فائل بھی تھی جو اس نے اپنے پرس میں ڈال لی تھی اور پھر جیولری واپس رکھ کرلاکر بند کردیا تھا۔

گھر پہنچنے کے بعد اس نے اپنے پرس سے فائل نکالی تھی اور اس میں لگے کاغذات کا جائزہ لیا تھا' اس پر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ گئے تھے اس فائل میں مختلف کاغذات کے ساتھ ایک ایسا کاغذ بھی تھا جس نے اس کے دل کی دنیا ویران کردی تھی وہ ایک بلڈ رپورٹ تھی جس میں بلڈ ٹسٹ کی تفصیل لکھی تھی اس پر 26 مئی کی تاریخ پڑی تھی جو اس کی پیدائش سے دس دن بعد کی تھی جس میں ایک لائن لکھی تھی کہ اس کے اور اس کے والد کے خون ٹیسٹ کی رپورٹ سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ ان کی بیٹی نہیں۔

❖......☆......❖

امریکہ کے چیف آف آرمی اسٹاف فورڈیل ہاتھ میں ایک فائل لیے بیضوی کمرے میں داخل ہوئے جو امریکی صدر کا دفتر تھا اور ہاتھ میں پکڑی ہوئی فائل امریکی صدر وارنر کے سامنے رکھ دی۔

''کیا بات ہے؟'' وارنر نے پوچھا۔

''آج دوپہر وائس پریذیڈنٹ ڈرکن کے آفس میں میٹنگ ہے۔''

''اس کے علاوہ؟''

''ہمیں ننانوے فیصد یقین ہے کہ سیکورٹی فورسسز پھر کام کررہی ہیں یہ بات کانگریس ممبر رائن نے بتائی ہے۔'' فورڈیل نے کہا اور وارنر کے چہرے پر غصے کے آثار نظر آنے لگے۔

''اب وہ کس کی تلاش میں ہیں؟ انہیں کہاں دیکھا گیا ہے؟''

''پچھلے چند مہینوں میں نیویارک اور کنساس میں دیکھا گیا ہے۔'' وارنر نے فورڈیل کے جواب پر کچھ دیر آنکھیں بند کیں وہ کچھ سوچ رہا تھا اسے سیاسی زندگی میں اپنے کیریئر کی بہت پروا تھی وہ اپنی کوتاہیوں کو عام لوگوں سے چھپا کر رکھنا چاہتا تھا تاکہ اس کی سیاسی زندگی متاثر نہ ہو۔

''یقیناً وہ اس لڑکی تک پہنچنے کی کوشش کررہے ہوں گے۔'' وارنر نے کہا اور چیف آف اسٹاف نے فائل کے چند ورق الٹ کر وارنر کے سامنے رکھ دیے اس میں ایک تصویر لگی تھی جسے وارنر نے بغور دیکھا۔

''اس معاملے کو تم ہی سنبھالو فورڈیل۔''

''یس مسٹر پریذیڈنٹ'' فورڈیل نے کہا اور فائل لے کر کمرے سے نکل گیا پھر وہ سکریٹریل روم میں گیا تھا اور وہاں موجود کلرک کو مخاطب کیا تھا۔ ''مجھے ایک محفوظ لائن کے ذریعے FBI سے بات کرواؤ۔''

❖......☆......❖

دوسرے روز جب سمنتھا بارلیٹ اپنے والدین کی قبر پر گئی اور اس نے اپنی ماں کی قبر پر پھول رکھے تو برابر والی قبر کا کتبہ دیکھ کر اس کی آنکھیں آبدیدہ ہوگئیں۔

''جان ولیم بارلیٹ۔'' اب وہ تذبذب میں تھی کہ وہ ڈیڈی کا لفظ ادا کرے یا نہیں۔ وہ سوچ رہی تھی کہ کیا وہ یہ بات جانتے تھے اس خیال کے آتے ہی اسے لگا جیسے کوئی کانچ کا ٹکڑا اس کے دل میں چبھ گیا ہو اسے اپنی ماں کی بات یاد آنے لگی وہ اکثر کہا کرتی تھیں کہ باپ تو کوئی بھی ہوسکتا ہے لیکن اصل اور اسپیشل باپ ہونے کے لیے کچھ خاص کوالٹی ہونا ضروری ہوتی ہے اس نے کبھی ان الفاظ کی گہرائی پر غور نہیں کیا تھا لیکن اب جب اس پر ایک حقیقت کھل چکی تھی تو اسے ان الفاظ کے مطلب کا اندازہ ہوا تھا۔

''آپ میرے ساتھ ایسا نہیں کرسکتیں ماما۔'' اس نے سسکتے ہوئے کہا۔ ''آپ نے اپنے شوہر سے بے وفائی کی؟ اور مسٹر ایڈی بھی یہ سچائی جانتے ہیں؟'' اس کا دماغ پھٹا جارہا تھا وہ سوچ رہی تھی کہ کیا اس کی والدہ کا کسی کے ساتھ کوئی فلرٹ تھا یا وہ کسی اور سے محبت کرتی تھیں کیا یہی وجہ تھی کہ اسے کنساس سے دور کردیا گیا تھا یا اس کی ماں اپنے شوہر سے کوئی سچائی چھپا رہی تھی۔

''ماما آپ نے مجھے اس بارے میں کیوں نہیں بتایا؟'' اس نے شکوہ کیا ''مجھے اس بات سے بہت دکھ ہوا ہے کہ میرے بارے میں اتنی بڑی حقیقت کے بارے میں سب جانتے تھے لیکن میں نہیں جانتی تھی؟'' اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے اچانک اس کی نظر اپنی والدہ کے کتبے پر پڑی اس کے نیچے زمین سے ایک دھات کا ٹکڑا جھانک

ہاتھا اس نے اسے کریدا تو لگا کہ کوئی دھات کی چیز ہے اس نے مزید مٹی ہٹائی تو وہاں سے ایک چھوٹا سا بکس نکلا اسے اس نے تیزی سے اپنے پرس میں ڈال لیا تھا' وہ نہیں جانتی تھی کہ اس میں کیا ہے لیکن وہ حیران تھی کہ اسے وہاں کس نے اور کیوں چھپایا ہے وہ تیزی سے اٹھی اور اپنی کار میں بیٹھ کر وہاں سے روانہ ہوگئی۔

وہ گھر میں پچھلے دروازے سے داخل ہوئی تھی گھر اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا اور گھر میں اسے دیواروں کے ساتھ ساتھ سائے حرکت کرتے محسوس ہورہے تھے سمنتھا نے سب کھڑکیوں کے پردے ڈال دیئے وہ خود کو پرسکون رکھنے کی کوشش کررہی تھی اس کے کان ہر آواز کو سننے کی کوشش کررہے تھے' گھر کے چاروں طرف خاموشی تھی وہ گھر کی لائٹیں جلانے سے بھی گریز کررہی تھی نہ جانے کیوں اسے خوف سا محسوس ہورہا تھا اور یوں لگ رہا تھا کہ جیسے اس کا تعاقب کرنے والا سایہ کہیں قریب ہی موجود ہو۔

اس نے پرس سے دھات کا چھوٹا سا بکس نکال کر میز پر رکھا وہ حیران تھی کہ ایسی کیا اہم چیز ہے جو کسی نے اس بکس میں اس کی ماں کے کتبے کے نیچے چھپائی ہے اس کی آنکھوں کے سامنے آگ کا وہ منظر آگیا جو بچپن میں اس نے دیکھا تھا اور اس کے والدین اس حادثے میں ہلاک ہوگئے تھے وہ جب سے یہاں آئی تھی عجیب وغریب حادثات کا شکار ہورہی تھی اس کا جی چاہا کہ کاش نیویارک میں گزاری ہوئی زندگی کے دن واپس آجائیں لیکن ایسا ممکن نہیں تھا۔

اس نے کانپتے ہاتھوں کے ساتھ بکس کا ڈھکن کھولا اس کے اندر کچھ کاغذات موجود تھے جو طویل عرصہ گزرنے کے بعد زردی مائل ہوگئے تھے سمنتھا نے احتیاط سے انہیں باہر نکالا اس میں پیدائشی سرٹیفکیٹ' شادی کی دستاویز' ڈرائیونگ لائسنس اور پاسپورٹ تھے ان پر اس کے والدین کی تصاویر تھیں لیکن نام کسی اور کے تھے اچانک اس کے دل میں خیال آیا کہ اس کے والدین نے ایسا کیوں کیا' کیا وہ خود کو کسی سے چھپا رہے تھے یا ان کا تعلق کسی مافیا گروپ سے تھا؟ یا شاید CIA سے ہو؟ سمنتھا اس بات پر اپنے والدین سے کتنا ہی ناراض ہوتی لیکن وہ انہیں چور یا دھوکے باز سمجھنے کے لیے تیار نہیں تھی آخر میں اس بکس میں ایک لفافہ رہ گیا تھا اس نے دھڑکتے دل کے ساتھ اسے بھی کھولا اور اس میں موجود کاغذ نکال کر پڑھنے لگی جوں جوں وہ پڑھتی جارہی تھی اسے اپنے کانوں میں اپنی ماں کی آواز گونجتی محسوس ہورہی تھی۔

''میری پیاری سمنتھا!''

اگر تم یہ خط پڑھ رہی ہو تو میری خواہش پوری ہوگئی ہے اگر ہم باحفاظت واپس نہ آسکیں تو سیکورٹی کے لوگ تمہیں ایک دستاویز بھیجیں گے جس سے تمہیں پتہ چلے گا کہ ہم بے گناہ ہیں اور ہم اپنے وطن کے لیے ایک بڑی قربانی دے رہے ہیں لیکن اس کے بدلے میں ہمیں صرف اور صرف مشکلات اور پریشانیاں ملی ہیں' ہم نے کبھی یہ ذمہ داری اٹھانے سے انکار نہیں کیا ہم تم سے محبت کرتے ہیں تم بھی ہم سے بدگمان مت ہونا تم نے ہماری زندگی کو خوشیوں سے بھر دیا تھا میری خواہش ہے کہ ہماری قربانیاں رائیگاں نہ جائیں اب وقت آگیا ہے کہ تمہیں حقیقت بتادی جائے۔

تمہارے والد اور میں اس قابل نہیں تھے کہ ہمارے ہاں اولاد ہو' ہم اس نعمت سے محروم تھے شادی کو کافی عرصہ گزرنے کے بعد بھی ہمیں اولاد نہیں ہوئی تھی تب میری ملاقات ایک شخص سے ہوئی جو اس وقت کسی بڑے عہدے پر فائز نہیں تھا لیکن گورنر کے لیے انتخاب لڑ رہا تھا' میں نے اس کی انتخابی مہم میں حصہ لیا اور ایک موقع پر اس نے تنہائی سے فائدہ اٹھالیا میں بہت روئی' بہت شور مچایا لیکن کچھ نہ ہوا' تمہارے والد اسے قتل کردینا چاہتے تھے' کوئی حکومتی ادارہ ہماری بات سننے کو تیار نہیں تھا اور پھر مجھے پتہ چلا کہ تم دنیا میں آنے والی ہو' ہماری زندگیوں میں روشنی کی کرن داخل ہوگئی لیکن میرے ٹیسٹ سے پتہ چلا کہ تم ہماری اولاد نہیں ہو۔

سمنتھا اس شخص سے ہمیشہ دور رہنا اور اس سے کبھی ملنے کی کوشش مت کرنا میں سوچنا بھی نہیں چاہتی وہ تمہیں کتنا نقصان پہنچا سکتا ہے لیکن تمہیں حقیقت بتانا ضروری تھا تمہارے والد جان بارلیٹ ہمیشہ تمہارے والد رہیں گے لیکن درحقیقت تم گورنر ڈرکن نارمن کی بیٹی ہو۔'' سمنتھا کا چہرہ یہ تحریر پڑھ کر سفید ہوگیا اس کے جسم سے سارا خون

نچوڑلیا گیا ہو وہ اس سے زیادہ نہیں پڑھ سکتی تھی اسے لگا وہ بے ہوش ہوکر گر پڑے گی اب ڈرکن نارمن امریکا کا وائس پریذیڈنٹ تھا۔ اسے یوں لگا جیسے یہ سب ڈراؤنا خواب ہو اس نے اپنے آپ کو پرسکون رکھنے کے لیے کئی گہرے گہرے سانس لیے اس کی آنکھیں دھات کے بکس اور کاغذات کو گھور رہی تھیں اچانک اس کے ذہن میں خیال آیا کہ اس شخص نے بھی اسے وہ بکس اپنی ماں کی قبر کے کتبے کے نیچے سے نکالتے دیکھا ہوگا جو کسی بدروح کی طرح اس کے تعاقب میں رہتا تھا ممکن ہے وہ تعاقب کرتا ہوا اس کے پیچھے گھر تک بھی آیا ہو اور گھر کے آس پاس موجود ہو......وہ لوگ اسے مار ڈالیں گے اسی طرح جس طرح انہوں نے اس کے والدین کو ہمیشہ کے لیے خاموش کردیا تھا۔

سمنتھا تیزی سے لیونگ روم میں آ گئی تھی اور اس نے فرش پر بچھا ہوا قالین ایک کونے سے پکڑ کر اٹھایا تھا وہ نہیں چاہتی تھی کہ وہ پراسرار سایہ اسے گھر سے نکلتے ہوئے دیکھے وہ یقیناً گھر کے باہر اس کے نکلنے کا منتظر ہوگا اور اس کے نکلتے ہی اسے گولی مار دے گا لیکن وہ اسے بے وقوف بنا سکتی تھی فرش سے قالین ہٹانے سے وہاں ایک سوراخ نمودار ہوا تھا جس سے سمنتھا اکثر نیچے تہہ خانے میں چلی جاتی تھی یہ تہہ خانہ طوفانوں میں چھپنے کے لیے بنایا گیا تھا یہ تہہ خانہ آخر میں جا کر گھر کے سامنے پورچ میں کھلتا تھا جہاں سیڑھیوں کے نیچے ایک تاریک پوشیدہ کونہ تھا جو عام آنکھوں سے پوشیدہ تھا اچانک اس کے کانوں میں ایک دھماکے کی آواز سنائی دی تھی اور شدید گرمی کا احساس ہوا تھا پھر وہ تاریکی میں ڈوبتی چلی گئی تھی۔

✩

جو حیران پریشان ایک کھنڈر پر کھڑا تھا جہاں کبھی سمنتھا کا گھر تھا جگہ جگہ آگ لگی ہوئی تھی اور کئی فائر انجن آگ بجھانے کی کوشش کررہے تھے اطراف کے گھروں کو بھی نقصان پہنچا تھا اور جو بالکل نزدیک گھر سے وہ بھی آگ کی لپیٹ بھی آئے تھے' سڑک کے پار جو گھر بنے تھے ان کے رہائشیوں نے اپنی کھڑکیاں اور دروازے بند کرلیے دھماکا کرنے والوں کے بارے میں کوئی کچھ نہیں جانتا تھا۔

جو تحقیقات کے لیے ضروری پوائنٹ لکھ رہا تھا لیکن اس کے دماغ میں مسلسل سیم کا خیال تھا اس کا کوئی نشان نہیں مل رہا تھا لیکن اس کی کار باقیات برابر والے گھر کے ڈائننگ روم کی دیوار میں گھس گئی تھیں وہاں بھی سمنتھا کا کوئی نشان نہیں تھا وہ سوچ رہا تھا کہ اگر سمنتھا وہاں نہیں تھی تو وہ شاید چہل قدمی کرنے باہر گئی ہو لیکن دھماکا ہونے کے بعد اسے اب تک واپس آ جانا چاہیے تھا اس کے کوئی ایسے دوست بھی نہیں تھے جن کی ساتھ وہ وقت گزارنے کہیں دور گئی ہو' سوائے مسٹر ایڈی کے لیکن ایڈی اور اس کے گھر والے بھی سمنتھا سے کئی دنوں سے نہیں ملے تھے اگر وہ واپس نیویارک گئی ہوتی تب بھی ایڈی اس کے بارے میں ضرور جانتا لیکن اسے بھی کوئی علم نہیں تھا۔

اچانک جو کے ذہن میں اس سوراخ کا خیال آیا جو لونگ روم کے فرش کے قالین کے نیچے تھا اور جہاں اس کے جانے پر ہمیشہ پابندی تھی اس نے سوچا ممکن ہے سمنتھا درست کہہ رہی ہو کہ اسے اور اس کی فیملی کو کسی سے خطرہ ہے اس نے اس پراسرار شخص کا بھی ذکر کیا تھا جو دھوپ کا چشمہ لگائے رکھتا تھا اور اس کے تعاقب میں تھا کہیں کسی نے جان بوجھ کر اس کے گھر کو نشانہ تو نہیں بنایا؟ کہیں یہ دھماکا اس لیے تو نہیں کیا گیا کہ جو نے جو تصویریں اور ثبوت سمنتھا کو دیئے تھے انہیں ضائع کردیا جائے اس خیال کے آتے ہی اس نے ایک فلیش لائٹ اٹھائی اور آگے بڑھ گیا اسے امید کم ہی تھی کہ اتنے شدید دھماکے کے بعد اگر سمنتھا گھر میں تھی تو زندہ بچی ہوگی اسے پچھلی یادیں بھی ستا رہی تھیں جب ایک بار اس پرانے تہہ خانے میں وہ سمنتھا کے ساتھ اکیلا تھا اور اس نے سمنتھا کو پیار کیا تھا۔

جو نے فلیش لائٹ کی روشنی میں آہستہ آہستہ سیڑھیاں اترنا شروع کیں اس کے ساتھ اس کی مدد کرنے کے لیے دو پولیس آفیسر بھی موجود تھے۔ تہہ خانے کی دیواریں بہت خستہ حالت میں تھیں بہت حد تک جھڑ بھی گئی تھیں۔

''سیم......سیم!'' جو تھوڑی تھوڑی دیر بعد سمنتھا کو پکار رہا تھا لیکن جواب میں خاموشی تھی وہ سوچ رہا تھا کہ اگر سمنتھا وہاں ہوئی بھی تب بھی اس کی حالت نہ جانے کیا ہوگی۔

''سیم!'' اس نے پھر پکارا۔ ''مجھے جواب دو سیم۔'' اس کی بے چینی بڑھتی جارہی تھی لیکن وہاں مکمل خاموشی تھی

پھر وہاں رکنے کے بعد وہ واپس پلٹ آیا تھا سیڑھیوں کے دہانے پر ایک اور پولیس آفیسر فلیش لائٹ لیے کھڑا تھا۔

''کچھ ملا؟'' اس نے پوچھا۔

''نہیں' یہاں کوئی نہیں ہے۔'' جو نے اداسی سے کہا۔

✩

روشنی سے اس کی آنکھیں چندھیا گئی تھیں' کمرہ چکراتا محسوس ہو رہا تھا اسے محسوس ہوا اس کے منہ اور ناک پر آکسیجن ماسک لگا ہوا ہے ایک چہرہ اس پر جھکا ہوا تھا جس کے سر پر بال سیاہ تھے اور نیلی آنکھیں اس پر مرکوز تھیں سمنتھا کو لگا جیسے اس میں کوئی چیز سمنتھا کے لیے جانی پہچانی ہے۔

''میں کہاں ہوں؟'' سمنتھا نے بولنے کی کوشش کی لیکن الفاظ ماسک کی وجہ سے مبہم تھے وہ شخص شاید سمنتھا کی بات سمجھ گیا تھا۔

''تم نے زندہ رہنے کا فیصلہ کرلیا ہے شاید خدا کا شکر ہے تمہیں ہوش آ گیا۔'' اس نے کہا اور پھر اپنے ہاتھ میں موجود فائل میں کچھ نوٹ کرنے لگا پھر اس نے بیڈ کے قریب رکھے ہوئے مانیٹر کو بغور دیکھا تھا اس نے سمنتھا کے ماتھے پر ہاتھ رکھا تو اس کا سفید کوٹ ہوا میں لہرایا جس کے ساتھ ہی سمنتھا کے ذہن میں تتلیوں کا خیال آیا اور وہ جیسے اپنے بچپن کی یادوں میں پہنچ گئی اس کو لگا جیسے وہ اپنی ماں کے ساتھ ایک سبزہ زار میں موجود ہے اس کے اطراف میں تتلیاں اڑ رہی ہیں اور وہ دوڑ دوڑ کر انہیں پکڑنے کی کوشش کررہی ہے اس کی والدہ بھی اس کام میں اس کی مدد کرتی ہیں لیکن تتلیاں ان کے ہاتھ نہیں آتیں پھر ان کے خوبصورت نکھرے ہوئے رنگ پھیکے پڑنے لگتے ہیں اور وہ سرمئی ہوکر سیاہ ہوجاتی ہیں پھر یہ سیاہی ایک اندھیرے سوراخ میں تبدیل ہوجاتی ہے اور سمنتھا اس بلیک ہول میں گرتی چلی جاتی ہے۔

''سمنتھا!'' اچانک وہ اپنا نام سن کر پھر جاگ جاتی ہے۔ وہ اب بھی گہری نیلی آنکھوں سے اسے دیکھ رہا ہوتا ہے۔

''کیا تم ڈاکٹر ہو؟'' وہ پوچھتی ہے۔

''تم مجھے ڈاکٹر مرکس کہہ سکتی ہو۔'' اس نے کہا اور سمنتھا کو لگا جیسے وہ نیویارک کے کسی اسپتال میں ہو لیکن وہ جانتی تھی کہ وہ تو کنساس میں تھی۔

''میں کہاں ہوں؟ کیا ہوا ہے؟'' اس نے پوچھا اسے لگا جیسے اس کی زبان لڑکھڑا رہی ہو اور الفاظ کی ادائیگی میں اس کا ساتھ نہ دے رہی ہو اس کے ساتھ ہی اسے اپنی نانی کی موت کا منظر یاد آ گیا' موت کے منظر کے ساتھ ہی بالترتیب قبرستان' بکس اور پھر دھماکے کا خیال آتے ہی وہ تیزی سے بیڈ سے اٹھنے کی کوشش کرنے لگی اس نے اپنے اوپر پڑی ہوئی چادر ہٹائی اور اٹھتے اٹھتے ایک بار پھر گرتے گرتے اسے اپنے بازو میں درد کی شدید لہر بھی محسوس ہوئی تھی۔

''تم ونچیٹا کے قریب واقع ایک اسپتال میں ہو۔'' ڈاکٹر مرکس نے کہا اس کے ساتھ ہی اس نے سمنتھا کی کلائی پکڑ کر نبض چیک کی تھی۔

''کسی نے تہہ خانے کی تعمیر کے وقت اپنا کام ٹھیک طرح نہیں کیا تھا وہاں ایک جھری موجود تھی جس سے دھواں تہہ خانے میں چلا گیا تھا اور ہمیں تم تک پہنچنے میں دیر لگ گئی تھی۔'' وہ بول رہا تھا اور سمنتھا خالی خالی نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی وہ کچھ جاگی اور کچھ سوئی ہوئی حالت میں تھی۔

''تہہ خانہ؟'' اس نے سوچا۔

''تمہیں تہہ خانے کے بارے میں کیسے پتہ ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''دراصل اسے ہم نے ہی تعمیر کیا تھا۔'' ڈاکٹر نے جواب دیا اور سمنتھا مزید حیرت سے دوچار ہوئی۔

✩

جب جو اپنی تحقیقات کے دوران کاسٹر کنٹریکشن ایڈمنسٹریٹو کے آفس پہنچا تو وہاں خاصی گہما گہمی تھی اور میڈیا کا سرکس شروع ہوچکا تھا مختلف ذرائع ابلاغ کی ایجنسیاں وہاں ویڈیو بنا رہی تھیں ان کے نمائندے نوٹس جمع کررہے تھے کیونکہ کچھ ہی دیر پہلے اس کمپنی کے CEO کو قتل کردیا گیا تھا اسے دن کی روشنی میں اس کے آفس میں گولی ماردی گئی تھی اس کے چیف سنو نے اسے ہدایت کی تھی کہ وہ اپنی گاڑی بلڈنگ کی سائڈ میں میں پارک کرے۔

''تم اوپر جاؤ میں میڈیا والوں سے نمٹ کر آتا ہوں۔''

اس کے چیف نے کہا۔

''اوکے چیف۔'' جو نے جواب دیا اور بلڈنگ کی طرف بڑھ گیا وہ جب سے اس محکمے میں آیا تھا موت اس کے تعاقب میں تھی وہ بہت مواقع پر موت کو دھوکا دے چکا تھا لیکن اسے کبھی بھی خوف محسوس نہیں ہوا تھا وہ اکثر سوچا کرتا تھا کہ اس کام میں دو ہی چیزیں ہیں زندگی یا موت چنانچہ اسے ڈرنا نہیں چاہیے لیکن سمنتھا کی موت نے اسے توڑ کر رکھ دیا تھا اس کی موت کو ایک ہفتہ گزر چکا تھا لیکن وہ صدمے سے نہیں نکل سکا تھا اسے سمنتھا کی موت کا جتنا صدمہ تھا اتنا اپنی والدہ کی موت کا بھی نہیں ہوا تھا جو چھ سال پہلے اللہ کو پیاری ہوئی تھیں کیونکہ انہیں کینسر تھا اور انہوں نے اس کی تکلیف میں ایک لمبا عرصہ گزارا تھا ان کی موت کا سب کو علم تھا کہ بالآخر ان کا انجام وہی ہونا تھا اس کے لیے ذہن پہلے سے تیار تھا اسے اپنی ماں کے ساتھ بہت وقت گزارنے کا موقع ملا تھا اس نے اپنے دل کی تمام باتیں ان سے کرلی تھیں انہیں الوداع کہہ دیا تھا لیکن سمنتھا کا معاملہ مختلف تھا وہ اس سے شدید محبت کرنے کے باوجود بچپن سے اب تک دل کی بات نہیں کہہ سکا تھا اور سمنتھا کی نانی کی موت کے بعد جب وہ کنساس واپس آئی تھی تب اس کا ارادہ تھا کہ وہ اس سے اظہار محبت کردے لیکن وہ مناسب وقت کی تلاش میں تھا لیکن وقت کی یہ تلاش اور اس کا انتظار سمنتھا کو اس سے دور کر گئے تھے۔

البرٹ کاسٹر (CEO) کے آفس میں پہنچ کر اس نے لاش کا معائنہ کیا تھا وہ ابھی تک کرسی پر تھی اس کی پشت پر موجود کھڑکی کے شیشے میں گولی کا سوراخ تھا گویا کسی نے پشت پر سے فائر کیا تھا' لاش اور اطراف کا جائزہ لینے کے بعد جو نے کچھ نوٹس جمع کیے تھے اور موقع کی تصاویر بنوائی تھیں پھر باڈی اٹھانے والوں کو اشارہ کردیا تھا اور انہوں نے باڈی کو ایک بڑے بیگ میں رکھ کر وہاں سے ہٹا لیا تھا کاسٹر کی ٹیبل پر موجود چیزیں اپنی جگہ پر تھیں انہیں کسی نے ہاتھ بھی نہیں لگایا تھا۔

واپسی پر جو نے ہال سے گزرتے ہوئے کاسٹر کے بیٹے کو دیکھا جو میڈیا والوں کے کچھ سوالات کے جواب دے رہا تھا لیکن اس کی آنکھیں جو پر لگی ہوئی تھیں وہ کاسٹر کا بڑا بیٹا تھا۔

''ہیلو میں کاسٹر میں سراغرساں جو ہوں۔'' اس نے مصافحے کے لیے اپنا ہاتھ اس کی طرف بڑھایا۔

''سراغرساں؟'' جواب میں کاسٹر نے کہا لیکن اس نے مصافحے کے لیے اپنا ہاتھ نہیں اٹھایا تھا۔

''جب تمہارے والد کو قاتل مارنے آئے تو کیا تم یہاں تھے؟'' جو نے پوچھا۔

''نہیں اتفاق سے میں یہاں نہیں تھا۔''

''تمہارے والد کی سیکرٹری کا کہنا ہے کہ تم کچھ دیر پہلے ہی ان سے مل کر گئے تھے اور ان سے کسی بات پر شدید غصے کا اظہار بھی کیا تھا؟'' جو نے اپنے ہاتھ میں پکڑی نوٹ بک کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''ہاں' میں ایک پروجیکٹ کے سلسلے میں ان سے بات کررہا تھا دراصل میں اس پروجیکٹ کی ایک اور بلو پرنٹ ان سے مانگ رہا تھا تاکہ اس کو چیک کرسکوں۔''

''دوسرا بلو پرنٹ کہاں ہے؟''

''مجھے نہیں معلوم؟ میں نے اپنے والد کے کمرے سے آنے والے فائروں کی آواز سنی تھی۔''

''اور تم نے قاتلوں کو ان کے کمرے سے نکلتے نہیں دیکھا؟''

''نہیں۔''

جو کو اس کے جواب پر حیرت تھی وہ جان گیا تھا کہ منی کاسٹر کچھ چھپا رہا ہے وہ اس بارے میں کچھ نہ کچھ انفارمیشن رکھتا ہے لیکن بتانے سے گریزاں ہے۔

◆......☆......◆

سمنتھا کو جب دوبارہ ہوش آیا تھا تو اس کی حالت خاصی بہتر ہوگئی تھی اب وہ لوگوں کو پہچاننے کے قابل تھی۔

''تم اب کیسا محسوس کررہی ہو؟''

''بہت بہتر۔'' سمنتھا نے کہا ڈاکٹر مرکس اس کی آنکھوں میں جھانک رہا تھا اور اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔

''میرا خیال ہے یہ بہتری کی طرف آرہی ہے۔'' ڈاکٹر نے جھک کر ایک شخص سے کہا جو سمنتھا کے سرہانے کی طرف کھڑا تھا اور اس کا چہرہ نظر نہیں آرہا تھا۔

''کوئی مجھے بتائے گا کہ کیا ہورہا ہے...... مجھے یہاں

کون لایا؟' پلیز میری مدد کرو۔'' سمنتھا نے کہا تب اس کے سرہانے کھڑا شخص اس کے سامنے آ کھڑا ہوا۔

''تم مجھے ڈبرل کہہ سکتی ہو۔'' اس نے کہا اور بیڈ کے قریب رکھی کرسی پر بیٹھ گیا۔

''میں ایک لمبے سفر سے واپس آیا ہوں اور تمہیں زندگی میں ایک بار ملنے والا خوبصورت موقع دینا چاہتا ہوں۔''

''ٹھیک ہے ڈبرل پہلے مجھے یہ بتاؤ کہ میں کہاں ہوں میں اس اسپتال کو پہچاننے سے قاصر ہوں۔'' سمنتھا نے کہا۔

''تم میری ریاست میں ہو جہاں بہت سی سہولیات موجود ہیں۔'' ڈبرل نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''اور میری اس طرح کی بہت سی ریاستیں دنیا میں دوسرے مقامات پر بھی ہیں یہاں پر میں نے پچھلے سالوں میں بہت کام کیا ہے۔''

''میں کچھ سمجھی نہیں؟''

''اس کی وضاحت میں کچھ وقت لگے گا دراصل میں نے اپنی ساری زندگی دہشت گردی کے خاتمے کے لیے وقف کردی ہے اس مقصد کے لیے میں نے زمین دوز تجربہ گاہیں' میڈیکل سینٹرز' رہائشی منصوبے اور مواصلاتی نظام بنایا ہے اور اس پر بے دریغ اخراجات کیے ہیں پھر ان سب کا تعلق اوپر کی دنیا سے قائم کیا ہے میں اپنے ساتھ بہترین دماغ والوں اور ماہرین کو دیکھنا پسند کرتا ہوں اور ہم لوگ دنیا میں ہر شعبہ زندگی پر دسترس رکھتے ہیں عام اور غریب لوگوں کو امیر اور ظالم دہشت گردوں سے بچاتے ہیں اور پھر اپنا نشان چھوڑے بغیر رات کے اندھیرے میں غائب ہوجاتے ہیں ہم تب ہی نظر آتے ہیں جب ہم نظر آنا چاہتے ہیں۔'' وہ بول رہا تھا اور سمنتھا حیرت سے آنکھیں پھاڑے اسے دیکھ رہی تھی۔

''کیا تم پسند کروگی کہ تمہیں اس بیڈ پر ڈالنے کا ذمہ دار جو شخص ہے اس سے اپنا بدلہ لے سکو؟''

''تم کیا کہہ رہے ہو؟ کیا تم جانتے ہو کہ دھماکا کس نے کیا تھا؟'' سمنتھا نے پوچھا اور ڈبرل نے ڈاکٹر مرکس کو اشارہ کیا جس پر اس نے ایک تصویر سمنتھا کو دکھائی۔

''کیا تم اس شخص کو پہچانتی ہو؟'' ڈبرل نے پوچھا اور سمنتھا نے اس کے ہاتھ سے تصویر چھین کر اس کے ٹکڑے ٹکڑے کردئے وہ روتی جارہی تھی وہ تصویر ڈرکن نارمن کی تھی اس کے والد کی۔

''تمہیں اس بات کا پتہ کیسے چلا؟ تمہیں کیسے پتہ چلا کہ میں کون ہوں؟ تمہیں کیسے پتہ چلا کہ دھماکے کے بعد تم کو میں کہاں ملوں گی؟''

''کیونکہ تم جہاں سے ملیں اس تہہ خانہ کی تعمیر کا حکم میں نے ہی دیا تھا۔'' ڈبرل نے کرسی پر سیدھا بیٹھتے ہوئے کہا۔ ''تمہارے والدین میرے لیے کام کرتے تھے...... اس نے تمہارے والدین اور تمہاری نانی کو مار دیا اور اس نے ہی تمہاری موت کا حکم دیا اب تمہیں میرے ساتھ کام کرنا ہوگا کیونکہ وہ کسی قیمت پر خاموش نہیں بیٹھے گا وہ ہر حالت میں تمہیں خاموش کرنا چاہے گا۔'' ڈبرل نے کہا اور سمنتھا کو اپنی والدہ کا خط یاد آگیا جس میں اس نے کہا تھا کہ تمہیں سیکورٹی والے بچائیں گے وہ تم سے رابطہ کریں گے۔

''تم سیکورٹی سے تعلق رکھتے ہو؟''

'اوہ...... تمہارا ذہن بھی تمہاری ماں کی طرح تیز ہے ممکن ہے اس جیسی تیزی بھی تم میں ہو۔'' ڈبرل نے کہا۔

''میں ابھی تک نہیں سمجھی کہ تم میرے بارے میں اتنا کیسے اور کیوں جانتے ہو؟''

''ہم کچھ چیزوں کو خود بخود سمجھتے ہیں اور ان کے بارے میں جانتے ہیں ہم بہت عرصے سے تمہاری حفاظت کررہے ہیں۔''

''میری حفاظت؟ کس چیز سے؟''

''تمہارے حقیقی والد سے۔''

''اسے آئندہ کبھی میرا والد مت کہنا۔'' سمنتھا نے غصے سے کہا۔

''مجھے اس کا غصہ اور جوش پسند آیا۔'' ڈبرل نے ڈاکٹر مرکس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اس کا غصہ بھی اس کے باپ جیسا ہی ہے۔'' سمنتھا نے اس سے نہیں پوچھا تھا کہ اس کے باپ سے ڈبرل کی کیا مراد ہے؟

''ڈیئر' ہم بہت سالوں سے تمہاری حرکات وسکنات پر نظر رکھے ہوئے ہیں اور تمہیں اس کی پہنچ سے بچائے ہوئے ہیں۔ تمہارے نشانات کو پوشیدہ رکھتے ہیں اسے نہیں پتہ چلا کہ تم نیویارک کا اسکول چھوڑ چکی ہو لیکن جب

تم یہاں واپس آئیں تب اسے تمہارے بارے میں پتہ چلا وہ تمہیں اپنے راستے کا پتھر سمجھتا ہے اور ہر قیمت پر تم سے نجات چاہتا ہے اسی لیے اس نے دھما کا کروایا اور اب اسے یقین ہے کہ تم مر چکی ہو اس کے علاوہ دوسروں کو بھی جو تمہیں جانتے تھے یہ یقین ہے کہ اب تم اس دنیا میں نہیں ہو۔“

”میں مر چکی ہوں؟ میں اس دنیا میں نہیں ہوں؟“ سمنتھا نے حیرت سے کہا۔

”لیکن یقیناً کسی نے تو تمہیں دیکھا ہوگا جب تم مجھے آگ سے نکال کر لائے ہو گے؟“ سمنتھا نے کہا وہ سوچ رہی تھی کہ بہت لوگوں نے دھما کا سنا ہوگا آگ دیکھی ہوگی وہاں جمع ہو گئے ہوں گے فائر ڈپارٹمنٹ کے لوگ بھی ہوں گے اور علاقے کی پولیس کے ساتھ جو بھی ہوگا جو کا خیال آتے ہی اس کے دل میں درد کی کسک اٹھی تھی۔ لیکن دنیا اسے مردہ سمجھ رہی تھی تو جو بھی اسے مردہ سمجھ بیٹھا ہوگا گویا اس کا ناتہ زندہ لوگوں کی دنیا سے ٹوٹ چکا۔

”تمہیں کیسے پتہ چلا کہ میں تہہ خانے میں موجود ہوں؟“

”تم بھی اپنی ماں کی طرح تیز ہو۔“ ڈبرل نے مسکرا کر کہا۔ ”یہ بات تمہاری ماں کے ہی دماغ میں آئی تھی کہ اگر کوئی خطرہ ہوا تو جان کیسے بچائی جائے گی اس نے یہ تہہ خانہ بنوایا اور وہی ہوا یہ سمجھنا تو بڑی آسان سی بات تھی۔“ ڈبرل نے کہا اور ایک سگریٹ جلا کر گہرے گہرے کش لینے لگا۔

”اب جب کہ باہر کی دنیا سے تمہارا کوئی تعلق نہیں ہے تو ہم تمہیں اپنی یہ دنیا پیش کرتے ہیں تم بھی ہماری سیکورٹی فورس میں شامل ہو جاؤ۔“ ڈبرل نے اس سے کہا۔ ”ہم تمہارے راستے میں کوئی رکاوٹ نہیں آنے دیں گے۔“

”لیکن مجھے بہت سے بقایاجات ادا کرنے ہیں...... میری نیویارک میں رہائش کے، تعلیم کے، نانی کی زمینوں کے، ٹیکسوں کے۔“ سمنتھا نے گنوانا شروع کیا۔

”وہ سب ادا کر دیئے گئے ہیں ڈیئر اور یہ تمہیں اپنے ساتھ رکھنے کی قیمت ہم نے ادا کر دی ہے اب ڈاکٹر مرکس تمہاری مدد کریں گے اور میڈیکل کی فیلڈ میں تمہیں جو مزید ٹریننگ کی ضرورت ہے وہ دیں گے۔“ ڈبرل نے کہا۔ ڈاکٹر مرکس اس کی طرف دیکھ رہا تھا اس کی گہری نیلی پرسکون آنکھیں اس کا چوکور جبڑا سمنتھا کو جانا پہچانا لگا۔

”سمنتھا ہمیں تمہاری اور تمہیں ہماری ضرورت ہے یہ وقت ہے کہ تم اپنے دشمن سے بدلہ لے سکو اس شخص سے جس نے تمہاری ماں سے کھلواڑ کیا اور تمہاری ساری فیملی کو ختم کر دیا اور اب تمہیں مارنا چاہتا ہے۔“ ڈبرل کہہ رہا تھا اور سمنتھا اسے خالی خالی نظروں سے تک رہی تھی۔

”مجھے منظور ہے۔“ سمنتھا نے دھیمے مگر کسی قدر برہم لہجے میں کہا اس کی نظریں اب نارمن کی چیدہ چیدہ تصویروں پر تھیں، معاملہ طے ہوتے ہی ڈبرل کرسی سے اٹھ گیا پھر ایک گارڈ کے ساتھ وہ کمرے سے نکل گیا تھا ڈاکٹر مرکس نے سمنتھا کی ڈرپ تبدیل کی تھی اور اس کی رپورٹ میں کچھ نوٹس کا اضافہ کیا تھا۔

”میں نے تمہاری ڈرپ میں سکون بخش دوا ڈال دی ہے تاکہ تم کچھ دیر سو جاؤ اس طرح تمہارے زخمی بازو اور تھکے ہوئے دماغ کو بھی سکون ملے گا۔“

”میں آرام کی اہمیت کو سمجھتی ہوں ڈاکٹر اور مجھے یقین ہے کہ آپ جانتے ہیں کہ میڈیکل کی طالبہ ہونے کے ناتے مین ہمیشہ اپنی کلاس میں بہترین طالب علموں کی فہرست میں اول رہی ہوں۔“

”میں اس بارے میں سوچ رہا ہوں کہ تمہاری میڈیکل کی ٹریننگ کو آگے بڑھایا جائے تاکہ مستقبل ایک اچھے ڈاکٹر سے محروم نہ رہے۔“ ڈاکٹر مرکس نے کہا اور کمرے سے نکل گیا سمنتھا آہستہ آہستہ نیند کی وادی میں جا رہی تھی اس کی نظروں کے سامنے اپنی نانی کے ڈرائنگ روم کا منظر ناچ رہا تھا جس میں دو چہرے نمایاں تھے ایک ڈاکٹر مرکس اور دوسرا پراسرار سایہ!

﴿......☆......﴾

چند روز بعد سمنتھا ایک کار میں بیٹھی اپنے آبائی قبرستان پہنچی تھی اس نے کالا لباس زیب تن کیا ہوا تھا اور چہرے پر سیاہ نقاب تھا جس کی وجہ سے دور سے اسے نہیں پہچان سکتے تھے، ڈاکٹر مرکس اس کے ساتھ کار میں موجود تھا سمنتھا کی نظریں جیسے ہی تازہ تیار کی گئی قبر پر پڑی اس کے بدن نے ایک جھرجھری سی لی جس پر ایک نیا سنگ مرمر کا کتبہ لگا تھا۔ ”سمنتھا جان بارلیٹ“ جہاں اس کی باقیات دفنائی جانا تھیں اس نے اپنے کان کی لو کو انگلی سے چھوا جہاں اس کی بے ہوشی کے دوران ایک آلہ نصب کر دیا گیا تھا جس سے وہ فون کی طرح کسی کی گفتگو سن سکتی تھی اور اس کے بولے جانے والے الفاظ دوسری طرف موجود شخص سن سکتا تھا اور وہ شخص مسٹر ڈبرل تھا۔

”تم اس کی عادی ہو جاؤ گی۔“ ڈاکٹر مرکس نے کہا جس نے اسے کان کی لو چھوتے ہوئے دیکھا تھا۔ جب سمنتھا نے Elite (سیکورٹی فورس) میں شمولیت کا اقرار کیا تھا تب اسے پتہ نہیں تھا کہ اس کے کان میں مائیکرو چپ رکھ دیا جائے گا لیکن اب وہ ایک چلتا پھرتا سٹلائیٹ ٹرانسمیٹر تھی جس کی موجودگی ڈبرل ہر جگہ محسوس کر سکتا تھا اس کی ہر حرکت سے واقف رہ سکتا تھا اور جب چاہے اپنی ناگوار آواز اسے سنا سکتا تھا اور یہ بات سمنتھا کو پسند نہیں تھی۔ وہ ہر وقت اس کے ساتھ تھا اور اسے اپنی ہر حرکت کی وضاحت کرنا پڑتی تھی وہ سب سے پہلے اس کی نانی کی تدفین کے موقع پر نظر آیا تھا اور اس بارے میں اس نے سمنتھا کو یہ بتایا تھا کہ وہ یہ دیکھنے کے لیے وہاں موجود تھا کہ کہیں سمنتھا کو کوئی نقصان نہ پہنچے وہ جانتا تھا کہ سمنتھا کی نانی کو اس لیے مارا گیا کہ سمنتھا کھل کر سامنے آ جائے اس نے ہی ڈاکٹر مرکس سے اس کی جیکٹ کی جیب میں کاغذ کا پرزہ رکھوایا تھا تاکہ وہ حقیقت جان سکے۔

جیسے ہی کار قبرستان کے قریب پہنچ کر رکی ڈاکٹر مرکس نے اتر کر اس کے لیے دروازہ کھولا اور وہ باہر آ گئی اس نے کئی ہفتوں بعد سورج کی روشنی دیکھی تھی۔

”یاد رکھنا، سمنتھا بارلیٹ مر چکی ہے۔“ ڈاکٹر مرکس نے آہستہ سے کہا۔

”ہوں۔“

”پریشان مت ہو سب کچھ جلد ٹھیک ہو جائے گا۔“ ڈاکٹر مرکس نے کہا، سمنتھا آہستہ آہستہ اپنی قبر کی طرف بڑھ رہی تھی جہاں ان کی باقیات کو دفن ہونا تھا جو مسٹر ایڈی نے مکان کے ملبے سے جمع کی تھیں اس نے اپنی ماں کی قبر کی طرف دیکھا۔

”اوہ ماما...... میں یہاں ہوں...... میں زندہ ہوں۔“ اس نے دل ہی دل میں اپنی ماں کو پکارا اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ ”میں آپ کے نقش قدم پر چل رہی ہوں...... میری فکر مت کرنا، مجھے حالات ٹھیک کرنے کا ایک موقع ملا ہے اس مقصد کو پورا کرنے کے لیے مجھے کچھ وقت کے لیے آپ سے دور رہنا ہوگا۔ بہت لمبے وقت کے لیے...... میں خود نہیں جانتی کہ میں کب واپس آؤں گی...... آؤں گی بھی یا نہیں۔“ اس نے اپنی ماں کے کتبے پر ہاتھ پھیرا اور ڈاکٹر مرکس نے اس کے کاندھے پر تھپکی دی جس کا مطلب تھا کہ اگر وہ وہاں سے نہیں ہٹی تو اسے الیکٹرک شاک دیا جا سکتا ہے جس کا تجربہ اسے پہلے بھی ہو چکا تھا، وہ ایکدم سیدھی ہو گئی۔

”میں اس وقت آپ کی شدید کمی محسوس کر رہی ہوں ماما کاش آپ اس وقت میری مدد کے لیے یہاں ہوتیں اور مجھے کچھ چیزوں کے بارے میں بتاتیں، میں نارمن کو نہیں چھوڑوں گی ماما اس نے آپ کے اور میرے ساتھ جو کچھ کیا ہے اس کا اسے حساب دینا ہوگا میں اسے اس قابل نہیں چھوڑوں گی کہ وہ کسی اور کے ساتھ یہ حرکت کر سکے۔“ سمنتھا دل ہی دل میں اپنی ماں سے عہد کر رہی تھی پھر تدفین کی تقریب ختم ہوتے ہی وہ ڈاکٹر مرکس کے ساتھ کار کی طرف مڑ گئی تھی اور سوچ رہی تھی کہ وہ واقعی مر چکی تھی اس کی پچھلی زندگی ختم ہو چکی تھی اب اسے ایک نئے نام اور نئی پہچان کے ساتھ نئی زندگی کا آغاز کرنا تھا جہاں کی دنیا بہت مختلف تھی اور جس کا سمنتھا نیا نیا تجربہ کر رہی تھی اب وہ جہاں تھی وہاں کوئی کسی کا نہیں تھا کوئی کسی کے لیے محبت کا جذبہ محسوس نہیں کرتا تھا۔

جیسے ہی سمنتھا کی کار قبرستان سے روانہ ہوئی تھی جو کی نظروں نے اس کا تعاقب کیا تھا وہ حیران تھا کہ سمنتھا کی تدفین کی تقریب میں سیاہ کپڑوں میں ملبوس کون خاتون تھی جو اس فیملی سے اتنی قریب تھی کہ تدفین میں شرکت کے لیے آئی تھی اور جو اسے نہیں جانتا تھا جبکہ وہ سمنتھا کا بچپن کا ساتھی تھا یہ چیز اسے بے چین کر رہی تھی وہ سوچ رہا تھا کہ کیا وہ سمنتھا کی کوئی دوست تھی جو نیویارک سے آئی ہو تاکہ تدفین میں شرکت کرے یا اس کے ساتھ کام کرنے والی نرس؟

جو ہاتھ میں پکڑے پھول لے کر سمنتھا کی قبر کی طرف بڑھا اور پھول قبر پر رکھ دیئے اسے سمنتھا شدت سے یاد آ رہی تھی۔

⟡......☆......⟡

جیسے ہی سمنتھا نے انڈر گراؤنڈ ٹرین سے نیچے قدم رکھا اس نے اطمینان کا سانس لیا اس زمین دوز دنیا میں اسے سکون ملتا تھا اور وہ خود کو محفوظ سمجھتی تھی وہ اس وقت جس بڑے ہال میں داخل ہوئی تھی وہاں دیواروں پر نقش و نگار والی ٹائلز لگے تھے جو پرانے زمانے کے آرٹ کے نمونوں سے مزین تھے جس سرنگ سے گزر کر وہ ہال تک آئی تھی اس سے ایک دریا بھی گزرتا تھا' ڈاکٹر مرکس کے ساتھ کئی راہداریوں سے گزرتی وہ ایک دروازے کے سامنے رکی تھی اور اسی وقت اس کے کان میں موجود ڈیوائس سے آواز آئی تھی۔

''تم اندر آ سکتی ہو۔'' وہ لاشبہ ڈبرل کی آواز تھی سمنتھا کو یوں محسوس ہوا جیسے اس نے ایک وائرلیس ریڈیو ریسیور کی آواز سنی ہو' دروازہ ایک ہال میں کھلا تھا جہاں چھت میں ایک بڑا فانوس نصب تھا پھر ہال کا ایک دروازہ کھلا تھا اور ڈبرل مسکراتا ہوا شاہانہ انداز میں ہال میں داخل ہوا تھا۔

''اوہ ڈیر تمہیں دیکھ کر خوشی ہوئی۔'' ڈبرل نے کہا انداز ایسا ہی تھا جیسے وہ اپنے کسی ساتھی سے برسوں بعد ملا ہو۔

''ہم اس وقت کہاں ہیں؟'' سمنتھا نے پوچھا۔ ''ہم نے ونچھا سے اب تک ایک گھنٹہ کا سفر کیا ہے اور اتنے وقت کسی دور دراز علاقے تک تو نہیں پہنچا جاسکتا؟''

''ہم اس وقت ''میرے چیمبر'' میں ہیں یہ میرا ذاتی آفس ہے جو چیس پیک بے Chasapeake Bay میں واقع ہے۔

'یعنی گلف کے قریب؟'' سمنتھا نے حیرت سے کہا۔ ''میں سوچ بھی نہیں سکتی کہ ٹرین نے اتنا تیز سفر کیا ہے؟''

''میرا خیال ہے تم اپنے کام کا آغاز کرو۔'' ڈبرل نے سمنتھا کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے ڈاکٹر مرکس سے کہا پھر وہ سمنتھا کی طرف مڑا تھا۔

''ہم جہاں ہیں یہ جگہ ایک طرف الیگزینڈریا اور دوسری طرف واشنگٹن سے ملتی ہے۔''

''واشنگٹن سے؟'' سمنتھا نے حیرت سے کہا' اسے لگا جیسے اس کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا ہو اس کا دشمن اس سے بہت قریب تھا نارمن واشنگٹن ہی میں رہتا تھا۔

''ہاں تقریباً۔'' ڈبرل نے جواب دیا پھر اس نے بات کا رخ موڑ دیا تھا۔

''جیسا کہ تم جانتی ہو کہ اب سمنتھا بارلیٹ موجود نہیں ہے اور تم Elite کا حصہ بن چکی ہو اب تم ہماری ہو تمہارے کان میں موجود مائیکرو چپ ہمیں سیٹلائٹ کے ذریعے کسی بھی جگہ تمہاری موجودگی کا پتہ دے سکتی ہے۔''

''ہاں میں جانتی ہوں ڈاکٹر نے مجھے بتایا تھا۔''

''آئندہ کبھی گفتگو کے دوران میری بات مت کاٹنا۔'' ڈبرل نے غصے سے کہا۔

''سوری۔'' سمنتھا نے کہا اور اسے محسوس ہوا کہ وہ باقاعدہ ان کی قیدی بن چکی ہے وہ اسے اپنا معمول بنا چکے ہیں وہ اب ان کی ملکیت ہے۔

''مرکس تمہیں تمہاری ٹریننگ سے متعلق تمام کورسز کے بارے میں بتادے گا وہ تمہیں آنے والے آٹھ مہینوں میں مکمل ٹرینڈ کردے گا تمہارا ذہن اور جسم تربیت کے بعد پرفیکٹ ہوں گے اور اگر اس عرصے میں یہ مطمئن نہیں ہوا تو تمہاری ٹریننگ ختم کردی جائے گی۔'' ڈبرل نے کہا سمنتھا سر جھکائے سن رہی تھی۔

⟡......☆......⟡

صدر وارنر نیو میکسیکو اسٹیٹ میں ایک تقریب میں تقریر کررہا تھا وہ وائس پریذیڈنٹ نارمن کی دعوت پر وہاں آیا تھا وہ نارمن کو ان دنوں سے جانتا تھا جب وہ دونوں ہارورڈ یونیورسٹی میں زیر تعلیم تھے وہ دن ان کی زندگی کا بہترین سرمایہ تھے ان دنوں نارمن بھی مستقبل میں عالی شان زندگی کے خواب دیکھتا تھا دونوں کا ارادہ ملکی سیاست میں حصہ لینے کا تھا پھر ایک موقع پر اس نے جب گورنر کے عہدے کے لیے الیکشن میں حصہ لیا تب اس کی ملاقات سمنتھا کی والدہ سے ہوئی جسے اس نے اپنے جھوٹے عشق کا یقین دلایا اور ایک کمزور لمحے میں اس کی عزت سے کھیل بیٹھا پھر وہ واپس اپنی ریاست چلا گیا تھا کافی عرصے بعد وارنر نے اسے واپس بلایا اور اسے اپنے وائس پریذیڈنٹ کا عہدہ پیش کیا یہ ذمہ داری اس نے خوش اسلوبی سے ادا کی اور اب وہ دوبارہ یہ الیکشن لڑ رہا تھا اس تقریب میں بہت سخت حفاظتی انتظامات کیے گئے تھے وارنر مجمع سے خطاب کررہا تھا یہ تقریر وہ ڈرکن نارمن کے لیے کررہا تھا۔

''جیسا کہ آپ لوگوں نے دیکھا کہ ڈرکن وارنر نے اس اسٹیٹ کے لیے اپنی ذمہ داریاں خوش اسلوبی سے ادا کی ہیں انہوں نے اپنی اسٹیٹ میں معیشت کو ترقی دی ہے جس سے بہت زیادہ ملازمتیں لوگوں کو ملی ہیں' آپ کی فیملیز کو بہت سے مفادات حاصل ہوئے ہیں۔ آپ کے بچوں کے لیے اسکولوں میں فنڈ بڑھا کردیئے گئے ہیں اور میں نے خود نیو میکسیکو کے لوگوں کے لیے زیادہ فائدہ مند منصوبوں پر دستخط کیے ہیں' ڈرکن نارمن آپ کے مفاد میں اسی طرح کام کرتے رہنا چاہتے ہیں تاکہ سیکنڈ ٹرم میں بھی آپ انہیں اپنے ووٹ کے ذریعے منتخب کرکے خدمت کا موقع دیں' اسے میری پوری سپورٹ حاصل ہے اور میں اس کے لیے دعاگو ہوں۔'' وارنر کچھ دیر کے لیے رکا پھر اس نے مجمع پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالی لوگ نارمن کے حق میں نعرے لگا رہے تھے۔

''مجھے امید ہے کہ آپ ڈرکن نارمن کو دوبارہ خدمت کا موقع دیں گے اور نیو میکسیکو کو امریکہ بھر میں روشنی کا سرچشمہ بنادیں گے شکریہ۔'' وارنر نے تقریر ختم کی تو مجمع نارمن کے حق میں پھر نعرے لگانے لگا فوٹو گرافر تصویریں بنا رہے تھے نارمن خوش نظر آرہا تھا۔

''میں اس تقریر کے لیے تمہارا شکر گزار ہوں وارنر۔'' نارمن نے دوستانہ انداز میں کہا۔ ''تم نے ہارورڈ میں بھی ہمیشہ اپنی دوستی کا ثبوت دیا میں چاہتا ہوں تم ڈنر میں بھی شرکت کرو۔''

''میں مجبور ہوں ڈنر میں شرکت نہیں کرسکتا مجھے واپس D.C پہنچنا ہے وہاں کچھ ذمہ داریاں میری منتظر ہیں۔''

''میں جانتا ہوں۔'' نارمن نے کہا اسی وقت کئی سمتوں سے فائرنگ شروع ہوگئی اور کئی لوگ زمین پر ڈھیر ہوگئے سیکورٹی گارڈز نے نارمن اور وارنر کو اپنے حلقے میں لے کر وہاں سے نکال لیا تھا اور قریبی بلڈنگ میں لے گئے تھے۔

⟡......☆......⟡

سمنتھا کو ٹریننگ کرتے ہوئے تین ماہ گزر گئے تھے ڈاکٹر مرکس ہر وقت اس کے دماغ میں یہی بات گھساتا رہا تھا کہ میں مرچکی ہے...... سمنتھا مرچکی ہے۔

''تو پھر میں کون ہوں؟'' ایک دن سمنتھا نے اس سے پوچھا۔

''ایک مشین۔'' ڈاکٹر مرکس نے سرد مہری سے کہا۔ ''صرف ایک مشین...... جسے میں جنم دے رہا ہوں' اس کی تربیت کررہا ہوں۔''

''تمہیں بیڈ پر جانے سے پہلے تین مشقیں اور کرنا ہیں پھر رات کا کھانا ملے گا اور اس کے بعد تم سو سکو گی۔'' ڈاکٹر مرکس نے کہا۔

''مجھے کھانے کی پروا نہیں ہے لیکن میں سونا چاہتی ہوں۔'' سمنتھا نے کہا۔

''نہیں آج رات تم نہیں سوگی ابھی بہت کام باقی ہے۔''

''میری بات سنو۔'' سمنتھا کو اچانک غصہ آ گیا تھا۔ ''میں تم سے تنگ آ گئی ہوں اور تمہاری رات بھر کی ٹریننگ کی مشقوں سے بھی...... تین مہینے سے میں دن رات مشقیں کررہی ہوں اور کبھی شکایت نہیں کی لیکن میری نیند پوری نہیں ہوئی' میں تنگ آ چکی ہوں۔'' سمنتھا نے کہا اور ڈاکٹر مرکس کے جواب کا انتظار کیے بغیر کمرے سے نکل گئی اس کو اپنے پیچھے ڈاکٹر مرکس کے ہنسنے کی آواز سنائی دیتی رہی تھی۔

دوسری صبح اس کی آنکھ کان میں لگے چپ کی آواز سے کھلی تھی اس کے کان کی لو اتنی گرم ہورہی تھی جیسے آگ سے جل گئی ہو۔

''ڈبرل...... خدا تمہیں پوچھے۔'' وہ غصے سے چیخی اور وائٹ ہاؤس ہسٹری پر لکھی گئی ایک کتاب اٹھا کر دروازے پر دے ماری' اسے یہ کتابیں بھی ڈبرل کے کہنے پر پڑھنا پڑتی تھیں اور وہ یہ سمجھنے سے قاصر تھی کہ آخر نارمن کو اس کے انجام تک پہنچانے کے لیے وائٹ ہاؤس ہسٹری پڑھنا کیوں ضروری ہے۔

''تم آخر مجھ سے کیا چاہتے ہو۔'' اس نے کہا وہ جانتی تھی کہ اس کی آواز ڈبرل بخوبی سن سکتا تھا۔

''تمہیں جو کام کرنا ہے اس میں آرام نہیں ہے فوراً میرے چیمبر میں پہنچو۔'' ڈبرل نے تحکمانہ انداز میں کہا اور سمنتھا روبوٹ کی طرح تیار ہوکر کمرے سے نکل گئی۔

ذبرل کے آفس میں ڈاکٹر مرکس بھی موجود تھا جس کے ہونٹوں پر زہریلی مسکراہٹ تھی' سمنتھا سمجھ گئی تھی کہ

اس نے پچھلی رات کی شکایت ڈبرل سے ضرور کی ہوگی۔

''تم نے کل رات ڈاکٹر مرکس کی ہدایت پر عمل نہیں کیا اور سونے سے پہلے اپنی رات کی مشقیں پوری نہیں کیں کیا تم چاہتی ہو کہ میں تمہیں سزا دوں؟ تم جانتی ہو کہ تمہارے کان میں لگے ہوئے چپ کے ذریعے میں تمہیں کیسی سزا دے سکتا ہوں۔'' اس نے دھمکی دی اور سمنتھا کانپ گئی' کیونکہ اسے اس سزا کا تجربہ ہو چکا تھا جب اس چپ کو ایکٹویٹ کر کے ڈبرل سمنتھا کے سر میں اور بازو میں شدید درد پیدا کر سکتا تھا' جس سے وہ تڑپ اٹھتی تھی اور اس کی حکم عدولی کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔

''تم بھول رہے ہو میں سمنتھا ہوں سمنتھا بارلیٹ جس کی حفاظت کی ذمہ داری میرے والدین نے تمہیں سونپی تھی۔'' سمنتھا نے کہا۔

''پہلی بات تو یہ ہے کہ تم اب سمنتھا بارلیٹ نہیں ہو وہ مر چکی ہے اسے دفن کر دیا گیا تمہیں ہم نے نئی زندگی دی ہے اب تمہارا نام الیگزینڈر رہا ہے تم امریکی شہری نہیں اب تم روسی شہریت رکھتی ہو تمہیں جلد ہی اپنی ٹریننگ کے ساتھ ساتھ روسی زبان بھی سیکھنا ہوگی اور ڈاکٹر مرکس اپنی بہترین صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے تمہیں ایک خوبصورت روسی دوشیزہ بنا دیں گے تمہارے نقوش تمہارے خدوخال تمہاری بول چال حد تو یہ کہ تمہارے جسم کی رنگت بھی تبدیل کر دی جائے گی تم خود کو کبھی بھی سمنتھا نہیں کہو گی اگر زندہ رہنا چاہتی ہو۔''

''میرا مقصد اس تنظیم میں شرکت کرنا اس لیے تھا کہ میں وائس پریذیڈنٹ سے اپنی ماں کا انتقام لے سکوں یہ سب کچھ کیے بغیر بھی انتقام لیا جا سکتا ہے میں جانتی ہوں تمہارے ذرائع کتنے ہیں تم لوگ جس جگہ چاہو اور جب چاہو پہنچ سکتے ہو۔''

''بس' میں کسی کو اتنی بات کرنے کی اجازت نہیں دیتا ہم جو کچھ کر رہے ہیں اس کے کچھ مقاصد ہیں اور ہم ہر بات کے لیے تمہیں جواب دہ نہیں ہیں تمہیں بھی کوئی سوال کرنے کی اجازت نہیں۔'' ڈبرل نے ناگواری سے کہا اور پھر ڈاکٹر مرکس کو اشارہ کیا کہ وہ سمنتھا کو وہاں سے لے جائے۔

''مجھے دوبارہ شکایت نہ ملے کہ تم نے ڈاکٹر مرکس کی حکم عدولی کی ہے تم نے Elite میں شمولیت کی ہے اور تم اس کے قواعد و ضوابط پر عمل کرنے کی پابند ہو۔'' ڈبرل نے کہا اور ہاتھ سے انہیں جانے کا اشارہ کیا۔

کچھ دیر بعد وہ ڈاکٹر مرکس کے سامنے اس کی لیب میں کھڑی تھی اس کے چہرے پر پریشانی نمایاں تھی۔

''جب تم لوگ مجھے ملے تو مجھے یوں لگا جیسے میں کچھ محفوظ ہاتھوں میں پہنچ گئی ہوں لیکن میری یہ زندگی تو میرے لیے سوہان روح بن گئی ہے۔

''تم ڈرکن نارمن سے انتقام لینا چاہتی ہو؟'' ڈاکٹر مرکس نے کہا۔

'بالکل لینا چاہتی ہوں۔''

''تو کیا تم اصلی شکل میں رہ کر یہ کام کر سکو گی؟ جبکہ سب تم سے واقف ہیں انہوں نے اپنی طرف سے تو تمہیں موت کی نیند سلا دیا ہے لیکن اگر پھر تم اسی طرح منظر عام پر آئیں تو وہ دوبارہ سرگرم ہو جائیں گے اور تمہارے لیے کہیں پناہ نہ ہوگی اس لیے ڈبرل کے مشورے پر عمل کرنا بے حد ضروری ہے تمہارا حلیہ بدل جانے کے بعد تمہارا منظر عام پر ایک نئی شناخت کے ساتھ آنا تمہاری کامیابی کے دروازے کھول دے گا' ڈبرل کے پاس بہت ذرائع ہیں وہ تمہیں ڈائریکٹ وائس پریذیڈنٹ سے متعارف کرائے گا چند ملاقاتوں میں اسے اعتماد میں لینا اور پھر تمہارا کام آسان ہو جائے گا۔'' ڈاکٹر مرکس نے اسے سمجھایا۔

''نارمن سے انتقام لینے کے لیے میں کچھ بھی کر سکتی ہوں۔'' سمنتھا نے زیر لب کہا۔

''نارمن اپنی وائس پریذیڈنٹ کی مدت پوری کر چکا ہے اور اب دوبارہ اگلے پانچ سال کے لیے اسی عہدے کے لیے الیکشن میں حصہ لے رہا ہے' صدر وارنر اسے سپورٹ کر رہا ہے۔ وہ اس کا بچپن کا دوست ہے' ہماری پلاننگ ہے کہ تمہیں بالکل تمہاری ماں کی طرح نارمن سے متعارف کرایا جائے تم امریکا میں رہنے والی روسی شہری ہوگی اور نارمن کی انتخابی مہم میں شرکت کے دوران تمہارا تعارف اس سے ہوگا پھر تمہیں اپنی مہارت دکھانا ہوگی اور اس سے اس حد تک قریب ہونا ہوگا کہ تم تنہائی میں اس پر کاری وار کر سکو۔''

''میں کوشش کروں گی کہ اس مقصد میں کامیاب ہو سکوں۔'' سمنتھا نے کہا جس کے بعد اس کی اس دن کی مشقوں کا آغاز ہو گیا تھا۔

رات کو جب وہ اپنے بیڈ پر لیٹی تو اس کے ذہن میں پچھلی یادیں گھوم رہی تھیں اس کے والدین کی محبت' اس کی نانی کی بہترین توجہ اور جو کی بے تکلفی اور پیار...... وہ کچھ بھی نہیں بھولی تھی اس کے والدین اور نانی اس دنیا سے رخصت ہو چکے تھے لیکن جو موجود تھا وہ اس سے پیار کرتا تھا لیکن وہ بھی اس کی تدفین کے وقت قبرستان میں موجود تھا سمنتھا نے ایک نظر اسے دیکھا تھا وہ بہت اداس تھا جو کا خیال آتے ہی اس کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا اسے جو کے ساتھ گزارے ہوئے بچپن کے دن یاد آنے لگے جب وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر سمنتھا کے کنساس کے گھر کے لان میں گھنٹوں کھیلتے رہتے تھے اس کی نانی جو سے بہت خوش تھیں کیونکہ وہ سمنتھا کا واحد دوست تھا اس کا جی چاہا کہ کسی طرح وہ ساری دوریاں پار کر کے جو کے پاس پہنچ جائے لیکن وہ جانتی تھی کہ ایسا ممکن نہیں ہے اور شاید اب کبھی بھی ایسا نہ ہو سکے۔

☆

سمنتھا کے گھر کے دھماکے اور اس کی موت اور تدفین کے بعد جو کے چہرے سے مسکراہٹ روٹھ گئی تھی وہ دوستوں کی گفتگو میں بھی حصہ نہیں لیتا تھا اس کا زیادہ وقت دفتر کی فائلوں کی ورق گردانی میں گزرتا تھا اس نے سمنتھا کے تباہ شدہ گھر کے کئی چکر لگائے تھے' کوئی چیز تھی جو اسے پرسکون نہیں ہونے دیتی تھی اس کا بس نہیں چلتا تھا کہ وہ اس گھر کے کھنڈرات میں سے جیتی جاگتی سمنتھا کو نکال لے اس نے کیس کی فائل بند ہو جانے کے باوجود بھی اپنی تحقیقات جاری رکھی تھی وہ جاننا چاہتا تھا کہ سمنتھا کے گھر میں دھماکا کس نے کیا تھا اور اس کے پیچھے کیا وجوہات تھی پھر جو چیز اسے زیادہ پریشان کر رہی تھی وہ سمنتھا کی لاش کا نہ ملنا تھا' وہ حیران تھا کہ سمنتھا کہاں غائب ہو گئی تھی' سمنتھا کی باقیات جو دفنائی گئی وہ بھی اس نے نہیں دیکھی تھیں شروع میں اس کے چیف اسنو نے اس کی مخالفت کی تھی لیکن پھر جو نے اسے قائل کر لیا تھا اور اس نے جو کو اپنے اسسٹنٹ بل کے ساتھ مل کر خاموشی سے سمنتھا کی موت کی تحقیقات کی اجازت دے دی تھی۔ پھر سمنتھا کی موت کے بعد مسٹر ایڈی کی موت اور کاسٹر کی موت نے اسے چونکا دیا تھا مسٹر ایڈی سمنتھا کے خاندانی وکیل تھے اور کاسٹر اس کنسٹرکشن کمپنی کا مالک تھا جس نے سمنتھا کے گھر کی تعمیر کی تھی جو کو ان تینوں اموات کے تانے بانے ملتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔ سمنتھا کو بم دھماکے میں مارا گیا تھا اور مسٹر ایڈی اور کاسٹر کو گولیوں کا نشانہ بنایا گیا تھا۔

جو نے احتیاطی تدبیر کے طور پر اپنے اسسٹنٹ بل کو ہدایت کر دی تھی کہ وہ تحقیقات کے دوران کسی بھی قسم کی معلومات کو تحریری شکل نہیں دے گا کیونکہ اس طرح کوئی اور ان کی تحقیقات تک پہنچ سکتا ہے اس نے ہدایت کی تھی کہ وہ تمام معلومات اپنے ذہن میں محفوظ رکھے گا اور بالمشافہ ملاقات میں ہی جو کو بتائے گا ایسی ہی ایک ملاقات کے دوران جب بل اسے کچھ معلومات دے رہا تھا تب وہ ایک ریستوران مین بیٹھے تھے جو نے محسوس کیا کہ ریستوراں میں کچھ اجنبی اور ناپسندیدہ قسم کے افراد موجود تھے صرف شک کی بنا پر جو نے بل کو وہاں سے اٹھنے کا اشارہ کیا وہ ریستوران سے نکل کر چند قدم آگے ہی گئے تھے کہ اچانک ان کے عقب سے ایک تیز دھماکے کی آواز آئی جو نے پلٹ کر دیکھا تو ریستوراں سے شعلے بلند ہو رہے تھے اور لوگ افراتفری کے عالم میں وہاں سے باہر نکل رہے تھے باہر کھڑی کئی کاروں کے شیشے ٹوٹ گئے تھے جو نے فوراً اپنے چیف اسنو کو اپنے فون پر اس واقعے کی اطلاع دی۔

''ٹھیک ہے جو احتیاط سے کام کرو اس حادثے کا مطلب ہے کہ تم دشمن کی نظر میں آ چکے ہو کوئی اس بات سے واقف ہو چکا ہے کہ تم سمنتھا کی موت کی تحقیقات کر رہے ہو تمہیں چاہیے کہ تم اپنے سیل پر مختصر بات کرو اور کسی پبلک بوتھ سے مجھ سے رابطہ کرو فوراً اپنا فون بند کردو۔''

''اوکے'' جو نے کہا اور فون بند کر دیا اس دھماکے کے بعد اسے یقین ہو گیا تھا کہ نا صرف اس کی تحقیقات درست ہیں بلکہ وہ صحیح سمت میں جا رہا تھا اور دشمن کے لیے خطرہ بن گیا ہے اس نے بل کی طرف دیکھا تھا جسے معمولی خراشیں آئی تھیں اور اسے فوراً وہاں سے چلے جانے کا کہا تھا پھر وہ

بھی مختلف چھوٹی چھوٹی گلیوں سے گزرتا ہوا کافی دیر تک شہر میں چکراتا رہا تھا اور جب اسے یہ یقین ہوگیا تھا کہ اس کا تعاقب نہیں کیا جارہا ہے تو وہ ایک لمبا چکر کاٹ کر اس جگہ پہنچا تھا جہاں اس نے اپنی کار کھڑی کی تھی پھر اطراف کا جائزہ لینے کے بعد وہ اپنی کار میں بیٹھ کر وہاں سے روانہ ہوگیا تھا وہ اپنے گھر جانے کی حماقت نہیں کرنا چاہتا تھا کیونکہ اس کے گھر اور اس کے دفتر میں اس کے دشمن اس تک با آسانی پہنچ سکتے تھے اس کو اب ایک ایسے ہوٹل کی تلاش تھی جہاں اس کے دشمنوں کا خیال بھی نہ پہنچ سکے پھر شہر سے باہر اس نے ایک مضافاتی علاقے میں پانچ منزلہ ہوٹل کا انتخاب کیا تھا جس کے زمین دوز کار پارکنگ میں اس نے اپنی کار پارک کی تھی اور اپنے کمرے میں پہنچ گیا تھا جو اس نے فون پر ہی بک کرایا تھا۔

اس ہوٹل میں پہنچنے کے بعد وہ اپنے دشمنوں سے تو دور ہو ہی گیا تھا لیکن وہ اپنے ونچیلا کے دوستوں سے بھی دور ہوگیا تھا اس وقت اسے مستقبل کی فکر تھی کہ اب اسے کیا کرنا ہے وہ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر اپنے دشمنوں کو ان کے انجام تک پہنچانے کا منصوبہ بنانا چاہتا تھا اسی وقت اس کی جیب میں موجود سیل فون کی گھنٹی بجی دوسری طرف سے پھر اس کا چیف بول رہا تھا۔

''مجھے خوشی ہے کہ تم ریسلنگ میچ سے باہر نکل گئے ہو۔'' چیف نے کہا اور ریسلنگ میچ کے لفظ کا مطلب سمجھ کر جو کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی اس کے چیف کا مطلب ''دھماکے'' سے تھا۔

''میں ہمیشہ ہی ریسلنگ میچ سے باہر رہنے کی کوشش کرتا ہوں جناب۔'' جو نے اس کے انداز میں جواب دیا۔ فون کی لائن کھلی مت رکھنا میں نہیں جاننا چاہتا کہ تم کہاں ہو میں بھی تمہارا لوجیک سگنل آف کر دیا ہے اس وقت تک جب تک تم خود مجھے کوئی تفصیل بتانا نہ چاہو میرے لیے یہ جاننا کافی ہے کہ تم محفوظ ہو کیا تمہیں کوئی سراغ ملا؟''

''جی ہاں جناب۔''

''یہ جان کر خوشی ہوئی اب سے تمہیں ایک اچھے فوجی کی طرح کام کرنا ہے اور کبھی بھی ایک جگہ قیام مت کرنا۔''

''سر؟''

''اب تم نشانے پر ہو وہ تمہیں ڈھونڈنے کے موبائل سگنل کے علاوہ بھی بہت سے ذرائع رکھتے ہیں' اگر تم محتاط نہیں ہوگے تو جلد ہی مشکل میں پھنس جاؤ گے چنانچہ اپنے اطراف پر نظر رکھنا اور دشمن کی بو سونگھتے رہنا میری بات سمجھ گئے؟''

''یس سر!'' جو نے کہا اور جیسے ہی لائن آف ہوئی اسے لگا جیسے اس کی ریڑھ کی ہڈی میں سردی کی لہر دوڑ گئی ہو۔

پھر جو نے تین دن میں چار ہوٹل تبدیل کیے تھے وہ اپنی تحقیقات کے دوران اس بات تک تو پہنچ گیا تھا کہ اس کے دشمنوں کے ٹھکانے اس شہر میں زمین دوز ہیں لیکن ان تک پہنچنے کے راستوں سے وہ واقف نہیں تھا اس کے علاوہ بھی اس پر بہت سے انکشافات ہوئے تھے جن میں سے کچھ کی سچائی جاننے کے لیے وہ کام کر رہا تھا وہ اب تک ونچیلا میں سمنتھا کے گھر میں بنے تہہ خانے اور سرنگ کو نہیں بھولا تھا اور اس کی معلومات میں آیا تھا کہ ایسی بہت سی سرنگیں لندن میں بھی موجود ہیں جو دوسری جنگ عظیم کے دوران نازیوں نے بنائی تھیں اور بہت ممکن تھا کہ جنگ کے بعد ان سرنگوں کو امریکا تک طویل کر دیا گیا ہو کیونکہ دوسری جنگ عظیم کے بہت سے مجرم ان کے ذریعے فرار بھی ہوئے تھے یہ سب معلومات اسے دوسری جنگ عظیم کے ریکارڈ سے ملی تھیں۔ اس رات جب وہ سونے کے لیے لیٹا تو اسے پھر وہی خواب نظر آیا جو ہمیشہ نظر آتا تھا۔

وہ سرنگ میں موجود تھا اور ہتھوڑی سے سرنگ کا بند راستہ کھولنے کی کوشش کر رہا تھا اس کے بازو شل ہو چکے تھے ٹوٹنے والے کنکریٹ کی کرچیاں اسے لگ رہی تھیں پھر بند دیوار میں ایک سوراخ ہوگیا تھا اور سمنتھا کے چیخنے کی آوازیں اس کے کانوں سے ٹکرانے لگی تھیں وہ کسی کو مدد کے لیے پکار رہی تھی اس نے ہمیشہ کی طرح ہتھوڑا پھینک دیا اور اپنے ہاتھوں سے ہی سیمنٹ ہٹانے لگا اس کے ہاتھ زخمی ہوگئے اور ان سے خون بہنے لگا جب دیوار کا سوراخ اتنا بڑا ہوگیا کہ وہ اس میں سر ڈال کر دوسری طرف دیکھ سکے تو اس نے سوراخ میں جھانک کر سمنتھا کو آواز دی۔

''سمنتھا!'' لیکن ہمیشہ کی طرح اسے دیر ہو چکی تھی دیوار کے دوسری طرف موجود کھائی میں سمنتھا گرتی چلی گئی تھی اور اس کی آواز آہستہ آہستہ معدوم ہوگئی تھی پھر سرنگ کی دیوار بھی ہمیشہ کی طرح اس کے گلے کے گرد تنگ ہوگئی تھی جس سے آزاد ہونا اس کے لیے ممکن نہیں تھا' اور اسے سمنتھا کی معدوم ہوتی ہوئی چیخیں سنائی دے رہی تھیں۔

دوسری صبح جب وہ سو کر اٹھا تو اسے اپنا رات کا خواب اچھی طرح یاد تھا سمنتھا کی چیخیں اب بھی اس کے ذہن میں گونج رہی تھیں اور اچانک اس کے ذہن میں خیال آیا تھا کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ اس کے دشمنوں نے اسے اغوا کر لیا ہو یا وہ ان کے ساتھ اپنی مرضی سے گئی ہو لیکن یہ محض خیال تھا اس کی وضاحت کے لیے اس کے پاس کوئی ثبوت نہیں تھا اچانک دروازے کی بیل بجی تھی جو نے چونک کر گھڑی کی طرف دیکھا تھا' صبح کے تین بجے تھے اسے اچھی طرح یاد تھا کہ اس نے کھانے کا آرڈر نہیں دیا تھا وہ چوکنا ہوگیا اس نے اپنا پستول نکالا اور کمرے کے دروازے کے سوراخ سے باہر جھانکا سامنے ہی کھانے کی ٹرالی پڑی تھی لیکن وہاں کوئی موجود نہیں تھا جو نے آہستہ سے دروازہ کھولا اور اسے ایک ہلکی سی کلک کی آواز سنائی دی وہ تیزی سے پلٹا تھا اور باتھ روم میں جا کر اس کا دروازہ بند کرتے ہوئے نہانے کے ٹب میں گر گیا تھا دوسرے ہی لمحے زوردار دھماکا ہوا تھا اور باتھ روم کا دروازہ ٹوٹ کر ٹب کے اوپر آگرا تھا اس طرح بن جانے والے تابوت نے اس کی جان بچالی تھی۔

جو تیزی سے اٹھا تھا' دروازے کو اپنے اوپر سے اٹھاتے ہوئے اس نے اپنی گن ڈھونڈی تھی اور پھر ایک تولیہ بھگو کر اپنے چہرے کے گرد لپیٹا تھا کیونکہ کمرے میں دھواں اور آگ کے شعلے ناچ رہے تھے' اس نے کمرے کی پچھلی جانب کھلنے والی کھڑکی کھولی تھی اور باہر چھلانگ لگادی تھی کہیں سے کسی نے فائر کیا تھا گولی اس سے کچھ ہی فاصلے سے گزری تھی اور جو نے خود کو تیزی سے خودرو جھاڑیوں میں چھپا دیا تھا وہ اندھیرے میں آنکھیں پھاڑے دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا اس کے دشمن بہت چالاک تھے وہ اس تک پہنچنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے تھے وہ ہر حالت میں اس سے نجات حاصل کرنا چاہتے تھے لیکن کیوں؟ یہی بات جو معلوم کرنا چاہتا تھا۔

کافی دیر خاموشی رہی تھی تو جو نے آہستہ آہستہ جھاڑیوں میں حرکت کی تھی اور باہر کھلی فضا میں آنا چاہا تھا اسی وقت پھر لگا تار کئی فائر ہوئے تھے لیکن جو رکا نہیں تھا وہ زمین پر رینگتا ہوا کار پارکنگ تک آیا تھا لیکن اس نے اپنی کار تک جانے کی حماقت نہیں کی تھی بلکہ وہ دوسری کاروں کے دروازے بڑی خاموشی سے چیک کر رہا تھا پھر ایک کار کا دروازہ اسے کھلا مل گیا تھا اور وہ ڈرائیونگ سیٹ پر جھک کر بیٹھ گیا تھا چابی کے بغیر اس نے انجن کے تاروں کو ٹچ کرکے کار اسٹارٹ کی تھی اور سیٹ پر سیدھا بیٹھا تھا اسی وقت فائرنگ دوبارہ شروع ہوگئی تھی جو نے کار کو ریورس میں ڈالا تھا اور پھر تیزی سے پیچھے کی طرف ڈرائیونگ کرتا ہوا کار کو ہائی وے پر لے آیا تھا اسی وقت کار پارکنگ میں موجود اس کی کار میں دھماکا ہوا تھا اور آگ لگ گئی تھی جس کے شعلوں کی روشنی میں دور دور تک منظر صاف نظر آرہا تھا۔

⟡......☆......⟡

آٹھ ماہ بعد سمنتھا کی ٹریننگ مکمل ہوتے ہی ڈبرل نے بڑے ڈرامائی انداز میں اس کی ملاقات ڈرکن نارمن سے کروادی تھی اسے Elite ہی کی ایک لڑکی نے نارمن سے ملوایا تھا جو اس کی انتخابی مہم کا پہلے سے حصہ تھی اور سمنتھا اپنی ٹریننگ اور اپنے حسن کی بدولت چند ہی ملاقاتوں میں نارمن کو اپنا گرویدہ بنا چکی تھی وہ اکثر نارمن سے اس کی ذاتی رہائش گاہ پر ملنے جاتی تھی نارمن کے سیکورٹی گارڈ بھی اس کی اہمیت سے واقف ہو چکے تھے چنانچہ اس کے کسی بھی وقت آنے جانے پر کوئی پابندی نہیں تھی۔

گرمیوں کی چھٹیاں گزارنے کے لیے جب ڈرکن نارمن صدر وارنر کے ساتھ کیمپ ڈیوڈ گیا تو اس کی بیوی کی جگہ سمنتھا ہی الیگزینڈریا کے روپ میں اس کے ساتھ تھی اور وہ سوچ رہی تھی کہ کیا ڈبرل کی رسائی یہاں بھی ممکن تھی؟ ایک لمحے کو اس کے دل میں خیال آیا تھا کہ وہ نارمن کی بے خبری میں اسے ہلاک کرکے یہاں سے فرار ہو جائے لیکن یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ اس کے سیکورٹی گارڈ کی نظروں سے پوشیدہ رہے حالانکہ اس نے ایک کار کے اگنیشن میں چابیاں لگی چھوڑ دی تھیں دوسرے ہی لمحے اسے اپنے کان میں لگے ایئر چپ کا خیال آیا تھا جس کی وجہ سے بھی اس کا فرار ممکن نہیں تھا Elite کے لوگ اسے کسی ایسے کتے کی طرح ڈھونڈ نکالتے جیسے ایک کتا لومڑیوں کے شکار میں

اپنے شکار کو جا دبوچتا ہے وہ ایک گھنٹے کے اندر اندر اسے ڈھونڈھ کر اس کے کان میں لگے چپ کو کسی بم کی طرح پھاڑ سکتے تھے جس سے اس کا سر اس کے جسم سے ایسے الگ ہو جاتا جیسے کسی خودکش بمبار کا سر ہو جاتا ہے اس خیال سے ہی اس کے جسم میں جھرجھری سی پیدا ہوئی تھی۔

وہ نارمن کے کمرے میں موجود تھی اس وقت نارمن نیند کے مزے لے رہا تھا اور نیند سمنتھا کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی وہ کھڑکی کے پاس کھڑی دور اندھیرے میں سر اٹھائے لمبے لمبے درختوں کی قطار کو دیکھ رہی تھی وہ جانتی تھی کہ اس اندھیرے میں درختوں کے پیچھے کہیں نہ کہیں Elite کے لوگ بھی موجود ہوں گے جن کی نظریں ادھر ہی لگی ہوں گی اس نے سوچا کہ اگر Elite کے لوگ نارمن کو مارنا چاہتے ہیں تو ان کے لیے بہت اچھا موقع ہے کہ وہ سمنتھا کے کان میں لگے چپ کی مدد سے ایک ہی وقت میں دونوں کو ختم کر دیں لیکن انہوں نے سمنتھا کو چارے کے طور پر استعمال کیا ہے اس کی بھی کوئی وجہ ہو گی اس کا دل چاہا کہ وہ خود یہ کام کر گزرے اور نارمن کے ساتھ خود کو بھی ختم کر لے لیکن شاید اس میں اتنی ہمت نہیں تھی۔

''الیگزینڈریا!'' نارمن نے اسے پکارا اور وہ چونک کر اس کی طرف مڑی وہ خوابیدہ آنکھوں سے اسے دیکھ رہا تھا اور وہ اب بھی یہی سوچ رہی تھی کہ اگر اس نے نارمن کا کام تمام کر دیا تو وہ یہاں سے کیسے فرار ہو گی اور جب نارمن ختم ہو جائے گا تو Elite کے لیے اس کی اہمیت بھی ختم ہو جائے گی۔

''کیا بات ہے؟ کیا تم پریشان ہو؟'' نارمن نے دوبارہ پوچھا اور وہ آہستہ آہستہ چلتی اس کے بیڈ کے قریب آ گئی پھر وہ اس کے پاس بیٹھ گئی تھی چاند کی روشنی نارمن کے چہرے پر پڑ رہی تھی اور وہ اس کی طرف دیکھ رہا تھا سمنتھا نے سوچا کیا کبھی نارمن نے اس کی ماں کی طرف بھی اسی طرح دیکھا ہو گا؟

''کیا تم اپنی بیوی سے محبت کرتے ہو؟'' سمنتھا نے پوچھا لیکن نارمن نے جواب نہیں دیا۔

''میں نے محسوس کیا ہے کہ تم دونوں ایک دوسرے کو نہیں چاہتے۔''

''تم یہ کیسی باتیں کرنے لگیں الیگزینڈریا' بھلا اس سے تمہارا کیا تعلق؟''

''کیا تم نے اپنی زندگی میں واقعی کبھی کسی عورت سے محبت کی ہے؟'' سمنتھا نے پھر پوچھا۔

''تم ٹھیک تو ہو؟ کیسی بہکی بہکی باتیں کر رہی ہو؟''

''میں جاننا چاہتی ہوں کیا واقعی تم نے کبھی پیار کیا ہے؟ سچا پیار؟''

''کیا تم سنجیدہ ہو؟'' نارمن نے پوچھا۔

''ہاں۔''

''ہاں' میری زندگی میں ایک عورت آئی تھی۔'' نارمن نے اداسی سے کہا۔ ''لیکن ہماری ملاقات بہت دیر سے ہوئی تھی۔''

''کیا ہوا تھا؟''

''میں بھی شادی شدہ تھا اور وہ بھی شادی شدہ تھی اور میرے سامنے میری پوری سیاسی زندگی تھی اگر میں اس وقت عقلمندی کا مظاہرہ نہ کرتا تو میرا کیریئر تباہ ہو جاتا۔''

''تم نے اپنے پیار پر اپنے کیریئر کو ترجیح دی؟'' سمنتھا نے کہا وہ اپنا غصہ چھپانے کی پوری کوشش کر رہی تھی۔

''ہاں؟ اور میرا یہ فیصلہ ساری زندگی مجھے دکھ دیتا رہا ہے۔''

''کیوں؟ تم نے اپنی مرضی سے فیصلہ کیا ہو گا نا؟''

''ہاں لیکن مجھے دکھ ہے کہ میں کبھی اپنی بیٹی سے نہیں مل سکا۔'' نارمن نے کہا وہ اٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔

''پھر تمہاری موجودہ بیوی سے تمہارے بچے نہیں ہوئے؟''

''وہ کبھی بچوں کی تمنا نہیں رکھتی تھی۔''

''تو جب تم اپنی بیوی سے محبت نہیں کرتے تو اس سے شادی کیوں کی؟''

''اس کا تعلق ایک اچھی فیملی سے ہے اس کے بہت لوگوں سے اچھے تعلقات ہیں اس کا باپ مجھے پسند کرتا تھا اور حالات نے ہمیں ملا دیا۔''

''میں شرط لگا سکتی ہوں کہ وہ خوشی سے کنساس نہیں آئی ہو گی؟'' سمنتھا نے مزید کریدا۔

''میں نے اسے بہت مجبور کیا تھا۔'' نارمن نے کہا اور سمنتھا نے اندازہ لگایا کہ وہ اس کی ماں کی محبت میں کنساس آیا ہو گا لیکن وہ یہ سوال پوچھ نہیں سکتی تھی کیونکہ وہ اپنی شنا

خت اس سے چھپا رہی تھی۔

''بس وہی عورت تھی جس سے میں نے محبت کی تھی۔'' نارمن نے کہا اور سمنتھا نے اثبات میں سر ہلایا۔

''اس کی آنکھیں گہری سیاہ تھیں جو زندگی کی چمک سے لبریز تھیں۔ اس کے بال اخروٹ جیسی رنگت کے تھے اس کے چہرے پر اداسی چھائی رہتی تھی۔'' نارمن اپنے ہی خیالات میں مگن بول رہا تھا۔ ''اس نے کنساس میں میری ایک انتخابی مہم میں کام کیا تھا میں اس وقت گورنر کا الیکشن لڑ رہا تھا اور ہم ایک بس کے سفر پر گئے تھے تب ہی...... تب ہی۔'' وہ کہتے کہتے رک گیا اور سمنتھا سوچ رہی تھی کہ وہ کتنا بدنصیب ہے کہ بغیر کسی کے پیار کے زندگی گزار رہا ہے۔ اس کی زندگی کا کوئی مقصد نہیں اس کی قسمت میں کوئی فیملی نہیں' کوئی اولاد نہیں اور یہ بھی اس کی بدقسمتی ہے کہ وہ اسے دیکھ رہا ہی اس سے باتیں کر رہا ہے اور یہ نہیں جانتا کہ وہ اس کی بیٹی ہے جسے دیکھنے کی حسرت اس کے دل میں ہے۔

''پھر اس عورت اور تمہاری بیٹی کا کیا ہوا؟'' سمنتھا نے پوچھا۔

''وہ دونوں مر گئیں۔'' نارمن نے اداسی سے کہا اور اس کی آواز میں بے انتہا کرب تھا اور آنکھوں میں آنسو جھلملا رہے تھے اچانک سمنتھا کو احساس ہوا کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ اسے جو خط اپنی ماں کی قبر کے کتبے کے نیچے سے ملا تھا وہ جعلی ہو اس کی ماں کی طرف سے نہ رکھا گیا ہو بلکہ کسی اور نے اسے غلط رستے پر ڈالنے کے لیے لکھا ہو اس کا مطلب تھا کہ اس خط میں موجود باتیں بھی غلط ہوسکتی تھیں اسے نارمن سے ہمدردی محسوس ہونے لگی اور اس نے نارمن کو مارنے کا ارادہ ملتوی کر دیا۔

کیمپ ڈیوڈ سے واپسی کے دوسرے روز سمنتھا کی ملاقات ڈاکٹر مرکس سے ہوئی وہ پچھلے دنوں بہت مصروف رہا تھا اور ڈبرل کے لیے کسی پروجیکٹ پر کام کر رہا تھا وہ اسے اپنے ساتھ ڈبرل کے پاس لے گیا۔

''تم کہاں تھے؟'' سمنتھا نے پوچھا۔

''تمہارے لیے ایک خاص لباس کی تیاری کر رہا تھا جسے پہن کر تم کسی کو نظر نہیں آؤ گی۔ ڈاکٹر مرکس کے بجائے ڈبرل نے کہا۔

''اس کی کیا ضرورت ہے؟''

''اس طرح تمہیں سین سے فرار ہونے میں آسانی ہوگی۔''

''سین سے فرار ہونے سے تمہارا کیا مطلب ہے؟''

''میرا مطلب ہے کہ قتل کے بعد تمہیں وہاں سے فرار ہونے میں آسانی ہوگی۔'' ڈاکٹر ڈبرل نے وضاحت کی۔

''کس کا قتل؟'' سمنتھا سمجھ تو گئی تھی لیکن اس نے انجان بنتے ہوئے پوچھا۔

''ظاہر ہے نارمن کا قتل۔'' ڈاکٹر مرکس نے کہا اور سمنتھا نے سوچا کہ اسے Elite کے لوگوں ہی نے بتایا تھا کہ نارمن نے اس کے والدین کو قتل کروایا اس کی نانی کو قتل کروایا خود اس کی زندگی لینے کی کوشش کی اس وجہ سے وہ بھی نارمن کی دشمن ہوگئی تھی لیکن اب اس کے ساتھ کئی ماہ گزارنے کے بعد اس پر جو حقیقت کھلی تھی وہ یہ تھی کہ اس کی ماں کے ساتھ نارمن کے جو تعلقات تھے وہ ان پر شرمندہ نہیں تھا اسے اس کی ماں سے بچھڑنے کا دکھ تھا ممکن تھا کہ Elite والے غلط بیانی کر رہے ہوں وہ حقیقت جاننا چاہتی تھی' یہ بھی ہوسکتا تھا کہ یہ Elite کی شرارت ہو اور نارمن بے قصور ہو لیکن اسے اندازہ نہیں تھا کہ کون سچا ہے؟ اور اس سب کچھ کا کون ذمہ دار ہے؟

''میں یہ نہیں کر سکتی۔'' سمنتھا نے ڈبرل کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا وہ نہیں جانتی تھی کہ اس میں اتنی طاقت کہاں سے آ گئی تھی کہ اسے ڈبرل کی ناراضگی کا بھی خیال نہیں رہا تھا وہ جانتی تھی کہ اس کے اس رویے پر وہ ڈاکٹر مرکس کو اسے شوٹ کرنے کا حکم بھی دے سکتا تھا لیکن اس کی توقع کے خلاف ڈبرل کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔

''اوہ' لیکن تمہیں یہ کرنا ہوگا مائی ڈیئر۔''

''ڈبرل تم مجھے قتل کر سکتے ہو اور کسی اور کو لے کر نئے سرے سے کام کر سکتے ہو لیکن تم نارمن کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتے وہ ایسی جگہ پر ہے جہاں پہنچنے کا تمہارا خواب کبھی پورا نہیں ہوگا۔''

''میں دیکھ رہا ہوں کہ اس نے تمہارے خیالات پر بھی قبضہ کر لیا ہے۔'' ڈبرل نے ناراضگی سے کہا۔

''یہ تمہارا وہم ہے۔''

''تمہیں نارمن کو مارنا ہوگا۔'' ڈبرل نے اس کے نزدیک آتے ہوئے کہا۔

''تم مجھ سے ایسا کچھ بھی نہیں کروا سکتے۔'' سمنتھا نے بھی اس کے انداز میں جواب دیا۔

''تو پھر ہمیں مجبوراً تمہارے پرانے دوست کو ختم کرنا ہوگا۔'' ڈبرل کا لہجہ دھمکی آمیز تھا اور سمنتھا سوچ رہی تھی کہ اس کا اشارہ کس کی طرف ہے اس کا تو کبھی کوئی ایسا دوست ہی نہیں تھا۔

''میرا کوئی دوست نہیں ہے۔''

''کیا تم اتنی بھلکو ہو کہ اپنی زندگی کے پہلے پیار کو بھول گئی ہو تم سراغرساں جو رابرٹ کو بھول گئی ہو جو ایک ایجنٹ بھی ہے۔'' ڈبرل نے کہا۔

''ایجنٹ؟''

''ہاں' اس کا ہمیشہ FBI میں شمولیت کا خواب پورا ہوگیا ہے اور وہ ایک امتحان پاس کر کے اب ہمارے سروں پر آ بیٹھا ہے۔''

''وہ یہاں ہے؟ واشنگٹن میں؟'' سمنتھا نے حیرت سے کہا۔

''تم بھی اپنی ماں کی طرح بہت تیز اندازے لگانے کی صلاحیت رکھتی ہو۔'' ڈبرل نے کہا اور ڈاکٹر مرکس کو کچھ اشارہ کرتا ہوا کمرے کے دروازے کی طرف بڑھا۔

''رابرٹ کو ڈھونڈو مرکس۔'' ڈبرل نے جاتے جاتے دانت پیس کر کہا۔

''ساشا اس پر کام کر رہی ہے ریکارڈز سے پتہ چلتا ہے کہ وہ آج صبح بھی سرنگ میں داخل ہوا تھا۔'' ڈاکٹر مرکس نے جواب دیا۔

''ساشا سے کہو کہ آج ہی اسے ڈھونڈے میں بھی کچھ مدد بھیج رہا ہوں اور ایرک سے بھی رابطہ کرو۔''

''کیا اسے اپنے پیچھے لگانا عقلمندی ہوگی؟'' ڈاکٹر مرکس نے کہا۔

''ہمیں اس شخص کو بہت جلدی ڈھونڈنا ہوگا ورنہ ہماری ساری محنت بے کار ہو جائے گی اور ہدایت کر دینا کہ وہ کسی بھی طرح سمنتھا سے نہ مل سکے۔''

''یس سر۔'' ڈاکٹر مرکس نے کہا۔

''اور ہاں مرکس......''

''یس؟''

''آئندہ کبھی مجھ سے سوال مت کرنا۔'' ڈبرل نے کہا اور کمرے سے نکل گیا۔

سمنتھا کی آنکھوں میں آنسو تھے اسے اپنی پروا نہیں تھی لیکن وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کی وجہ سے جو بھی مصیبت میں پھنسے وہ وہ نچھاجانے سے پہلے جو سے بہت عرصے دور رہی تھی لیکن جب وہ اس سے اس کے آفس میں ملی تھی تو اس نے بچپن کی محبت کو محسوس کیا تھا وہ سوچ رہی تھی کہ جو کب سے DC میں ہے؟ وہ اس سے بہت قریب ہے لیکن اس کی پہنچ سے باہر ہے ممکن ہے وہ اس کی آواز پہچان جائے لیکن کاسمیٹک کے سرجری کے بعد اس کی بدلی ہوئی شکل اور شخصیت سے وہ اسے نہیں پہچان سکے گا اسے احساس ہوا کہ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی ایک گہری دلدل میں پھنستی جا رہی ہے اس نے سوچا کہ اسے ڈبرل کے کہنے پر نارمن کو ختم کر دینا چاہیے کیونکہ وہ نہیں چاہتی کہ اس کی خاطر جو کی زندگی خطرے میں پڑے۔

☆

یہ جو کی حماقت ہی تھی لیکن وہ ایسا کرنے کے لیے مجبور تھا کسی کو بھی توقع نہیں کہ جو اچانک ہی آفس میں نمودار ہو جائے گا وہ زخمی تھا اس کے پیروں میں جوتے نہیں تھے کپڑے جگہ جگہ سے پھٹے ہوئے تھے اور وہ لنگڑاتا ہوا لفٹ کی طرف بڑھ گیا تھا آفس کے سیکیورٹی گارڈز نے اس کی معمولی سی تلاشی لی تھی لیکن سب ہی اسے حیرت سے دیکھ رہے تھے جب وہ دوسری منزل پر واقع اپنے چیف اسنو کے دفتر میں پہنچا تھا تو اسنو بھی اسے دیکھ کر اپنی سیٹ سے کھڑا ہوگیا تھا۔

''اوہ خدایا جو...... تم نے کال کیوں نہیں کی؟ میں صبح تین بجے سے یہاں بیٹھا ہوں۔''

''اس کا مطلب ہے خبر مجھ سے پہلے یہاں پہنچ گئی ہے۔'' جو نے ایک کرسی پر ڈھیر ہوتے ہوئے کہا۔

''ہاں بالکل...... لیکن تمہیں میرے اور اپنے درمیان رابطہ رکھنا چاہیے تھا۔' اسنو نے تیزی سے اپنے کمرے کا دروازہ بند کرتے ہوئے کہا وہ نہیں چاہتا تھا کہ کوئی انہیں ڈسٹرب کرے پھر اس نے کھڑکیوں کے پردے بھی

گرادیئے تھے اور اپنی میز پر رکھا فون اٹھایا تھا۔
''فوراً اسٹاف آفس اور میرے کمرے کے درمیان کی جگہ صاف کرو کوئی دھبہ نظر نہیں آنا چاہیے۔'' اسنو نے جو کے پیروں سے ٹپکتے خون کو دیکھ کر کہا۔
''دکھاؤ تمہارے تو پاؤں زخمی ہیں۔'' اسنو نے جھکتے ہوئے کہا پھر اس نے ایک گیلے کپڑے سے اس کے پاؤں صاف کیے تھے اور جو نے تکلیف کی شدت سے دانت بھینچ لیے تھے تاکہ منہ سے کوئی آواز نہ نکلے۔
''جو کار میں لایا ہوں اسے غائب کروادو...... میری کار حادثے میں تباہ ہوگئی ہے۔'' جو نے کہا۔
''میں جانتا ہوں مجھے بتایا گیا ہے کہ وہ شعلوں کی لپیٹ میں تھی تمہارے جسم کے زخم بھی کہیں کہیں سے جلے ہوئے ہیں۔''
''چار دنوں میں یہ تیسرا دھماکا کیا گیا ہے۔'' جو نے کہا۔
''جس کار میں تم آئے ہو وہ کہاں کھڑی کی ہے؟'' اسنو نے پوچھا۔
''یہاں سے آدھا میل کے فاصلے پر۔'' جو نے جواب دیا پھر اس نے کار کی لوکیشن بھی بتائی تھی۔
''یہاں بھی زیادہ دیر ٹھہرنا ٹھیک نہیں ہے۔'' اسنو نے فکرمندی سے کہا۔
''میں جانتا ہوں لیکن جب میں نے کھڑکی سے چھلانگ لگائی تو میرا فون نیچے گر کر ٹوٹ گیا تھا میں تمہیں کال نہیں کرسکتا تھا۔'' جو نے کہا اسنو نے اس کے پیروں کے زخم صاف کرکے دوا لگائی تھی اور بینڈیج کردی تھی پھر اس کے آفس کا دروازہ کھول کر باہر جھانکا تھا۔
''گڈ......سب صاف ہوگیا۔'' اس نے کہا۔
''کیا صاف ہوگیا؟'' جو نے پوچھا۔
''تمہارے خون آلود پیروں کے نشانات۔'' اسنو نے جواب دیا۔
''اس کا مطلب ہے وہ سمجھ گئے ہوں گے کہ میں یہاں ہوں۔'' جو نے فکرمندی سے کہا۔
''ہاں بہت ممکن ہے......آؤ میرے ساتھ آؤ۔'' اسنو نے کہا اور اپنی کی رنگ میں لگا ایک بٹن دبایا اس کے ساتھ ہی اس کے کمرے کی پچھلی دیوار ایک طرف کھسک گئی اور دوسری سمت ایک کمرہ نظر آنے لگا جس کے بارے میں اس کو پہلے کبھی کوئی علم نہیں تھا وہ جو کو ساتھ لے کر اس کمرے میں داخل ہوگیا اور دوبارہ بٹن دبانے پر دیوار واپس اپنی جگہ پر آگئی۔ کمرے میں مدھم نیلی روشنی پھیلی ہوئی تھی چاروں دیواروں کے ساتھ مانیٹرز لگے تھے وہاں موجود افراد خاموشی سے اپنے کام میں مصروف تھے وہ ایک دوسرے سے بات بھی نہیں کررہے تھے۔
''کیا میں ناسا کے مشن کنٹرول روم میں آگیا ہوں؟'' جو نے حیرت سے کہا۔
''ہمارا ارادہ بہترین ہے۔ میں تمہیں FBI کے اسپیشل ڈیژن میں خوش آمدید کہتا ہوں۔'' اسنو نے کہا۔ ''آؤ...... تمہیں کپڑے اور جوتے تبدیل کرنے کی ضرورت ہے۔''
جو دیوار میں لگے بڑے بڑے اسکرینز کو دیکھ رہا تھا جن میں دنیا کے مختلف شہروں کے لائیو مناظر نظر آرہے تھے۔
''یہ کیا ہے؟'' جو نے پوچھا۔
''یہ سیٹلائٹ سے حاصل ہونے والے مناظر ہیں اس میں سے کچھ تمہارے موجودہ کیس سے بھی تعلق رکھتے ہیں۔'' اسنو نے کہا اور ایک الماری سے کپڑے اور جوتے نکال کر جو کی طرف بڑھادیئے۔ پھر اس سے پہلے کہ جو کچھ بولتا آفس کا دروازہ کھلا تھا اور بل اندر داخل ہوا تھا۔
''اوہ جو تم زندہ ہو؟'' اس نے حیرت سے کہا جو نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا اور اسنو نے ایک نیا سیل فون جو کی طرف بڑھادیا۔
''دیکھو اس سلسلے میں کچھ نئی پیش رفت ہوئی ہے۔'' بل نے کہا اور ایک تصویر جیب سے نکال کر اسنو کی میز پر رکھ دی۔
''مرکس اسٹنسن یہ MIT اسپیشلسٹ ہے اس کے پاس میڈیکل کی ڈگری بھی ہے بہت ذہین شخص ہے اس نے ریسرچ کا بہت کام کیا ہے یہ پانچ سال پہلے اپنی بیوی اور بچی کے ساتھ ایک حادثے میں مارا گیا لیکن دو سال بعد ہی اس کی ماں نے اسے دیکھا تھا۔''
''ممکن ہے وہ کوئی غلط فہمی ہو وہ اس کا کوئی ہمشکل ہو جسے دیکھا گیا تھا۔'' جو نے کہا۔
''اگر تم اپنے بیٹے کو گیس اسٹیشن سے باہر آتے دیکھو گے تو کیا نہیں پہچانو گے؟'' بل نے اور ایک تصویر میز پر رکھ دی۔
''یہ اب سے چند ماہ پہلے کی ہے۔'' بل نے کہا دونوں تصویروں میں مماثلت تھی۔
''ممکن ہے یہ مرکس کا کوئی قریبی رشتہ دار ہو؟'' اسنو نے کہا۔
''اس کا ہماری تحقیقات سے کیا تعلق ہے؟'' جو نے پوچھا۔
''میرا خیال ہے کہ یہ ایک خفیہ تنظیم کا سربراہ ہے جو امریکہ کو تباہ کرنا چاہتی ہے۔'' بل نے کہا۔

◆......☆......◆

سمنتھا ایک بار پھر الیگزینڈریا کے روپ میں نارمن سے ملنے اس کی خواب گاہ میں پہنچ چکی تھی اس بار وہ مہلک سرنج بھی لائی تھی جو ڈاکٹر مرکس نے اس کے حوالے کی تھی سرنج اس کے منہ میں تھی اور وہ سیکورٹی سے گزر کر نارمن کی خواب گاہ میں پہنچنے میں کامیاب ہوگئی تھی پھر نارمن کی گردن میں اس سرنج کی سوئی چبھونا اس کے لئے کوئی مسئلہ نہیں تھا نارمن کی خواب گاہ میں داخل ہونے کے پندرہ منٹ بعد ہی اس نے کامیابی سے یہ کام کردیا تھا اور نارمن پرسکون ہوتا چلا گیا تھا یوں جیسے نیند نے اسے اپنی آغوش میں لے لیا ہو' سمنتھا ہمیشہ کی طرح بڑے اطمینان سے اس کی خواب گاہ سے نکلی تھی اور گارڈز پر الوداعی نظر ڈالتی اپنی کار کی طرف بڑھ گئی تھی رات کا پچھلا پہر تھا ہر طرف خاموشی تھی اور سب کچھ معمول کے مطابق تھا' سمنتھا کی کوشش تھی کہ وہ کم سے کم وقت میں زمین دوز دنیا میں واقع اپنے ٹھکانے تک پہنچ جائے۔
جب وہ ڈاکٹر مرکس کے پاس اس کی لیبارٹری میں پہنچی تھی اس وقت تک نارمن کی موت کی خبر عام ہوچکی تھی اور شہر میں الیگزینڈریا کی تلاش شروع ہوچکی تھی ٹی وی چینلز سے اس کی تصاویر دکھائی جارہی تھیں اور شہر میں ریسرچ آپریشن شروع ہوچکا تھا۔
''سمنتھا جلدی کرو تم خود کو خفیہ سرنگوں میں چھپالو انہیں ہم پر شک ہوسکتا ہے وہ ہماری تلاش میں یہاں بھی آسکتے ہیں شاید ہم یہاں محفوظ نہ رہیں جلدی کرو۔'' ڈاکٹر مرکس نے کہا اور سمنتھا تیزی سے اس کی لیبارٹری سے نکل گئی۔

❖......☆......❖

چیف اسنو کی میز پر رکھے رفون کی بیل بجی اور اس نے تیزی سے ریسیور اٹھایا اس نے تھوڑی دیر دوسری طرف سے آنے والی آواز سنی تھی اور پھر تیزی سے ریسیور کریڈل پر مار دیا تھا۔

''ہمیں بہت دیر ہوگئی ہے مجھے جلدی ایک کار دو۔'' اس نے دروازے کی طرف بھاگتے ہوئے کہا جو کی توجہ ابھی تک میز پر پڑی تصویروں کی طرف تھی۔

''مرکس کے ساتھ یہ جو عورت ہے اس کا نام کیا ہے؟'' جو نے تصویر میں موجود عورت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا اس کی نظریں اس کے سرخ بالوں پر مرکوز تھیں۔

''الیگزینڈریا' لیکن میرا خیال ہے کہ یہ ایک کوڈ نیم ہے کیونکہ ہمیں اس کے بارے میں زیادہ معلومات نہیں ملی ہیں صرف اس کا قد' وزن معلوم ہوسکا ہے جو کہ ایک بین الاقوامی اسٹینڈرڈ کے مطابق ہے۔'' بل نے کہا۔

''یعنی 5.7 قد اور 125 وزن؟'' جو نے کہا۔

''ہاں...... اچھا مجھے ابھی جانا ہے مزید تحقیق کے لیے۔'' بل نے بتایا تو جو بھی کھڑا ہوگیا۔

''میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گا۔'' اس نے کہا اور بل کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلنے لگا FBI کے دفتر سے باہر آنے کے بعد وہ کار میں بیٹھے تھے فضا میں تفتیشی ہیلی کاپٹرز کی پروازیں شروع ہوچکی تھیں بل کافی دیر تک شہر کی مختلف سڑکوں پر کار دوڑاتا رہا تھا پھر اس نے ایک پرانی سی بلڈنگ کے سامنے جاکر کار روک دی تھی اور کار سے اتر گیا تھا جو نے بھی اس کی تقلید کی تھی۔

''تم نے یہی کہا تھا نہ کہ وہ عورت اس بلڈنگ کے مشرقی کونے کی طرف جاکر غائب ہوگئی۔'' بل نے موقع پر کھڑے سیکرٹ سروس ایجنٹ سے پوچھا۔

''جی جناب۔''

''اس کا مطلب ہے کہ ہمیں ویئر ہاؤس ڈسٹرکٹ جانا ہوگا۔'' جو نے جلدی سے کہا۔

''کیوں؟''

''کیوں؟'' بل نے تیزی سے پوچھا۔

''کیونکہ اس بلڈنگ کے مشرق کی طرف ویئر ہاؤس ڈسٹرکٹ ہے ممکن ہے ہمارے دشمنوں کے ٹھکانے وہاں ہی ہوں۔''

''ٹھیک ہے میں بھی تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔'' بل نے کہا اور وہ دونوں ویئر ہاؤس کی طرف بڑھ گئے تھے۔ ویئر ہاؤس کے علاقے میں خاموشی تھی۔ یہاں پولیس کی کاروں کے سائرن بھی سنائی نہیں دے رہے تھے اور ہیلی کاپٹرز کی آوازیں بھی دور سے آرہی تھیں رات کی تاریکی پھیلتی جارہی تھی جو تیزی سے سڑک کے دوسری طرف ایک گلی کی طرف بڑھا اور بل کو مخالف سمت میں جانے کی ہدایت کی ان دونوں کی نظریں اور کان تاریکی میں کچھ دیکھنے اور سننے کے لیے بے چین تھے۔

جو گلی کا کونہ مڑ کر ایک محرابی دروازے کے سامنے پہنچ گیا تھا جہاں خاصا اندھیرا تھا اس نے اپنی آنکھوں کو اندھیرے کا عادی کرنے کے لیے کچھ دیر کے لیے آنکھیں بند کیں اور ایک گہرا سانس لے کر دروازے کی تاریکی میں غائب ہوگیا کچھ آگے جانے کے بعد اسے تھکی تھکی سانسوں کی آواز سنائی دی اس کو خیال آیا کہ شاید کوئی چہل قدمی کرتے ہوئے گزر رہا ہوگا پھر سانسوں اور قدموں کی آوازیں قریب آتی گئی قریب...... اور قریب...... جو نے اپنی کمر میں لگی پستول اپنے ہاتھ میں پکڑ لی اور انتظار کرنے لگا چند ہی سیکنڈ میں کوئی زور سے اس سے ٹکرایا تھا اور اپنے اوپر گرنے والے کے وزن سے خود بھی پیچھے کو گرتا چلا گیا تھا۔

''جو؟'' اسے سمنتھا کی جانی پہچانی آواز سنائی دی تھی۔ اس کے سامنے اندھیرے میں ایک عورت نیچے گری ہوئی تھی لیکن کا چہرہ نظر نہیں آرہا تھا لیکن جو اس آواز کو ہزاروں آوازوں میں بھی پہچان سکتا تھا۔

''سیم؟'' جو کے منہ سے بے ساختہ نکلا جبکہ وہ جانتا تھا کہ سمنتھا مرچکی ہے لیکن اس نے ذہنی طور پر اس کی موت کو تسلیم نہیں کیا تھا وہ اس کی سوچوں میں زندہ تھی اس کے خوابوں میں روز آتی تھی اور اب اس کے سامنے سڑک پر پڑی تھی اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔ اس کی پستول اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے گرگئی تھی اور اس نے سمنتھا کا اپنی طرف بڑھا ہوا ہاتھ تھام لیا تھا جس کے ساتھ ہی اس کے جسم میں ایک بجلی سی دوڑی تھی اور اس نے سمنتھا

کو اپنی طرف کھینچا تھا دوسرے ہی لمحے وہ اس کے سینے سے لگی تھی۔

''جو......! جو تم کہاں تھے؟'' سمنتھا نے بے قراری سے کہا لیکن جو والہانہ انداز میں اسے پیار کررہا تھا وہ برسوں کی دوریاں ختم کردینا چاہتا تھا اس کی انگلیاں سمنتھا کے بالوں میں گردش کررہی تھیں پھر اچانک ہی وہ اس سے جدا ہوگیا تھا۔

''تم...... تم تو مرچکی ہو۔'' اس نے اچنبے سے کہا اب اس کی نظریں سمنتھا کے اخروٹی بالوں اور ہری آنکھوں پر مرکوز تھیں اس کے گالوں کی ہڈیاں خاصی ابھری ہوئی تھیں اور وہ کسی طرح بھی سمنتھا سے مشابہہ نہیں تھی سوائے آواز کے۔' جو نے تیزی سے زمین پر پڑا اپنا پستول اٹھایا اور اسے اس عورت کی گردن پر لگا دیا۔

''بتاؤ تم کون ہو؟'' جو نے کہا لیکن اس عورت کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے اور ہونٹوں پر ایک اداس مسکراہٹ تھی۔

''مجھے یقین نہیں آرہا جو کہ تم میرے سامنے موجود ہو۔'' اس نے کہا۔ ''تم مجھے نہیں پہچان سکتے کیونکہ انہوں نے مجھے تبدیل کردیا ہے انہوں نے پلاسٹک سرجری کے ذریعے میری بہت سی چیزیں بدل دی ہیں یہ جسم اب مکمل طور پر میرا نہیں ہے لیکن تم مجھ پر یقین کرو میں سمنتھا ہی ہوں۔''

''میں تم پر کیسے یقین کرلوں؟'' جو نے کہا۔

''تمہیں وہ دن یاد ہے جب میری نانی کے گھر کے تہ خانے میں تم نے مجھے پہلا پیار کیا تھا؟'' اس نے کہا اور جو کی آنکھوں میں برسوں پرانا وہ منظر گھوم گیا جس کے بارے میں ان دونوں کے علاوہ کوئی نہیں جانتا تھا اس کے دل کی دھڑکنیں تیز ہوگئیں وہ بغور اس کے چہرے کی طرف دیکھنے لگا اور اپنی یادوں میں محفوظ چہرے سے اسے ملانے کی کوشش کرنے لگا اس کا پستول والا ہاتھ نیچے گرگیا۔

''تمہارے ساتھ کیا ہوا؟''

''میرا خیال ہے میرے پاس کوئی اور راستہ نہیں ہے۔'' سمنتھا نے اداسی سے زمین کو دیکھتے ہوئے کہا پھر وہ اس کی طرف اجنبی انداز میں دیکھنے لگی۔

''میں جن لوگوں سے پیار کرتی تھی انہوں نے ان سب کو مار دیا' میں اب تمہارے لیے ایسا نہیں ہونے دوں گی' میں انہیں تمہیں مارنے کی اجازت نہیں دوں گی تم مجھے جانے دو ورنہ وہ تمہیں بھی مار دیں گے۔''

''وہ کون؟ ان سے تمہاری کیا مراد ہے؟'' جو نے پوچھا اور اسی وقت ہیلی کاپٹرز کی آواز قریب آتی سنائی دی سمنتھا کے چہرے پر خوف کے سائے لہرانے لگے۔

''جو پلیز' تم مجھ سے دور چلے جاؤ...... اگر میں جلدی واپس نہ گئی تو وہ ایک بٹن دبائیں گے اور مجھے ایک دھماکے سے اڑا دیں گے ہم دونوں مرجائیں گے......'' سمنتھا نے کہا تو جو کے ذہن میں اس تصویر کا خیال آیا جس میں وہ ڈاکٹر مرکس کے ساتھ موجود تھی۔

''کیا ڈاکٹر مرکس کا اس سے کوئی تعلق ہے؟'' جو نے پوچھا اور اسی وقت ہیلی کاپٹرز کی نیچی پرواز کے باعث فضا میں مٹی اور گرد و غبار چھا گیا سمنتھا ایک بار پھر جو سے لپٹ گئی۔

''تم Elite کو ڈھونڈو تم مجھے ڈھونڈ لو گے۔'' سمنتھا نے کہا اور تیزی سے سڑک پار کرکے اندھیرے میں غائب ہوگئی اسی وقت ایک دھماکا ہوا اور ہر طرف دھوئیں کے بادل چھا گئے۔

❖......☆......❖

مرکس اپنی لیبارٹری میں کھلنے والی لفٹ کی طرف بڑھا تھا ہر طرف سے چیخنے اور قدموں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں زینے کے دروازے بھی کھلے تھے اور لوگ اندر داخل ہوئے تھے ان میں سے کچھ زخمی تھی اور کچھ لاشیں تھیں جنہیں لوگ اٹھائے ہوئے تھے' مرکس کی لیبارٹری کی لفٹ کا دروازہ کھلا تھا اور لفٹ میں سمنتھا بے ہوش پڑی تھی وہ زخمی تھی مرکس نے اسے کھینچ کر نکالا تھا اور اسے ایک بیڈ پر لٹا دیا تھا اس کی سانسیں بہت دھیمی تھیں لفٹ کا دروازہ بند ہوگیا تھا اور مرکس نے سمنتھا کو طبی امداد دینا شروع کردی تھی۔

مانیٹر کی سیٹی کی مستقل آواز ڈاکٹر مرکس کے کانوں سے ٹکرا رہی تھی۔ سمنتھا زندہ رہنے کی جدوجہد کررہی تھی اور سمنتھا کی زندگی مرکس کے لیے بھی اہمیت اختیار کرگئی تھی اس کی سیدھی ٹانگ بری طرح زخمی تھی مرکس نے اس کے زخم کو ٹانکے لگائے تھے اسے کئی گھنٹے لگ گئے تھے وہ ٹانگ

کے زخم کا علاج کرنے کے ساتھ ساتھ سمنتھا کی زندگی کو بھی یقینی بنانا چاہتا تھا اور چاہتا تھا کہ اس کی ٹانگ بھی ناکارہ نہ ہوجائے۔ ٹانگ کے ٹشوز میں دوران خون برقرار رکھنا بہت مشکل مرحلہ تھا اس کے ساتھ کئی اسسٹنٹ اس کام میں مشغول تھے پھر اچانک ہی لیبارٹری کا دروازہ زوردار آواز کے ساتھ کھلا تھا اور ڈبرل غصے کے عالم میں اندر داخل ہوا تھا اس نے کوئی دستانے یا ماسک نہیں پہنا ہوا تھا جو اسے جراثیم سے محفوظ رکھے جبکہ پہلے وہ اس کا بہت خیال رکھتا تھا۔

''آخر تم کر کیا رہے ہو کہیں تم پاگل تو نہیں ہو؟'' ڈبرل نے غصے سے کہا۔

''میں اس کی زندگی بچانے کی کوشش کررہا ہوں۔'' ڈاکٹر مرکس نے دھیمی آواز میں جواب دیا۔

''تمہارا خیال ہے کہ میں تمہاری اس ہمدردانہ کوشش کی تعریف کروں گا کہ تم اسے بچانے کی کوشش کررہے ہو۔'' اس نے کہا مرکس نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔

''تم ہمارے قیمتی اثاثے اس پر ضائع کررہے ہو ہمارا مشن مکمل ہوچکا ہے اور اب اس کی زندگی کی ہمیں کوئی ضرورت نہیں ہم اس مشن کی تکمیل کی اس آخری گواہی کو بھی ختم کردینا چاہتے ہیں۔'' مرکس اب بھی خاموش تھا وہ جانتا تھا کہ اگر اس نے ذرا بھی مزاحمت کی تو ڈبرل اسے بھی گولی ماردے گا وہ پہلے بھی ایسا کرچکا تھا اور اپنی مرضی کے خلاف کام کرنے والوں کو ختم کردیا کرتا تھا اس کی تمام وہ مجبوریاں اب ختم ہوچکی تھیں جن کی وجہ سے اس نے بہت سال پہلے Elite میں شمولیت اختیار کی تھی۔ اس نے ڈبرل کو بہترین فارمولوں پر کام کرکے دیا تھا لیکن اس کے بدلے میں کبھی اس کی تعریف نہیں کی گئی بلکہ اسے ہمیشہ ذلیل کیا گیا۔ ڈبرل کا سلوک مرکس کے ساتھ نوکروں جیسا تھا جبکہ اس نے ایک شراکت دار کے طور پر اسے اپنے ساتھ شامل کیا تھا۔

''میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ انہوں نے DNA کے سیمپلز لیے ہوں گے اور چند ہی دنوں میں انہیں حقیقت پتہ چل جائے گی وہ اس کا اصل نام ڈھونڈھ نکالیں گے میرا خیال ہے تم اسے زندہ رکھنے کی جو کوشش کررہے ہو وہ غلط ہے۔'' ڈبرل نے کہا لیکن مرکس بغور سمنتھا کی ٹانگ کا معائنہ کررہا تھا۔

''اس کی سرجری یہاں سے شروع کرنا۔'' ڈبرل نے اپنی انگلی اپنے چہرے پر پھیرتے ہوئے کہا۔ ''لیکن جیسے ہی یہ صحت یاب ہوا سے یہاں سے کہیں دور بھیج دینا میں آئندہ نہ اس کی آواز سننا چاہتا ہوں اور نہ اس کی شکل دیکھنا چاہتا ہوں۔''

''یس سر۔'' مرکس نے آہستہ سے کہا۔

پھر جیسے ہی ڈبرل لیبارٹری سے گیا تھا مرکس نے اپنا کام شروع کردیا تھا۔ پھر اچانک اس کے ذہن میں ایک خیال آیا تھا اور اس نے اس پر عمل کرنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ وہ سمنتھا کو زندہ رکھنے کی ہر ممکن کوشش آزمانا چاہتا تھا اور توقع سے بھی کم وقت میں اسے اس کے پیروں پر کھڑا کرنا چاہتا تھا کہ وہ یہاں سے فرار ہوسکے۔

☆

''یہ ناممکن ہے۔'' چیف اسنو نے DNA کے رزلٹ کی کاپی جو کو دیتے ہوئے کہا۔

''تم خود دیکھ لو۔''

''یہ کیسے ممکن ہے؟'' جو نے رپورٹ دیکھتے ہوئے کہا جس میں سمنتھا رابرٹ کا نام لکھا ہوا تھا۔

''وہ تو دھماکے میں ماری گئی تھی۔'' جو نے کہا۔

''ہاں، لیکن تم اس سرنگ کو بھول جاؤ گے جو اس کے گھر سے باہر کی طرف جاتی تھی تم نے خود وہاں کے کئی چکر لگائے تھے۔'' اسنو نے یاد دلایا اور جو نے سوچا اس سرنگ کو وہ کبھی نہیں بھول سکتا اس نے سوچا ممکن ہے وہ سرنگ صرف خود کو کسی طوفان سے بچانے کے لیے احتیاطی طور پر بنائی گئی ہو لیکن پھر اسے سمنتھا کی تدفین کے موقع پر اس سیاہ لباس والی عورت کا خیال آیا جس کی حقیقت وہ آج تک نہ جان سکا تھا وہ سمنتھا کے والدین کی قبروں پر بھی کچھ لمحے کے لیے رکی تھی جیسے دعا کررہی ہو کاش وہ اس روز اس عورت پر خاص توجہ دیتا اس کی نظریں چیف اسنو کے پرائیویٹ روم میں لگے اسکرینز پر جمی ہوئی تھیں جہاں سمنتھا کے جسم اور چہرے کی پلاسٹک سرجری کے مختلف مراحل کی تصاویر دکھائی جارہی تھیں ایک اور اسکرین پر وائس پریذیڈنٹ نارمن کی تدفین کے مناظر چل رہے تھے اور جو سوچ رہا تھا کہ سمنتھا قاتل نہیں ہوسکتی وہ اب پولیس کو مطلوب تھی ایک قاتل کی حیثیت سے اگر جو اسے بچانے کی کوشش بھی کرتا تو نہیں بچا سکتا تھا اسے کہیں نہ کہیں

شناخت کرلیا جاتا اسے یوں لگا جیسے سمنتھا کو ایک بار پھر کھودینے کے خوف سے اس کا دل ڈوبتا جارہا ہے۔

☆

ڈبرل پھر سمنتھا سے ملنے نہیں آیا تھا ڈاکٹر مرکس نے اس کی بہترین دیکھ بھال کی تھی اور بہت کم وقت میں وہ چلنے پھرنے کے قابل ہوگئی تھی لیکن اسے حیرت تھی کہ وہ ڈاکٹر مرکس ڈبرل کے مشن میں اس کا ساتھی تھا اب سمنتھا سے اتنی ہمدردی کیوں کررہا تھا وہ اب وہاں زیادہ دیر ٹھہرنا نہیں چاہتی تھی کیونکہ مشن کی تکمیل کے بعد وہ ان کے لیے ایک بے کار پرزے سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی تھی۔ اسے موقع کی تلاش تھی تاکہ وہاں سے فرار ہوسکے وہ مرکس کی غیر موجودگی میں اپنی ٹانگ کو مضبوط بنانے کے لیے مختلف ورزشیں کرتی رہتی تھی۔

ایک شام جب وہ تنہا تھی تو مرکس اس کے کمرے میں آیا اور اس کا معائنہ کرنے کے بعد اس نے اپنے اوورکوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک نوٹ بک اور پین نکالا اور اس پر کچھ لکھنے لگا پھر اس نے وہ پیپر پھاڑ کر سمنتھا کی طرف بڑھادیا تھا۔

''کیا اب میرا آئی ٹیسٹ لے رہے ہو؟'' اس نے پوچھا تو ڈاکٹر مرکس نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور سمنتھا پیپر پر لکھی تحریر پڑھنے لگی۔

''فرار کا منصوبہ، کسی کو پتہ نہ چلے کہ تم چل سکتی ہو خاموشی سے غائب ہوجانا۔''

''کیوں؟'' سمنتھا نے کاغذ پر لکھا وہ اسے حیرت سے دیکھ رہی تھی۔

''ڈبرل تمہیں ختم کروادینا چاہتا ہے۔'' مرکس نے کاغذ پر لکھا۔

''میرے کان کی چپ کا کیا ہوگا؟'' سمنتھا نے کاغذ پر پھر لکھا۔ ''اس سے نجات پائے بغیر میں کیسے آزاد ہوسکتی ہوں۔''

''میں تمہیں اس سے نجات دلادوں گا۔'' مرکس نے کہا اور پھر اس نے سارے کاغذ جمع کرکے ایک پلیٹ میں رکھے اور ان پر ہائیڈروکلورک ایسڈ ڈال دیا دیکھتے ہی دیکھتے وہ کاغذ اس ایسڈ میں گھل گئے تھے۔ اور ان کی گفتگو کا ثبوت مٹ گیا تھا۔

دوسری رات ڈاکٹر مرکس نے سمنتھا کو سوتے سے جگایا تھا۔

''سمنتھا! سمنتھا اٹھو اب وقت آگیا ہے۔'' اس نے سرگوشی کی اور سمنتھا کروٹ لے کر اٹھ گئی کمرے میں آتے ہی ڈاکٹرز نے بڑی مہارت سے کمرے میں لگا کیمرہ ٹیپ سے چھپادیا تھا پھر اس نے ایک چھوٹا سا پیکٹ سمنتھا کو دیا تھا۔

''یہ کیا ہے؟''

''اس میں کچھ چھوٹے اوزار ہیں۔''

''کس لیے؟''

''میں تمہیں ابھی یہاں سے نکالنا چاہتا ہوں۔''

''میری ٹانگ میں ابھی درد ہے۔''

''میں جانتا ہوں لیکن ہمارے پاس وقت نہیں ہے مجھے امید نہیں تھی کہ وہ اتنی جلدی سمنتھا اور الیگزینڈریا کا راز جان جائیں گے لیکن وہ جان گئے ہیں وہ تمہیں پہچان گئے ہیں کہ تم سمنتھا ہو اور تم ہی الیگزینڈریا ہو انہیں یقین ہوگیا ہے کہ ایک سال پہلے ہونے والے دھماکے میں تم نہیں ماری گئی تھیں وہ تمہاری تلاش کررہے ہیں ڈبرل کو FBI کی معلومات مل چکی ہیں وہ ابھی ملک سے باہر ہے لیکن جلد ہی واپس آنے والا ہے اور اس کے آنے سے پہلے تمہیں یہاں سے نکلنا ہے۔'' مرکس نے کہا اور سمنتھا کو فوراً ہی جو کا خیال آیا صرف جو ہی اس کی مدد کرسکتا تھا وہ اسے قانون سے انصاف دلاسکتا تھا۔

''لو یہ کچھ رقم ہے اسے تم رکھ لو تمہیں ضرورت پڑسکتی ہے۔'' مرکس نے اسے کچھ رقم دیتے ہوئے کہا۔

''تم یہ سب کیوں کررہے ہو؟''

''مجھے احساس ہوگیا ہے کہ میں ڈبرل کے ساتھ غلط راستے پر جارہا تھا اس نے میری بیوی اور بچی کو بھی ماردیا تھا میں اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کرنا چاہتا ہوں میں جانتا ہوں کہ تم بے قصور ہو میں اس لیے تمہاری مدد کررہا ہوں۔'' مرکس نے کہا پھر اس نے سمنتھا کے کان کی لو میں ایک انجکشن لگایا۔

''جیسے ہی دوا کام کرے گی یہ حصہ سن ہوجائے گا۔'' اس نے لو پر ایک کالا نشان بناتے ہوئے کہا۔

''تم اس چپ کو نکال پھینکنا پھر تم آزاد ہوگی۔''

''اور تم؟ تم کیا کروگے؟''

''میں بعد میں تمہارے پاس آ جاؤں گا۔''

''ٹھیک ہے۔''

''تم شہر کے بڑے گرجا گھر چلی جانا اور وہاں میرا انتظار کرنا میں دو گھنٹے میں پہنچ جاؤں گا لیکن اگر نہ پہنچوں تو تم وہاں سے چلی جانا۔''

''کہاں؟'' سمنتھا نے پوچھا۔

''تم سمجھدار ہو...... خود فیصلہ کر سکتی ہو۔'' مرکس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''میں جانتا ہوں تم میں ایسی صلاحتیں ہیں کہ اگر تم چاہو تو ان سے ایک قدم آگے چل سکتی ہو۔''

''تم نے اس وقت کا ہی کیوں انتخاب کیا؟'' سمنتھا نے پوچھا۔

''تمہیں ابھی تک اندازہ نہیں ہوا؟ میں تمہیں چاہتا ہوں مجھے احساس ہوا ہے کہ تمہارے ساتھ زیادتی ہوئی ہے اور میں نے جیسے پہلے کہا میں اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کرنا چاہتا ہوں تم تین نمبر سرنگ سے جانا میں نے وہاں کے کیمرے ناکارہ کر دیئے ہیں اور کنٹرول کو آٹو پر لگا دیا ہے تمہارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔'' مرکس نے کہا اور دوسرے ہی لمحے اسے تنہا چھوڑ کر وہاں سے چلا گیا' سمنتھا کو محسوس ہوا کہ اس کے کان کی لو انجکشن کے اثر سے سن ہو گئی ہے اس نے ہول پنچ اٹھایا اور آئینے میں دیکھتے ہوئے لو پر لگے کالے نشان پر ہول پنچ رکھ کر دبا دیا اس کے منہ سی ایک ہلکی سی سسکی نکلی تھی اس نے چپ سے جڑی ہوئی تمام تاروں کو ایک بار ہی میں کاٹ دیا تھا ورنہ وہ دھماکے سے مر سکتی تھی چپ سے نجات ملنے پر سمنتھا نے آنکھیں بند کر کے ایک گہرا سانس لیا تھا اور لفٹ میں چلی گئی تھی۔

کچھ دیر بعد ڈبرل اس کے کمرے میں آیا تھا اور سمنتھا کو وہاں نہ پا کر اس کا غصہ عروج پر پہنچ گیا تھا۔

''میں چاہتا ہوں اسے فوراً تلاش کرو۔'' اس نے غصے سے کہا۔ مرکس نے کبھی اسے اتنے غصے میں نہیں دیکھا تھا وہ دل ہی دل میں دعا مانگ رہا تھا کہ غصے کی شدت سے ڈبرل کو ہارٹ اٹیک ہو جائے تو بہت سی زندگیاں اس کے ظلم سے نجات پالیں گی اور سمنتھا بھی اس کی پہنچ سے دور نکل جائے گی اور پھر وہ بھی اپنے پروگرام کے مطابق موقع دیکھ کر فرار ہو جائے گا اس کا دل چاہا کہ کسی طرح وہ وقت کو واپس لا سکے اور اس وقت میں پہنچ جائے جب اس کی بیوی اور بیٹی اس کے ساتھ تھیں اسے اب تک ڈبرل کے ساتھ گزارا ہوا وقت ایک ڈراؤنا خواب نظر آ رہا تھا وہ اپنی زندگی کو نئے انداز سے گزارنے کا منصوبہ بنا چکا تھا۔

''شمالی جانب کے چیمبرز چیک کرواؤ اور اسے ڈھونڈو یہ بھی پتہ کرو کہ اس سب کے پیچھے کون ہے؟''

ڈبرل نے غصے سے کہا۔ ''اس کے کمرے سے ایک ہول پنچ ملا ہے کسی نے اس کی مدد کی ہے اس کی ٹانگ زخمی ہے وہ زیادہ دور نہیں گئی ہو گی۔'' ڈبرل غصے میں بولے جا رہا تھا۔

''تم فکر مت کرو میں پتہ کرتا ہوں۔'' مرکس نے کہا۔

''جو بھی اطلاع ملے فوراً مجھے بتانا۔''

''ٹھیک ہے۔'' مرکس نے کہا پھر اس نے سرچ ٹیم کو دو حصوں میں بانٹ دیا تھا اور زمین دوز دنیا میں کئی گھنٹے تک سمنتھا کی تلاش ہوتی رہی تھی' خود مرکس کو کسی ایسے لمحے کا انتظار تھا کہ وہ اپنے کمرے تک جا سکے اور پھر اسے موقع مل ہی گیا تھا۔

''ڈاکٹر مرکس مجھے کچھ ملا ہے۔'' ایک سیکورٹی گارڈ نے کہا۔

''کیا ہے؟''

''ایک سادہ نوٹ بک ہے لیکن اس کے صفحات پر لکھے جانے کے نشانات مل سکتے ہیں۔''

''یہ سادہ ہے اس میں کیا ملے گا۔'' مرکس نے تھوک نگلتے ہوئے کہا۔

''لیکن سر یہ کچرے دان میں تھی اور ڈبرل نے کہا ہے کہ ہر چیز چیک کرو۔''

''اچھا ٹھیک ہے۔'' مرکس نے وہاں موجود دوسرے سیکورٹی گارڈ کو بھی بلایا۔ ''تم دونوں جاؤ اور ڈبرل کو یہ نوٹ بک دکھاؤ ممکن ہے اس سے کوئی سراغ مل سکے۔''

''ٹھیک ہے جناب۔''

''میں بھی ڈبرل سے ملوں گا کچھ ضروری بات کرنا ہے میں دس منٹ میں آتا ہوں۔'' مرکس نے کہا اور وہ بھی وہاں سے اپنے کمرے کی طرف چلا گیا اپنے کمرے میں جا کر اس نے دروازہ بند کر لیا تھا اس نے اپنے کمرے کا کیمرہ چھپانے میں وقت ضائع کرنے کے بجائے کمرے کی لائٹ آف کر دی تھی اور اندازے سے کمرے میں حرکت کر رہا تھا اس نے بھی ایک درواز سے ہول پنچ نکالا تھا اور اپنے کان کی لو میں لگے چپ کو سمنتھا کی طرح مہارت سے نکال دیا تھا اس کے ساتھ ہی تین درد کی گولیاں بھی کھائی تھیں۔ یہ بہت بڑا خطرہ تھا جو مرکس اور سمنتھا نے لیا تھا اس طرح دھماکے میں وہ ہلاک بھی ہو سکتے تھے لیکن دونوں نے مہارت سے خود کو چپس سے آزاد کر لیا تھا پھر مرکس نے کان کی زخمی لو پر ٹیپ کی مدد سے بینڈ ایج لگائی تھی پھر اس نے اپنا پستول لے کر کمر میں لگایا تھا اور کمرے سے نکل گیا تھا وہ زمین دوز دنیا سے اوپر کی دنیا میں جانے والی لفٹ کی طرف بڑھا تھا لفٹ کا دروازہ کھلا تھا اور لفٹ میں اس کے سامنے ڈبرل موجود تھا جو اسے حیرت سے دیکھ رہا تھا لیکن مرکس گھبرایا نہیں تھا۔

''مرکس تم......؟ میں تو سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ تم یہ کام کر سکتے ہو؟'' ڈبرل نے کہا اور مرکس نے بغیر سوچے سمجھے اپنی پستول نکالی اور ڈبرل پر گولیاں چلا دیں پھر اس نے اپنے سر میں بھی گولی مار لی تھی وہ نہیں چاہتا تھا کہ کوئی سمنتھا تک پہنچ سکے چنانچہ اپنی جان کا نذرانہ پیش کر دیا تھا۔

......☆......

مرکس کا بتایا ہوا وقت گزر چکا تھا۔ سمنتھا چرچ میں اس کا انتظار کر رہی تھی لیکن مرکس نہیں آیا تھا۔ سمنتھا نے اپنے بالوں کو سیاہ رنگ لیا تھا کپڑے تبدیل کیے تھے بالوں کا اسٹائل بدلا تھا' وہ چرچ میں ہر دو گھنٹے بعد اپنے چھپنے کی جگہ بدل رہی تھی اسے شدت سے مرکس کا انتظار تھا اس کے نہ آنے پر وہ بدگمان ہو گئی تھی اور اسے خیال آیا تھا کہ ممکن ہے وہ کسی مصیبت کا شکار ہو گیا ہو اس خیال کے ساتھ ہی آنسو اس کے گالوں پر بہہ نکلے تھے اس بار اس نے چھپنے کے لیے پادری کی بیٹھک والی جگہ کو چنا تھا۔ پھر کافی دیر وہاں چھپے رہنے پر وہ تھک گئی تھی اور اسے نیند آ گئی تھی۔

کچھ دیر بعد اس کی آنکھ کسی کے پیروں کی آہٹ سے کھلی تھی' کوئی اس پارٹیشن میں آیا تھا جہاں بیٹھ کر پادری لوگوں کی فریاد سنا کرتا تھا۔

''یہ تو بہت جلدی ہے لیکن کوئی بات نہیں ہم تو خدا کے لیے اس کے وقت کے مطابق کام کرتے ہیں۔'' کسی نے نرم آواز میں کہا' سمنتھا حیران تھی کہ وہاں سے بھاگ جائے یا اس پادری کی بات کا جواب دے۔

''اگر تم چاہو تو میں تمہاری فریاد سننے کے لیے تیار ہوں۔'' پادری نے کہا۔

''فریاد؟'' سمنتھا نے اچانک کہا۔

''اس وقت کسی کو یہاں کھینچ لانے کا مقصد یہ ہے کہ تمہاری فریاد بہت دکھ بھری ہے۔''

''میں بہت عرصے سے چرچ میں نہیں گئی۔''

''کوئی بات نہیں' خدا سب کی سنتا ہے۔''

''لیکن شاید میری نہیں سنتا۔'' سمنتھا نے دکھ سے کہا۔

''تمہاری یہاں موجودگی کا مطلب یہی ہے کہ تم وہاں آ گئی ہو جہاں خدا سب کی سنتا ہے۔'' پادری نے کہا اور اس کے لہجے میں نہ جانے کیا بات تھی کہ سمنتھا بے ساختہ اسے سب کچھ بتاتی چلی گئی اس کی پیدائش' اس کی موت' اس کی دوبارہ نئی زندگی' Elite سے تعلق' مرکس اور ڈبرل کے بارے میں' نارمن کا قتل' نانی اور فیملی کا قتل' غرض اپنی زندگی کے ایک ایک لمحے کے بارے میں اسے جو یاد تھا اس نے بتا دیا۔ اس میں کافی وقت گزر گیا پادری نے اسے دعا دی اور جب وہ اس جگہ سے نکلی تو وہ کسی تتلی کی طرح ہلکی پھلکی تھی اس کے دل سے ایک بڑا بوجھ ہٹ گیا تھا وہ چرچ کی سیڑھیوں پر کھڑی تھی۔ اور رات کی سرد ہوا اس کے بالوں سے اٹھکیلیاں کر رہی تھی جلد ہی سورج طلوع ہونے والا تھا' اسے علم نہیں تھا کہ کچھ ہی فاصلے پر جو اس کے انتظار میں کھڑا تھا' کیونکہ پادری نے فون پر اسے بتا دیا تھا کہ سمنتھا چرچ سے باہر آ رہی ہے سمنتھا سیڑھیوں سے اتری اور تاریکی میں آگے بڑھ گئی۔

پادری کھڑا نظروں سی دور ہوتی ہوئی سمنتھا کو دیکھتا رہا تھا اس کے لباس کا کالر اس کے گلے میں چبھ رہا تھا اس نے کالر نکال دیا اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی اس نے نقلی داڑھی ہٹائی تو وہ جو کا دوست اور اسسٹنٹ بل تھا جو سمنتھا کا تعاقب کرتا یہاں پہنچا تھا اور سمنتھا کے بارے میں جو کو اطلاع دے چکا تھا اسے سمنتھا اور جو کی محبت کا علم تھا اور وہ ایک دوست اور ہمدرد ہونے کے ناتے ان کی مدد کرنا چاہتا تھا جو اس نے کر دی تھی اور اندھیرے میں اس نے بغور دیکھا سورج طلوع ہونے والا تھا اور دو سائے ایک دوسرے سے گلے مل رہے تھے۔



خالی ہاتھ

فلک شیر ملک

ایک ایسے بدقسمت نوجوان کی داستان' جس نے اپنی زندگی میں سب کچھ پا کر بھی کچھ نہ پایا تھا۔

ایک قتل کی روداد، سسپنس سے بھرپور کہانی

سراغ رسان مارٹن اپنے پرائیویٹ دفتر میں بیٹھا سگریٹ پہ سگریٹ پھونکے جا رہا تھا۔ بیئر کے بھی کئی گلاس اپنے اندر انڈیل چکا تھا مگر ذرا بھی اس کی پریشانی کم نہیں ہوئی تھی۔ وہ گہری سوچوں میں گم' اس قتل کیس کے بارے میں بہت پریشان دکھائی دے رہا تھا' جس کا مجرم ابھی تک قانون کی پہنچ سے دور تھا۔ امریکا کی سیکرٹ ایجنسی کا یہ سراغ رساں بہت ذہین اور چالاک تھا۔ یہ پہلا کیس تھا جس میں مارٹن بے بس نظر آیا تھا ورنہ اس سے پہلے وہ ہزاروں مجرموں کو جیل کی سلاخوں کے پیچھے پہنچا چکا تھا۔ اس کے ٹیبل پر پڑی یہ بلیک رنگ کی فائل وہ کئی مرتبہ پڑھ چکا تھا' جس میں کیتھرین کی پوسٹ مارٹم رپورٹ کے ساتھ ایک اور اہم دستاویز کی لیبارٹری رپورٹ بھی تھی۔ ایک دفعہ پھر اس نے اس فائل کی ورق گردانی شروع کردی۔

☆......☆......☆

آج سے کچھ دن پہلے یعنی بائیس دسمبر کی ایک سرد ترین رات کیتھرین کو ایک ایسا زہر دے کر ہلاک کیا گیا تھا جس سے انسان ایک دو منٹ میں ہی موت کے منہ میں چلا جاتا ہے۔ یہ مہلک قسم کا زہر اس وقت دیا گیا جب مسز کیتھرین ایک چیرٹی شو سے واپس گھر جانے کی لیے اپنی گاڑی میں بیٹھ رہی تھی۔ زہر دینے کا یہ انوکھا طریقہ سمجھ سے بالاتر تھا۔ مجرم بہت ہوشیار تھا' اور ابھی تک نظروں سے اوجھل تھا۔

☆......☆......☆

کیتھرین بمشکل تین سال کی تھی جب اس کے والدین ایک ایکسیڈنٹ میں چل بسے تھے۔ پولیس کمانڈرز اور جیوری نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ کیتھرین جب تک بڑی نہیں ہوجاتی اسے ٹرسٹ میں رکھا جائے۔ نیویارک میں ایسے کسی ادارے میں جو لاوارث بچوں کی کفالت کرتے ہیں' ان میں مادام ڈیلناس ٹرسٹ' کی رپورٹ باقی اداروں کی نسبت بہتر تھی۔ یوں کیتھرین کو اس ٹرسٹ کے حوالے کردیا گیا۔

مادام ڈیلناس ایک معمر خاتون تھیں جو اس ٹرسٹ کو چلا رہی تھیں۔ وہ بڑی ہمدرد اور پرخلوص عورت تھی' اس ٹرسٹ میں اور بھی کافی بچے' بچیاں زیر تربیت تھے۔ کیتھرین کچھ دن تو بہت اداس رہی' مگر آہستہ آہستہ وہاں ننھے منے بچوں میں اس کا دل بہل گیا۔ کچھ لڑکے لڑکیوں سے اس کی دوستی بھی ہوگئی جن میں ریگن پال اور الیگزا بھی شامل تھے۔ وہ اس کے ہم عمر ہی تھے الیگزا اس سے ایک سال چھوٹی تھی اور ریگن دو برس بڑا تھا۔ تعلیم کے علاوہ وہاں اور بھی کافی تفریح کا سامان تھا۔ جس سے کیتھرین محظوظ ہوتی رہتی۔

☆......☆......☆

وقت گزرتا رہا' کیتھرین اور ریگن پال کی محبت بھی پروان چڑھتی رہی۔ الیگزا بھی ریگن کو چاہتی تھی مگر کیتھرین کا پیار دیکھ کر وہ خموش ہی رہی۔ اور پھر وہ دن آپہنچا جب کیتھرین' ریگن اور الیگزا کو اس ٹرسٹ سے فارغ کردیا گیا کیونکہ اب وہ جوانی کی حدوں کو پہنچ گئے تھے۔

کیتھرین کے لیے وہ گھڑی بڑی پریشان کن تھی جب وہ اور ریگن بچھڑ رہے تھے تو دونوں کی آنکھوں میں آنسوؤں کی نمی تھی وہ الیگزا نے بھی دیکھ لی تھی۔ وہ بھی رہی تھی' اس کا بھی دنیا میں کوئی نہیں تھا' سوائے ایک خالہ کے' وہ بھی نا جانے زندہ تھی یا مر چکی تھی۔



ریگن پال نے بتایا تھا کہ وہ شکاگو جائے گا' شاید کوئی جاب وغیرہ مل جائے' یوں یہ تینوں ساتھی اپنی اپنی منزلوں کی طرف رواں دواں ہوگئے۔

☆......☆......☆

کیتھرین اب سترہ برس کی عمر میں پہنچ چکی تھی' خوب رنگ روپ نکالا تھا' اس نے' اپنی ماں کی طرح' پانچ فٹ آٹھ انچ قد کے ساتھ سرخ وسفید رنگت دراز بال' لمبی گردن اس کو اور بھی باوقار بنا رہی تھی۔ گویا کہ وہ مکمل ایک باشعور خوبصورت عورت بن چکی تھی۔

☆......☆......☆

ٹرسٹ سے وہ سیدھی اپنے خاندانی وکیل مسٹر سائمن کے پاس گئی تھی' سائمن اسے ٹرسٹ میں بھی مل چکا تھا۔ اس وقت کیتھرین آٹھ برس کی تھی۔

آج سائمن کیتھرین کو دیکھ کر بہت خوش ہوا تھا۔ اس نے الماری سے کچھ کاغذات پر کیتھرین کے دستخط کروائے' وہ کاغذات سائن بھی کرتی جا رہی تھی اور ساتھ ساتھ اس کے کان مسٹر سائمن کی طرف لگے ہوئے تھے جو ماضی کے بند دریچوں کو آہستہ آہستہ کھول رہا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا۔

''بے بی کیتھرین' آپ کے والد مسٹر رابرٹ جان' بہت بڑے بزنس مین تھے۔ ساتھ وہ ایک کنسٹرکشن کمپنی بھی چلا رہے تھے۔ مسٹر رابرٹ نے کیتھرین کی والدہ سے اس وقت شادی کی تھی جب وہ لاوارث تھی اور کسی ٹرسٹ میں تھی پھر وکیل سائمن نے اس ساری جائداد کی تفصیل بتائی جو مسٹر رابرٹ اور مسز رابرٹ نے مرتے وقت چھوڑی تھی۔ کچھ پلاٹس تھے جو مختلف شہروں میں تھے' نیوجرسی میں کچھ لاس ویگاس' واشنگٹن اور دو پلاٹ نیویارک میں تھے۔

پچاس لاکھ ڈالرز بینک بیلنس تھا' نیویارک میں بہت بڑا گھر اور ایک بڑا اسٹور تھا جس کو مسٹر رابرٹ کا ایک وفادار منیجر جیرالڈ چلا رہا تھا۔ اس ساری پراپرٹی کی اب واحد مالک کیتھرین تھی۔ سائمن وکیل نے کچھ فائلیں' چیک بکس اور گھر کی چابیوں کا ایک بڑا سا گچھا کیتھرین کے حوالے کردیا۔ سائمن کیتھرین کو اس کے گھر تک چھوڑنے آیا تھا اور پھر جلدی واپس چلا گیا۔

دوسو چالیس گز کا یہ محل نما بنگلہ تھا۔ مسٹر رابرٹ نے بڑے شوق سے بنوایا تھا۔ کیتھرین نے تالا کھولا اور اندر داخل ہوگئی۔ وہ عجیب سی کشمکش کا شکار تھی۔ بچپن کی دھندلی یادیں دامن گیر ہورہی تھیں۔ وہ جھولا ابھی تک وہیں موجود تھا جس میں وہ لوریاں سنتی تھی۔

جدید فرنیچر سے آراستہ ہر کمرہ سجا ہوا تھا۔ اس نے ایک فائل کھولی تو اس میں کیتھرین کے ماں باپ کی تصویریں تھیں' وہ بہت دیر تک ان تصویروں کو چومتی رہی اور روتی رہی۔ روتے روتے وہ سوگئی' پتہ نہیں کب تلک سوتی کہ کسی خواب نے اسے جگادیا' وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ وہ لان میں چلی گئی' وہاں بھی اس کا دل نہیں لگا تو وہ باہر نکل گئی۔ شام کو گھر لوٹی تو اس کے ساتھ ایک ملازمہ بھی تھی' آج کیتھرین نے دل کھول کر شاپنگ کی تھی' ڈھیر سارے ملبوسات اور نئی ہنڈا سوک گاڑی بھی خریدی تھی۔ اس کے علاوہ کچھ جیولری' ایک رنگ اور ایک نفیس قسم کا ڈائمنڈ نیکلس بھی لیا جو کیتھرین کی لمبی گردن میں اس کے حسن میں اور بھی اضافہ کررہا تھا۔

وہ اپنے اسٹور پر بھی گئی' منیجر جیرالڈ نے بڑی گرمجوشی اور خوشی کا اظہار کیا تھا۔ مس کیتھرین کو ملتے ہوئے اور اسٹور کی ساری صورت حال سے آگاہ کرتے ہوئے جیرالڈ اس بات پر بہت خوش تھا کہ اسٹور کی اصل مالکہ آچکی ہے۔

منیجر جیرالڈ بہت محنتی اور وفاشعار تھا۔ وہ پہلی نظر میں ہی پہچان گئی تھی کہ جیرالڈ پر بھروسہ کیا جاسکتا ہے۔

☆......☆......☆

اتوار ہونے کی وجہ سے آج چھٹی تھی کیتھرین نے ساحل سمندر پر جانے کا پروگرام بنایا اور اپنی ملازمہ کو ساتھ لے کر ساحل کی طرف روانہ ہوگئی۔ سڑک پر کیتھرین کی گاڑی سمندر کی طرف رواں دواں تھی۔ اور وہ گہری سوچوں میں گم' اپنے مستقبل کے بارے میں الجھی ہوئی تھی۔

☆......☆......☆

ساحل سمندر پر بہت رش تھا۔ طرح طرح کے لوگ کچھ ٹولیوں کی شکل میں ناچ رہے تھے۔ کچھ ریت پر دوڑ رہے تھے' بچے اونٹ کی سواری کررہے تھے' کیتھرین نے ایک بحری جہاز کو دیکھا جو لنگر انداز ہورہا تھا۔ جس میں بہت سارے فوجی نظر آرہے تھے' ان کی ٹوپیوں اور کندھوں پر سجے بیج چمک رہے تھے۔ پھر یکا یک کیتھرین کی نظر جیسے جھپکنا بھول گئی ہو۔ انہی فوجیوں میں اس نے ریگن پال کو دیکھ لیا تھا۔ اس کے دل کی دھڑکنیں بے ترتیب ہونے لگیں۔ ریگن ہاتھ ہلا رہا تھا شاید اس نے بھی کیتھرین کو پہچان لیا تھا۔ جہاز رکا تو وہ نیچے اتر آیا' اس نے کیتھرین کو بہت دیر تک اپنے سینے سے چمٹائے رکھا۔ کیف وسرور کے یہ لمحے اس وقت ختم ہوئے جب جہاز کے کمانڈر نے سب فوجیوں کو نئے آرڈرز جاری کرنے کے لیے بلایا۔ ریگن نے اپنی ساری کہانی کیتھرین کے گوش گزار کردی تھی کہ امریکا اور عراق جنگ میں اسے جبری بھرتی کرلیا گیا ہے' جونہی جنگ ختم ہوگی' وہ فوج سے فارغ ہوجائے گا۔ کچھ دنوں تک جنگ کے خاتمے کا اعلان ہوچکا تھا۔ اس جنگ میں عراق کو بہت نقصان پہنچا تھا۔ یوں ریگن پال شکاگو پہنچ کر کچھ دن یونہی آوارہ گردی کرتا رہا' پھر ایک دن اس کی جیب سے ایک پرچی ملی جس پر کیتھرین کا سیل نمبر اور نیویارک کا ایڈریس لکھا ہوا تھا۔ اس نے وہ نمبر ڈائل کیا تو کیتھرین کی رس بھری آواز سن کر مدہوش ہونے لگا۔ ریگن نے بتایا کہ وہ فوج سے جان چھڑا چکا ہے اب کل کی فلائٹ سے نیویارک پہنچے گا۔ اس خبر نے کیتھرین کے دل میں ایسے شعلے پیدا کردیئے جس کی تپش اس کے چہرے پر بھی دیکھی جاسکتی تھی۔

☆......☆......☆

کیتھرین این جی روز کی ممبر' اور ایک سماجی کارکن ہونے کی حیثیت سے کافی شہرت پاچکی تھی۔ وہ ایک غمگسار قسم کی لڑکی تھی۔ وہ اکثر اوقات بے سہارا بچوں کے اداروں میں جاتی تھی۔ کچھ وقت ان یتیم اور نادار و بے کس

لوگوں میں گزار کر اسے بہت خوشی ہوتی۔ فنڈز کے علاوہ بھی وہ ان کی بہت خدمت کرتی' اس کی دلی خواہش تھی کہ ان لاوارث بچوں کے لیے کوئی ایسا کام کیا جائے جس کی روشنی آنے والی نسلوں تک پھیلے۔

☆......☆......☆

وہ ایئرپورٹ کے باہر کھڑی تھی' اس کی نظر پسنجر لاؤنج کی طرف بار بار اٹھ رہی تھی۔ پھر انتظار کی گھڑیاں ختم ہوگئیں کیونکہ ریگن ایک بیگ ہاتھوں میں لیے نمودار ہوا۔ نظروں سے نظریں ملیں' دل سے دل' اور ریگن نے کیتھرین کو اپنی بانہوں کے حصار میں لے لیا۔ کیتھرین کے چہرے پر شفق کے رنگ بکھرے ہوئے تھے۔ گلاب سے بھی معصوم کیتھرین کی ایک دیرینہ خواہش پوری ہونے والی تھی۔

گاڑی ایک خوبصورت بنگلے کے سامنے رک گئی تھی۔ جس پر بڑے حروف میں کیتھرین لاج کا بورڈ آویزاں تھا۔

چند دنوں میں ہی کیتھرین مسز ریگن پال بن گئی۔ سہاگ کے جوڑے میں وہ مجسمہ حسن یوں لگ رہی تھی جیسے آکاش سے کوئی شہزادی اتر آئی ہو۔ ریگن بھی کسرتی جسم والا چھ فٹ کا جوان زبردست شخصیت کا مالک تھا۔ دونوں کی جوڑی خوب جچ رہی تھی۔ ہنی مون دو ماہ پر مشتمل تھا۔ لاس ویگاس میں کچھ عرصہ گزارہ پھر لندن اور گرین لینڈ سے ہوتے ہوئے واپس گھر پہنچ گئے۔

یہ سنہری لمحات کیتھرین کی زندگی میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتے تھے۔ ریگن' کیتھرین سے بہت پیار کرتا تھا' کیتھرین کو اپنی محبت مل گئی تھی' اور ریگن پال کو محبوب کے علاوہ ٹھکانا بھی۔

☆......☆......☆

وقت کی گھڑیاں چلتی رہیں' ان کی شادی کو تین سال ہوگئے تھے مگر کیتھرین ابھی تک ماں نہیں بن سکی تھی۔ دوسری عورتوں کی طرح اس کی بھی یہ خواہش تھی کہ اس کے صحن چمن میں بھی کوئی پھول کھلے' اس نے اپنے تمام ٹیسٹ کروائے' جو کہ نارمل تھے' پھر ریگن کو بھی ایک ماہر ڈاکٹر کے پاس بھیجا' رپورٹ کے مطابق ریگن' بانجھ تھا۔ ڈاکٹر نے ریگن کو بتایا کہ بچپن میں اس کی سپرم والی نالی پر کوئی چوٹ لگی تھی جس کی وجہ سے وہ نالی بند ہوچکی ہے اور اب وہ

باپ نہیں بن سکتا۔ ریگن پریشان تھا مگر اس نے کیتھرین کو رپورٹ کے متعلق نہیں بتایا...... کہ کہیں وہ شک وشبہہ میں مبتلا نہ ہوجائے۔ کیتھرین کو اس نے مطمئن کردیا تھا کہ ٹیسٹ نارمل ہیں' وہ رپورٹ اس نے اسٹور کے بیڈروم میں اپنی الماری کے خفیہ خانے میں رکھ دی۔

☆......☆......☆

کیتھرین نے ریگن کو اسٹور کا مالک بنادیا تھا۔ تاکہ وہاں کا سارا نظام وہ اپنی نگرانی میں چلائے' وہ صبح ناشتہ کرکے اسٹور پر چلا جاتا' دوپہر کا کھانا وہ وہیں کھاتا۔ رات نو بجے وہ گھر آجاتا' کیتھرین سے گپ شپ رات گئے تک ہوتی رہتی' شب وروز بڑے پرسکون گزر رہے تھے۔ ہر طرف خوشیاں ہی خوشیاں تھیں۔

☆......☆......☆

آج صبح ریگن حسب معمول ناشتہ کرکے اسٹور کی طرف جارہا تھا تو بازاروں میں لوگوں کا کافی رش تھا۔ موسم میں کچھ ٹھنڈک کا احساس ہورہا تھا' آسمان پر سفید بادلوں کے ٹکڑے تیر رہے تھے۔ شاید کرسمس قریب آرہا تھا' اس لیے لوگ برف باری کے خدشے کے پیش نظر جلدی جلدی شاپنگ میں مصروف تھے۔

☆......☆......☆

وہ جونہی اسٹور میں داخل ہوا۔ اس کی نظر ایک شناسا سی لڑکی پر پڑی۔ لڑکی نے مختصر سا لباس پہنا ہوا تھا' ریگن نے ذہن پر زور دیا وہ الیگزا کو پہچان چکا تھا۔ الیگزا نے بھی ریگن کو دیکھ لیا تھا۔ اس اچانک ملاقات پر وہ اچھل پڑی تھی۔ وہ بلا کی حسین ہوگئی تھی۔ سنہری رنگت' موٹی موٹی سفید آنکھوں میں پیار کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر' لمبے بال جوجوڑے کی شکل میں بندھے ہوئے تھے۔ الیگزا نے باریک ٹی شرٹ پہنی ہوئی تھی جس میں سے جسم کے سارے خدوخال واضح طور پر نمایاں تھے۔ لمبے سفید بازو اس کی شخصیت کو اور بھی اجاگر کررہے تھے' جونیکر اس نے پہنا تھا وہ گھٹنوں سے اوپر تک تھا' سرخ وسفید موٹی پنڈلیاں اس کی بھرپور جوانی کی عکاسی کررہی تھیں۔ کیتھرین کی پانچ کالز آچکی تھیں مگر ریگن الیگزا کی دوشیزگی کے پیچ وخم میں اس قدر کھویا ہوا تھا کہ وہ فون کی گھنٹی بھی نہیں سن سکا۔ وہ الیگزا کو لے کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔ وہ دونوں ایک ہی صوفے پر بیٹھ گئے۔ سامنے شیشے کا ایک بڑا ٹیبل تھا جس پر کھانے کے کچھ لوازمات تھے جو ریگن نے منگوالیے تھے اور شراب کے دو جام بھی تھے جو لبالب بھرے ہوئے تھے۔ پھر جام سے جام ٹکرائے اور خالی ہوگئے۔ ریگن کا ہاتھ الیگزا کی سفید گردن سے بازوؤں کو ٹٹولتا ہوا ٹانگوں سے گھٹنوں تک پہنچ چکا تھا کہ اچانک منیجر جیراللہ اندر آگیا' وہ بہت گھبرایا ہوا لگ رہا تھا پھر اس نے معذرت خواہ لہجے میں بتایا کہ سوری سر ایک شرابی اسٹور کے اندر گھس آیا ہے' وہ نشے میں دھت اندر ہنگامہ کررہا ہے' تمام گاہک ڈسٹرب ہو رہے ہیں۔

ریگن یہ لمحات کھونا نہیں چاہتا تھا مگر مجبوری میں جانا پڑا' اس نے الیگزا سے معذرت کی اور جاتے جاتے اپنا فون نمبر اس کی جیب میں ڈال دیا۔ الیگزا جب اسٹور سے نکل رہی تھی تو یہ نوخیز کلی سراپا آگ بنی ہوئی تھی' شاید پہلی مرتبہ اسے کسی مرد نے اس طرح چھوا تھا۔ اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک ابھری تھی۔ سفاکانہ قسم کی چمک۔

☆......☆......☆

پھر یہ سلسلہ چلتا رہا' کبھی الیگزا کال کرلیتی تو کبھی ریگن گھنٹوں اس کی آواز سے محظوظ ہوتا رہتا۔

کیتھرین کے دل میں پہلی دراڑ اس وقت پڑی جب جیراللہ نے اسے ریگن اور الیگزا کے بارے میں سب کچھ بتادیا اور ساتھ ریگن کی میڈیکل رپورٹ کے متعلق بھی کہ وہ بانجھ ہے۔ اب ریگن کے رویے میں بھی بہت فرق آگیا تھا۔ وہ کبھی رات گیارہ بارہ بجے آتا اور کبھی وہیں اسٹور میں ہی سوجاتا' جب سے ریگن نے الیگزا کا بھرپور شباب اور دوشیزگی کی جھلک دیکھی تھی' اسے چین نہیں آرہا تھا۔ وہ کچھ بیقرار سا رہنے لگا تھا' کیتھرین اسے پرانی پرانی سی لگنے لگی تھی حالانکہ وہ اب بھی ایک خوبرو لڑکی تھی۔ شاید یہ چیز انسانی فطرت میں شامل ہے کہ وہ ہر چیز سے جلدی اکتا جاتا ہے۔

ریگن کی مثال اس بھنورے کی طرح تھی جو ایک پھول کا رس چوس کر دوسرے پر جا بیٹھتا ہے۔ ریگن اب کیتھرین سے نظریں چرانے لگا تھا مگر وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کی محبت ناکام ہوجائے' وہ ریگن کو کھونا نہیں چاہتی تھی اس کی ساری کوششیں بے کار ثابت ہوئی تھیں۔ وقت کے ساتھ

ساتھ دوریاں بڑھتی گئیں' پیار نفرت میں تبدیل ہوتا گیا۔

عورت ہر دکھ' ہر غم سب کچھ برداشت کرسکتی ہے مگر اس کا شوہر کسی غیر لڑکی سے تعلق رکھے یہ اس کے ضبط سے باہر ہے۔

☆......☆......☆

آج اکیس دسمبر کی رات تھی' برف گرنا بند ہوچکی تھی۔ ریگن ابھی تک اسٹور سے واپس نہیں آیا تھا۔ رات کے تین بجے تھے اور کیتھرین ابھی تک سو نہیں سکی تھی۔ سفید رنگ کا لفافہ جس میں کیتھرین کا دعوتی کارڈ تھا میز پر پڑا تھا۔ جس میں این جی اوز کے تمام ارکان وممبران کو دعوت دی گئی تھی اس شو میں شرکت کرنے کے لیے جو بائیس دسمبر رات نو بجے شروع ہونا تھا۔ ''ادارہ برائے کفالت' کیتھرین ٹرسٹ'' کے نام سے بنایا جارہا تھا۔ اس ٹرسٹ کی نقاب کشائی کی اس تقریب کی مہمان خصوصی بھی کیتھرین تھی' جس نے بھرپور جدوجہد کرکے اس ٹرسٹ کو چھ ماہ میں ہی مکمل کروالیا تھا۔ اس تقریب رونمائی کی تشہیر اخبار میں بھی کی گئی تھی جسے ریگن نے بھی پڑھا ہوگا۔

☆......☆......☆

صبح ہونے کو تھی اور کیتھرین جو ساری رات کوئی فیصلہ نہیں کرپائی تھی۔ اچانک اس کے منہ سے یس YES کے الفاظ نکل گئے۔ اس نے فیصلہ کرلیا تھا۔ ریگن سے علیحدگی کا فیصلہ' طلاق کا فیصلہ۔

☆......☆......☆

آج بائیس دسمبر تھا۔ صبح سے ہی یخ بستہ ہوائیں چلنا شروع ہوگئی تھیں۔ سنو فال کچھ دیر تک جاری رہی جونہی موسم کچھ بہتر ہوا' وہ گھر سے نکل گئی۔ وکیل سائمن کے پاس بھی وہ گئی تھی' پھر کورٹ گئی' یوں وہ سارا دن مصروف رہی' جب وہ شام پانچ بجے گھر پہنچی تھی' اس کے بریف کیس میں بہت سی اہم دستاویزات تھیں۔

☆......☆......☆

ریگن شام سات بجے کے قریب گھر آیا تھا' اور پھر واپس جانے لگا تو کیتھرین نے اسے دلفریب مسکراہٹ سے شب بخیر کہا تھا' اور وہ بڑی پرسکون تھی۔ ملازمہ نے چائے دی' کیتھرین آج بہت اچھے موڈ میں تھی' اس نے ملازمہ کو ڈھیر سارے کپڑے' اور نقد رقم بھی دی۔

مصنفین سے گزارش

☆مسودہ صاف اور خوشخط لکھیں۔

☆صفحے کے دائیں جانب کم از کم ڈیڑھ انچ کا حاشیہ چھوڑ کر لکھیں۔

☆صفحے کے ایک جانب اور ایک سطر چھوڑ کر لکھیں' صرف نیلی یا سیاہ روشنائی کا ہی استعمال کریں۔

☆خوشبوئے سخن کے لیے جن اشعار کا انتخاب کریں ان میں شاعر کا نام ضرور تحریر کریں۔

☆ذوق آگہی کے لیے بھیجی جانے والی تمام تحریروں میں کتابی حوالے ضرور تحریر کریں۔

☆فوٹو اسٹیٹ کہانی قابل قبول نہیں ہوگی۔ اصل مسودہ ارسال کریں اور فوٹو اسٹیٹ کرواکر اپنے پاس محفوظ رکھیں کیونکہ ادارہ نے ناقابل اشاعت کہانیوں کی واپسی کا سلسلہ بند کردیا ہے۔

☆مسودے کے آخری صفحہ پر اردو میں اپنا مکمل نام پتا اور موبائل فون نمبر ضرور خوشخط تحریر کریں۔

☆کہانیوں پر آپ کے تبصروں پر مشتمل خطوط (گفتگو) ادارہ کو ہر ماہ کی 3 تاریخ تک مل جانے چاہئیں۔

☆اپنی کہانیاں دفتر کے پتا پر رجسٹرڈ ڈاک کے ذریعے ارسال کیجیے۔

☆خصوصی توجہ: ای میل سے کہانیاں ارسال کرنے والے مصنفین سے گزارش ہے کہ وہ کہانی کے اختتام پر اپنا اردو میں مکمل ایڈریس اور موبائل فون نمبر ضرور تحریر کریں۔

☆نوٹ: 1:00 تا 2:30 نماز ظہر اور کھانے کا وقفہ ہوتا ہے لہٰذا اس دوران دفتر ٹیلی فون کرنے سے گریز کریں۔

7' فرید چیمبرز' عبداللہ ہارون روڈ' کراچی۔

وہ تقریب میں جانے سے پہلے کچھ اور کام بھی کرنا چاہتی تھی۔ اس نے اپنے اسٹور منیجر جیرالڈ کو گھر بلایا تھا اور تمام قیمتی زیورات وغیرہ اس کے حوالے کیے تھے تاکہ بینک کے لاکر میں رکھوا دیئے جائیں۔

پھر وہ اپنی گاڑی کو یونیورسٹی روڈ پر دوڑا رہی تھی' یہ تقریب اس یونیورسٹی کے بڑے ہال میں منعقد کی گئی تھی جس کے ساتھ ملحقہ عمارت میں کیتھرین ٹرسٹ بنایا گیا تھا۔ ہال کو بڑی خوبصورتی سے سجایا گیا تھا۔ بڑے بڑے پوسٹر لگائے گئے تھے جن پر کیتھرین کی تصویر سجائی گئی تھی۔ پارکنگ لاٹ میں گاڑی کھڑی کرنے کے بعد کیتھرین جب وہاں پہنچی تو تمام لوگوں نے کھڑے ہوکر چیف گیسٹ کا استقبال کیا۔ تالیوں کی گونج میں کیتھرین نے اپنے ہاتھ سے اس تختی سے ریشمی نقاب کو ہٹایا جس پر کیتھرین ٹرسٹ کے الفاظ کندہ تھے۔ ہال میں تمام کرسیوں پر لوگ براجمان ہوچکے تھے۔ چیف گیسٹ کی چیئر پر بیٹھی کیتھرین حسن کی دیوی لگ رہی تھی۔

جب یہ تقریب ہو رہی تھی۔ اس وقت الیگزا اپنی تمام تر حشر سامانیوں اور گداز جسم کے ساتھ ریگن کے اسٹور میں موجود تھی۔ ریگن نشے میں دھت تھا البتہ الیگزا ہوش میں تھی۔ ریگن آج خلوت کے مزے لینا چاہتا تھا۔ اس نے بہت کوشش کی کہ الیگزا آج رات اس کی ہر جائز وناجائز خواہش کو پورا کرے' مگر وہ دلربا' خوبصورت ہونے کے ساتھ ساتھ ایک پختہ کردار کی مالک بھی تھی۔ اس نے ریگن سے محبت ضرور کی تھی لیکن شادی سے پہلے' وہ اس گناہ کی دلدل میں نہیں پھنسنا چاہتی تھی۔ وہ ریگن کو بیہوشی کی حالت میں چھوڑ کر جاچکی تھی۔

☆......☆......☆

اس تقریب میں نادام ڈیلناس نے بھی شرکت کی تھی' مقررین خطاب کررہے تھے اور کیتھرین گہرے خیالوں میں ڈوبی ہوئی تھی۔ اس کا طلسم اس وقت ٹوٹا جب چیف گیسٹ' کو اسٹیج پر بلایا جارہا تھا۔ وہ اٹھی اور باوقار چال چلتی ہوئی ڈائس کے پیچھے جا کھڑی ہوئی۔ ہال ایک بار پھر تالیوں سے گونج اٹھا۔

تقریر کا متن کچھ یوں تھا۔ لیڈیز اینڈ جنٹلمین' سدا مسکراتے رہو۔ میں وہ بدنصیب عورت ہوں جو بچپن میں ہی یتیم ہوگئی تھی' آپ لوگوں کی دعاؤں سے آج اس مقام پر کھڑی ہوں' امید ہے کہ آپ ہمیشہ نیک تمناؤں اور اچھے جذبات سے مجھے یاد رکھو گے۔ آج میں یہ اعلان کرتی ہوں کہ میرے گھر کے علاوہ ''جب تک میں زندہ ہوں'' میری تمام جائیداد کیتھرین ٹرسٹ' کے نام کردی جائے اور میرے مرنے کے بعد میرا بنگلہ بھی فروخت کرکے بے سہارا بچوں کی کفالت میں لگا دیا جائے۔ اس نے جیوری اور این جی اوز کے ممبران کو بتا دیا کہ تمام دستاویزات اس کے وکیل مسٹر سائمن کے پاس ہے جو ایک ماہ کے اندر سارا پروسیجر مکمل کرکے ٹرسٹ کے حوالے کردے گا۔ دیٹس آل...... کے ساتھ ہی تالیوں کی گونج بھی بند ہوچکی تھی۔ تمام لوگ اٹھ کھڑے ہوئے اور اپنے اپنے گھروں کو جانے کی فکر کرنے لگے۔

☆......☆......☆

رات کے دو بج رہے تھے۔ کیتھرین اپنی گاڑی میں بیٹھ چکی تھی۔ اس نے اندر کی لائٹ آن کی تو اس کی نظر ڈش بورڈ پر رکھی ہوئی ایک چھوٹی سی پاکٹ نما ڈائری پر پڑی' گاڑی کے اندر والی چھوٹی لائٹ آن کرکے اس نے ڈائری کو کھولنا چاہا' مگر اس کے صفحے جڑے ہوئے تھے' وہ کوشش کررہی تھی تاکہ یہ پیج کھل جائیں اور اس پراسرار ڈائری کا پتہ چل سکے۔ وہ انڈکس والی انگلی اور انگوٹھے کی مدد سے ان اوراق کو کھول رہی تھی ایک صفحے پر جلی حروف میں کچھ الفاظ تحریر تھے مگر کچھ سمجھ نہیں آ رہے تھے۔

وہ باری باری انگلی کو زبان پر لگا کر ڈائری کھولنے کی کوشش کرتی رہی' حتیٰ کہ اس کی زبان پر کڑواہٹ کے ساتھ ساتھ اس کی نظر بھی دھندلانے لگی۔ سر چکرانے لگا۔ اس نے جلدی سے گاڑی اسٹارٹ کی' اس کے ہاتھ لرز رہے تھے' پاؤں میں بھی طاقت کم ہونے لگی تھی۔ جونہی گاڑی ففٹی ون ایونیو والی سڑک پر چڑھی تو کیتھرین کا جسم جواب دے چکا تھا۔ ایک جھٹکا لگا' گاڑی رک گئی۔ رات کا پچھلا پہر تھا غالباً تین بج چکے تھے۔ اتنی سرد رات میں شاذ و نادر ہی کوئی ادھر سے گزرتا...... کیتھرین مرچکی تھی' اور اس کی گردن ایک طرف کو ڈھلک گئی تھی۔ اس کے ہونٹ اور چہرے کا رنگ نیلا پڑچکا تھا۔ پولیس کی دو گاڑیاں جو گشت پر تھیں ابھی ابھی وہاں پہنچی تھیں۔ گشتی ٹیم کے انچارج نے ڈپٹی ولیم کو یہ اطلاع وائرلیس سیٹ پر دے دی تھی جو چند منٹوں میں ہی وہاں پہنچ گیا' اس نے لاش پوسٹ مارٹم کے لیے بھجوادی تھی' گاڑی کے معائنے کے دوران وہ پاکٹ ڈائری بھی مل گئی تھی' اور کچھ دستاویزات وغیرہ بھی۔ کیتھرین کی گاڑی کو بھی پولیس اسٹیشن پہنچا دیا گیا۔

☆......☆......☆

صبح ہو رہی تھی' ریگن ابھی تک سویا ہوا تھا کہ اس کے فون پر سرخ سبز رنگ کے نقطے ابھرنے لگے۔ یہ نقطے عموماً پولیس چیف یا ڈپٹی چیف کی کال کو ظاہر کرتے ہیں۔

وہ بوکھلا کر اٹھا اور فون کان سے لگایا ہی تھا کہ دوسری طرف سے ڈپٹی ولیم کی بھاری اور کرخت آواز ابھری...... ڈپٹی ولیم از سپیکنگ'' آپ غالباً ریگن پال ہو کیتھرین کے شوہر...... ڈپٹی نے پوچھا۔

''جی میں ریگن پال بول رہا ہوں۔ اس کی آواز میں لرزش واضح طور پر محسوس ہو رہی تھی۔ ڈپٹی نے اسے پولیس اسٹیشن طلب کیا...... اور ساتھ اس کی بیوی کی موت کی خبر بھی اسے سنادی۔ اس خبر نے ریگن کے اعصاب کو جھنجوڑ کر رکھ دیا تھا۔ وہ گزری رات والی ساری مستی بھول چکا تھا۔

☆......☆......☆

پولیس اسٹیشن میں پولیس چیف کے علاوہ بھی کچھ لوگ تھے جن میں سراغ رساں مارٹن بھی موجود تھا۔ اس نے ریگن سے چند سوال کیے گزشتہ رات کے حوالے سے' مگر ریگن رات اسٹور میں تھا' اور اس کے بیان کی تصدیق وہاں سیکورٹی پر تعینات گارڈز نے بھی کردی تھی۔ اس کیس کو سراغ رساں مارٹن کے حوالے کیا گیا تھا' سو ریگن اس کیس سے بری الذمہ ہوگیا تھا۔

☆......☆......☆

پوسٹ مارٹم ہوچکا تھا' کیتھرین کی لاش ریگن کے حوالے کردی گئی۔

ابھی تک پوسٹ مارٹم رپورٹ مکمل نہیں ہوئی تھی اور نہ ہی کیمیکل لیبارٹری سے اس پاکٹ نما ڈائری کا تجزیہ سامنے آیا تھا۔

کیتھرین کی آخری رسومات ادا کردی گئی تھیں جس میں لاکھوں لوگوں نے شرکت کی' ٹرسٹ' این جی اوز کے ممبران کے علاوہ بھی بہت سے سوگوار چہروں نے شرکت کی' کیتھرین نے اپنا گھر بار مال و دولت جن پھولوں کے لیے وقف کردیا تھا' یہ وہی اداس چہرے تھے' جو اپنی مالکہ کو آخری سلام پیش کرنے آئے تھے۔ اس کے اپنے آنگن میں تو کوئی غنچہ نہ کھل سکا تھا' مگر جاتے جاتے اس نے ان بے شمار لاوارث پھولوں کی آبیاری کا سامان کردیا تھا۔ بظاہر وہ مرچکی تھی مگر ہزاروں دلوں میں وہ آج بھی زندہ تھی۔

☆......☆......☆

انہی دنوں امریکہ طالبان کا زور توڑنے کے لیے افغانستان پر لشکر کشی کرنا چاہتا تھا' اس سلسلے میں آج یعنی تین جنوری کو حکومتی سطح پر ایک بڑا اجلاس ہو رہا تھا جس میں حکومتی عہدیداروں کے علاوہ تمام سیاسی جماعتوں کے لیڈرز' فوجی کمانڈر خفیہ اداروں کے سربراہ' سیکرٹ اور خفیہ ایجنٹوں کے مشہور سراغ رساں بھی شامل کیے گئے' جن میں سراغ رساں مارٹن بھی تھا جس کے کوٹ کی جیب میں کیتھرین کی پوسٹ مارٹم رپورٹ کے ساتھ اس ڈائری کی بھی کیمیکل رپورٹ موجود تھی جو مقتولہ کی گاڑی کے ڈیش بورڈ سے ملی تھی۔

کچھ سائنسدان بھی اس اجلاس میں شریک تھے اور کچھ رپورٹرز تھے۔ اجلاس کی کارروائی شروع ہوچکی تھی۔ گرما گرم بحث جاری تھی' طالبان اور افغانستان پر کہ ایک نوجوان رپورٹر نے ایک عجیب سا سوال اٹھایا۔ رپورٹر نے ارباب اختیار اور فوجی کمانڈرز سے پوچھا کہ جنگ کے دوران اگر کوئی امریکی فوجی طالبان کی قید میں چلا جائے تو کیا ہوگا؟ تشدد کے ذریعے اس امریکی فوجی سے وہ سارے خفیہ راز اگلوالیں گے اور پھر نائن الیون جیسا واقعہ دوبارہ رونما ہوسکتا ہے' پورے اسمبلی ہال میں ایک خموشی چھا گئی تھی۔

گہری خموشی کے بعد ایک بزرگ سائنسدان کھڑا ہوگیا' اس نے اپنا نام پروفیسر برگ پیٹر بتایا تھا۔ لمبے قد کے ساتھ سفید بال اس کے مہذب ہونے کا پتہ دیتے تھے۔ پروفیسر نے اونچی آواز میں بتایا کہ جو امریکی فوجی افغانستان بھیجے جائیں' سامان جنگ کے ساتھ ہر ایک کو

دو قطرے ''قلوپطرہ'' زہر کسی کیپسول میں ڈال کر دیا جائے تا کہ اگر کوئی فوجی دشمن کے نرغے میں آ جائے تو ایک قطرہ زہر اپنی زبان پر لگانے سے اپنی زندگی کا خاتمہ کر سکتا ہے۔

☆......☆......☆

پھر پروفیسر نے بتایا وہ کچھ عرصہ پہلے چند سالوں کے لیے ساؤتھ افریقہ کے شہر کیپ ٹاؤن سے دس کلو میٹر شمال کی طرف ایک ایسی لیبارٹری میں رہا ہے جہاں پرندوں پر ریسرچ کی جاتی ہے۔ یہ سمندری پرندے صومالیہ اور ساؤتھ افریقہ میں بہت پائے جاتے ہیں۔ ان پرندوں میں ایک ایسا نایاب پرندہ ہے جس کے پتے میں یہ زہر پایا جاتا ہے' یہ بہت خطرناک زہر ہے اور صرف نیلسن منڈیلا نامی لیبارٹری میں دستیاب ہے۔ یعنی ساؤتھ افریقہ سے یہ زہر جس کو ''قلوپطرہ پوائزن'' سے پکارا جاتا ہے۔ مل سکتا ہے۔ اجلاس میں شریک تمام لوگوں نے پروفیسر برگ کی اس تجویز کو سراہا تھا۔ یوں صبح آٹھ بجے شروع ہونے والا یہ اجلاس بارہ بجے ختم ہوا۔

کچھ ریفریش منٹ کرنے کے بعد تمام حضرات جا رہے تھے' مگر مارٹن پروفیسر پیٹر برگ کا سیل نمبر لینا نہیں بھولا تھا۔ کیونکہ اس کے انکشاف نے جو اس نے قلوپطرہ زہر کے متعلق کیا تھا' مارٹن کے پیٹ میں ایک بے چینی سی پیدا کر دی تھی' جو زہر ڈائری کے صفحوں پر لگا کر کیتھرین کی گاڑی میں رکھا گیا تھا' اور جس سے فوراً ہی اس کی موت واقع ہو گئی تھی وہ یہی مہلک قسم کا زہر تھا۔

☆......☆......☆

ایک بجے سراغرساں مارٹن اپنے دفتر میں نیویارک ٹائمز اخبار پڑھتے پڑھتے کچھ چونک سا گیا تھا۔ اخبار میں ریگن کی شادی کی خبر چھپی تھی اور اس کے ساتھ جس لڑکی کی تصویر تھی' وہ بڑی خوبصورتی کے ساتھ عروسی جوڑے میں ملبوس تھی۔ اور بڑی دلکش بھی تھی۔

مارٹن سوچ رہا تھا کہ کیتھرین کو مرے ابھی پندرہ دن بھی نہیں گزرے کہ ریگن نے نئی شادی کر لی۔

☆......☆......☆

مارٹن نے کافی پی اور سگریٹ سلگائی۔ وہ جب بھی بیئر یا کافی پی کر سگریٹ پیتا تو اس کا ذہن تیز ہو جاتا تھا۔ اس نے اخبار لپیٹا اور سیدھا پروفیسر سائنسدان پیٹر برگ کے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ فون نمبر کے ساتھ ہی مارٹن نے پروفیسر کا ایڈریس بھی لے لیا تھا۔ جب وہ وہاں پہنچا تو اس نے کال بیل کا بٹن دبا دیا' کچھ دیر خاموشی رہی' کوئی دس بارہ منٹ بعد دروازہ کھلا تو پروفیسر سامنے کھڑا مسکرا رہا تھا۔ آیئے آیئے مسٹر سراغ رساں صاحب' پروفیسر نے بڑی بے تکلفی سے کہا۔ دونوں اندر چلے گئے۔ پروفیسر نے ملازم سے کہہ کر چائے منگوائی' کچھ سینڈوچ' برگر وغیرہ بھی تھے۔

اور پھر پروفیسر پیٹر برگ نے اپنی کہانی شروع کی جو کچھ یوں تھی...... میں میکسیکو کا رہنے والا ہوں' بچپن میں ہی والدین فوت ہو گئے' مجھے کسی رشتہ دار کا کوئی علم نہیں تھا' اس وقت میری عمر لگ بھگ تین سال کی ہو گی' مجھے سرکاری ٹرسٹ میں رکھا گیا۔ وہاں میں نے سائنس کی تعلیم پر زور دیا۔ یوں جب میں جوان ہوا تو مجھے ڈگری مل چکی تھی۔ ٹرسٹ سے نکلا تو مجھے واشنگٹن میں ایک ایٹمی ریسرچ لیبارٹری میں جاب مل گئی' میں نے ابھی تک شادی نہیں کی کیونکہ میری ساری دلچسپی سائنس میں تھی۔ شادی کا خیال ہی نہیں آیا' پھر مجھے کچھ عرصہ ساؤتھ افریقہ بھیج دیا گیا' ابھی حال ہی میں وہاں سے واپس لوٹا ہوں۔ اور جس زہر کے بارے میں آپ پوچھنے آئے ہیں یہ زہر اسی لیبارٹری میں موجود ہے۔ پروفیسر نے اپنی داستان ختم کر کے سگریٹ سلگا لیا تھا۔ مگر جس مقصد کے لیے مارٹن آیا تھا وہ ابھی پورا نہیں ہوا تھا۔ مارٹن نے اپنے کوٹ کی جیب سے وہ اخبار نکال لیا تھا' جس میں ریگن اور اس کی دوسری بیوی کی تصویر تھی۔

☆......☆......☆

پروفیسر برگ اس لڑکی کی تصویر کو پہچان چکا تھا۔ یہ وہی الیگزا تھی جو پروفیسر برگ کے ساتھ کیپ ٹاؤن کی اس لیبارٹری میں کام کر چکی تھی' اور جسے سائنسدان پروفیسر برگ نے شادی کے لیے پروپوز بھی کیا تھا' مگر وہ ٹال گئی تھی۔

وہ ساؤتھ افریقہ کیسے پہنچی یہ کہانی ذرا لمبی ہے' فی الوقت آپ یہ سمجھیں کہ وہاں اس کی خالہ رہتی تھی' وہ اس کے پاس چلی گئی تھی اور لیبارٹری میں اسے جاب مل گئی۔

☆......☆......☆

اور آج وہی الیگزا مسز ریگن پال بن کر سہاگ رات منانے کی تیاریوں میں مصروف تھی مگر کاتب تقدیر کے لکھے کو کوئی نہیں جانتا۔

☆......☆......☆

شام کے پانچ بج رہے تھے جب سراغ رساں مارٹن اپنے دفتر سے پولیس ڈیپارٹمنٹ میں فون کر رہا تھا۔ پھر جونہی شام ڈھلنے لگی' دن رات میں بدل گیا' آسمان پر کچھ ستارے نمودار ہو چکے تھے۔ جب مارٹن نے کیتھرین لاج کے بڑے گیٹ پر لگی بیل پر ہاتھ رکھا' ریگن نے جلدی سے دروازہ کھولا' وہ سمجھا تھا شاید جیرالڈ گلاب کے پھول لایا ہے مگر ایک پولیس آفیسر کے ہاتھ میں ہتھکڑی دیکھ کر اس کی بھویں سکڑ گئی تھیں اور سانسیں پھولنے لگی تھیں۔

اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ پولیس کی تین گاڑیاں اس کے گھر کو گھیرے میں لیے ہوئے تھیں' پولیس چیف کے ساتھ لیڈی پولیس آفیسر بھی تھی۔ مارٹن نے الیگزا کے وارنٹ گرفتاری دکھاتے ہوئے اندر کی طرف قدم بڑھا دیئے' پولیس چیف اور لیڈی پولیس آفیسر کے علاوہ اور بھی کافی پولیس کی نفری ساتھ تھی۔ اندر الیگزا حجلہ عروسی میں بیٹھی ریگن کا انتظار کر رہی تھی۔ مگر اچانک پولیس کو دیکھ کر اس کا گلابی چہرہ پیلا پڑ گیا تھا۔ لیڈی پولیس آفیسر نے الیگزا کے مہندی لگے ہاتھوں میں ہتھکڑی لگا دی تھی۔ الیگزا نے کوئی مزاحمت نہیں کی۔ سراغ رساں مارٹن نے اس کے کان میں کہا تھا جو کسی کا سہاگ اجاڑ دے وہ کیسے سہاگن بن سکتی ہے۔ ریگن جو بت بنا کھڑا تھا ساری صورتحال سمجھ چکا تھا۔ اس کی وہ خواہش آج بھی شاید ادھوری رہ گئی تھی۔ جو وہ بائیس دسمبر کی رات پوری کرنا چاہتا تھا' جب الیگزا کو پولیس گاڑی میں لے جا رہی تھی' ریگن نے اس کی طرف دیکھا تک نہیں تھا۔ اگلے دن الیگزا کا پانچ دن کا جسمانی ریمانڈ لے لیا گیا' مگر پہلے دن ہی اس نے اقرار جرم کر لیا۔

اقبال جرم کرتے ہوئے الیگزا نے بتایا کہ جب کیتھرین بائیس دسمبر کی رات نو بجے یونیورسٹی ہال میں جا رہی تھی تو اس نے ماسٹر کی کے ذریعے کیتھرین کی گاڑی کا دروازہ کھول کر وہ زہریلے کاغذوں والی ڈائری ڈیش بورڈ پر رکھ دی تھی' اور پھر ریگن کے پاس اسٹور میں پہنچ گئی تھی۔ وہ اس دن کو کوس رہی تھی جب ریگن سے ملاقات ہوئی تھی۔ وہ اس کے پیار میں ڈوب گئی تھی وہ رو رہی تھی کہ اس نے کیتھرین جیسی معصوم لڑکی کو قتل کر دیا۔

☆......☆......☆

جس دن الیگزا کو سزائے موت سنائی جا رہی تھی' پروفیسر پیٹر برگ بھی کمرہ عدالت میں موجود تھا۔ اس نے الیگزا کے کان میں کچھ کہا تھا مگر الیگزا نے جیسے انکار میں سر ہلایا تھا۔ وہ جیل جا چکی تھی۔ مارٹن کے پیٹ میں پھر مروڑ اٹھ رہے تھے۔ وہ بات جاننا چاہتا تھا جو پروفیسر برگ نے کمرہ عدالت میں الیگزا کے کان میں کہی تھی۔ وہ جیل میں الیگزا سے ملا' جس کا حسن ماند پڑ چکا تھا۔ وہ جسم جو کبھی آفتاب کی طرح چمکتا تھا' ہڈیوں کا ڈھانچہ بن گیا تھا۔ باتوں باتوں میں مارٹن نے اس سے وہ بات پوچھ ہی لی' جس کے لیے وہ بے تاب تھا۔ الیگزا نے بتایا کہ پروفیسر کہہ رہا تھا مجھ سے شادی کرنے کی ہامی بھر لو میں ہائر اتھارٹی سے آپ کی رہائی کی سفارش کر دوں گا۔ مگر میں اپنے گناہ کا کفارہ ادا کرنا چاہتی ہوں' جیل میں رہ کر۔

☆......☆......☆

آج کیتھرین کی موت کو ایک مہینہ ہو چکا تھا۔ اس کی تمام جائیداد ٹرسٹ کے حوالے کر دی گئی تھی۔ آج اس کا گھر بھی نیلام کر کے ساری رقم ''کیتھرین ٹرسٹ'' کو دی جا رہی تھی۔

ریگن پال جب شکاگو جانے والی بس میں سوار ہو رہا تھا تو اس نے ایک آخری نظر نیویارک شہر پر ڈالی تھی' اس شہر میں اس کی بہت سی یادیں دفن ہو چکی تھیں۔ وہ جب لاوارث ہو کر یہاں ٹرسٹ میں آیا تھا تو خالی ہاتھ تھا' اور آج جب وہ یہاں سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جا رہا تھا تو بھی ''خالی ہاتھ''



ایک سو سولہ چاند کی راتیں

عشنا کوثر سردار

قسط نمبر 15

یہ ناول 1947ء کے تقسیم ہندوستان کے پس منظر میں ہے، اس کے تمام کردار تقریباً 69 سال قبل کے ہیں جنہوں نے Partition سے ایک سو سولہ دن قبل جنم لیا، انڈو پاک کی تقسیم جب ہونے جا رہی تھی اس دوران اپنا سفر شروع کیا، جہاں ایک پاک سرزمین کی تاریخ رقم ہوئی ہمیں ایک آزاد مملکت کا احساس ملا وہیں محبت نے دلوں میں گھر بھی کیا، یہ سفر تب شروع ہوتا ہے جب ناول کے دو کردار پہلی بار 18 اپریل 1947ء کو ملے۔ اس سے آگے کی ایک سو سولہ راتیں ان کی ان کہی محبت کا ایک سفر ہے۔ جب تاریخ رقم ہو رہی تھی زمین ٹکڑوں میں تقسیم ہو رہی تھی تب خاموشی میں کہیں محبت دلوں کو جوڑ رہی تھی۔ زمین کی تقسیم نے دلوں کو تقسیم نہیں کیا تھا دلوں کو جوڑ دیا تھا اس تقسیم کی جو صعوبتیں ہماری ان نسلوں نے سہی تھیں ان کا اندازہ ہم نہیں کر سکتے مگر میں نے اس تکلیف کو اپنے اندر محسوس کیا ہے۔ میرے ناول کے کردار ان مصائب سے گزر رہے ہیں اور ان کے ساتھ میں نے بھی ان مصائب کی تکلیف کو محسوس کیا ہے وہ ڈر...... وہ خوف...... تمام احساسات میرے اندر کہیں مجھے محسوس ہوتے رہے ہیں۔



وہاں جیسے کوئی موجود تھا ان کے چونکنے پر جو کوئی بھی تھا اپنی جگہ چھوڑ گیا تھا نواب صاحب نے خاموشی سے دیکھا تھا حکمت صاحب بولے تھے۔

''نواب صاحب محل میں کون ہے جو گھر کے معاملات کی خبر گیری رکھتا ہے۔''

''کوئی نہیں ہے کوئی ملازم ہوگا شاید کوئی کام کر رہا تھا۔'' وہ سرسری لہجے میں بولا تھا حکمت صاحب نے ایک نگاہ ان پر ڈالی تھی اور دانستہ بات کو طول دیے بنا سمیٹ لیا تھا۔

''خیر کل ملتے ہیں پھر اجلاس میں۔'' وہ اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔

❁ ❁ ...... ❁ ...... ❁ ❁

فتح النساء نے از سر نو معاملات کو جانچا تھا انہیں جلال کی طبیعت پر غصہ نہیں آیا تھا یہ بدگمانیاں اس طور پھیلائی گئی تھیں کہ رشتوں میں دراڑ ہمیشہ باقی رہے حیدر میاں نے جس طور اپنی اوقات دکھائی تھی انہیں حیرت ان سے بھی نہیں تھی جب وہ اپنے ناپاک ارادوں میں کامیاب نہیں ہو سکے تھے تو انہوں نے ایسا جال بچھا دیا تھا کہ ہر دیکھنے والا ان معاملات کو کسی اور کے زاویے سے دیکھے۔

''بیگم صاحبہ چھوٹے نواب صاحب کو کھانے پر مدعو کر رہے ہیں۔'' ملازم نے کہا تھا اور فتح النساء نے چونک کر دیکھا تھا۔

''ہمیں بھوک نہیں۔'' انہوں نے مدہم لہجے میں کہا تھا اور چلتی ہوئی فون اسٹینڈ کی طرف بڑھ گئی تھیں ملازمہ واپس پلٹ گئی تھیں۔ جب وہ بوا سے بات کر رہی تھیں تبھی جلال دروازے میں آن رکے تھے فتح النساء ان کو دیکھ کر چونکی تھیں۔

''ہم آپ سے بعد میں بات کریں گے بوا۔'' انہوں نے فون کال کا سلسلہ منقطع کرتے ہوئے کہا تھا۔

''آپ کھانے کے لیے نہیں تشریف لائیں۔'' جلال نے شکوہ کیا تھا۔

''وہ دراصل ہمیں بھوک نہیں تھی اور۔'' وہ وضاحت دینا چاہتی تھیں جب وہ قطع کلامی کرتے ہوئے بولے تھے۔

''جب تک یہاں ہیں محل کے اصولوں کی پاس داری کر لیا کریں فتح النساء اس کے بعد آپ یقیناً اس سے آزاد ہوں گی۔'' وہ کہہ کر پلٹ گئے تھے ان کی لاتعلقی اور شکوہ جیسے دل میں پیوست ہو کر رہ گیا تھا مگر وہ خاموشی سے ان کی تقلید کرتی ہوئی ان کے پیچھے چل پڑی تھیں۔

❁ ❁ ...... ❁ ...... ❁ ❁

ابا جان نے اسے بلوایا تھا تو وہ کسی قدر حیرت میں مبتلا ہوئی تھیں۔

''ابا جان آپ نے بلوایا تھا۔'' عین نے پوچھا تھا ابا نے ان کو بیٹھنے کا اشارہ کیا تھا عین بیٹھ کر ان کی طرف خاموشی سے دیکھنے لگی تھیں۔ اتنا تو پتا چل گیا تھا کہ کوئی اہم معاملہ تھا ورنہ وہ اس طرح ان کو طلب نہیں کرتے تھے۔

''بیٹا مرزا صاحب نکاح کی بات کر رہے ہیں، بچپن میں طے کیے گئے اس رشتے کو وہ اب عملی جامہ پہنانے کے خواہشمند ہیں، وہ حیدر میاں پر ذمہ داریاں ڈالنا چاہتے ہیں ان کے نزدیک ایسا کرنا انہیں راہ راست پر لا سکتا ہے۔''

''لیکن ابا جان۔'' عین نے ان کی بات کو قطع کرنا چاہا تھا مگر پھر احتراماً خاموش ہو گئی تھیں تبھی ابا جان بولے تھے۔

''ہم جانتے ہیں مرزا سراج الدولہ ہمارے خلاف سازشوں کے مرتکب پائے گئے ہیں۔ مگر ہم مرزا سراج کو پہلے ہی معاف کر چکے ہیں اور دوسری بات ہم ایک انسان کے قول و فعل کا ذمہ دار دوسرے کو نہیں مانتے جو سراج صاحب نے کیا اس کی سزا ہم حیدر میاں کو نہیں دے سکتے ہم یہ رشتہ ختم نہیں کر سکتے۔ مرزا سراج کا سازشوں میں ملوث پایا جانا ایک قیاس ہے ہم ملازم کی گواہی کا یقین نہیں رکھتے اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ وہ ایسا کرتے رہے ہیں تو کیا معاف کر دینا بہتر نہیں، ہم معاف کر چکے ہیں سو ہم شادی کے معاملے میں رضا مندی دینا چاہتے ہیں۔'' ابا جان نے کہا تھا اور عین ان کو دیکھ کر رہ گئی تھی۔

❁ ❁ ...... ❁ ...... ❁ ❁

''آپ کو اپنے بیٹے کی کوئی فکر ہے کہ نہیں؟ معاملات کو نواب صاحب کے کان میں کیوں نہیں ڈالتے آپ اگر آپ نے ایسا نہ کیا تو میں خوش بخت کے ساتھ ان کی بات پکی کر دوں گی اور اس کے اثرات کے ذمہ دار آپ ہوں گے۔'' بیگم حکمت نے کہا تھا اور حکمت صاحب ان کو دیکھ کر

رہ گئے تھے پھر نرمی سے بولے تھے۔

''بیگم یہ اقدام مناسب نہیں لگتا میں ایسے رشتے کی بات نہیں کر سکتا کیونکہ عین بیٹی کی بات ان کے بچپن سے طے ہے اور اس رشتے کی موجودگی میں ایک نئے رشتے کی بات کرنا مناسب نہیں لگتا۔'' حکمت صاحب نے کہا تھا تب بیگم حکمت ان کو خاموشی سے دیکھنے لگی تھیں۔

''یہ ضروری نہیں کہ رشتے مرضی سے طے ہوں تیمور کے نصیب میں جو ہوگا وہ اسے مل کر رہے گا آپ ایسے زبردستی چیزوں کو توڑنے موڑنے کی کوشش مت کریں جو شے ہمارے اختیار میں نہیں ہم اس کے متعلق تردد نہیں کر سکتے۔'' وہ متانت سے بولے تھے اور بیگم حکمت انہیں دیکھنے لگی تھیں۔

''آپ کو جو مناسب لگے آپ کریں۔ ہم نے ٹھان لی ہے کہ ہم تیمور کا رشتہ خوش بخت کے ساتھ طے کر دیں گے باقی آپ جو سوچیں آگاہ کر دیں۔'' وہ لاتعلقی سے بولی تھیں حکمت صاحب دیکھ کر رہ گئے تھے۔

❁ ❁ ...... ❁ ...... ❁ ❁

''بیگم ہم سوچ رہے ہیں بہو بیگم کی رخصتی کرا لیں جیسے جو بھی ہوا سو ہوا مگر بہرحال فتح النساء اس محل اور خاندان کی بہو ہیں نکاح جیسے بھی ہوا ہو مگر ان کا باقاعدہ اس گھر میں آنا ضروری ہے آپ کیا کہتی ہیں؟'' نواب صاحب نے پوچھا تھا بیگم صاحبہ ان کو دیکھنے لگی تھیں۔

''بچے بھی کیا گھر بساتے ہیں شادی بیاہ کو بچوں کا کھیل سمجھ لیا آپ نے؟'' وہ سخت لہجے میں گویا ہوئیں۔

''بیگم یہ بات تو آپ کو اپنے لاڈلے سپوت سے پوچھنا چاہیے نکاح انہوں نے کیا ہے اس کا الزام کسی اور کے سر کیا دھرنا۔'' نواب صاحب غیر جانبداری سے بولتے ہوئے مسکرائے تھے۔

''ہم نے کب کہا کسی کو کچھ بات الزام دینے والی نہیں نواب صاحب بات اصول کی ہے مانا نکاح ہو گیا مگر فتح النساء تو نکاح کے بعد تنی بیٹھی ہیں ایک بار ان کو احساس ہوا کہ آئیں اور ہم سے ملیں چلی گئیں محل میں آتے ان کو قدغن ہے؟'' بیگم صاحبہ نے دانستہ سخت لہجہ اختیار کیا تھا نواب صاحب مسکرا دیے تھے۔

''جانے دیجیے بیگم آپ کی بہو ہیں بہو کو بیٹی سمجھنا چاہیے بیٹی کو جا کر گھر لانے میں کوئی قباحت نہیں۔'' نواب صاحب نے نرم لہجے میں کہا تھا بیگم صاحبہ دیکھ کر رہ گئی تھیں۔

''بیٹی کو دعوت کہاں دینا پڑتی ہے نواب صاحب جانے دیجیے ہم بیٹی جانتے رہیں اور وہ بہو بن کر تن کر بیٹھی رہیں۔'' بیگم صاحبہ نے غصہ کا اظہار کیا تھا۔

''بیگم آپ بھی تو بہو ہیں آپ کے ناز نخرے تو ابھی تک اٹھائے جا رہے ہیں۔'' نواب صاحب نے مسکراتے ہوئے چھیڑا تھا بیگم صاحبہ جھینپ کر رہ گئی تھیں۔

''آپ بھی نا۔''

''ہاں تو آپ کی ساس بیگم تو ابھی تک آپ کو دلہن بیگم کہہ کر بلاتی ہیں اور تو اور ابھی تک آپ کے ناز بھی نئی نویلی بہوؤں کی طرح اٹھاتی ہیں اکلوتی بہو ہیں آپ اور خیر سے فتح النساء بھی ہماری اکلوتی بہو ہوئیں۔'' نواب صاحب نے کہا تھا تو بیگم صاحبہ نے سر ہلایا تھا۔

''آپ اماں سے بات کر لیں جو اماں کہتی ہیں وہ کر لیتے ہیں۔'' بیگم صاحبہ نے گویا نیم رضا مندی ظاہر کی تھی نواب صاحب نے سر ہلا دیا تھا۔

''وہ تو ٹھیک ہے بیگم مگر آپ کے صاحبزادے نے نکاح زبردستی کیا ہے اپنی مرضی کو اہم جانا ہے آپ کو جا کر ایک بار فتح النساء بیٹی سے ملنا ہوگا، ان کے دل کی بات جاننا بھی ضروری ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ اس نکاح کے لیے رضا مندی دینا ہی نہ چاہتی ہوں اگر ان کی آمادگی نہیں تو یہ نکاح کوئی وقعت نہیں رکھے گا دونوں فریقین کی مرضی جاننا ضروری ہے نکاح اور شادی کے معاملات کسی ایک فریق کی مرضی سے نہیں چلتے۔'' نواب صاحب نے سمجھایا تھا۔

''ویسے یہ چھوٹے نواب پر الزام لگتا ہے وہ بھلا کیوں ایسا چاہیں گے ان کو لڑکیوں کی کمی تھی کیا کہ وہ زبردستی نکاح کسی پر مسلط کرنا چاہیں گے یہ بات دل کو جمتی نہیں، محبت کا کوئی معاملہ بھی نہیں عشق ہوتا تو ہم کہتے کہ چھوٹے نواب کی آنکھوں پر اور عقل پر پٹی بندھی تھی سو عشق نے کچھ دیکھنے نہیں دیا۔'' بیگم صاحب نے کہا تھا۔

''بیگم جیسے بھی ہوا عشق کی موجودگی میں یا عشق کے بنا بہرحال عشق نہ سہی ایک جائز رشتہ تو ہے اور ہم خود بیٹی والے ہیں ہم کسی پر انگلی نہیں اٹھا سکتے اور فتح النساء کو تو یوں

بھی ہم نے ہمیشہ اس گھر کی بیٹی کا درجہ دیا ہے اور ان کو بیٹی سمجھا بھی ہے ہم ان پر رتی بھر بھی شک نہیں کر سکتے۔" نواب صاحب سنجیدگی سے گویا ہوئے تھے تبھی وہ بولی تھیں۔

"شک کی بات نہیں نواب صاحب شک کی بات تو سرے سے ہم نے کی ہی نہیں ہم تو یہ کہہ رہے ہیں کہ چھوٹے نواب نے اچانک سے فتح النساء کو زندگی میں شامل کرنے کا فیصلہ کیونکر کرلیا فتح النساء کو جانتے ہیں ہم وہ با کردار لڑکی ہیں ان کی حقیقت منکشف ہے اس گھر پر بہر حال نوابی دماغ ہے نواب کا دماغ اور اونٹ کا دماغ ایک جیسا ہوتا ہے کس کروٹ بیٹھے خبر نہیں ہوتی چھوٹے نواب کے دل و دماغ کی ان کو خبر مگر ہم پھر بھی کہیں گے آپ کو فتح النساء کی فکر ہو رہی ہے وہ تو خیر لڑکی ہیں۔ لڑکیاں تو زندگی میں سمجھوتے کر لیتی ہیں ہمیں جلال کی فکر ہے آپ ان سے بات کرلیں کہیں ایسا نہ ہو ہم فتح النساء کو یہاں لانے کا ذکر چھیڑیں اور جلال بدک جائیں جوان اولاد ہے ان کی مرضی کا خیال کرنا بھی ضروری ہے۔" بیگم صاحب نے کہا تھا تو نواب صاحب نے سر ہلایا تھا۔

"مرزا صاحب جتنی سبکی آپ کی ہوئی ہے اس کا خاتمہ ایک ہی صورت میں ممکن ہے آپ سیدھا جا کر نواب صاحب سے حیدر میاں کی شادی کے معاملات طے کرلیں معاملات بدلیں گے تو توجہ بھی بٹ جائے گی توجہ بٹے گی تو آپ کی شرمندگی بھی جاتی رہے گی اور سبکی کا احساس بھی معدوم ہو جائے گا۔" ایک احباب نے بہت سلجھاؤ کے ساتھ مشورہ دیا تھا مرزا صاحب پر سوچ نظروں سے ان کی طرف دیکھنے لگے تھے۔

"صحیح کہا آپ نے آفتاب صاحب یوں بھی کسی کے بال پاؤں میں ہوں تو کوئی سر مشکل سے اٹھاتا ہے ان موصوف کی عزت ہمارے گھر ہوگی تو وہ کوئی معاملہ اٹھا ہی نہیں سکیں گے۔" مرزا صاحب نے کہا تھا اور آفتاب مسکرائے تھے۔

"آپ کی ہمشیرہ زندہ ہوتیں تو معاملہ وٹہ سٹہ کا ہو جاتا ان کی عزت آپ کے گھر آپ کی عزت ان کے گھر سو کوئی فریق بھی سر نہ اٹھا پاتا۔" آفتاب صاحب مسکرائے تھے اور مرزا سراج الدولہ کی رگیں تن گئی تھیں ان کی آنکھوں میں جیسے خون اتر آیا تھا انہوں نے غصے کو گویا دبانے کو مشروب کا گلاس اٹھا کر لبوں سے لگایا تھا۔

آفتاب صاحب نے تسلی دینے کو ہاتھ ان کے شانے پر رکھا تھا۔

"ہم موجود تھے مرزا صاحب ابا جان مرحوم نے رشتہ بھی بجھوایا تھا مگر آپ تب تک اپنی ہمشیرہ کی بات نواب صاحب کے بڑے بھائی کے ساتھ طے کر چکے تھے اگر ان کا نکاح ہم سے ہوا ہوتا تو شاید آج وہ زندہ ہوتیں اور خوش و خرم زندگی گزار رہی ہوتیں۔" آفتاب صاحب نے گویا جلتی پر تیل کا کام کیا تھا مرزا سراج الدولہ کی گرفت گلاس پر اس قدر بڑھی تھی کہ کانچ کا گلاس ان کے ہاتھ کے دباؤ سے چکنا چور ہو کر رہ گیا تھا۔

"اوہ مرزا صاحب آپ نے تو ہاتھ زخمی کرلیا دیکھیے خون رس رہا ہے۔" آفتاب صاحب ہمدردی سے بولے تھے اور ان کے ہاتھ سے کانچ لے کر ایک طرف رکھتے ہوئے اپنے رومال سے زخم کو لپیٹا تھا۔

"ہم کبھی بھول نہیں سکیں گے ہماری ہمشیرہ نے جتنی تکلیف سہی اس کا ازالہ نواب صاحب کی بیٹی کو کرنا ہوگا ہم نے نواب صاحب کو معاف نہیں کیا نہ ان کے بھیا کو ان کے بھیا نے جتنی تکلیفیں ہماری ہمشیرہ کو دیں اس سے زیادہ بری تکلیف ہم نواب صاحب اور ان کے خاندان کو دیں گے۔" وہ مضبوط ارادے سے بولے تھے تبھی آفتاب صاحب گویا ہوئے تھے۔

"جناب ہمیں تو یہ تمام نواب صاحب کا کیا دھرا لگتا ہے انہوں نے بڑے بھائی کو جائیداد سے برخاست کرنے کے لیے پاگل قرار دلوایا اور پھر راستے سے ہٹا دیا اور اس خودکشی سے قبل انہوں نے آپ کی ہمشیرہ کی زندگی کو جہنم بنائے رکھا اور اتنا مجبور کیا کہ وہ زندگی کو خیر باد کہہ گئیں نواب صاحب کا اصل چہرہ چھپا ہوا ہے اپنی نیت کی خرابی کا ازالہ کرنے کو بہت میٹھے بنے پھرتے ہیں مگر درحقیقت وہ ایک چالباز شخص ہیں۔" آفتاب صاحب نے کہا تھا مرزا سراج الدولہ نے سر ہلایا تھا۔

"جانتے ہیں ہم اور ہم نواب صاحب کو معاف نہیں کریں گے ان کو وہ سزا دیں گے کہ ان کی پشتوں کو یاد رہے گا کہ کسی نے سزا دی تھی، معاف کرنے والے ہم بھی نہیں

ہماری ہمشیرہ کو جو اذیت دی اس سے کہیں زیادہ ہم نواب خاندان کے ہر فرد کو دیں گے۔" وہ مضبوط ارادے سے بولے تھے اور آفتاب صاحب مسکرا دیے تھے انہوں نے ڈرنک کا گلاس مرزا کی طرف بڑھایا تھا جسے تھام کر مرزا سراج الدولہ نے منہ سے لگا لیا تھا۔

❁ ❁ ...... ❁ ...... ❁ ❁

"ابا جان آپ نے ارادہ کر لیا ہے تو ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہم نے نکاح کیا ہے اور ہم نکاح کی اہمیت بہر حال سمجھتے ہیں فتح النساء اس خاندان کا حصہ بن چکی ہیں اور آپ کو ان کو اس محل میں لانا چاہیے اسی عزت اور احترام کے ساتھ جس کی حق دار وہ ہیں۔" جلال نے سمجھداری سے کہا تھا اور نواب صاحب نے ان کو دیکھتے ہوئے فخر سے ان کے شانے پر ہاتھ رکھا تھا۔

"بیٹا ہمیں خوشی ہوئی ایک نواب زادے کا جو سوچ اور طرز تخاطب ہونا چاہیے وہ آپ کا ہے ہمیں خوشی ہے ہمارے سپوت بیرون ملک رہ کر بھی اپنی اقدار سے جڑے ہوئے ہیں۔" انہوں نے فخریہ کہا تھا اور جلال ان کو دیکھ کر رہ گئے تھے۔

"یہ بات تو ہے کہ آپ فتح النساء کو محض دینے کے لیے اس رشتے کو نبھانا چاہتے ہیں فتح النساء کو اس گھر میں لانا چاہتے ہیں مگر اس کے برعکس آپ کیا سوچتے ہیں کیا آپ اس نکاح کو قائم رکھ سکیں گے۔" اس تعلق کو نباہ سکیں گے اگرچہ ایسا ممکن نہیں کہ ہماری اولاد ہو کر آپ اپنی قدروں کے خلاف جائیں یا پھر اس تعلق یا رشتے کو کوئی اہمیت نہ دیں مگر پھر بھی ہم آپ سے پوچھنا چاہتے ہیں کیا آپ فتح النساء کے وفادار رہیں گے۔ ہم نے فتح النساء کو بیٹی سمجھ کر پالا ہے ہمیں وہ بہت عزیز ہیں اور ہم ان کو دکھ کی کیفیت میں نہیں دیکھ سکیں گے آپ ہمارے ہونہار اور لاڈلے سپوت ضرور ہیں مگر ہم آپ کو ایسی کسی کوتاہی کے لیے معاف نہیں کریں گے۔" نواب صاحب نے حتمی انداز میں کہا تھا اور جلال ان کو دیکھ کر رہ گئے تھے پھر جیسے کچھ سوچ کر قدرے توقف سے بولے تھے۔

"ابا جان، ہم نواب خاندان سے جڑے ہیں اور آپ کا خون ہیں قدم اٹھا کر واپس لینا ہم نے نہیں سیکھا اتنا یقین دلاتے ہیں کہ ہم فتح النساء کو اس رشتے سے جڑی عزت، توقیر اور مکمل احترام ملے گا اور ہم ان کے حقوق ہمیشہ ادا کریں گے۔" جلال نے بردباری سے کہا تھا نواب صاحب نے سر ہلا دیا تھا۔

اقوال خلیل جبران

مجھ سے وہی لوگ حسد اور دشمنی کرتے ہیں جو میرے مقابلہ میں کمتر ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ میں کسی سے بڑھ کر نہیں ہوں۔

اور میری تعریف یا توہین وہی شخص کر سکتا ہے جو مجھ سے بڑھ کر ہو لیکن آج تک نہ کسی نے میری تعریف کی اور نہ توہین اس سے معلوم ہوتا ہے کہ میں کسی سے کم تر نہیں ہوں۔

اگر بادل میں بیٹھ جاؤ، تو تمہیں دو ملکوں کے درمیان حدِ فاصل اور کھیتوں کے درمیان سنگِ فاصل بالکل نظر نہ آئے۔

لیکن افسوس تو اسی کا ہے کہ تم بادل پر بیٹھ نہیں سکتے۔

جب میں ایک شفاف آئینہ بن کر تمہارے سامنے کھڑا ہوا تو تم مجھے دیر تک غور سے دیکھتے رہے اور تمہیں میں اپنی صورت نظر آئی

پھر تم نے مجھ سے کہا۔

"میں تم سے محبت کرتا ہوں۔"

لیکن درحقیقت تم نے مجھ سے نہیں اپنی ذات سے محبت کی تھی۔

جو آدمی جتنا زیادہ بولتا ہے اتنا ہی ناسمجھ ہوتا ہے اور ایک خطیب اور دلال کے درمیان بہت بڑا فرق ہے۔

جب تمہارا غم یا خوشی حد سے بڑھ جائے، تو دنیا تمہاری نظروں میں حقیر ہو جائے گی۔

نوشین اقبال نوشی ...... گاؤں بدر مرجان

❁ ❁ ❁ ...... ❁ ...... ❁ ❁

بیگم صاحبہ فتح النساء کے سامنے وضع داری سے بیٹھتے ہوئے انہیں بغور دیکھا تھا۔

''آپ نے کیوں زحمت کی ہمیں حکم بھجوا دیا ہوتا اماں جان ہم حاضر ہو جاتے۔'' فتح النساء شرمندہ ہو کر بولی تھیں اماں جان نے ان کو خاموشی سے دیکھا تھا پھر قدرے نرمی سے گویا ہوئی تھیں۔

''آپ نواب خاندان کی بہو ہیں فتح النساء یہ وقار یہ مرتبہ اب آپ کو زیب دیتا ہے۔

ہمیں نواب خاندان کی بہو ہونے کا شرف حاصل ہے اور جو عزت ہمیں ملی ہم اس کا حق دار آپ کو تصور کرتے ہیں آپ سے ملنے آنا ہمیں رشتوں کی قدر کرنا سکھاتا ہے مرتبے سے نیچے نہیں لاتا ہمیں ایک بیٹی سمجھ کر محل میں جو مقام اب تک ملا ہے آپ بھی یقیناً اس کی حقدار ہیں۔ اماں جان ہم سے ملنے اسی طور آئی تھیں اور اب ہمارا چل کر آنا اور آپ سے ملاقات کرنا اسی عمل کی پیروی ہے۔'' بیگم نے بہت نرمی سے کہا تھا فتح النساء ان کو دیکھ کر رہ گئی تھیں۔

فتح النساء یقیناً اس ملاقات کا مدعا جاننے کی خواہش مند تھیں اور بیگم صاحبہ بھی وقت ضائع کرنے کی قائل نہیں تھیں تبھی گویا ہوئی تھیں۔

''ہمیں باتوں کو توڑنا موڑنا پسند نہیں فتح النساء آپ کے سر نواب صاحب نے حکم صادر کیا تھا کہ آپ سے رائے طلب کی جائے آپ جلال سے نکاح کو ایک بندھن کے طور پر قائم رکھ کر آگے بڑھانا چاہتی ہیں یا آپ تصور کرتی ہیں کہ یہ نکاح آپ کی مرضی کے خلاف ہوا سو آپ متفق نہیں دوسرے اور صاف لفظوں میں ہم یہ پوچھنے حاضر ہیں کہ چھوٹے نواب جلال الدین پٹوڈی بطور خاوند قبول ہیں کہ نہیں اگر نہیں تو آپ کو اس رشتے سے برخاست کر دیا جائے گا اگر آپ چھوٹے نواب کے ساتھ زندگی گزارنے کی خواہشمند ہوں گی تو ہم رخصتی کا عمل مکمل کریں گے اور آپ کو محل میں عزت و احترام کے ساتھ خوش آمدید کہا جائے گا اب یہ آپ پر منحصر ہے کہ آپ کیا فیصلہ لینا ضروری خیال کرتی ہیں مگر نواب خاندان آپ کے فیصلے کو اہم سمجھتا ہے اور ہر صورت میں آپ کے فیصلے کو احترام کی نگاہ سے دیکھا جائے گا سو آپ بے خوف و خطر اس فیصلے کے عمل سے گزریے اور ہمیں آگاہ کر دیجیے ہم آپ کے فیصلے کا انتظار کریں گے۔'' بیگم صاحبہ نے آگاہ کیا تھا اور اٹھ کھڑی ہوئی تھیں فتح النساء ان کے ساتھ احتراماً کھڑی ہوئی تھیں اور نرمی سے بولی تھیں۔

''ہم پر نواب خاندان کے اتنے احسانات ہیں کہ ہم اس وزن تلے خود کو دبا محسوس کرتے ہیں ہم ایسی حیثیت نہیں رکھتے کہ نواب صاحب کے فیصلے کی نافرمانی کے مرتکب ہوں ہم نواب چاچا کی عزت اپنے والد محترم کی طرح کرتے ہیں سو ہم ان کے فیصلے کے آگے سر جھکانا اپنا فرض سمجھتے ہیں ان کے فیصلے سے انحراف ممکن نہیں۔'' وہ احتراماً گویا ہوئی تھیں بیگم صاحبہ نے ان کی سمت دیکھا تھا۔

''فتح النساء ہم آپ کو جتانا بھول گئے ہم کسی احسان کے باعث آپ کا جواب سننا نہیں چاہتے آپ کا فیصلہ اس سب سے مبرا ہونا شرط ہے آپ سوچ سمجھ کر جواب دے سکتی ہیں اس بات کو یکسر دل سے نکال دیجیے کہ آپ پر کوئی احسان کیا گیا یا آپ بوجھ تلے دبی ہوئی ہیں، نواب خاندان نے کبھی یہ نہیں چاہا کہ کوئی ہمارے احسانوں تلے دب کر اپنے کسی فیصلے کو متاثر کرے۔'' بیگم صاحبہ نے کہا تھا۔

''فی امان اللہ۔'' وہ کہہ کر مڑ گئی تھیں۔

''فی امان اللہ۔'' فتح النساء کے لب آہستگی سے ہلے تھے۔

❁ ❁ ❁ ...... ❁ ...... ❁ ❁

''مرزا صاحب عین آپ کی ہی بیٹی ہیں اور آپ کی ہی امانت ہیں ایسی بھی کیا جلدی ہے ہم چاہتے ہیں یہ تقسیم کا معاملہ نبٹ جائے اس کے بعد نکاح کی کوئی بات چھیڑی جائے۔'' نواب صاحب نے مرزا سراج الدولہ کو سمجھایا تھا مرزا سراج الدولہ مسکرا دیے تھے۔

''تقسیم کے وقت جو آپ یہاں سے ویسے ہی کوچ کر جائیں گے پھر آپ کو ڈھونڈتے ہوئے پاکستان کون جائے گا۔'' سراج صاحب نے بات کو مزاح کا رنگ دیا تھا اور نواب صاحب مسکرا دیے تھے۔

''یہ بات بھی مناسب ہے میاں مگر پاکستان سے بھاگ کر کہاں جائیں گے پاکستان تو ہماری آخری منزل ہے بہرحال عین بیٹی کا جو فرض ہے وہ تو بہر طور پورا کرنا ہی ہے ان شاء اللہ کچھ سوچتے ہیں۔'' نواب صاحب نے سہولت سے قصے کو سمیٹا تھا مگر مرزا صاحب مسکرا دیے تھے اور گویا ہوئے تھے۔

''نواب صاحب آپ کی طرف سے دھڑ سا لگا رہتا ہے کہیں فیصلہ مت بدل دیجیے گا۔'' وہ مسکرائے تھے تو نواب صاحب نے ان کے شانے پر ہاتھ رکھ کر مسکراتے ہوئے تسلی دینا ضروری خیال کیا تھا۔

''کیسی باتیں کرتے ہیں جناب نواب خاندان فیصلہ کر کے مکرنے والوں میں سے نہیں زبان کی بات ہے زبان کا اعتبار کیجیے زبان سے بڑھ کر تو کچھ نہیں زبان کے لیے ناک تو کٹوانے سے رہے۔'' مرزا صاحب ہنسے تھے۔

''یہ بات بھی خوب کہی نواب صاحب جس مزاج کا جواب نہیں آپ کی جانب سے قبل بھی ہوگا تو کرامت لگے گی۔'' سراج صاحب مسکرائے تھے نواب صاحب نے ان کی طرف دیکھا تھا۔

''خدانہ کرے مرزا صاحب دوستوں پر وار نہیں کرتے ہیں دوستی میں تو سر جھکا دیتے ہیں ہم مزاج یار میں جو آئے سو کرے۔'' نواب صاحب نے کہا تھا ان کے لبوں کی خفیف سی مسکراہٹ ان کے قلبی سکون کا پتا دے رہی تھی مرزا نے جانچتے ہوئے کہا تھا۔

''چلیے مرزا کو جانے دیجیے ہم مدعے پر آتے ہیں اور مدعا یہ ہے کہ ہم اپنی بیٹی کو اب اپنے گھر میں اتارنا چاہتے ہیں آپ بھی اب پس و پیش سے کام نہ لیجیے کو فیصلہ کر ڈالیے تقسیم کے وقت میں کتنی دیر ہے ہمیں کیا خبر یہ فرنگی اتنی آسانی سے اس سونے کی چڑیا کی جان کہاں چھوڑیں گے ان کی سامراجیت جانے کب تک قائم رہے چاہے دوسری جنگ عظیم نے ان کی کمر توڑ کر رکھ دی ہو اور باقی کی کئی جگہوں سے ان کا انخلا ہو رہا ہو مگر اس ساؤتھ ایسٹ ایشیا سے گویا انہیں عشق ہو چکا ہے حکمرانی کا بھی اپنا نشہ ہے صاحب کسی کی گردن دبا کر رکھنا کبھی کبھی بہت لطف دیتا ہے اور فرنگی یہ کام بہت خوبی سے کر رہے ہیں۔'' وہ مسکرائے تھے نواب صاحب نے سر ہلایا تھا۔

''بہرحال امید اچھی رکھنا چاہیے جناب بات چاہے مسلم لیگ کی ہو یا کانگریس کی دونوں کی خواہش یہی ہے کہ فرنگی اب اس خطے کی جان چھوڑ دیں۔'' نواب صاحب نے کہا تھا اور مرزا نے سر تائید میں ہلایا تھا۔

''اب تو مرتے کیا نہ کرتے کے مصداق ان کو یہ خطہ چھوڑنا ہی پڑے گا نواب صاحب جنگ عظیم دوم نے ان کی معیشت کو جو دھچکا لگایا ہے وہ اسے ایسے فراموش نہیں کر سکتے یہ بھرائی کرتے ان کی نسلیں تھک جائیں گی دوبارہ سے کسی مملکت پر سامراجیت کا جھنڈا کرنے سے قبل دس بار سوچیں گے ضرور۔'' مرزا نے کہا تھا تو نواب نے مثبت انداز میں سر ہلایا تھا۔

''بجا فرما رہے ہیں میاں آپ لگتا تو یہی ہے کہ یہ سامراجیت کا خاتمہ ہے اور اس کے بعد مملکتیں آزادی سے سانس لے سکیں گی مگر فرنگیوں کا کچھ پتا نہیں وہ وہاں سے بھی کاٹتے ہیں جہاں بوتے نہیں۔'' نواب صاحب مسکرائے تھے مرزا صاحب مسکرائے تھے۔

''ٹھیک کہا جناب چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی حکمران اور سامراجیت کا نشہ جاتے جاتے جائے گا مگر حالات تو کہتے ہیں کہ آئندہ برطانیہ کی طاقت کا سورج ہر جگہ نہیں چلے گا جہاں چمکنا تھا چمک چکا اب اس آفتاب کی روشنی میں وہ آب و تاب نہیں رہی وہ وقت گئے جب لوگ کہتے تھے کہ برطانیہ کا سورج کبھی غروب نہیں ہوتا آنے والا وقت برطانیہ کی معیشت کے لیے کڑا ہوا ہم نہ لکھیں گے تو آنے والی نسلیں دیکھیں گی کیونکہ بہرحال ہر عروج کو زوال ہے بے انتہا سرمستی کے بعد زوال دیکھنا بھی شرط ہے ہم نہ دیکھیں گے تو دنیا دیکھے گی جناب۔'' مرزا نے کہا تھا اور نواب صاحب نے سر تائید میں ہلایا تھا۔

''بات تو مناسب ہے آپ کی مرزا سراج الدولہ صاحب بہرحال آپ نے کیا سوچ رکھا ہے آنے والے دنوں کے لیے کیا حکمت عملی ہے آپ کی سننے میں آیا تھا کہ کانگریس کے ساتھ اگرچہ آپ ہیں مگر حمایت آپ مسلم لیگ کی کرتے دکھائی دیتے ہیں اس معاملے میں راز پنہاں ہے۔'' نواب صاحب نے مسکراتے ہوئے دریافت کیا تھا مرزا صاحب ہنس دیے تھے۔

''جانے دیجیے نواب صاحب کیوں مذاق بناتے ہیں کانگریس ہو یا مسلم لیگ ہمیں تو بس ان فرنگیوں کی سامراجیت سے نجات چاہیے مگر مسلم لیگ کے ایک دوست ہیں ان کی طرف سے دعوت موصول ہوئی تھی وہیں باتوں

باتوں میں تذکرہ چل پڑا کہ کس لیڈر نے اپنا موقف بہتر انداز میں بیان کیا ہم نے نہرو کی بجائے جناح صاحب کا نام لے لیا اور وہیں اخباروں میں شہ سرخیاں بننے لگیں لوگ تو رائی کا پہاڑ بنا لیتے ہیں مسلم لیگ کی حمایت مہنگی پڑی ویسے جواباً ہمیں تردید کرنا پڑی کہ ایسا کوئی معاملہ نہیں تھا خیر ان سیاست کی باتوں میں اہم معاملات کہیں درگزر نہ ہو جائیں آپ کو یاد دہانی کرائے دیتے ہیں کہ آنے والے رمضان سے قبل ہم اپنی بیٹی کی رخصتی اپنے گھر میں چاہتے ہیں پھر جو ہو سو ہو اگر عین بیٹی اور حیدر میاں کو کوچ کرنا ہوا تو ہم ان کی مدد خود کریں گے۔'' مرزا جیسے ٹھان کر آئے تھے کہ نواب صاحب کو قائل کر کے جائیں گے اور نواب نے سر ہلا دیا تھا۔

❁ ❀ ...... ❀ ...... ❀ ❁

خوابوں کی تعبیریں بھیانک ہوتی ہیں یا خوب صورت وہ جان نہیں پائی تھیں انہوں نے جس شے کی تمنا کی تھی وہ خواہش کسی بھی طور پوری ہو گئی تھی مگر بعض اوقات خواہش مکمل پوری نہیں ہوتیں، کہیں نہ کہیں کچھ ادھورا پن رہ جاتا ہے ایسا ہی ادھورا پن اس خواہش میں بھی رہ گیا تھا۔

''جلال آپ ہماری زندگی میں آئے بھی تو کیا رنگ لے کر کہ ہماری خواہشیں اپنے ہونے پر خود حیران سی ہمیں تکتی ہیں ان خواہشوں کا کیا کریں ہم ہم آپ کے ہم سفر تو ہیں مگر ہمنوا نہیں کیا کریں کیا درج ہے ہمارے بخت میں ہم نہیں جانتے مگر یہ باتیں ہمارا سکون رخصت کرنے آتی ہیں تو سارا دل ویران کر کے رکھ جاتی ہیں۔'' وہ سوچ کر رہ گئی تھیں انہوں نے فیصلہ جلال کے نام کر دیا تھا وہ نہیں جانتی تھیں کہ یہ فیصلہ صحیح تھا کہ غلط مگر اس فیصلے کے علاوہ کوئی اور فیصلہ ہونا ممکن نہیں تھا۔

''ہمارا سکون جتنا بھی بے مزہ ہو جلال ہم آپ کے جنوں کے بے کمال ہونے پر ششدر نہیں کیونکہ ہم آپ کے اختیارات سے واقف ہیں اور ہماری بے بسی بھی ہماری نگاہ میں ہے عشق کو حیرتوں میں مائل کرنا آپ کو زبانی ازبر ہے اور ہم شکوہ کے لیے لب بھی نہیں کھول سکتے۔

حیرتوں کے ساتھ سرنگوں کے لیے ہم ایسا کہتے تو پابند ہیں کہ ایسا ہے تو پھر ایسا ہی سہی یہی جنوں کی کوئی منزل ہے تو ہم کو قبول ہے۔'' وہ ہتھیار ڈالنے والے انداز میں سوچتے ہوئے شکست کا گویا باقاعدہ اعتراف کر لیا تھا۔

❁ ❀ ...... ❀ ...... ❀ ❁

''تیمور آپ چاہیں اب انکار کریں یا کتنے بھی بہانے گھڑیں ہم آپ کی بات خوش بخت کے ساتھ پکی کرنے جا رہے ہیں۔'' بیگم حکمت نے کہا تھا تو تیمور ماں کو دیکھ کر رہ گئے تھے۔

''معلوم ہے آپ معاملات کو ٹالنا چاہتے ہیں کیونکہ آپ کسی خوش فہمی میں ہیں یا پھر کسی امید میں مبتلا ہیں مگر معجزے ہر بار ہوں یہ ضروری نہیں۔ بیٹا آپ کو حقیت تسلیم کرنا ہوگی عین کی بات حیدر میاں کے ساتھ پکی ہے اور اس تعلق کے ختم ہونے کے کوئی شواہد نہیں ملتے۔'' بیگم حکمت بیٹے کی دل جوئی نہیں کر سکتی تھیں سو ان کو حقیقت کی سمت دھکیلتے ہوئے گویا ہوئی تھیں تیمور اٹھے تھے اور چلتے ہوئے باہر نکل گئے تھے۔

❁ ❀ ...... ❀ ...... ❀ ❁

ابھی ہماری محبت کسی کو کیا معلوم
کسی کے دل کی حقیقت کسی کو کیا معلوم
خدا کرے نہ پھنسے دام عشق میں کوئی
اٹھاتی ہے جو مصیبت کسی کو کیا معلوم

خوش نما کے لب ہولے سے ہلے تھے۔

''چھوٹے نواب محبت کی ہمیں کیا خبر، یہاں محبت نہیں ہوتی سودے بازی ہوتی ہے اور سودے بازی میں محبت مخل نہیں ہوتی ہمارا نصیب یہ ہے کہ ہم محبت کی م کے متعلق بھی سوچ نہیں سکتے اس م کے متعلق سوچنے کی بھی اجازت نہیں ہے ہمیں۔'' وہ عجیب سی مسکراہٹ کے ساتھ بولی تھی جلال ان کو دیکھ کر رہ گئے تھے خوش نما ان کو دیکھتی رہی تھی پھر ہوئے سے بولی بھی۔

اس ادا سے وہ جفا کرتے ہیں
کوئی جانے کہ وفا کرتے ہیں
یوں وفا عہد وفا کرتے ہیں
آپ کیا کہتے ہیں کیا کرتے ہیں
اس لیے دل کو لگا رکھا ہے
اس میں محبوب رہا کرتے ہیں
تم ملو گے نہ وہاں بھی ہم سے
حشر سے پہلے گلہ کرتے ہیں
روز لیتے ہیں نیا دل دلبر
نہیں معلوم یہ کیا کرتے ہیں
داغ تو دیکھ کر کیا ہوتا ہے
جبر پر صبر کیا کرتے ہیں

''ہم نہیں جانتے خوشنما ہم نے وہ کیا جو ہمیں کرنا چاہیے تھا ہمارے کاندھوں پر جو ذمہ داری عائد ہوتی ہے ہم اس سے منہ نہیں موڑ سکتے۔'' چھوٹے نواب نے گویا وضاحت دینا چاہی تھی وہ عجیب زخمی انداز میں مسکرا دی تھیں۔

''ہم کہاں گلہ کرتے ہیں نواب صاحب ہم تو تذکرہ بھی نہیں کرتے آہ کرنا تو دور کی بات ہے ہمیں تو خود سے ذکر کرنے کے اسلوب بھی نہیں معلوم خوش رہیے ہم آپ کو خوش دیکھنا چاہتے ہیں بس۔'' خوشنما کا انداز دکھ سے عبارت تھا۔

''ہم بے وفائی کے مرتکب نہیں ہوئے خوش نما ہم نہیں جانتے مگر محبت کے متعلق شاید ہمیں خبر نہیں ہے۔'' جلال نے کہا تھا وہ مسکرا دی تھیں۔

آرزو تیری برقرار رہے
دل کا کیا ہے رہا نہ رہا

حسرت موہانی کے ساتھ کیا معاملہ رہا ہوگا ہمارا دل تو رہا ہی نہیں۔'' خوشنما نے لحہ بھر کو ان کی طرف نگاہ کی تھی اور آہستگی سے بولی تھیں۔

بڑا شور سنتے تھے پہلو میں دل کا
جو چیرا تو اک قطرہ خون نہ نکلا

جیسے دل تھا ہی نہیں دل ہوتا تو درد کا گمان بھی ہوتا۔ دل نے تو طوفان مچایا ہوا تھا مگر اچھا ہوا خبر ہو گئی کہ دل تھا ہی نہیں۔'' وہ عجیب حسرت و یاس سے بولی تھیں جلال آئے تھے اس نے بے ارادہ ان کا ہاتھ تھام لیا تھا جلال نے ان کی طرف نہیں دیکھا تھا خوشنما نگاہ اٹھا کر ان کی سمت بغور تکتی رہی تھیں ان کی آنکھوں میں عجیب پیاس تھی۔

''نگاہ پیاس سے بلکتی ہے ہو سکے تو دیدار کا سامان کیجیے۔'' وہ جیسے دیوانگی کی انتہاہ میں تھیں جلال نے ان کی جان بنا دیکھے ہاتھ چھڑایا تھا۔

اک عشق کا غم اور اس پر یہ دل آفت

ازدواجی ڈکشنری

شادی: ایک ایسا ذریعہ ہے جس سے شوہر کو رفتہ رفتہ یہ علم ہوتا ہے کہ اس کی بیوی کیسے شوہر کی طلبگار ہے۔

جمائی: منہ کھولنے کے لیے شادی شدہ مردوں کے لیے قدرت کا عطیہ ہے۔

کنوارا: جو صبح کام پر جانے سے قبل صرف ایک آدمی کا ناشتہ تیار کرتا ہے۔

خبر: شوہر کی لائی ہوئی اطلاع۔

افواہ: بیوی کی لائی ہوئی اطلاع۔

علقمندی کا تقاضہ: بیوی سے بحث میں جیت جانے کے باوجود معافی مانگ لینی چاہیے۔

ماہر نفسیات کا تجزیہ: لڑکیاں عموماً ان مردوں سے شادی کرنا پسند کرتی ہیں جن میں ان کے باپ کی صفات موجود ہوں شاید یہی وجہ ہے کہ شادی کے موقع پر ان کی مائیں روتی ہیں۔

......☆☆......

تلخ مگر حقیقت

☆ اولاد کی وفا کا پتا بڑھاپے میں چلتا ہے۔

☆ بہن کی وفا کا پتا اس کی جوانی میں چلتا ہے۔

☆ بھائی کی وفا کا پتا بیوی کی بیماری میں چلتا ہے۔

☆ بیوی کی وفا کا پتا شوہر کی غربت میں چلتا ہے۔

☆ ان سب رشتوں کو اپنے تجربات کی کسوٹی پر پرکھو اور سوچو کہ کون کس کے ساتھ کتنا مخلص ہے، یہ ہے تو ''تلخ مگر حقیقت بھی ہے۔''

شگفتہ خان......بھلوال

یا غم نہ دیا ہوتا یا دل نہ دیا ہوتا

خوشنما نے مسکراتے ہوئے ان کا ہاتھ چھوڑ دیا تھا جلال نے دانستہ ان کی سمت نگاہ کی تھی خاموشی سے دیکھا تھا اور پلٹ کر باہر نکلنے لگے تھے خوشنما ان کی سمت دیکھی رہی تھی پھر نگاہیں بند کرلی تھی۔

تمہارا دل مرے دل کے برابر ہو نہیں سکتا
وہ شیشہ ہو نہیں سکتا یہ پتھر ہو نہیں سکتا

ان کے لب ہلے تھے اور آنسوؤں کے قطرے آہستگی سے ٹوٹ کر رخساروں پر بہہ نکلے تھے

''یارب دل میں محبت ڈالنا تھی تو نصیب ایسا کیوں دیا؟'' ایک شکوہ ان کے لبوں پر تھا آواز میں بہت درد تھا جیسے سینہ چھلنی تھا۔



فتح النساء بے دھیانی میں چل رہی تھی جب حیدر ان کے مقابل آن کھڑے ہوئے تھے اور وہ چونکتے ہوئے حیرت سے اسے دیکھنے لگی تھیں وہ مسکرایا تھا اور پھر ہاتھ بڑھا کر ان کا چہرہ چھوا تھا فتح النساء بدک کر پیچھے ہٹی تھیں جب انہوں نے ہاتھ تھام کر ان کو اپنی طرف کھینچنا چاہا تھا فتح النساء نے الجھ کر خود کو چھڑانے کی کوشش کی تھی حیدر میاں مائل دکھائی نہیں دیے تھے تب فتح النساء نے ان کو زور سے تمانچہ رسید کردیا تھا وہ غصے سے آگ بگولہ ہو کر ان کو دیکھنے لگے تھے۔

''آپ کی یہ اوقات ایسی ہمت دماغ ٹھکانے لگادیں گے آپ کا۔''

وہ دھمکی پر اتر آئے تھے ان کی سرخ آنکھوں میں جیسے خون تیرنے لگا تھا فتح النساء دو قدم پیچھے سرکی تھیں اور جواباً غصے سے انہیں دیکھا تھا۔

''آپ کی بدتمیزیوں کا کیا مطلب ہے آپ کی ہمت کیسے ہوئی ہماری حویلی میں آنے کی اجازت کس نے دی آپ کو۔'' وہ آگ بگولہ ہوئی تھیں مگر وہ مسکرا دیا تھا اور ان کی سمت دیکھتے ہوئے عجیب لہجے میں گویا ہوا تھا حویلی میں کیا محترمہ آپ کی خواب گاہ میں بھی کود سکتے ہیں ہم آپ ایسی ارزاں کو اس سے بھی ارزاں کرسکتے ہیں آپ ہماری ہمت سے واقف نہیں ابھی ہمیں جلال کا بھی ڈر نہیں آپ ان کی منکوحہ ہیں تو ہوا کریں شرافت سے آپ کو آپ کی مرضی سے چاہتے ہیں سو اپنا آپ سونپ دیں ورنہ ہم سے برا کوئی نہیں ہوگا۔'' حیدر نے انہیں عجیب ہوس سے دیکھا تھا ان کے جسم میں سنسنی سی دوڑ گئی تھی اور حیدر ہنسنے لگے تھے۔

''ہرنی کا شکار کرنے کا اپنا لطف ہے اور ہم اس لطف کو انتہا پر دیکھنا چاہتے ہیں جلال سے قبل حاصل کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں اعلان کرتے ہیں جلال سے قبل آپ کو حاصل کر کے رہیں گے۔'' وہ کھلی دھمکی دے رہے تھے فتح النساء اپنی جگہ ششدر رہ گئی تھیں وہ بھاگتی ہوئی وہاں سے نکل جانا چاہتی تھیں مگر ان کا رادہ بھانپ کر حیدر نے ان کی کلائی دبوچ لی تھی۔

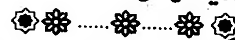
دل کا کیا حال کیوں صبح کو جب اس بت نے
لے کر انگڑائی کیا ناز سے ہم جاتے ہیں

حیدر نے مدہم لہجے میں مسکراتے ہوئے فتح کی سماعتوں کے پاس ایک سرگوشی کی تھی وہ ان کی گرفت میں مچلنے لگی تھیں۔

دونوں ہاتھوں سے لوٹتی ہے ہمیں
کتنی ظالم ہے تیری انگڑائی

''جی میں آتا ہے کہ پی جائیں مگر پھر کچھ سوچ کر رک جاتے ہیں آپ کے معاملے میں ہم خود کو خود ترسی میں مبتلا رکھنا چاہتے ہیں ہاتھ بڑھا کر تھامنا ناممکن نہیں مگر ہم دانستہ ہاتھ بڑھانا نہیں چاہتے خود کو اس حد بندی میں مصلحتاً جکڑے ہوئے ہیں دیکھنا چاہتے ہیں کہ شوق کی حد کیا ہے اور اشتیاق کیسے بڑھتا ہے سرور کی مدعا چاہتے ہیں سو خود کو روکے ہوئے ہیں ورنہ ناممکن کچھ نہیں ہے محترمہ فتح النساء۔'' وہ کلائی کو موڑ کر ان کو قریب کرتے ہوئے بولا تھا فتح النساء ان کی گرفت میں کراہ کر رہ گئی تھیں حیدر نے ان کو بغور دیکھا تھا۔

''وقت دے رہے ہیں آپ کو چرا لیں گے ایک دن کوئی اسباب کرنا چاہتی ہیں تو کرلیں۔'' وہ ایک جھٹکے سے ان کو چھوڑ کر وہاں سے چلا گیا تھا فتح النساء درد کی شدت سے اس سمت دیکھنے لگی تھیں۔



''آپ منگنی کر رہے ہیں۔'' عین نے پوچھا تھا تیمور نے ان کی سمت دیکھے بنا دھیان پھیر لیا تھا کوئی جواب نہیں

دیا تھا عین ان کی خاموشی سے الجھنے لگی تھیں۔

''کیا ہو رہا ہے یہ؟'' وہ حیرت سے پوچھ رہی تھیں۔

''کس بابت پوچھ رہی ہیں آپ؟'' وہ ان کی طرف دیکھے بنا بولے تھے۔

''آپ منگنی کر رہے ہیں اسی دوشیزہ سے۔'' وہ اسے دیکھ چکی تھیں سو خوش بخت کے متعلق دریافت کیا تھا تیمور نے شانے اچکا دیے تھے اور مدہم لہجے میں بولا تھا۔

''یہ ذکر اہم نہیں عین آپ کے نکاح کے معاملات طے پا رہے ہیں۔'' تیمور نے الٹا دریافت کیا تھا عین اس کی سمت دیکھ کر نفی میں سر ہلانے لگی تھیں۔

''ہم نہیں جانتے ایسا کوئی ذکر ہم نے اب تک نہیں سنا۔'' وہ بے خبری سے گویا ہوئی تھیں تیمور مسکرا دیا تھا مگر عجیب بجھا بجھا انداز تھا۔

''خوشی کی بات ہے آپ کی رخصتی عمل میں آئے گی بچپن کی محبت تکمیل کی سمت گامزن ہے۔'' وہ عجیب طنز بھرے لہجے میں گویا تھا عین چونکی تھی۔

''ایسا کچھ فی الحال نہیں ہو رہا گھر میں ان دنوں صرف ایک تذکرہ عام ہے اور وہ جلال بھیا کی شادی کا ہے فتح النساء کی رخصتی عمل میں لائی جا رہی ہے اس سے زیادہ ہم کچھ نہیں جانتے۔'' وہ لاعلمی کا شکار دکھائی دی تھیں تیمور ان کو خاموشی سے دیکھنے لگا تھا وہ دھیمے لہجے میں بولی تھیں۔

''اب آپ بتائیے کیا چل رہا ہے؟''

''کیا یہ ذکر اہم ہے۔'' تیمور نے پوچھا تھا ان کے لبوں پر ایک مرجھائی سی مسکراہٹ تھی عین نے بغور ان کی سمت دیکھتے ہوئے سر ہلا دیا تھا۔

''آپ اہم دوست ہیں تیمور آپ کے متعلق خبر رکھنا ضروری ہے۔''

''ضروری نہیں، ہے عین آپ اپنی بات کیجیے آپ اہم ترین ہیں۔'' وہ جتاتے ہوئے بولا تھا وہ الجھی نظروں سے دیکھنے لگی تھی۔

''آپ کو کیوں لگتا ہے کہ ہم اہم ترین ہیں۔''

''کیا حیدر میاں نے یہ بات کبھی نہیں جتائی۔'' تیمور نے پوچھا تھا مگر عین نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ الٹا پوچھنے لگی تھی۔

''کوئی اہم ترین کیسے ہوتا ہے تیمور۔'' اور تیمور نے شانے اچکا دیے تھے اور اٹھ کھڑا ہوا تھا جب عین نے ان کا ہاتھ تھاما تھا وہ پلٹ کر دیکھنے لگا تھا عین نے جھینپ کر ان کا ہاتھ چھوڑ دیا تھا اور مدہم لہجے میں نگاہ چراتے ہوئے بولی تھیں۔

''آپ کی منگنی کا سوچ کر ہی اتنی راحت مل رہی ہے ہم آپ کو خوش دیکھنا چاہتے ہیں وہ دیکھنے میں بہت دلکش ہے محبت کا واقع ہونا صاف دکھائی دیتا ہے۔'' وہ بات بناتے ہوئے بولی تھیں۔

''محبت بلا سبب نہیں ہوتی عین محبت کے اسباب ڈھونڈنے نکلو تو شاید کبھی نہیں ملتے مگر دل جانتا ہے کہ وہ مبتلا کیونکر ہوا دل کو تمام اسباب معلوم ہوتے ہیں۔'' وہ سمجھانے لگے تھے عین نے سر نفی میں ہلایا تھا تیمور ان کی معصومیت پر مسکرایا تھا۔

''آپ تو حیدر میاں کی محبت میں مبتلا ہیں آپ کو ایسے سوالوں کے جوابات ڈھونڈنے کی ضرورت کیونکر آگئی؟'' تیمور نے پوچھا تھا وہ نگاہ پھیر گئی تھیں پھر پلٹ کر چلتے ہوئے وہاں سے نکلنے لگی تھیں تیمور تادیر ان کو دور جاتا دیکھتے رہے تھے پھر چلتے ہوئے مخالف سمت میں آگے بڑھنے لگے تھے۔



رخصتی کی تاریخ طے پا گئی تھی گھر میں شادی کی تیاریاں ہونے لگی تھیں ڈھولک شادی بیاہ کے گیت مگر فتح النساء جانے کیوں خاموش سی تھیں وہ جلال سے ملنا چاہتی تھیں ان سے بات کرنا چاہتی تھیں مگر جیسے اب ایسا ممکن نہیں رہا تھا ہاتھوں میں ان کے نام کی مہندی رچ گئی تھی اور بالآخر وہ بیاہ کر محل بھی آگئی تھیں تب جلال سے سامنا ہوا تھا اور ان کو لگا تھا جیسے وہ کسی اجنبی کے سامنے کھڑی ہوں۔

''ہم آپ کے تمام حقوق ادا کریں گے مگر فی الحال ہمیں وقت درکار ہے سو ہم سے کوئی سوال مت کیجیے گا کیوں اور کیوں نہیں جیسے سوال فی الحال ہم سننا نہیں چاہتے آپ سو جائیے ہمیں اسٹڈی میں کچھ کام ہے ہم صبح ناشتے پر ملیں گے آپ سے۔'' وہ کہہ کر مڑے تھے اور کمرے سے نکل گئے تھے۔

''کیا جلال کو واقعی حاکم خاتون سے اس درجہ محبت تھی۔'' فتح النساء کے ذہن میں وہ واقعہ گھوما تھا جب وہ سو

رہے تھے وہ انہیں جگانے گئی تھیں اور وہ حاکم خاتون کا نام پکار رہے تھے ان کو پل میں سب خسارہ لگا تھا آنکھیں بھیگنے لگی تھیں مگر انہوں نے کسی سے اس بات کا تذکرہ نہیں کیا تھا۔

❁ ❃ ...... ❃ ...... ❃ ❁

"نواب صاحب ہم نے تیرہ شعبان کی تاریخ نکالی ہے کیا مناسب نہ ہوگا اب بنا کسی حیل حجت کے آپ ہاں کردیں۔" مرزا صاحب نے کہا تھا اور نواب صاحب سوچنے لگے تھے۔

"چلیے جیسا آپ کو مناسب لگے بیٹے کی ذمہ داری سے تو نمٹ ہی چکے ہیں سوچتے ہیں بیٹی کی ذمہ داری سے بھی سبکدوش ہوجائیں ہم۔" نواب صاحب نے کہا تھا۔

"ارے جناب تو پھر نیک کام میں دیر کیسی، ایسا نیک خیال ہو تو پھر عمل پیدا ہونے میں دیر نہیں ہونا چاہیے ہم حیدر میاں کو ایک نیا تجارت کا کاروبار سونپ رہے ہیں، موصوف خاصے ذمہ دار ہوچکے ہیں بچہ جب اپنے پیروں پر کھڑا ہوجائے تو پھر کوئی پریشانی نہیں رہتی یقیناً حیدر میاں اب زندگی کی سمجھ بوجھ پہلے سے زیادہ رکھتے ہیں۔" مرزا صاحب نے بیٹے کو سراہا تھا نواب صاحب نے سر ہلایا تھا۔

"ایک بار گھر میں بات کرلیں بیگم سے بات کرنا مشورہ لینا بھی اہم ہے۔" نواب صاحب نے ازراہ مذاق کہا تھا مرزا صاحب ہنسے تھے۔

"ارے نواب صاحب جانے دیجیے آپ جیسا اثر و رسوخ رکھنے والا انسان اب عورتوں سے مشورے لے کر چلے گا۔" مرزا صاحب نے جیسے ان کے لیے عام دروازے بند کرنے چاہے تھے مگر وہ سہولت سے مسکرا دیے تھے۔

"ایسی بات نہیں جناب آپ کی بھابی عقلمندی میں ثانی نہیں رکھتیں اور یوں بھی وہ گھریلو امور میں سربراہ کی حیثیت رکھتی ہیں دل سے مشورے کے ساتھ ان سے مشورہ بھی ضروری ہے۔" نواب صاحب نے ٹالا تھا۔

"چلیے صاحب جیسا آپ کو مناسب لگے ہم نے تو آپ کے کان میں ڈال دی اب آپ جو مناسب جانیں۔" مرزا صاحب نے گھیرنے کی کوشش کی تھی مگر ناکام ہوکر سرد آہ بھری تھی۔

❁ ❃ ...... ❃ ...... ❃ ❁

"اتنا اعتبار کیسے کرسکتے ہیں آپ ان پر جانتے نہیں آپ ان کو۔" ابا جان ہمیں یہ عجلت پسندی لگتی ہے مرزا چاچا گھاگ ہیں وہ جال بچھا کر آپ کو پھانسنا چاہتے ہیں آپ کو محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔" جلال نے کہا تھا مگر نواب صاحب مسکرائے تھے۔

"ایسا نہیں جلال غلطی انسان سے ہوتی ہے مگر جب کوئی شرمندہ ہو تو پھر لکیر پیٹنا مناسب نہیں۔" نواب صاحب نے سمجھایا تھا مگر جلال نے سر نفی میں ہلایا تھا۔

"آپ بہتر جانتے ہیں ابا جان آپ یقیناً ہم سے زیادہ فہم وفراست رکھتے ہیں مگر......!" جلال کچھ کہتے کہتے رک گئے تھے نواب صاحب نے ان کی طرف دیکھا تھا۔

"ہمیں نہیں لگتا مرزا صاحب کے ساتھ رشتے داری رکھ کر کوئی نقصان ہوگا جو ہوا اسے بھول کر رشتے کو آگے بڑھانا ہی عقلمندی ہوگی اس سے زیادہ ہم کچھ نہیں کہہ سکتے۔" وہ بردباری سے بولے۔

جلال نے ان کو خاموشی سے دیکھا تھا تبھی نواب صاحب حتمی انداز میں بولے تھے۔

تاہم نکاح کی تاریخ طے کرنے جارہے ہیں اب آگے جو ہو سو ہو، اللہ کی رضا اہم ہے۔" وہ مدہم لہجے میں بولے تھے اور جلال دیکھ کر رہ گیا تھا۔

❁ ❃ ...... ❃ ...... ❃ ❁

"مبارک ہو میری گڑیا سی بیٹی دلہن بنے گی، ابھی کل کی ہی بات لگتی ہے جب وہ محل میں یہاں سے وہاں بھاگا کرتی تھیں عین میری پیاری بچی بیٹیاں کتنی جلد بڑی ہوجاتی ہیں وقت گزرنے کا پتا ہی نہیں چلتا۔" اماں جان نے عین کے سر پر سرخ آنچل ڈالتے ہوئے اسے مسکراتے ہوئے دیکھا تھا اور اس کی بلائیں لی تھیں عین حیرت سے ان کی طرف دیکھنے لگی تھیں۔

"اماں جان یہ کب ہوا اور۔" اماں نے مسکراتے ہوئے ان کے منہ پا ہاتھ رکھ دیا تھا۔

"فکروں میں گھلنے کی ضرورت آپ کو نہیں آپ خوش رہیں چہرے پر تازگی تبھی تو آئے گی آج سے دو ملازمائیں۔" آپ کے ہمراہ رہیں گی اور آپ کا خاص خیال رکھیں گی۔" اماں جان نے کہا تھا عین نے جواباً کچھ

نہیں کہا تھا اور چلتی ہوئی باہر نکل گئی تھیں۔

شرما گئی ہیں۔" اماں نے دادی جان کو دیکھتے ہوئے کہا تھا دادی جان نے سر ہلایا تھا۔

"میں نے بٹیا کا جوڑا بننے کو دے دیا ہے خالص سونے کے تار کا کام ہے اور کئی قیمتی جواہرات ان کے جوڑے میں ٹانکے جائیں گے آخر کو نواب خاندان کی اکلوتی بیٹی کا نکاح ہے لگنا تو چاہیے کہ نواب خاندان کی بیٹی ہیں۔" اماں نے کہا تو دادی جان نے ناگواری سے دیکھا تھا

"یہ کیا بہو بیگم ارے سادگی سے بڑھ کر اور کچھ نہیں ماشاءاللہ ہماری عین بیٹی پڑھی لکھی اور باشعور ہے والدین کی طرف سے اس سے بڑا تحفہ کوئی نہیں ہوسکتا اس دور میں جب بیٹیوں کو پڑھایا بھی مشکل سے جاتا ہو اس میں عین بیٹی کی اعلیٰ تعلیم وتربیت کی گئی ہے کہتے ہیں بیٹی کا بہترین زیور اس کی پرورش ہے ہم نے نواب زادی کی عمدہ پرورش کرکے اپنا فرض احسن طریقے سے پورا کردیا ہے باقی بیٹیوں کے جیتے تو کبھی ہاتھ رکتا نہیں عمر بھر دینا چلتا رہتا ہے۔" دادی اماں نے سمجھایا تھا دادی اماں کے کہنے پر اماں جان قریب بیٹھ گئی تھیں۔

"ہاں آپ ٹھیک کہتی ہیں اماں جان بیٹی کو تو ساری عمر ہی دینا ہوتا ہے مگر ہم اپنے دل کی حسرت نکالنا چاہتے ہیں اکلوتی بیٹی ہے ہماری خیر سے بہو بیگم بھی گھر گئی ہیں یہاں تو خوشی دیدنی ہے۔" اماں جان نے وضاحت دی تھی۔

"چلیے جیسے آپ کی مرضی بہو بیگم مگر بیٹی اور بہو میں کوئی تفریق مت کیجیے گا ہمیشہ ایک جیسا سلوک روا رکھیے گا جہاں لباس بیٹی کے لیے بنوا رہی ہیں ویسا ہی لباس بہو بیگم کے لیے بھی بنوالیں وہ اس گھر کو آباد کرنے آئی ہیں اس خاندان کی اصل بیٹی تو وہی ہیں۔" دادی اماں نے کہا تھا اور اماں جان نے سر ہلایا تھا۔

"اماں جان تفریق کیسی بہو بھی تو بیٹی ہوتی ہے ہم نے تو پہلے ہی یہ بات فتح النساء کو باور کرادی ہے ہمیں جو عزت ومرتبہ اس خاندان میں آکر ملا اسی روایت آگے برقرار رکھیں گے ہم نے جتا دیا ہے ان کو دہلیز میں پاؤں رکھیں تو خود کو اس گھر کی بیٹی تصور کریں یہاں بہوؤں کا کوئی نظریہ موجود نہیں ہے۔" اماں مسکرائی تھیں دادی اماں نے سر ہلا دیا تھا۔

جنت میں لے جانے والے چار عمل

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے وہ بیان کرتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے دریافت کیا۔

"تم میں سے کس نے آج روزہ رکھا ہے؟"

سیدنا ابو بکر صدیقؓ نے کہا میں نے آج روزہ رکھا ہے۔" آپ نے پھر دریافت کیا۔

"تم میں سے کس نے آج کسی کا جنازہ پڑھا ہے؟"

سیدنا ابو بکر صدیقؓ نے کہا "آج میں نے جنازہ پڑھا ہے۔"

آپ نے پھر دریافت کیا۔

"تم میں سے آج کس نے کسی مسکین کو کھانا کھلایا ہے؟"

سیدنا ابو بکر صدیقؓ نے کہا "آج میں نے مسکین کو کھانا کھلایا ہے۔"

آپ نے پھر دریافت کیا۔

"تم میں سے کس نے آج کسی مریض کی عیادت کی ہے؟"

سیدنا ابو بکر صدیقؓ نے کہا۔

"آج میں نے مریض کی عیادت کی ہے۔"

تو آپ نے فرمایا

"جس شخص میں بھی یہ کام جمع ہوں گے وہ جنت میں جائے گا۔" سبحان اللہ

ملالہ اسلم...... خانیوال

❁ ❃ ...... ❃ ...... ❃ ❁

فتح النساء پریشانی سے یہاں سے وہاں ٹہلتی رہی تھیں سکون جیسے رخصت ہوگیا تھا حیدر میاں جس طرح گھر میں آکر دھمکا کر گئے تھے ان کے ارادے خطرناک لگتے تھے

مگر وہ سوچ سوچ کر تھکنے لگی تھیں سمجھ نہیں آرہا تھا کہ کس طور یہ بات جلال کو بتائی جائے وہ پہلے ہی اکھڑے ہوئے سے تھے ان کا مزاج وہ سمجھتی تھیں جس طرح اس گھر میں لا کر وہ ان کو بھول گئے تھے وہ ان سے کوئی خاص امید نہیں رکھتی تھیں وہ یقیناً اس بات سے چڑ جاتے شک کا بیج ان کے دل میں شاید اور گہرا ہو جاتا مگر وہ یہ سوچ کر اور بھی پریشان ہو رہی تھیں اگر وہ آگاہ نہ کر سکیں اور اس دوران حیدر میاں نے کوئی چال چل دی تو پھر اور اب تو یوں بھی ان سے سامنا رہتا تھا گھر میں نکاح کی تیاریاں شروع ہو گئی تھیں تاریخ کیا ٹھہری تھی گھر میں ہلچل سی مچ گئی تھی وہ زیادہ تر کمرے میں بند رہنے لگی تھیں، وہ حیدر میاں کا سامنا نہیں کرنا چاہتی تھیں یہ تو طے تھا کہ وہ مزید سازشوں کے جال بن رہے تھے اور وہ ان کو ایسا کرنے سے باز نہیں رکھ سکی تھی بہتر یہی تھا کہ جلال کو اعتماد میں لیا جاتا مگر اس ضمن میں کوئی سرا ہاتھ نہیں آرہا تھا۔

''کیا ہوا بیٹی ایسے پریشان کیوں ہیں آپ بوا کی یاد آرہی ہے؟'' دادی اماں نے ان کو غیر موجود پا کر کمرے میں قدم رکھا تھا اور وہ سٹپٹا کر رہ گئی تھیں۔

''نہیں دادی جان ایسی بات نہیں۔'' وہ کوئی معقول جواز نہیں ڈھونڈ سکی تھیں دادی جان نے سر پر ہاتھ رکھا تھا اور شفقت سے بولی تھیں۔

''اس قدر چہرہ ہونق کیوں ہے کیا چھوٹے نواب سے کوئی معاملہ درپیش ہے کوئی شکایت ہو تو ہم سے کہیے دو کانوں میں سر کر دیں گے ان کی اتنی مجال جو ہماری بہو بیگم کو پریشان کریں یا ان کا دل دکھائیں۔'' دادی اماں نے کہا تھا فتح النساء نے سر نفی میں ہلایا تھا اور مدہم لہجے میں بولی تھیں۔

''ایسا کوئی معاملہ درپیش نہیں دادی اماں ہم اداس یا پریشان نہیں دراصل گھر میں عین کی شادی کی تیاریاں شروع ہو گئی ہیں اور ہم سوچ رہے تھے کہ کیسے اماں جان کا ہاتھ بٹائیں۔'' فتح النساء نے بہانہ گھڑا تھا۔

''ارے بیٹا اس میں پریشانی والی کیا بات ہے آپ تو عین کی اچھی سہیلی ہیں آپ ان معاملات میں بنا ہچکچاہٹ حصہ لیں ہم تو آپ کو خوش دیکھنا چاہتے ہیں بس اس گھر کو اپنا ہی گھر جانیے اب شادی کے بعد لڑکی کا اصل گھر ان کا سسرال ہی ہوتا ہے رہی بات آپ کی بوا کی تو ہم کسی کو بھیج کر ان کو بھی یہیں بلوا لیتے ہیں وہ وہاں کہاں اکیلی پڑی رہیں گی۔ یہاں ہونگی تو ان کا دل بہلا رہے گا۔'' دادی اماں نے معقول حل نکالا تھا۔

''شکریہ دادی جان۔'' فتح النساء نے کہا تھا وہ ان کی بلائیں لیتی ہوئی باہر نکل گئی تھیں فتح النساء ان کو دیکھ کر رہ گئی تھیں۔

❁ ❁ ......❁...... ❁ ❁

''کچھ کہنا چاہتی ہیں آپ۔'' تیمور نے ان کو ٹہلتا دیکھ کر پوچھا تھا عین رکی تھیں ان کی طرف دیکھا تھا اور پھر نفی میں سر ہلاتے ہوئے نگاہ پھیر لی تھی۔

''آپ کے نکاح کی تاریخ ٹھہر گئی خوش نہیں آپ۔'' تیمور نے پوچھا تھا مگر عین نے کوئی جواب نہیں دیا تھا تیمور ان کی طرف بغور دیکھنے لگا تھا۔

''ہم خوش ہیں آپ کے لیے آپ کے خواب تعبیر پانے جا رہے ہیں اس سے بڑھ کر کیا خوشی ہوگی؟'' تیمور نے کہا تھا وہ ان کی طرف دیکھ نہیں سکی تھیں کچھ دیر تک خاموش رہی تھی تب وہ بولی تھی۔

''آپ سے کس نے کہا کہ ہماری خواہش یہ تھی۔'' عین نے پوچھا تھا تیمور فوری طور پر کوئی جواب نہیں دے سکا تھا۔

''خواہش دل کے اندر پرندوں کی طرح رہتی ہے ان پرندوں کی سوچ کی خبر ہر ایک کو ہونا ضروری نہیں ہوتی۔'' عین سر جھکا کر بولی تھیں۔

''آپ کیا کہنا چاہتی ہیں۔'' تیمور نے جاننا چاہا تھا مگر عین نے ان کی طرف دیکھے بنا سر انکار میں ہلا دیا تھا اور چلتی ہوئی اندر کی طرف بڑھ گئی تھیں تیمور ان کو دیکھتے رہ گئے تھے۔

❁ ❁ ......❁...... ❁ ❁

''ممی ہم یہ رشتہ استوار کرنا نہیں چاہتے۔'' تیمور نے کہا تھا اور بیگم حکمت چونکتے ہوئے دیکھنے لگی تھیں۔

''اس کا کیا مطلب ہے تیمور کیا چاہتے ہو تم عین کی شادی ہو رہی ہے وہ بیاہ کر اپنے گھر جانے کو ہیں ان کی محبت کو گلے میں طوق کی طرح سجا کر رکھیں گے آپ کیا چاہتے ہیں جوگ لینے کا ارادہ کر لیا ہے؟'' بیگم حکمت غصے میں بولی تھیں تیمور ان کی طرف دیکھ کر رہ گئے تھے پھر سر جھکا کر بولے تھے۔

''ہم فی الحال آپ کی خواہش کو پورا نہیں کر سکتے معذرت خواہ ہیں اس معاملے کو کبھی بعد کے لیے اٹھا رکھیں۔'' وہ کہہ کر باہر نکل گئے تھے۔

❁ ❁ ......❁...... ❁ ❁

شادی کے گھر میں جس قدر گہما گہمی ہو سکتی ہے وہ دکھائی دے رہی تھی مگر عین بہت الجھی الجھی سی تھیں فتح النساء کھوئے سے انداز میں کمرے میں داخل ہوئی تو ان کو دیکھ کر چونک پڑیں۔

''کیا ہوا، یہ کیسے بیٹھی ہیں آپ آپ کی رسم حنا ہے آج آپ ایسے اداس کیوں بیٹھی ہیں عین۔'' مگر عین نے کوئی جواب نہیں دیا تھا فتح النساء ان کو سمجھانے لگی تھیں تبھی ملازمہ اندر داخل ہوئی تھیں۔

''بہو بیگم چھوٹے نواب نے آپ کو یاد فرمایا ہے۔'' اطلاع ملنے پر فتح النساء چونکی تھیں اور عین نے سر پر آنچل ڈال کر آگے بڑھ گئی تھیں۔ کمرے میں آ کر دیکھا تھا جلال منتظر تھے۔

''جی آپ نے یاد کیا تھا۔'' فتح النساء نے مدعا پوچھا تھا۔

جلال نے ان کو خاموشی سے دیکھا تھا۔

''اماں جان نے کہا آپ کو ہدایت کر دو کہ آپ کو اس تقریب میں بہت اچھے سے تیار ہونا ہے لوگوں کو یہ نہ لگے کہ بیٹی کی شادی میں نئی نویلی بہو کو جت کر رکھ دیا۔ سو ان کی خواہشوں کا احترام کیجیے۔'' جلال نے کہا تھا اور عین نے سر ہلایا تھا عجیب کھویا کھویا سا انداز تھا جلال ان کو دیکھنے لگے تھے۔

''کیا ہوا طبیعت ٹھیک ہے آپ کی۔'' جلال نے دریافت کیا تھا فتح النساء نے سر اثبات میں ہلا دیا تھا اور پلٹ کر باہر نکلنے کو تھیں جب یکدم جلال نے ہاتھ گرفت میں لیا تھا وہ چونک کر دیکھنے لگی تھیں مگر وہ نگاہیں پرسکوت تھیں ان میں کچھ نہیں تھا نہ کوئی اشتیاق نہ کوئی خواہش اور فتح النساء کا دل بجھنے لگا تھا۔

کیوں شامل کیا ہمیں زندگی میں۔ اگر ہماری کوئی خواہش آپ کے دل میں تھی ہی نہیں یہ سفر اختیار ہی کیوں

مصنفین سے گزارش

☆ مسودہ صاف اور خوشخط لکھیں۔

☆ صفحے کے دائیں جانب کم از کم ڈیڑھ انچ کا حاشیہ چھوڑ کر لکھیں۔

☆ صفحے کے ایک جانب اور ایک سطر چھوڑ کر لکھیں، صرف نیلی یا سیاہ روشنائی کا ہی استعمال کریں۔

☆ خوشبوئے سخن کے لیے جن اشعار کا انتخاب کریں ان میں شاعر کا نام ضرور تحریر کریں۔

☆ ذوق آگہی کے لیے بھیجی جانے والی تمام تحریروں میں کتابی حوالے ضرور تحریر کریں۔

☆ فوٹو اسٹیٹ کہانی قابل قبول نہیں ہوگی۔ اصل مسودہ ارسال کریں اور فوٹو اسٹیٹ کروا کر اپنے پاس محفوظ رکھیں کیونکہ ادارہ نے ناقابل اشاعت کہانیوں کی واپسی کا سلسلہ بند کر دیا ہے۔

☆ مسودے کے آخری صفحہ پر اردو میں اپنا مکمل نام پتا اور موبائل فون نمبر ضرور خوشخط تحریر کریں۔

☆ کہانیوں پر آپ کے تبصروں پر مشتمل خطوط (گفتگو) ادارہ کو ہر ماہ کی 3 تاریخ تک مل جانے چاہئیں۔

☆ اپنی کہانیاں دفتر کے پتا پر رجسٹرڈ ڈاک کے ذریعے ارسال کیجیے۔

☆ خصوصی توجہ: ای میل سے کہانیاں ارسال کرنے والے مصنفین سے گزارش ہے کہ وہ کہانی کے اختتام پر اپنا اردو میں مکمل ایڈرس اور موبائل فون نمبر ضرور تحریر کریں۔

☆ نوٹ: 1:00 تا 2:30 نماز ظہر اور کھانے کا وقفہ ہوتا ہے لہٰذا اس دوران دفتر ٹیلی فون کرنے سے گریز کریں۔

7، فرید چیمبرز، عبداللہ ہارون روڈ، کراچی۔

کیا اس رشتے کا کیا فائدہ جس میں آپ تنہا ہیں اور ہم تنہا اس تنہائی نے کیا دیا آپ کو۔'' فتح النساء بھیگی آنکھوں سے پوچھنے لگی تھی اور تبھی وہ بولا تھا۔

''اور آپ کو کیا ملا کس شے کی تمنا تھی کیا چاہ تھی آپ کہہ دیتیں ہم سب رکوا دیتے۔'' جلال کا لہجہ الزام دیتا تھا فتح النساء کی آنکھیں بھیگتی رہی تھیں۔

''ہم میں جو رشتہ ہے اس کی بنیاد ہے کہ نہیں ہم نہیں جانتے مگر ہم اتنا جانتے ہیں کہ اس رشتے میں اعتبار کی کوئی ایک اینٹ بھی نہیں۔'' فتح النساء نے کہا تھا اور وہ بجھے سے انداز میں مسکرا دیے تھے۔

''ایسے رشتے اعتبار نہیں رکھتے فتح النساء جہاں دھیان اور نظر کہیں اور لگی رہے۔'' وہ وار کرتے ہوئے بولے تھے فتح ان کو دیکھ کر رہ گئی تھی۔

''اللہ گواہ ہے ہم نے آپ کے ساتھ کبھی کوئی بے وفائی نہیں کی۔'' اور جلال نے بجائے یقین کرنے کے گردن نفی میں ہلائی تھی۔

''وفا کی بات نہیں ہو رہی وفا پر الزام نہیں لگایا یہ معاملہ الگ ہے فتح النساء آپ وہ بات سوچتی بھی نہیں جو دل میں ہے اور جو سوچتی ہیں اس کا سوچوں سے کوئی واسطہ نہیں بنتا۔'' وہ مدہم لہجے میں بولا تھا۔ اور فتح کا ہاتھ چھوڑ دیا تھا۔

''آپ کو اعتبار نہیں۔'' وہ مدہم لہجے میں بولا تھا اور فتح کا ہاتھ چھوڑ دیا تھا۔

''آپ کو اعتیار نہیں۔'' وہ شکوہ کناں نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی تھی۔

''ہاں نہیں۔'' وہ بنا کوئی لگی لپٹی رکھے بولا تھا۔

''کیوں؟'' وہ تڑپ کر رہ گئی تھی۔

''اس کی وضاحت آپ کو خود سے مانگنا چاہیے فتح النساء مجھ سے نہیں۔'' وہ صاف گوئی سے بولا تھا فتح کی آنکھوں سے آنسو بہہ گئے تھے۔

''کیا وجہ ہے ہم آپ کو قابل اعتبار کیوں نہیں لگتے۔''

''وجہ آپ کو خود سے دریافت کرنا چاہیے فتح النساء آپ اب بھی حیدر میاں سے رابطے میں ہیں اس کی وجہ تو فقط آپ ہی جان سکتی ہیں۔'' جلال نے کہا تھا اور وہ دنگ سی اسے دیکھنے لگی تھی۔ یعنی وہ اس حقیقت سے بھی واقف تھا کہ حیدر میاں اس سے ملنے آیا تھا وہ کیوں بھول گئی تھیں کہ وہ کتنے اثر در سوخ رکھتے ہیں کہ بات ان سے ڈھکی چھپی نہیں رہ سکتی؟ وہ جو اپنی صفائی دینے کے متعلق اور حیدر کی دھمکی کے متعلق بتانے کا سوچتی رہی تھی اس لمحے عجیب کیفیت میں جلال کو دیکھ رہی تھیں گویا انہوں نے جلال سے اس بابت بات نہ کر کے غلط کیا تھا گویا اس معاملے تو خود اپنے خلاف کر لیا تھا اگر وہ اعتماد میں لے کر بتا دیتی کہ حیدر ملنے آیا تھا اور اس نے ایسی دھمکی بھی دی تھی تو شاید جلال کی نظر میں ان کا کوئی مان باقی رہتا مگر ان کے نا بتانے پر معاملہ الٹ ہو گیا تھا۔

''آپ نے اس معاملے کو چھپایا نا صرف چھپایا آپ نے یہ بھی نظر انداز کر دیا کہ وہ آپ کی سہیلی کے ہونے والے خاوند ہیں اور نواب خاندان کے داماد ہیں جس خاندان کی بہو آپ ہیں ان کا رشتہ بھی اسی خاندان سے جڑا ہے اور وہ آپ کی سہیلی کا سہاگ ہیں وہ سہیلی جو آپ پر جان چھڑکتی ہیں اور انہی کا گھر برباد کرنے چلی ہیں اسے کہتے ہیں جس برتن میں کھانا اسی میں چھید کرنا۔'' وہ تلخ کڑوے لہجے میں بولے تھے اور بھیگی آنکھوں سے ان کو دیکھتی رہ گئی تھیں۔

نگاہ یار من
ایسی مستی طاری کی
ہم بھول گئے جفا کے معنی
ہائے یاد آ گئی تیری وفا

وہ ان کے چہرے کو چھوتے ہوئے مسکرائے تھے عجب ایک طنز تھا عجیب ایک کاٹ تھی انداز میں فتح النساء ایک لفظ بھول نہ پائی تھیں۔

''آپ سے وفا کی امید عبث تھی فتح النساء مگر ہم نے اعتبار کیا اور اس رشتے کو آگے بڑھایا ہمیں لگتا تھا آپ وفادار مگر حسن کو وفا کے معنی معلوم نہیں ہوتے یہ بات بھول گئے تھے بھول گئے تھے ہم کہ حسن کے تیمور جدا ہیں عشق کی وفائیں بڑھتی ہیں تو حسن مزید بے خبر ہونے لگتا ہے عشق سلگتا ہے تڑپتا ہے تو حسن کے سر مزید غرور سمانے لگتا ہے عشق پیچھے آتا ہے تو حسن پر سمیٹ کر سمت بدل لیتا ہے ریت پرانی ہے فتح النساء ہم نے کیا گنوایا ہے اس کا ادراک آپ کو نہیں ہوگا۔'' جلال الدین پٹوڈی نے کہا تھا اور ان کو عجیب الزام دیتی نظروں سے دیکھتا چلتا ہوا باہر نکل گیا تھا

فتح النساء بھیگی آنکھوں سے اسے دیکھتی رہ گئی تھی۔

✿ ✿ ...... ✿ ...... ✿ ✿

''آپ نے کھانا کیوں نہیں کھایا تیمور، کیا طریقہ ہے یہ؟'' بیگم حکمت نے ڈانٹا تھا مگر تیمور نے سر جھکائے رکھا تھا کوئی جواب نہیں دیا تھا تب بیگم حکمت نے تیمور کے سر پر ہاتھ رکھا تھا اور شفقت بھرے لہجے میں بولی تھیں۔

''ہم ماں ہیں آپ کی آپ کو اس طرح نہیں دیکھ سکتے ہم جانتے ہیں آپ کے دل پر کیا گزر رہی ہے مگر ہم آپ کی کوئی مدد نہیں کر سکتے کوئی معجزہ ہی اب آپ کو عین سے ملا سکتا ہے۔'' وہ دل گرفتگی سے گویا ہوئی تھیں تیمور ان کو دیکھنے لگا تھا۔

''ممی ہم خوش بخت سے کوئی رشتہ استوار نہیں کر سکتے ہم مخلص نہیں رہ سکیں گے جب تک ہم ایک تعلق کے لیے خود کو تیار نہیں پاتے ہم کوئی رشتہ بنانا نہیں چاہیں گے آپ پلیز کسی طرح کی ضد مت کیجیے گا۔'' تیمور نے سمجھایا تھا بیگم حکمت کی آنکھیں بھیگنے لگی تھیں۔

''ہمارے اختیار میں ہوتا تو ہم کیا آپ کی خواہش رد کرتے ہمارے اکلوتے بیٹے ہیں آپ، آپ کی خواہش کو کیسے ٹال سکتے ہیں آپ کی خوشی میں ہی ہم والدین کی خوشی ہے آپ اگر چاند بھی مانگتے تو ہم آپ کی جھولی میں ڈال دیتے مگر آپ نے مانگا بھی کیا جو ہم آپ کو نہیں دے سکتے۔'' بیگم حکمت بھیگی آنکھوں سے بولی تھیں۔ تیمور کو ماں کے آنسو اچھے نہیں لگے تھے تبھی اس نے ہاتھ بڑھا کر ان کی آنکھوں کو پونچھا تھا اور نرمی سے گویا ہوا تھا۔

''ممی پلیز آپ ان باتوں کو اتنا دل پر مت لیجیے دل ہی تو ہے سنبھل جائے گا پھر آپ جیسا کہیں گی ہم ویسا کریں گے آپ کی حکم عدولی نہیں کرنا چاہتے مگر فی الحال ہم کسی بھی رشتے کے لیے خود کو تیار نہیں پاتے۔'' وہ سمجھاتے ہوئے بولا تھا۔

''ہمیں رشتے کی پروا نہیں تیمور ہمارے بیٹے کا دل درد سے گھرا ہے ہمیں آپ کی فکر ہے ہم آپ پر دباؤ ڈالنا بھی نہیں چاہتے ہم اپنے بیٹے کا دکھ سمجھتے ہیں بیٹا قسمت کا لکھا کوئی نہیں بدل سکتا اگر عین آپ کے نصیب میں درج ہیں تو کسی نا کسی طرح وہ آپ سے آن ملے گی ہم کوئی خوامخواہ کی امید آپ کو دلانا نہیں چاہتے اور یہ بھی جانتے ہیں کہ آپ

اس درجہ بے وقوف نہیں آپ اتنی سمجھ بوجھ تو رکھتے ہیں سو آپ خود کو سنبھالنے کی کوشش کریں عین آپ کو اپنا بہترین دوست مانتی ہیں ان کی خوشی میں آپ کا اداس ہونا مناسب نہیں ان کی خوشیوں کے لیے دعا کریں اللہ ان کو آباد رکھے اگر یہی لکھا ہے تو یہی سہی۔'' بیگم حکمت نے سمجھایا تھا تیمور نے سمجھ داری سے سر ہلایا تھا۔

''ہم معاملات کو سمجھتے ہیں می آپ پریشان نہ ہوں ہم عین کی خوشی میں شریک ضرور ہوں گے اتنے بے ہمت نہیں ہیں ہم کہ اپنا درد ان پر آشکارا کردیں درد دل میں رہنے کے لیے ہے بھید کھولنے کے لیے نہیں ہمیں ان سے کسی طرح کی کوئی مدارات نہیں چاہیے وہ بس خوش رہیں ان کی خوشی ہی ہماری خوشی ہے دل میں بس ایک چبھن ہے اور کچھ نہیں ایک ہلکا سا درد ہے اور ملال بھی مگر اس کا شکوہ کس اور سے کرنا جائز نہیں۔'' وہ بردباری سے گویا ہوئے تھے اور بیگم حکمت نے ان کا سر چوم لیا تھا۔

''میرے بچے سلامت رہ اللہ تیری ساری مرادیں پوری کرے۔'' انہوں نے دل سے دعا دی تھی۔

❁ ❁ ……❁…… ❁ ❁

''کیا ہوا عین آپ اس طرح الجھی ہوئی کیوں ہیں سب خیریت ہے؟'' جلال نے پوچھا تھا عین نے کوئی جواب نہیں دیا تھا سر جھکائے بیٹھی رہی تھی جلال نے ان کے ہاتھ میں بنے مہندی کے نقش ونگار کو بغور دیکھا تھا۔

''عین آپ ہماری ہمشیرہ ہیں اور ہم ہمیشہ آپ کو خوش دیکھنا چاہتے ہیں ہم اس عمل کی مخالفت کریں گے جو آپ کی راہ میں رکاوٹ بنے گا جو آپ کی خوشیوں کو روکے گا اگر ہمیں زندگی سے لڑ کر بھی آپ کی خوشیوں کا رخ آپ کی طرف موڑنا پڑا تو بخدا ہم ایسا کر گزریں گے ہم ہمیشہ اپنی بہن کی حمایت میں کھڑے ہوں گے یہ ہمارا وعدہ ہے ہمارے ہوتے ہوئے کوئی آپ کی طرف اور آپ کی خوشیوں کی طرف بری نگاہ نہیں ڈال سکے گا۔'' وہ مضبوط لہجے میں گویا تھے میں نے نگاہ اٹھا کر ان کو دیکھا تھا اور بھائی کے شانے پر سر رکھ دیا تھا ان کی آنکھیں بھیگنے لگی تھیں جلال ان کے اس عمل پر ساکت رہ گیا تھا۔

''آپ خوش نہیں ہیں عین۔'' انہوں نے پوچھا تھا مگر عین نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔

''آپ ہم سے زیادہ دور نہیں جارہی عین ہم آپ سے ملنے آتے رہیں گے اس میں رونے کی کیا بات ہے اب آپ چھوٹی سی اسکول جاتی عین نہیں ہیں جو ذرا ذرا سی بات پر رو پڑتی تھیں اب آپ بہت بہادر اور سمجھدار سی عین ہیں اور آپ کا بھائی کا سایہ بن کر آپ کے ہمراہ رہے گا کوئی پریشانی ہو آپ ہمیں بتایئے گا ہم آپ کے لیے کھڑے ہونے والے پہلے انسان ہوں گے۔'' وہ مضبوط لہجے میں بولا تھا بہن کے آنسو پونچھتے ہوئے اس کے سر پر شفقت سے ہاتھ رکھا تھا۔

''وعدہ کریں آپ زندگی میں آج کے بعد کبھی نہیں روئیں گی اگر آپ کی آنکھوں میں آنسو آئے یا کوئی آپ کی آنکھوں میں آنسو لانے کا سبب بنا تو ہم اسے کبھی معاف نہیں کریں گے۔'' جلال نے ترچھی نگاہ سے قریب کھڑی فتح النساء کو دیکھا تھا۔

''ہم اس انسان کی زندگی جہنم بنادیں گے جو آپ کی خوشیوں کی سمت نگاہ کرے گا۔'' وہ جیسے کھلی دھمکی دے رہے تھے فتح النساء ان کو سنا رہی تھی سو نگاہ پھیر کر باہر نکل گئی تھیں جلال نے فتح النساء کو جاتے دیکھا تھا اور پھر اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔

❁ ❁ ……❁…… ❁ ❁

تیمور مہندی کی تقریب میں شرکت کرنے کی غرض سے آ تو گئے تھے مگر دل بہت بوجھل تھا وہ عین کا سامنا نہیں کرنا چاہتے تھے مگر یکدم فتح النساء ان سے آن ٹکرائی تھیں اور انہوں نے اسے سنبھالا تھا۔

''کیا ہوا فتح النساء آپ کچھ پریشان لگ رہی ہیں خیریت ہے نئی نویلی دلہن کا چہرہ ایسا اترا ہوا؟'' تیمور نے جانچنے کی کوشش کی تھی فتح النساء نے نگاہ بچا کر اپنے آنسو پونچھے تھے اور سر نفی میں ہلادیا تھا۔

''معاملہ کیا ہے؟'' تیمور نے بھانپ کر پوچھا تھا مگر فتح نے کوئی جواب دیے بنا قدم آگے بڑھادیے تھے تیمور ان کی سمت کسی قدر حیرت سے دیکھنے لگا تھا پھر نگاہ سامنے سے آتے حیدر میاں پر کی تھی ان کو دیکھ کر جو خوف فتح کے چہرے پر دکھائی دیا تھا وہ تیمور نے بغور جانچا تھا جانے قریب سے گزرنے پر حیدر میاں نے کیا کہا تھا کہ فتح النساء کے چہرے کا خوف مزید بڑھ گیا تھا مرزا حیدر مسکرائے تھے

اور دائیں بائیں نگاہ کرتے مسکراتے ہوئے آگے ہولیے تھے تیمور نے ان کے تیور صاف دیکھے تھے سو وہ کسی قدر متفکر ہوگئے تھے۔

❁ ❁ ……❁…… ❁ ❁

مہندی کی رسم کا آغاز ہوچکا تھا سکھیاں ڈھولک کی تھاپ پر سہاگ کے گیت گارہی تھیں قہقہوں اور ہنسی کے ساتھ خوشیوں کا ماحول سماں باندھ رہا تھا فتح النساء دادی اماں کے کہنے پر اوپر والی منزل سے مٹھائی کا ٹوکرا لینے آئی تھیں۔ جب اپنے پیچھے قدموں کی آہٹ محسوس کرکے وہ رک گئی تھیں پلٹ کر دیکھا تھا جب حیدر میاں کو دیکھ کر ان کی سانس رک گئی تھی حیدر میاں مسکرائے تھے اور قدم ان کی طرف بڑھانے لگے تھے اور فتح النساء کے دل کی دھڑکیں جیسے بند ہونے لگی تھیں۔

❁ ❁ ……❁…… ❁ ❁

تیمور جانے کیا سوچ کر اوپر آیا تھا جب شور سن کر اوپر کی منزل کے اس کمرے میں قدم رکھا تھا اور حیدر میاں کے ساتھ دیکھ کر وہ سرعت سے آگے بڑھا تھا یہ بھول کر کہ وہ کون ہیں اس نے ان کو دو مکے جڑے تھے حیدر میاں کے جبڑے سے خون رسنے لگا تھا اور وہ چکرا کر وہیں گر گئے تھے تیمور نے فتح النساء کا زمین پر گرا آنچل اٹھا کر ان کے شانوں پر ڈالا تھا اور مڑے تھے جب جلال وہاں کھڑا دکھائی دیا تھا۔

❁ ❁ ……❁…… ❁ ❁

''یہ محترمہ ہم پر نظر رکھتی تھیں جو ہوا ان کی منشا سے ہوا انہوں نے ہمیں اوپر والی منزل پر بلایا تھا ہم وہاں انہی کی ایما پر گئے تھے ہم جھوٹ نہیں کہہ رہے ہمیں کہتے ہوئے شرم آتی ہے ہم نے ان کو انکار بھی کیا تھا کہ آپ نواب خاندان کی عزت ہیں ہم آپ کا احترام کرتے ہیں مگر ان کو کچھ سمجھ نہیں آیا سو ہم بھی فرشتہ تو نہیں ہم نے بھی ہتھیار ڈال دیے۔'' حیدر میاں نے جلال کے سامنے کہنے میں کوئی حیل وحجت نہیں جانی تھی اور تیمور ان کے سفید جھوٹ پر دہاڑے تھے۔

''جلال ان کا یقین مت کیجیے گا یہ درست نہیں کہہ رہے فتح النساء پاک دامن ہیں انہوں نے انہیں نہیں بلایا تھا ان کو دیکھ کر فتح النساء کے چہرے پر جو خوف دکھائی دیا تھا اسی

کودیکھ کر ہم ان کے پیچھے گئے تھے اور تبھی ان کے ارادوں کا انکشاف ہوا اور ہم نے فتح النساء کی عزت پر کوئی آنچ نہیں آنے دی آپ ان کا اعتبار مت کیجیے گا یہ ٹھیک انسان نہیں ہم ان کو جانتے ہیں۔" تیمور نے کہا تھا مگر جلال نے ہاتھ اٹھا کر تیمور کو چپ کرادیا تھا۔ اور فتح کی سمت دیکھا تھا اور زہر خند لہجے میں بولا تھا۔

"نسی بدچلن اور بدکردار ہوں گی یہ بات ہم نے [illegible] ہم آپ کو کبھی معاف نہیں کریں گے برائے کرم اپنی اس درجہ بے شرمی کے ساتھ اس محل سے تشریف لے جائیں ورنہ ہم کچھ کر گزریں گے۔" جلال کا لہجہ اشتعال سے بھرا تھا فتح النساء ششدر سی ان کی سمت تکتی چلتی ہوئی خاموشی سے محل سے نکلتی چلی گئی تھیں تیمور نے جلال کی طرف حیرت سے دیکھا تھا۔

"جلال یہ کیا کیا آپ نے آپ نے فتح النساء کا یقین نہیں کیا وہ آپ کی زوجہ ہیں وہ آپ سے بے وفائی کرسکتی ہیں آپ نے سوچا بھی کیسے؟" تیمور نے جلال کو سمجھانا چاہا تھا مگر جلال نے ہاتھ اٹھا کر ان کو چپ کرادیا تھا۔

"تیمور آپ ہمارے دوست ہیں اور محل کے اہم فیصلوں میں ہمیشہ شامل رہے ہیں مگر اس بار ہم آپ کی مداخلت نہیں چاہتے ہمارے نجی معاملات میں کسی بھی طرح کی مداخلت پر ہم اگر آپ کو روک دیں تو برائے کرم اسے منفی نظر سے مت دیکھیے گا۔" جلال نے کہا تھا اور پلٹ کر چلتا ہوا وہاں سے نکل گیا تھا تیمور اسے دیکھ کر رہ گیا تھا جلال کے جاتے ہی حیدر میاں [illegible] تھا۔

"راجا اور رانی کی کہانی ختم [illegible] ھا نکلا اور رانی کانی بس آپ یہی کہانی دنیا کو ازبر رہے گی اور یہی بات راجہ کے سینے میں پھنسی رہے گی کہ ان کی رانی نے وفا نہیں کی چچ چچ آپ اچھے دوست ہو کر بھی جلال کو قائل نہ کرسکے اور ہم بازی مار گئے سچ وہی ہے جو ہم نے کہا سو آپ بھی زبانی یاد کرلیں رانی بدچلن ہیں انہوں نے خود ہمیں دعوت دی۔" یہ بات سن کر تیمور آپے سے باہر ہوگیا تھا اور ان پر لاتوں گھونسوں کی بارش کردی تھی مگر وہ دیوانہ وار ہنستے چلے گئے تھے۔

❁ ❁ ...... ❁ ...... ❁ ❁

شادی والے گھر میں یکدم خاموشی چھا گئی تھی شادی ملتوی کردی گئی تھی ہر کوئی ایک دوسرے سے نگاہ چرا رہا تھا کسی میں اس معاملے پر بات کرنے کی جیسے ہمت ہی نہیں تھی ہر کوئی اپنی جگہ جیسے چور تھا تیمور نے نواب خاندان کے اندرونی اور نجی معاملات میں مداخلت نہیں کی تھی اور دوبارہ وہاں پلٹ کر نہیں دیکھا تھا جلال پچھتاوا محسوس کررہے تھے کہ نہیں اس بارے میں ان کو خبر نہیں تھی مگر وہ مرزا حیدر سراج الدولہ کی سازش پر حیران رہ گئے تھے۔

"مرزا سراج الدولہ نے چال چل دی ہمیں یقین تھا وہ ایسے ہی کوئی چال چلیں گے ان کی دشمنی کی آگ ٹھنڈی نہیں ہوئی مگر نواب صاحب معصوم ہیں ان کی عقل میں یہ بات نہیں آتی اور جلال الدین بھی عقل کے اندھے نکلے جس لمحے ان کو زوجہ پر اعتماد کرنا چاہیے تھا اس لمحے وہ ان کی طرف انگلی اٹھانے والے پہلے انسان تھے۔" حکمت صاحب تاسف سے بولے تھے بیگم حکمت نے افسوس سے سر ہلایا تھا۔

"اچھا نہیں ہوا ہر کوئی ششدر تھا شادی والے گھر میں سناٹا چھا گیا تھا ہمیں یقین نہیں اگر فتح النساء نے ایسا کیا ہو وہ تو بہت سلجھے ہوئے مزاج کی لڑکی ہیں نواب صاحب نے پرورش کی ہے ان کی ایسا کیسے ممکن ہے عین اور وہ اچھی دوست ہیں بھلا فتح النساء اپنی سہیلی کا گھر کیوں اجاڑنا چاہیں گی اور جب کہ ان کو محل میں ایک خاص مقام حاصل ہے وہ جلال کی بیگم [illegible] پر مکمل اختیار ہے ان کو اور کیا درکار تھا ان کو ہمارا [illegible] مانتی یہ حیدر میاں کوئی چال چل گئے ہیں۔" بیگم حکمت نے کہا تھا حکمت صاحب نے سر ہلایا تھا۔

"جلال کی عقل پر یقیناً پتھر پڑے ہیں وہ زوجہ کی نہیں سن رہے جس وقت میں ایک شوہر بیوی کے ہمراہ کھڑا ہوا تھا وہ اس لمحے بیوی کو بے اعتبار ٹھہرا کر گھر سے نکال چکے تھے یہ بھی اچھا ہوا کہ نواب صاحب نے شادی رکوادی اگر شادی ہوجاتی تو جانے عین کی زندگی کس طور گزرتی حیدر جیسے نوجوان کے ہاتھ اپنی بیٹی کی زندگی سونپنا کوئی دانشمندانہ فیصلہ یقیناً نہیں تھا بہرحال جو ہوتا ہے اچھے کے لیے ہوتا ہے فی الحال شادی [illegible] ہمیں یقین ہے اگر حیدر میاں [illegible] نواب صاحب اگر شادی کو ہونے نہیں دیں گے مگر معاملہ یہ ہے کہ حیدر میاں کو غلط ثابت کون کرے گا یہاں تو گواہوں کی سنی گئی نا مدعی کی بہرحال لوگ جو باتیں کررہے ہیں اس سے نواب صاحب بھی واقف ہیں عزت پر کافی حرف آیا ہے اب اللہ ہی جانے اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے۔" حکمت صاحب خاصے متفکر دکھائی دیے تھے تیمور نے انہیں خاموشی سے سنا تھا۔

❁ ❁ ...... ❁ ...... ❁ ❁

ہر کوئی اپنی جگہ اسی طور خاموش رہا تھا وقت سرکنے لگا تھا مرزا سراج نے ایک بار پھر رخصتی کی بات کی تھی مگر نواب صاحب نے کوئی جواب نہیں دیا تھا عین خاصی بجھ سی گئی تھیں جلال ان کے روبرو آکر نظر نہ ملا سکے تھے۔

"فتح ایسا کیسے کرسکتی ہیں؟ وہ جلال کی محبت میں گرفتار تھیں ان کو جلال کے علاوہ کوئی دکھائی ہی نہیں دیتا تھا پھر یہ کیا ہوا؟" وہ اپنی جگہ حیران تھی۔

"شاید اقتدار کا حصول ان کو جلال کے قریب لایا ہو وہ نواب خاندان کے ٹھاٹھ باٹھ سے شاید متاثر ہوگئی تھیں انہوں نے جلال سے نکاح کرنا چاہا تھا۔" اماں جان نے کہا تھا مگر عین نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔

وہ بار بار سوچ رہی تھیں مگر کسی نتیجے پر پہنچ نہیں پا رہی تھیں مگر وہ حیدر کے متعلق بھی کچھ غلط سوچنا نہیں چاہتی تھیں بہرحال وہ ان کے منگیتر تھے اور وہ ان کا اعتبار کرتی تھیں کہ ان کے سامنے ان کا کردار اس درجہ واضح نہ تھا انہوں نے حیدر کا اصل چہرہ نہیں دیکھا تھا سو وہ اس معاملے میں چپ سادھے ہوئے تھیں۔

"نواب صاحب جانے دیجیے معاملہ رفع دفع ہوگیا ہوا سو ہوا اس بات کو بھول کر رخصتی کی بات کریں ہم عزت دار لوگ ہیں ہم آپ کی عزت پر حرف آتا نہیں دیکھ سکتے عین بٹیا کے نکاح کی بات ہوگی تو لوگ پچھلا واقعہ بھول جائیں گے یہ کہانی بھی فراموش ہوجائے گی۔" مرزا سراج الدولہ نے کہا تھا مگر نواب صاحب نے کوئی حوصلہ افزا جواب نہیں دیا تھا۔

"مرزا صاحب عین آپ کی امانت ہے مگر فی الحال اس معاملے کو رہنے دیجیے ہم اس معاملے پر رمضان کے بعد بات کریں گے فی الحال اس معاملے کو جوں کا توں رہنے دیں۔" نواب صاحب تھے انہوں نے یہ واقعہ کسی کے توسط سے سنا [illegible] وہ سمجھ نہیں پائے تھے سچائی ان کو معلوم نہیں تھی مگر وہ جانتے تھے کہ فتح النساء ایسا کچھ نہیں کرسکتیں وہ فتح النساء سے ملنے گئے تھے مگر پھر ملے بنا لوٹ آئے تھے۔

"ہم نے ان کو بیٹی سمجھا ہے بیٹی جانا ہے ہم ان کے کردار کو شک کی نگاہ سے نہیں دیکھ سکتے ہم ان کے والد کی جگہ رہے ہیں ان کی پرورش محل میں ہوئی ہے ہم یقین نہیں کرپارہے جن کو ہم نے بیٹی کا درجہ دیا ہے وہ اس حرکت کی مرتکب کیسے ہوسکتی ہیں۔" نواب صاحب لہجے میں افسوس اور دکھ تھا وہ ابھی تک بے یقینی کا شکار تھے۔

"جانے دیجیے نواب صاحب ہم کسی کی قسم نہیں لے سکتے ضروری نہیں فتح النساء کی پرورش ہمارے ہاتھوں ہوتی ہے تو عین کی طرح باکردار بھی ہوں وہ اچھی، سلجھی ہوئی طبیعت کی مالک تھیں مگر اب ہمیں کیا پتا ان کے دل میں کیا تھا انسان کی نیت کا کچھ پتا نہیں ابھی تو وہ چپ چاپ محل سے چل گئیں بے قصور ہوتیں تو اپنے لیے آواز اٹھاتیں عورت ذات پر ایسا ہی برا وقت نہیں آیا کہ اس کی سنی نہ جائے ہمارے خاندان کی بہو تھیں ہم ان کی سنتے ان کی حمایت میں بھی کھڑے ہوتے مگر نواب صاحب جس طور وہ خاموشی سے رخصت ہوئی یہ سب ان کے خلاف جا رہا ہے۔" بیگم نے کہا تھا تو نواب صاحب کچھ بولے بنا اٹھ کر وہاں سے رخصت ہوگئے تھے۔

❁ ❁ ...... ❁ ...... ❁ ❁

"فتح النساء آپ نے اس طرح خاموشی سے محل چھوڑ کر اچھا نہیں کیا اس طرح آپ مجرم ثابت ہورہی ہیں آپ نے کیوں ایسا کیا؟" بوا نے پوچھا تھا مگر وہ پتھرئی بیٹھی رہی تھیں۔

"حیدر میاں کی طبیعت ہر کوئی جانتا ہے افسوس نواب صاحب نے بھی آپ کا اعتبار نہیں کیا چلو جلال [illegible] ہیں ہوش سے کام نہیں لیا مگر نواب صاحب تو وہ [illegible] سمجھدار ہیں ان سے ایسی توقع نہیں تھی آپ کو گھر سے بے دخل کردینا کیا معنی رکھتا ہے کہ وہ آپ کے کردار پر انگلی اٹھا رہے ہیں آپ نواب خاندان کی عزت ہیں آپ کے کردار پر انگلی اٹھانا چاند پر تھوکنا ہے۔" بوا نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا تھا فتح النساء پتھرئی بیٹھی رہی تھیں۔

''فتح النساء کچھ بول میری بچی ایسے خاموش رہیں گی آپ تو لوگوں کو یقین ہونے لگے گا۔'' بوا نے انہیں جھنجوڑا تھا۔

''ہم کیا کہیں بوا کہنے کو کیا باقی ہے ہم مر چکے ہیں کوئی پوچھنے آئے تو کہہ دیجیے گا فتح النساء باقی نہیں۔'' وہ بولی تھیں اور پھر اٹھ کر وہاں سے چلی گئی تھیں بوا کا جی بھر آیا تھا اور وہ فتح النساء کے لیے آنسو بہانے لگی تھیں۔

❁ ❁ ...... ❁ ...... ❁ ❁

جلال چپ چاپ بیٹھے تھے جب تیمور اندر داخل ہوا تھا۔

''آپ نے بلوایا خیریت؟'' جلال چونکا تھا اور تیمور کو بیٹھنے کو کہا تھا۔

''ہم کسی مدعے پر بات کرنا نہیں چاہتے سو آپ کسی بات کو دہرانا ضروری مت جانیے گا ہم صرف آپ سے شرمندہ تھے اس دن ہم نے آپ سے تلخ لہجے میں بات کی ہمیں اس کا افسوس تھا آپ ہمارے بہت قریبی دوست ہیں ہم آپ پر اعتبار کرتے ہیں مگر اس معاملے میں یہ اعتبار برقرار نہیں رہ سکا مگر آپ کا شکریہ آپ نے خود کو ہمیشہ مددگار کی حیثیت سے پیش کیا۔'' جلال نے تیمور کے شانے پر ہاتھ رکھا تھا تیمور نے انہیں خاموشی سے دیکھا تھا پھر مدہم لہجے میں بولے تھے۔

''جلال آپ کے نجی معاملات میں مداخلت کرنا نہیں چاہتے مگر وہ آپ کی شریک حیات ہیں آپ کو ایک بار معاملات کی چھان بین کرنا چاہیے تھی فتح النساء پر آپ یقین کرتے ہیں کہ نہیں یہ تو بعد کی بات تھی مگر ایک شریک حیات کو اپنی زندگی کے ہمسفر پر جو اعتبار ظاہر کرنا چاہیے آپ کو اس کا مظاہرہ ضرور کرنا چاہیے تھا۔'' تیمور نے کہا تھا مگر جلال نے جیسے سنا ہی نہیں تھا سو ان کی طرف سے کوئی جواب نہیں آیا تھا۔

''جلال میں بے حسی فتح النساء کے لیے مناسب نہیں وہ آپ کی عزت ہیں ان کی آبرو کی قدر آپ سے زیادہ کسی کو نہیں مگر آپ وہ انسان نہیں جو ان کی آبرو کے لیے کھڑا ہوا ہو جو گھونسا ہم نے حیدر میاں کے منہ پر مارا وہ آپ کو مارنا چاہیے تھا اور۔'' تیمور جذباتی انداز میں بول رہے تھے جب جلال بولے تھے۔

''تعلقات اپنی موت مر جائیں تو ان کے متعلق بات کرنا فضول ہوتا ہے ہم بھول چکے ہیں کہ ہمارا کوئی واسطہ فتح النساء سے تھا آپ ہی بھول جائیے۔'' جلال کا لہجہ سرد تھا اور تیمور حیران ہوا تھا۔

''جلال اس درجہ بے حسی، آپ کی آنکھیں کہتی ہیں آپ فتح النساء کے لیے بے قرار ہیں ان کے عشق میں مبتلا ہیں پھر آپ ان پر اعتبار کیونکر نہ کر سکے؟'' تیمور کو حیرت ہوئی تھی جب جلال بولے تھے۔

''ہمیں فتح النساء سے محبت نہیں ہے وہ محبت تھی ہی نہیں نہ کبھی ہوگی ہم نے ان کا اعتبار کیا بس وہی غلط کیا۔'' وہ بولے تھے اور تیمور ان کو دیکھ کر رہ گیا تھا۔

''ہم ان کے لیے مر چکے ہیں تیمور یہ رشتہ ختم ہو چکا ہے یہاں کچھ باقی نہیں سو تذکرہ عجیب لگتا ہے۔'' جلال نے کہا تھا اور تیمور نگاہ پھیر کر گہری سانس لے کر رہ گئے تھے۔

❁ ❁ ...... ❁ ...... ❁ ❁

3 جون 1947ء کو آل انڈیا کانگریس اور آل انڈیا مسلم لیگ دونوں نے اصولی طور پر جس منصوبے کو منظور کیا تھا وہی دن قیام پاکستان کی نوید لے کر طلوع ہوا تھا کیونکہ اسی شام کو آل انڈیا ریڈیو پر لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے ہر مجیسٹی گورنمنٹ کی طرف سے اپنے منصوبے کا اعلان کر دیا تھا 9 جون کو جو اجلاس ہوا تھا اس پر غور و خوص کے بعد 3 جون 1947ء کو منصوبہ As a basis for compromises کے طور پر منظور کیا گیا تھا کیونکہ مسلم لیگ ایسا نہ کرتی تو انگریز حکومت کانگریس کے حوالے کر کے وہاں سے اپنا بوریا بستر سمیٹ لیتی اور مسلمان ہندوؤں کے رحم و کرم پر رہ جاتے آل انڈیا کانگریس نے بھی اس منصوبے کی منظوری دے دی تھی اور اس کے ساتھ ہی اس سیاسی ڈرامہ کا اختتام ہوا تھا اور 4 اگست کا دن بھی آن پہنچا تھا جب پاکستان کی آزادی کا اعلان کر دیا گیا۔

رمضان کریم کی مبارک ساعتوں میں 26 روزہ کو 27 ویں کی رات آزادی کے دیوانے، آل انڈیا مسلم لیگ کے پروانے اور قائداعظم کے محبان شام سے ٹولیوں اور گروپوں کی شکل میں چھتوں پر موجود تھے شب بارہ بجے جب اعلان ہوا تو فضا نعرہ تکبیر، نعرہ رسالت، پاکستان زندہ باد، مسلم لیگ زندہ باد اور قائداعظم زندہ باد کے نعروں سے گونجنے لگی تھی

اس دن ہر گھر میں چراغ روشن کیے گئے تھے۔

مرزا صاحب نے سب سے پہلے فون کر کے نواب صاحب کو مبارکباد دی تھی۔

''مبارکباد نواب صاحب آپ کا اور آپ کے رہنماؤں کا خواب شرمندہ تعبیر ہوا پاکستان بلآخر معرض وجود میں آ گیا اگرچہ پاکستان کے اعلان کے بعد پنجاب، بنگال، بہار اڑیسہ میں نسلی فسادات کی خبریں آنے لگی ہیں مگر خوشی میں ایسی خبریں نظر انداز کر دی جائیں تو بہتر ہیں۔'' وہ ہنسے تھے نواب صاحب نے خیانت سے انہیں سنا تھا اور بولے تھے۔

''میاں سوچی سمجھی سازش کو اتفاق نہیں سمجھا جا سکتا بہرحال اس مدعا پر بات کرنا مناسب نہیں سب جانتے ہیں کہ جب لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو ہندوستان کا وائسرائے بنا کر بھیجا گیا حلف اٹھانے کے فوراً بعد لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے ہندوستان کے تمام با اثر اور اہم سیاسی شخصیات سے ملاقاتوں کا آغاز کیا قائداعظم نے تبھی وائسرائے پر اپنا موقف واضح کر دیا تھا کہ وہ سندھ، بلوچستان، صوبہ سرحد، پنجاب، بنگال اور آسام کے صوبوں پر مشتمل ایک آزاد اور خود مختار پاکستان چاہتے ہیں دوسری طرف کانگریس لیڈروں نے بھی وائسرائے کو یہ عندیہ دیا تھا کہ وہ ہندوستان کی تقسیم اس صورت میں قبول کر لیں گے جس کے تحت بنگال اور پنجاب کے صوبے ہندوؤں او رمسلمانوں کے درمیان تقسیم ہوں گے اور ساتھ ہی ساتھ قیام پاکستان سے قبل سندھ بلوچستان، صوبہ سرحد، مغربی پنجاب اور مشرق بنگال کے عوام کی مرضی بھی معلوم کی جائے گی ان ملاقاتوں کے سلسلے کا جو آغاز کیا تھا اس میں قائداعظم نے اپنا موقف واضح کر دیا تھا وائسرائے اس ضمن میں ایک نتیجے پر پہنچ گئے تھے کہ متحدہ ہندوستان کی خواہش ایک ایسا خواب ہے جو کبھی شرمندہ تعبیر نہ ہو سکے گا وائسرائے کی ہندوستانی رہنماؤں سے بات چیت کے تناظر میں لندن سے شائع ہونے والے اخبار سنڈے آبزرور نے لکھا تھا کہ

''ان ملاقاتوں سے یقیناً وائسرائے اس نتیجے پر پہنچے ہوں گے کہ تقسیم ہی انتشار کو ختم کرنے کا سبب بن سکتی ہے 3 جون 1947ء وہ دن تھا جب ہندوؤں اور انگریزوں نے مسلمانوں کے مطالبے کے سامنے سر تسلیم خم کیا لیکن افسوس جس جغرافیائی حدود کا تعین قائداعظم نے کیا تھا ویسا پاکستان مسلمانوں کو نصیب نہیں ہونے دیا گیا بہرحال پاکستان اور انڈیا ریاستوں کی صورت نقشے پر ابھر چکے ہیں اور اس کو غنیمت جاننا چاہیے۔'' نواب صاحب کا لہجہ شکوہ کناں تھا اور مرزا صاحب ہنس دیے تھے۔

''چلیے بھاگتے چور کی لنگوٹھ ہی سہی کچھ ہاتھ تو لگا کچھ نہ ہونے سے کچھ ہونا بہتر ہے جناب فرنگیوں کو جانا تھا سو ایسی تقسیم ہی مناسب ہے فرنگیوں کی سامراجیت کا خاتمہ تو ہوا ورنہ تو انہی کی غلامی کرتے نکل جانا تھی۔'' مرزا سراج الدولہ نے کہا تھا اور نواب صاحب ان کو دیکھ کر رہ گئے تھے۔

''اب کیا ارادہ ہے محترم آپ تو پاکستان سدھارنا چاہیں گے اور ہم یہیں رہنا چاہیں گے مگر ان معاملات میں اور پاکستان بننے کی خوشی میں یہ مت بھول جائیے کہ عین ہماری امانت ہیں اور مرزا خاندان کی بہو ہیں۔'' مرزا نے یاد دلایا تھا اور نواب خاموشی سے انہیں دیکھنے لگے تھے۔

''مرزا صاحب مدعا کچھ یوں ہے کہ ہم یہ نکاح نہیں چاہتے۔'' اور مرزا صاحب حیرت سے انہیں دیکھنے لگے تھے۔

''یہ کیسے ممکن ہے جناب آپ نے تو وعدہ کیا تھا؟'' انہوں نے یاد دلایا تھا۔

''ہاں مگر اب ہم اس وعدے سے مکر رہے ہیں ہم نکاح نہیں چاہتے۔'' نواب صاحب نے سکون سے کہا تھا۔

''آپ ایسا کیونکر اور کیسے کر سکتے ہیں نواب صاحب کوئی آدمی اپنی بات سے کیسے مکر سکتا ہے گویا نواب صاحب کی کوئی زبان ہی نہیں واہ صاحب واہ کیا خوب کہی لگتا ہے آپ کو جگ ہنسائی کی بھی کوئی فکر نہیں رہی۔'' مرزا نے چڑانے والے انداز میں کہا تھا۔

(ان شاء اللہ باقی آئندہ ماہ)



یاجوج ماجوج

ایم زیڈ شیخ

ایم زیڈ شیخ کا تعلق ہمارے پڑوسی ملک بھارت سے ہے آپ کا شمار وہاں اردو ادب کے بڑے لکھاریوں میں ہوتا ہے آپ جیسے ادیبوں ہی کی وجہ سے بھارت میں اردو ادب اب بھی پوری آب و تاب سے زندہ ہے انہوں نے بطور خاص نئے افق کے قارئین کے لیے ایک مزاحیہ کہانی یاجوج ماجوج بھیجی ہے امید ہے وہ اس موضوع پر آئندہ بھی طبع آزمائی کرتے رہیں گے۔

آبی اور تابی کی شرارتیں ایک شگفتہ سی سیریز

''آبی'' اور ''تابی'' یہ ان دو شیطان کے چیلوں کے نام تھے جموں و کشمیر کے سرحدی علاقے چکوٹھی (آزاد کشمیر) کے قریبی ایک قصبہ کے باسی یہ دو کزنز پورے قصبے میں ''یاجوج ماجوج'' کے نام سے مشہور تھے شرارتیں کرنے میں پی ایچ ڈی تھے بابا کریم ہو یا چچا پھتا انکل ساجد ہوں یا پھوپھی کلثوم، کریانہ والا ہو یا رکشے والا ہر شخص ہی ان دونوں سے پناہ مانگتا تھا۔

بابا کریم کے ساتھ جو چار سال پہلے کی شرارت تھی دونوں کو اب تک یاد تھی گو کافی حد تک بے ضرر تھی پر پھر بھی شکایت پر امی سے خاصی ''گوشمالی'' ہوئی تھی۔

بابا کریم کا محلے میں کھوکھا تھا، جس پر چند کھانے پینے کی اشیا موجود ہوتی تھیں بابا کریم اگر چہ کافی حد تک خوش اخلاق بزرگ تھے پر ایک دن انہوں نے کسی بات پر آبی اور تابی کو ڈانٹ پلا دی، بس پھر کیا تھا آبی اور تابی کو ایک مشن مل گیا ''باباجی'' کی مٹی پلید کرنے کا پلان بنایا اور باباجی پر اس کا اطلاق کر دیا گرمیوں کے دن تھے بابا کریم نے دوپہر کے کھانے پر مکئی کی روٹی اور پودینے کی چٹنی کے ساتھ ساتھ دو گلاس لسی کے بھی اپنے ''پیٹ شریف'' کو عنایت کر دیے تھے دیسی دودھ کی بنی لسی ہو اور وہ بھی دو گلاس تو سمجھ لیجیے کہ آپ ''ٹن'' ہونے کے لیے تیار ہو جائیں۔ خمار اور نیند تو یوں دوڑی آتی ہے جیسے پہلی تاریخ کی شام اُدھار دینے والے دوکاندار گھروں کی طرف دوڑے آتے ہیں۔ قصہ مختصر کہ باباجی ''ٹن'' ہونے لگے ہلکا ہلکا سا خمار پیٹ کے رستے آنکھوں میں اترا تو وہ سر عقبی دیوار سے لگا کر جمائیاں لینے لگے پھر آنکھ لگنے کی دیر تھی کہ ''یاجوج ماجوج'' کی جوڑی نے درخت سے نیچے چھلانگ لگائی اور آہستہ آہستہ بابا کریم کے ''کھوکھے'' کی طرف بڑھنا شروع کر دیا۔ قریب آ کر آبی نے آہستہ سے پکارا پر باباجی نے ہلکی سی ہنہہ...... کر کے ''خراٹا خوانی'' جاری رکھی اُن کے خراٹوں سے ٹریکٹر چلنے کی آواز نکل رہی تھی. تابی نے محلے کی طرف منہ کر کے چوکنے انداز میں پہرہ دینا شروع کر دیا کہ کوئی آ نہ جائے جبکہ آبی نے مشن کی تکمیل کا آغاز کر دیا... نسوار کی پڑیا جو آبی ساتھ لایا تھا. چپکے سے ہتھیلی پر ڈال کر اُن کے چہرے کے قریب کی. اب منظر یہ تھا کہ ہر "خراٹے" کی آواز کے ساتھ ہی سانس



اندر کھینچتے ہوئے وہ نسوار کی کچھ مقدار ناک کے ذریعے اندر کھینچ رہے تھے...... تھوڑی دیر بعد وہ پڑیا ساری کی ساری "باباجی" کی ناک شریف کے راستے اندرونِ خانہ منتقل ہو چکی تھی. دونوں نے وکٹری کا نشان بنا کر "مشن سکسیسفل" کا اعلان کیا اور بھاگ کر سامنے سڑک کے کنارے بیٹھ کر "چڑی اڈی" کھیلنے لگ گئے. اب اُنہوں نے انتظار کرنا شروع کر دیا کہ کب کوئی گاہک آ کر "بابے" کو جگائے اور وہ تماشہ دیکھیں.

ظاہر گرد و نواح سے بے نیاز وہ دونوں ہر طرح سے گرد و پیش کی خبر رکھے ہوئے تھے. دوپہر کا وقت تھا کوئی بھی باہر نکلنے کو تیار نہیں تھا سب کھا پی کر آرام کر رہے تھے. ایسے میں "کالو ماسی" کی نسوار ختم ہونا اُن کے لیے راحت جاں ثابت ہوا. یہ راحت جاں گو کہ بعد میں کافی مضر صحت ثابت ہوا مگر اُس وقت "کالو ماسی" کی آمد پر انہوں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں جشن منایا... اب اُن کی نظروں کا محور فقط "بابا کریم" کا کھوکھا تھا۔ اُن کے بھرے ہوئے بارود نے اپنا کام دکھانا تھا......

جوں ہی "کالو ماسی" نے آوازیں لگا کر "باباجی" کو جگانا شروع کیا تو آبی اور تابی کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی.. پکی نیند والے لوگوں کو اکثر جھنجوڑ کر جگانا پڑتا ہے پس "کالو ماسی" نے بھی ہاتھ بڑھا کر اُنہیں جھنجوڑا تو وہ اٹھ بیٹھے اور پھر ایک یا ڈیڑھ سیکنڈ کے بعد ہی "دھماکے" شروع ہو گئے. منہ کھول کر پہلی ہی سانس لیتے ہی "باباجی" کے وجود نے زلزلہ کر دیا اور چھینکیں ایک طوفان کی صورت میں ان کے وجود سے ٹپک پڑیں. آچھی...... آچھی...... چھی... چھی...... آچھی......

آنچھ........ آنچھ..........ایک طوفان برپا تھا چھینکوں کا اور نسوار اُن کے منہ سے "کالو ماسی" کے منہ پر "نظرانہ عقیدت" پیش کرنے لگی پر ایک اور دھما کہ ہوا...... لسی اور نسوار کے خمار نے چھینکوں کے ساتھ مل کر انہیں دھڑام سے گرنے پر مجبور کردیا اور وہ کالو ماسی کے اوپر گرے اور اُنہیں لیتے ہوئے کھوکھے سے باہر آگرے... اب اوپر "بابا جی" اور نیچے محلے کی "چنگیزی خالہ" نیچے گرتے ہی کالو ماسی نے اپنے اوپر سے "ریسلر" کی طرح سے باباجی کو اچھال پھینکا۔ باباجی کے اچھلنے کا انداز ایسا تھا جیسے کسی ہتھنی نے مینڈک کو اچھال دیا ہو...... وہ جاکر ساتھ ہی بہتے گندے نالے میں گرے۔ وہ دونوں تو ہنس ہنس کر بے حال ہونے لگے.... مگر پھر اُن کی بدقسمتی کہ اُن دونوں کی مائیں جو کسی فوتگی پر گئی ہوئی تھیں واپس اُسی راستے آکر رکشے پر اتر کر گھر جانے لگیں.. مگر پھر کالو ماسی کی ہائے فریاد سن کر دونوں نے اُن کی طرف دوڑ لگا دی...... اب اِن دونوں کو بھی ہوش آیا کہ یہ تو برا ہوگیا... دونوں اپنی اپنی امی کی طرف آئے اور انجان بن کر باباجی کو اٹھانے لگے باباجی کا چھینکوں سمیت سارا نشہ ختم ہو چکا تھا اور وہ اُن کے اٹھانے سے اُٹھ بیٹھے۔ اتنے میں کالو ماسی بھی اُن دونوں بہنوں کے ساتھ واویلا کرتے کرتے باباجی کے سر پر پہنچ آئی تھی اور ایک بار پھر باباجی کا گریبان پکڑ لیا..

"ٹھرکی بڈھے مجھے چھیڑتا ہے تیری بیٹی کی عمر کی ہوں عمر دیکھ اور کام دیکھ محلے کی بہو بیٹیوں پر بری نظر رکھتا ہے تیری تو.........". کالو ماسی کے منہ میں جو آرہا تھا وہ کہے جارہی تھی مگر اُن دونوں بہنوں نے بمشکل چھڑا کر کالو ماسی کو پیچھے کیا ہوا تھا. شور سن کر قریبی گھر سے "ماسٹر جمیل صاحب" بھی پہنچ آئے تھے اور جب انہوں نے ساری بات سنی تو بابا کریم سے جرح کرنے لگے اور ساتھ ہی ساتھ حیرت سے اُن کی ناک سے بہتے مواد کو بھی دیکھنے لگے کہ یہ کیا ماجرا ہے؟ باباجی نے جب نسوار کا ذائقہ منہ میں محسوس کیا تو تھوک کر ناک صاف کی اور پھر غور سے نسوار دیکھنے کے بعد آبی اور تابی کی طرف اشارہ کیا کہ یہ ان دو "شیطانوں" کی شرارت ہوگی... آبی نے اپنی صفائی دینی چاہی تو ماسٹر صاحب نے اسے چپ کروا دیا اور پکڑ کر اُن دونوں کے ہاتھ چیک کرنے لگے... ہاتھ چیک کرنے کے بعد اُن کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی اور پھر انہوں نے دونوں بہنوں کو اپنے اپنے بیٹے کی شرارت سے آگاہ کیا... دونوں نے اپنے اپنے بیٹے کی کلائی پکڑی بابا کریم سے معافی مانگی اور "یاجوج ماجوج" کو لے کر اکٹھی گھر کی طرف روانہ ہوگئیں...

دونوں بہنوں کے شوہر بھی آپس میں بھائی تھے. یعنی آبی، تابی کا چچا زاد بھائی بھی تھا اور دوسری طرف دونوں کی مائیں آپس میں سگی بہنیں بھی تھیں. گھر آکر دونوں کی خوب دھنائی ہوئی "ہائے امی" ہائے مر گیا..." "امی قسم کھاتا ہوں آج کے بعد کوئی شرارت نہیں کروں گا"......". امی توبہ کرتا ہوں "...... یہ وہ رٹے رٹائے جملے تھے جو ہر بار وہ کہتے تھے مگر پھر اگلے دن نئے ولولے اور جوش کے ساتھ "تیغ شیطانی" لے کر کسی پر وار کردیتے تھے...

"امی اگر نہ آتی تو اور بھی مزے کا ڈرامہ ہوتا ہے نا.

"؟ ابراہیم (آبی) نے خوبانی کھاتے ہوئے ہنس کر کہا.

"نہیں یار! کافی سزا مل گئی تھی کھڑوس بابے کو اب دوبارہ اپن سے پنگا نئی لے گا" تابش (تابی) نے بھی شاپر سے خوبانی نکال کر منہ میں ڈالی اور باقی بچی ہوئی خوبانیوں میں سے ایک نکال کر دور بیٹھے کوے کا نشانہ لیا۔

"یار غلیل کہیں سے نکال کے لاو امی کی الماری سے۔ کتنا مزا آتا تھا جب ہم کووں اور چڑیوں کو مارتے تھے۔"

"امی کی الماری تو سمجھو میوزیم ہے ہمارے کارناموں کی کئی مثالیں وہاں کی چیزوں سے عیاں ہیں"

"اور یاد ہے آبی وہ ایک بار میں نے ایک کوئے نشانہ لے کر اسے پتھر مارا اور پھر......."

دونوں اُس واقعہ پر دیر تک دانتوں تلے انگلی دبائے ہنستے رہے اور پھر اگلی بار کے لیے پلاننگ کرتے رہے۔

"یار وہ "جمعے کاکے" کی شادی ہے نا اس ہفتہ، اتوار کو اُس پر ہی کچھ کریں گے فی الحال ہفتے میں دو بار امی کی مار کا حوصلہ نہیں ہے مجھ میں" آبی نے کہا تو تابی ہنستے ہوئے بولا۔

"تو تو ڈرپوک ہے. مجھے دیکھ اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر ابھی کالو ماسی کے گھر کے پیچھے سے یہ "شاپر" بھر کر لایا ہوں"

تابی درختوں پر چڑھنے کا ماہر تھا اور آس پاس کے گھروں کے پھل دار درختوں سے ہر پھل کی "بوہنی" وہی کرتا تھا. پکڑے جانے پر امی سے حسب دستور "پھینٹی" کھا کر توبہ کرلیتا تھا. اسکول میں دونوں ابھی چھٹی جماعت کے طالب علم تھے. بچپنا تو تھا اوپر سے دونوں کے ابو سعودی عرب ہوتے تھے. تو اکثر دونوں بہنیں بھی سر پکڑ کر بیٹھ جاتیں اُن کی شرارتوں سے۔

......//☆☆//......

تمنا صاحب کی یہ دوسری ملاقات تھی حسینہ سے......

حسینہ اسم مسمی تھی اُس علاقے میں اس سا حسین شاید ہی کوئی تھا. مغرور بھی مشہور تھی اور ایک دو لڑکوں کی ٹھکائی بھی کروا چکی تھی. اُس محلے کے سارے ہی لڑکے حسینہ کو دور ہی سے دیکھ کر آہیں بھرتے تھے. مگر تمنا صاحب کی تو ایسی قسمت جاگی کہ خود حیران رہ گئے. خود ہی حسینہ نے سب سے پہلے اظہار محبت کیا اور پھر پہلی ملاقات بھی کرلی. یہ دوسری ملاقات تھی اور اب تمنا صاحب نے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ وہ ایسے نہیں ملیں گے. کسی نے دیکھ لیا تو پورے محلے میں بدنامی ہوگی. تمنا صاحب محلے کے شریف ترین جوانوں میں شمار ہوتے تھے اور حسینہ کا کردار بھی بے داغ تھا... اظہار محبت اور دو ملاقاتوں میں ہی دنوں طرف محبت کی آگ شعلوں میں بدل گئی. حسینہ کے گھر رشتہ بھیجا گیا تو اُس کے گھر والوں نے تمنا صاحب سے لڑکی کے لیے الگ گھر کی ڈیمانڈ رکھ دی. الگ گھر کا مسئلہ نہیں تھا بن بھی جاتا مگر تمنا صاحب کی امی نے مخالفت کردی کہ شرائط پر رشتے داری نہیں ہوسکتی...... پر محبت تو شرائط سے مبرا ہوتی ہے. اسے نہیں فرق پڑتا کہ اماں مانی یا ابا ناراض ہیں گھر بنانا ہے یا بہن پہلے بیاہنی ہے...... محبت تو مقناطیس اور لوہے کے ٹکڑوں کی مانند ہوتی ہے جو کھینچتی ہے اپنی طرف بس ذرا سا ایک بار قریب لانے کی دیر ہوتی ہے پھر چاہ کر بھی کوئی نہیں روک سکتا... وہ تمنا ہی کیا جو حسن سے بے نیاز ہو اور وہ حسینہ ہی کیا جس کی تمنا نہ کی جائے... تمنا صاحب شاعر تھے اور الفاظ کے داؤ پیچ میں خوب ملکہ حاصل تھا. اب زمانے بھر کے "عشاق" کی طرح اُن دونوں کے درمیان بھی خط و کتابت ہی اظہار اور جذبات بتانے کا ذریعہ تھا. چنانچہ محبت کی کھیتی کو آب و دانہ ملتا رہا. تمنا صاحب الفاظ کے داؤ پیچ سے یوں دلوں کے تار چھیڑتے کہ حسینہ کا دل "گارڈن گارڈن" ہوجاتا...

حسینہ نے اپنے لیے آنے والا ہر رشتہ ٹھکرا دیا۔ وجہ اب گھر والوں کو پتہ تھی اور اُس نے بھی صاف صاف بتا دیا تھا کہ اگر شادی ہوئی تو تمنا سے ورنہ کسی سے نہیں. گھر والوں نے لاکھ سمجھایا مگر "زمیں جنبد نہ جنبد گل محمد" دوسری طرف تمنا صاحب کا بھی وہی حال تھا. وہ اپنی پسند سے ایک اِنچ بھی پیچھے ہٹنے کو تیار نہ تھے. اُن کے ذہن میں اکثر خیال آتا کہ کاش وہ بھی بچے ہوتے اور "آبی" اور "تابی" والا حربہ استعمال کرتے. آبی یا تابی کو جب بھی گھر سے کسی کام کرنے کی پابندی لگائی جاتی تو وہ ترکیب نمبر چار استعمال کیا کرتے تھے. ایک بار آبی کو گھر سے "کارٹون" دیکھنے پر پابندی عائد کر دی گئی. تو وہ شام کے کارٹون لگتے وقت مکان کی چھت پر چڑھ گیا اور اُونچی آواز میں پکارنے لگا کہ "میں یہاں سے کوُدنے لگا ہوں اگر مجھے ٹی وی نہیں دیکھنے دی گئی تو میں زندہ نہیں رہوں گا میں چھت پر سے کود کر اپنی جان دے دوں گا" آخر گھر والوں نے جب پابندی اٹھائی اور "کارٹون بحالی" کا عندیہ دیا تو موصوف نیچے اُترے. تمنا صاحب کی بھی خواہش تھی کہ کاش وہ بھی ایسے ہی چھت پر چڑھ جائیں اور خودکشی کی دھمکی دیں اور تب تک نہ اُتریں

جب تک "حسینہ" کو حاصل نہ کرلیں۔ یہی سوچ کر اُن کے دل میں خیال آیا کہ کیوں نہ ایسی ہی کوئی شرارت بلکہ ایک ڈرامہ کیا جائے جس کا مقصد "متوقع سسرال" کو رام کرنا ہو۔ حسینہ کے خط کا جواب بھی دینا تھا تو اُسی کے جواب میں اُنہوں نے "سکرپٹ" بھی لکھ ڈالا......

خط بھی کچھ اِسی قسم کا تھا۔ حسینہ نے لکھا تھا...... "تمنا کی تمنا کرنا ہر کسی کی تمنا ہوتی ہے۔ مگر تمنا کو حاصل کرنا کسی کسی کے بس میں ہوتا ہے۔ آجکل پتہ نہیں کیوں میری عادات بچوں سی ہو گئی ہے۔ بلکہ عادات کیا سوچ بھی بچوں سی معصومانہ ہو گئی ہیں۔ سوچتی ہوں کتنی عجیب بات ہے کہ لوگ محبت میں "لب و رخسار"، گلے ملنے اور چومنے کی باتیں کیوں کرتے ہیں۔ محبت تو ایک احساس لگتا ہے مجھے۔ بس کسی کی یاد میں کھو جانا کسی کو دیکھتے رہنا کسی کو سوچتے رہنا۔ اس کو اگر بچگانہ محبت کہا جائے تو بہتر ہے کیونکہ بالکل بچوں جیسے احساسات ہیں میرے میں الفاظ میں تو شاید کبھی اپنی کیفیت تحریر نہ کرسکوں لیکن مجھے آپکے خطوط سے بھی یہی لگا ہے کہ جیسے ہم دونوں میں بھی کہیں کہیں "آبی" اور "تابی" سی روح موجود ہے۔ مگر یہ بھی یاد رکھیے گا کہ میں صرف آپ کی ہوں۔ میرے جسم سے لے کر میری روح تک صرف آپ کا ہی نام لکھا ہے میں نے۔ میری آرزو، تمنا، حسرت اور خواہش سب آپ سے شروع ہو کر آپ پر ختم ہوتی ہیں۔ اب آپ ہی بتائیں میں کیا کروں؟" مزید کچھ باتوں کے بعد خط کا جواب جلد از جلد دینے کی تاکید بھی تھی۔ تو جواب میں تمنا صاحب نے بھی لکھا کہ......

"تمنا کی ہر تمنا پر فقط نامِ سرکار ہے۔ زندگی میں شاید ہی کوئی ایسی خواہش ہو جو پوری نہ ہوئی ہو مگر اِس بار شاید زندگی امتحان لے رہی ہے۔ اور وہ محبت ہی کیا جس میں حالِ دل میں تضاد ہو۔ جو کچھ ایک طرف ہے وہی دوسری طرف بھی موجود ہے۔ محبت ایک پاکیزہ جذبہ ہے۔ اور اُس جذبے میں ہوس اور ملاپ جیسی شرائط کا کوئی عمل دخل نہیں ہوتا۔ اور بچوں والی سوچیں تو شاید محبت کی ہی کرامات ہوتی ہیں۔ مجھے خود بھی کبھی شدت سے محسوس ہوتا ہے کہ کاش ہم دونوں بھی "آبی" اور "تابی" ہوتے۔ ہر جگہ اکٹھے شرارتیں کرتے۔ سردیوں کے دنوں میں لوگوں کی چھتوں پر پتھر مار کر بھاگ جاتے... گرمیوں کی دوپہروں میں گھروں کی گھنٹی بجا کر بھاگ جاتے اور کسی دن کسی کے درخت پر سے پھل چوری کرتے اور گھنٹوں بیٹھ کر ہنس ہنس کر باتیں کرتے اور اپنی "محنت" سے چرائے ہوئے پھل کھاتے۔ مگر یہ دنیا کے رسم و رواج اور بندشیں ہمیں ایسا نہیں کرنے دیتی کیونکہ ہم بڑے ہو چکے.. مگر میرا دل کہتا ہے کہ اس کے باوجود ہم اپنی راہیں ہموار کرنے کے لیے کچھ "بچگانہ" حرکتیں کرسکتے ہیں کچھ ڈرامے کرنے ہوں گے ہمیں۔ صرف چند دن کے لیے ہمیں بھی "آبی" اور "تابی" بننا ہوگا"......

کچھ دن بعد ہی دونوں نے اپنے پلان پر عمل کرنا شروع کر دیا... حسینہ بالکل چپ چپ سی رہنے لگی۔ کبھی کبھی دورہ بھی پڑ جاتا گھر والوں کی لاڈلی تھی۔ تعلیم یافتہ گھرانا تھا۔ علاج وغیرہ کروایا گیا مگر اُس نے دوا کھانے سے انکار کردیا۔ پورے محلے میں آہستہ آہستہ بات پھیل گئی کہ لڑکی پر جن عاشق ہو گیا ہے پورے محلے میں ہر جوان لڑکا اُس سے پہلے سے زیادہ ڈرنے لگا۔ لڑکیوں نے بھی ملنا چھوڑ دیا۔

رشتہ مانگنے والوں نے بھی گھر کا رخ کرنا چھوڑ دیا۔ یوں رشتے آنے بند ہوئے تو دوسری طرف سے تمنا صاحب نے گھر والوں کو اصل بات بتائی ہوئی تھی کہ ڈرامے کا اسکرپٹ اُس کا اپنا لکھا ہوا ہے۔ یوں اُن کے گھر والوں نے دوبارہ رشتہ لینے کہ غرض سے حسینہ کے گھر کی دہلیز پر قدم رکھا تو گھر والوں نے گرمجوشی سے استقبال کیا۔ تمنا صاحب قصبے کے اُن جوانوں میں سے تھے جن پر محلے کے لوگوں کو فخر تھا۔ دوبارہ دونوں خاندانوں میں قربت بڑھی تو یہ واضح طور پر طے پایا کہ شادی شرائط کے بغیر ہوگی کیونکہ شرائط سودے بازی کے لیے رکھی جاتی ہیں......

حسینہ کے گھر والوں نے اُس کی بیماری کا صاف

صاف بتایا تو تمنا صاحب کی بڑی بہن نے کہا۔

"آنٹی! بیماری تو خدا کا حکم ہے اور یہ تو انسانوں کے ساتھ لگا ہی رہتا ہے۔ یہ ہم جانتے ہیں کہ حسینہ کی صورت میں ہم اتنی اچھی لڑکی لے کر جائیں گے کہ لوگ ہماری قسمت پر رشک کریں گے۔ البتہ امی کی بات درست ہے کہ نہ ہم اپنی طرف سے کسی قسم کی جہیز کی ڈیمانڈ کا تقاضہ کریں گے نہ کسی ایسی ویسی فضولیات کا... اور امید کرتے ہیں کہ آپ کی طرف سے بھی پیار محبت سے غیر مشروط رشتہ داری ہوگی... باقی ہمارے اکلوتے بھائی کے پاس عزت و دولت سب کچھ ہے چھوٹی بہنوں کی شادی کے بعد سارا گھر آپ کی بیٹی کا ہوگا۔ ہمارا بھائی الحمدللہ برسر روزگار ہے۔ آپ کی بیٹی کے لیے اِس قصبے میں اِس سے بہتر رشتہ شاید ہی کوئی مل سکے۔

بیٹی! بات تو تمھاری بھی ٹھیک ہے البتہ میں نے یہ سوچ کر الگ گھر کا تقاضہ کیا تھا کہ کہیں اکٹھے رہنے میں نندوں سے جھگڑے ہی رہتے ہیں اکثر۔ خیر ہم اب قسمت میں اگر ایسا ہی لکھا ہے تو ہم کیا کر سکتے ہیں ہماری طرف سے "ہاں" ہی سمجھیے......

جب یہ خبر دونوں "پریمی پنچھیوں" تک پہنچی تو اُن کو پہلے تو یقین نہ آیا پھر یوں لگنے لگا کہ جیسے یہ سب خواب ہے اور جلد ہی آنکھ کھُل جائے گی۔ چٹ منگنی اور پٹ بیاہ والی بات ہوئی اور چند دن بعد ہی دونوں کی شادی کی تیاریاں شروع ہو گئیں... تین چھوٹی اور ایک بڑی بہن کا اکلوتا بھائی ہو اور دھوم دھام سے شادی نہ ہو یہ کیسے ممکن تھا... دوسری طرف حسینہ بھی ماں باپ کی اکلوتی اولاد تھی۔ دونوں گھروں میں شادی سے پہلے ہی شادی کا سا سماں ہو گیا تھا۔ حسینہ نے سب سہیلیوں کو اصل بات بتا دی تھی کہ بیماری اور دورے سب ڈرامہ تھے۔ یوں رات کو محلے کی تقریباً ساری ہی نوجوان لڑکیاں اُس کے گھر جمع ہوتیں اور ڈھولک کی تھاپ پر شادی بیاہ اور مہندی کے گیت گاتیں... ساجن کی یاد میں اُن گیتوں کو سن کر حسینہ پر عجیب سی کیفیت طاری ہو جاتی۔ کبھی کبھی حسینہ کو لگتا تھا کہ کسی غیبی طاقت نے اُسے وہ خوشیاں دے دی ہیں جن کو پا کر وہ اپنے آپ کو دنیا کی سب سے خوش قسمت لڑکی محسوس کرتی تھی۔ تمنا صاحب کی حالت بھی کچھ ایسی تھی۔ انھیں بھی کبھی کبھی ایسا لگتا تھا کہ کوئی ایسا راز ضرور ہے جو اُن کی نظر سے اوجھل ہے۔ اِسی کشمکش میں شادی کے دن قریب آ گئے۔ پورے محلے میں شادی کا چرچہ تھا۔ نوجوانوں کے لیے یہ "لو میرج" ایک مشعل راہ کی سی حیثیت رکھتی تھی۔ گو کہ بیماری اور دورے پڑنے کا چرچہ اپنی جگہ پر تھا مگر جو پریمی جوڑے کے ملن کی داستان تھی وہ کمال تھی۔ آخر کار ملن کی وہ گھڑی بھی آ گئی۔ خواب، خواب نہ رہا حقیقت کا روپ دھارنے لگا...

شادی کے بعد تمنا صاحب اور حسینہ کے درمیان محبت کا رشتہ مضبوط سے مضبوط تر ہوتا گیا۔ جی بھر کے خوشیاں سمیٹی گئیں اور پھر ہر سال ایک "کائناتی حسن" کا شاہکار اُن کے آنگن کی زینت بنتا رہا۔ دو سال بعد دو پھولوں کو جنم دینے کے بعد بھی حسینہ کے حسن کی آب و تاب میں کوئی کمی نہ آئی اور نہ ہی تمنا صاحب کی محبت میں۔ بلکہ شاید محبت کی دو مضبوط ترین زنجیروں نے اُن دونوں کو اپنے حصار میں لے لیا تھا۔ گزرے دو سالوں میں تمنا صاحب کی دو بہنوں کی شادی بھی ہو چکی تھی اور اب صرف ایک چھوٹی بہن گھر میں موجود تھی۔ گھر پر حسینہ نے محبت کی طاقت سے قبضہ جما لیا تھا۔ ہر زباں اُس کے بارے میں تعریفی کلمات ہی بیان کرتی۔ اکثر حسینہ کو محسوس ہوتا کہ اُس کی زندگی میں کوئی نہ کوئی "گرہ" ایسی ہے جو ابھی تک نہیں کھل پائی... اور پھر ایک دن حسینہ کے دل و دماغ میں سمائی وہ گرہ اچانک ہی کھُل کر سامنے آ گئی۔ یہ بڑی عید سے کچھ دن پہلے کی بات ہے جب کپڑوں کی دھلائی کا کام جاری تھا مگر حسینہ کو ایک واسکٹ نہیں مل رہی تھی وہ واسکٹ ڈھونڈنے کے لیے تمنا صاحب کی الماری کھولنے لگی۔ الماری کی چابیاں اُس کے اوپر ہی رکھی ہوتی تھیں واسکٹ تو الماری سے مل گئی مگر پھر حسینہ کو یاد آیا کہ اُس نے تمنا صاحب کے اصرار پر اپنا ایم اے کا داخلہ بھیجنا تھا۔ اور ڈاکومنٹس کے ساتھ اُسکا "بی اے" کا رزلٹ کارڈ بھی لگنا تھا۔ اور وہ

رزلٹ کارڈ اُس نے تمنا صاحب کو دیا تھا اور یقیناً تمنا صاحب کی خاص الماری میں ہی موجود ہونا تھا۔ اُس نے رزلٹ کارڈ نکالنے کے لیے اندر موجود تمام اوراق کے پلندے دیکھنے شروع کر دیے.. اور پھر اچانک ایک ورق پر اسکی نظر پڑی اور وہ چونک کر اسے دیکھنے لگی۔ تحریر پڑھتے پڑھتے اُسکے چہرے کا رنگ بدل گیا اور پھر آہستہ آہستہ وہ نارمل ہونے لگی.. اُس کے دماغ میں بنی کئی گرہیں کھلنے لگی۔ اتنا عجیب و غریب معاملہ تھا یہ وہ کیا سمجھ رہی تھی اور یہاں کیا نکلا......اتنا بڑا فراڈ "اس نے سوچا"......

......//☆☆//......

"آبی" اور "تابی" نے چند دن اپنی تمام شرارتوں کو بریک لگائی۔ اور شادی کے دن تک صبر سے کام لیا۔ اُن دونوں کا اگلا ٹارگٹ "ماسٹر جمیل صاحب" تھے۔ جمیل صاحب اُن دونوں کو اسکول میں نہیں پڑھاتے تھے اور پڑھاتے بھی ہوتے کونسا اُن دونوں نے ڈر جانا تھا۔ ہاں ایک شخصیت ایسی تھی جس کو دیکھ کر یا نام ہی سن کر اُن دونوں سمیت قصبے کے ہر لڑکے کی روح فنا ہو جاتی تھی۔ وہ تھے قاری عزیز صاحب۔ قاری صاحب کی قصبے میں وہ دہشت تھی کہ جس راستے سے وہ گزرتے تھے اُس راستے کے سامنے سے آنے والا طالب علم اپنے آپ کو دنیا کا سب سے بدقسمت انسان سمجھتا تھا۔ ایک بار تو ایسا بھی ہوا کہ قصبے کے ایک لڑکے نے قاری صاحب کو کسی سے باتیں کرتے دیکھ لیا اور جب تک قاری صاحب کی نظر اُس پر پڑتی وہ پاس ہی موجود دو کانوں میں سے ایک دوکان میں گھس گیا۔ اب اُس کی قسمت کہ اندر دھکتا تندور تھا اور اُس لڑکے نے آؤ دیکھا نہ تاؤ سیدھا تندور میں گھس گیا۔ یہ تو خوش قسمتی تھی اُس کی کہ تندور والے نے فوتگی کے سبب کئی دنوں بعد تندور جلانا تھا اور ابھی صرف لکڑیاں ہی ڈالی تھی۔ بصورت دیگر قاری صاحب کے ڈر کے سبب وہ لڑکا جلتے تندور میں ہی گھس جاتا۔ یہی حال آبی اور تابی کا بھی تھا۔ امی کا صرف ایک جملہ ہی کافی تھا "قاری صاحب کو بتاتی ہوں جا کر" اور یہ جملہ پورے قصبے کی ماؤں کا ناقابل شکست ہتھیار تھا...

خیر بات ہو رہی تھی ماسٹر جمیل صاحب کی۔ تو "بابا کریم مشن" میں امی کو ساری بات بتانے اور چھترول کروانے والے جمیل صاحب نے شاید سوچا بھی نہ تھا کہ یہ "نیکی" اُن کے گلے بھی پڑ سکتی ہے...

"یاجوج ماجوج" سے بنگالے کر وہ تو بات ہی بھول گئے تھے مگر دوسری طرف جنگی طیاروں کا رخ اب بے چارے جمیل صاحب کی طرف تھا۔ جمے کاکے کی شادی تھی اور جمیل صاحب لڑکی والوں کے عزیز تھے۔ اس لیے لڑکی والوں کے گھر کے کام میں ہاتھ بٹا رہے تھے... یہ دونوں بھی لڑکی والوں کے گھر موجود تھے اور موقعے کی تلاش میں تھے اُن کا پلان تھا کہ جمیل صاحب کے کپڑوں پر سالن سے کسی طرح "نقش و نگار" بنائے جائیں۔ اور یہ کام کھانا کھانے کے دوران کسی وقت کیا جا سکتا تھا۔ کیونکہ اکثر کھانا کھلانے والوں میں ماسٹر صاحب پیش پیش ہوتے تھے...

اُن دونوں نے کھانا کھایا مگر اچانک ہی خوش قسمتی سے ماسٹر صاحب کو کسی کام سے باہر جانا پڑا۔ اور جب... اُن کی جوڑی کھانا کھا کر چھت پر ڈھول بجانے والوں کے پاس پہنچی تو ماسٹر صاحب واپس آتے نظر آئے... وہ دونوں افسوس سے ہاتھ ملتے رہ گئے۔

"زندگی میں پہلی بار مشن فیل ہوا ہے" آبی نے افسوس سے کہا۔

"لگتا ہے ماسٹر کی قسمت اچھی ہے۔ اور اِس بار ہمیں ناکامی ہی ہوگی اس لیے کسی اور پر توجہ دینی ہوگی" تابی نے جواباً کہا تو آبی نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا "ہو ہی نہیں سکتا "ٹارگٹ" تو یہی رہے گا البتہ طریقہ کار میں تبدیلی لانا ہوگی... اب کوئی اور حل سوچنا ہوگا" دونوں نے سر جوڑ لیے اور پلان بنانے لگے۔ رات کی تاریکی میں کوئی کام کرنے کا خیال بھی رد کرنا پڑا کیونکہ ابھی اُن دونوں کی واپسی تھی۔ اور پھر تھوڑی دیر بعد ان دونوں نے گھر واپسی کا سفر شروع کیا۔ چند قدموں کا یہ سفر بھی ان دونوں نے اپنی اپنی امی سمیت کیا اِس لیے چپ چاپ

واپس گھر آگئے...... دوسرے دن کی دعوت جمعے کاکے کی طرف سے تھی۔ یعنی ولیمہ تھا۔ "یاجوج ماجوج" کی جوڑی سخت غصے میں تھی۔ کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا کہ کیا کریں۔ شادی کے موقع پر اگر کوئی شرارت نہ کی تو پھر کیا فائدہ ایسی زندگی کا۔ راستے میں چلتے چلتے اچانک ایک گھر کی چھت پر "تابی" کی نظر پڑی اور اُس کے شیطانی دماغ نے جھٹ سے فیصلہ کردیا کہ "یہ ہوجائے تو مزہ ہی آجائے" اُس نے آبی کو تازہ ترین "آئیڈیا" کے بارے میں بتایا تو آبی نے بھی گرم جوشی سے تائید کردی... شادی کا کھانا کھا کر دونوں اپنے ایک کزن کے پاس پہنچ گئے۔ کزن کی منت سماجت کرکے اُسے تھوڑی سی مدد پر آمادہ کیا اور پھر انتظار کرنے لگے۔ سہ پہر کے وقت اُنھوں نے جب درخت کی چھاؤں میں کھڑے ماسٹر صاحب کو دیکھا تو اسی وقت ایکشن میں آنے کا فیصلہ کرلیا دونوں طرف "حملہ" کیا گیا اور پھر نتائج کا انتظار کرنے لگے۔ یہ بہت بڑا زلزلہ تھا اور اس کے اثرات بہت دیرپا تھے۔ نتائج کے لیے اگلے دن کا انتظار کرنا تھا۔ اور وہ انتظار کرنے لگے۔

اِس شرارت کے اثرات واقعی دیرپا ثابت ہوئے...... اتنے دیرپا کہ جسکا اندازہ کسی کو بھی نہ تھا......

......//☆☆//......

اتنا بڑا فراڈ...... بلکہ شاید فراڈ تو نہیں شرارت کہنا زیادہ بہتر ہوگا۔ اُس نے پڑھنا شروع کیا۔ لکھا تھا......

"زندگی تو انسان گزار لیتا ہے مگر زندگی اپنے آئیڈیل کے ساتھ نہ گزرے تو انسان کی بدقسمتی کی انتہا ہے۔ میں نے زندگی میں اگر کسی کو اپنا" آئیڈیل" سمجھا ہے تو وہ آپ ہیں "تمنا صاحب" میں آپ سے بے انتہا محبت کرتی ہوں اور اگر آپ آج رات مجھ سے ملنے آسکتے ہیں تو میں سمجھوں گی کہ آپ نے میری محبت کو قبول کرلیا ہے اور اگر نہ آسکے تو میں یہی سمجھوں گی کہ میں آپ کے "قابل" ہی نہیں۔ میں اپنی چھت پر آپ کا انتظار کروں گی...... اور ہاں مجھ سے ملاقات کرنے کی صورت میں اِس خط کا تذکرہ مجھ سے نہ کیجئے گا کیونکہ شاید سامنے آکر میں ایسی بات کا اقرار نہ کرسکوں۔ اسی لیے آپ کی پیٹھ پیچھے تحریری شکل میں اظہار کردیا ہے اب اس خط کا ذکر کر کے مجھے شرمندہ نہ کیجئے گا" نیچے نام کوئی بھی نہیں لکھا گیا تھا۔ اور پھر حسینہ دوڑتے ہوئے اپنی جہیز کی الماری کی طرف گئی اور تھوڑی دیر بعد وہاں سے ڈھونڈ کر وہ خط نکال لیا......

بالکل وہی تحریر...... وہی لکھائی...... اور وہی انداز ... البتہ فرق صرف یہ تھا کہ ایک طرف مونث اور دوسری طرف مذکر کا صیغہ تھا۔ اور ساتھ ہی لکھا گیا تھا کہ "میں آپ کے مکان کی چھت پر آپ کا انتظار کروں گا" اور نیچے نام لکھا ہوا تھا "ماسٹر جمیل احمد تمنا"

......//☆☆//......

ماسٹر جمیل صاحب کو تابی جبکہ حسینہ کو آبی نے وہ خط جا کر دیا تھا مقصد یہ تھا کہ اگلے دن پورے قصبے میں خبر پھیلی ہونی تھی کہ ایک بار پھر حسینہ کے ہاتھوں اُس کے عاشق کی پٹائی اور اِس بار عاشق ہونے والی ہستی قصبے کے ہردلعزیز جوان اور اردو کے استاد کی تھی آبی اور تابی نے اپنے کزن سے دو خطوط لکھوا لیے تھے ایک حسینہ کی طرف سے جمیل صاحب کے لیے اور دوسرا جمیل صاحب کی طرف سے حسینہ کے لیے دونوں میں اظہار محبت کیا گیا تھا اور جب حسینہ نے یہ خط پڑھنا تھا تو توقع کی جاسکتی تھی کہ ماسٹر صاحب برے پھنسیں گے دونوں نے بیک وقت دو طرفہ وار کیا تھا کامیابی کا پورا یقین تھا مگر گزرتے دنوں کے ساتھ ساتھ کچھ بھی نہ ہوا چند دن بعد وہ ماسٹر صاحب کو بھول گئے کیونکہ دونوں بھائی (ان کے پاپا) واپس آرہے تھے اور آبی اور تابی نے اپنے پاپا کی آمد کا سن کر کچھ دن شرارتوں کو بریک لگادی تھی......

......//☆☆//......

تمنا صاحب گھر میں داخل ہوئے تو حسینہ صوفے پر بیٹھی وہ خطوط پڑھ رہی تھی اور بار بار پڑھنے کے بعد حیران تھی۔ جب تمنا صاحب داخل ہوئے تو اُن کے سلام کرنے پر چونک پڑی۔ پھر جواب دے کر انہیں وہ خط دکھاتے ہوئے پوچھا کہ یہ کس کا ہے؟

"ارے یہ کیوں نکال لیا۔ یہ تو تمھارے محبت ناموں کے ساتھ ہی تھا۔ باقی کدھر ہیں؟" اُنھوں نے پوچھا"۔ یہ خط آپکو کس نے دیا تھا اور کیا کہہ کر؟"

"یہ تو تمھارا پہلا خط ہے نا بھول گئیں خود ہی تو اظہار محبت کیا تھا؟" تمنا صاحب نے بتایا تو حسینہ نے پھر پوچھا "اچھا یہ بتائیں کہ اِس خط کی لکھائی اور ہے اور میرے دوسرے خطوط کی اور۔ تو کبھی آپ نے اِس پر غور نہیں کیا کیا؟"

"ارے ارے! یہ آج پولیس والی تفتیش کیوں شروع کردی بھئی... ظاہر ہے بندہ پہلی بار بدنامی کے اور پکڑے جانے کے ڈر سے اکثر خط اپنے کسی "رازدار" دوست یا سہیلی سے لکھواتا ہے کہ اگر کبھی پکڑا بھی جائے تو لکھائی نہ پہچانی جائے...... خیر تمھیں آج یہ خیال کیسے آگیا جان جہاں" تمنا صاحب نے شوخ انداز سے پوچھا تو حسینہ نے دوسرا خط تمنا صاحب کے ہاتھ میں پکڑا دیا اور خود صوفے پر گرنے کے سے انداز میں بیٹھ گئی۔

" ارے باپ رے! یہ کیا ہے؟ یعنی کے یعنی کے......؟" تمنا صاحب حیرت سے کبھی خط کو اور کبھی حسینہ کو دیکھنے لگے۔

"جی حضور! یہ خطوط ہمارے پاس پہنچائے گے تھے اور ساتھ ہی تاکید بھی کہ اِس بارے میں بات نہیں کرنی۔ میں سوچتی رہی کہ بے چارا ماسٹر میری محبت میں آس پاس کے گھروں پر سے کودتا ہوا ہماری چھت پر پہنچے گا اور میری نظر کرم پا کر خوشی سے پاگل ہوجائے گا...... اور دوسری طرف "ماسٹر صاحب" کو یہ پتہ چلا کہ کوئی اُن کا دیوانہ رات کو اپنے گھر کی چھت پر اُن کا انتظار کررہا ہے۔ مردانگی کا بھرم رکھنا ہے تو ڈرنے کے بجائے آجائے" حسینہ نے منہ بنا کر کہا تو تمنا صاحب بے اختیار ہنس پڑے۔

"یعنی کہ میں سوچتا رہا یہ "اظہار محبت" تمھاری طرف سے ہے اور تم سوچتی رہی کہ ماسٹر سرکاری نوکری لگتے ہی آسمان پر پہنچ گیا ہے۔ اور اصل بات یہ تھی کہ "یاجوج ماجوج" نے اِس بار میرا بیڑا غرق کرنا تھا اور کر بھی دیا" حسینہ سر پکڑے بیٹھی تھی۔ تمنا صاحب نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا اور بولے۔

"ان دونوں کی شرارتوں سے تو سارا قصبہ آج بھی تنگ ہے اور سچ بتاؤں تو مجھے بھی اکثر اُن کی شرارتوں سے غصہ آتا تھا۔ پر کبھی کبھی شرارت ہی شرارت میں تقدیر کے فیصلے بھی ہوجاتے ہیں۔ اُن کے لیے تو یہ ایک کھیل تھا پر وہ اگر جمعے کاکے کی شادی پر یہ شرارت نہ کرتے تو آج یہ ہاتھ میرے ہاتھوں میں شاید نہ ہوتا"۔ تمنا صاحب کی بات سن کر حسینہ کی آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑے۔ پاگل! اِس میں رونے کی کیا بات ہے بچے ہیں بچوں کا کام ہی شرارتیں کرنا ہے۔ اگر بچوں نے بھی شرارتیں کرنا چھوڑ دیں تو شاید دنیا میں ہر گھر ماتم کدہ محسوس ہوگا۔ اس لیے بچوں کی شرارتوں کا برا نہیں مناتے۔ ویسے کتنی عجیب بات ہے نا! ایک چھوٹی سی شرارت کا اتنا بڑا نتیجہ نکلا ہے کہ آج ہماری اپنی دو شرارتیں موجود ہیں" تمنا صاحب کی بات سن کر حسینہ مسکرانے لگی اور پھر منہ بناتے ہوئے بولی

"یاجوج ماجوج" دونوں کھلکھلا کر ہنس پڑے۔



ھمجان

فارس مغل

پہلا حصہ حصہ

معروف ناول نگار فارس مغل اردو ادب میں ہَوا کے ایک جھونکے کی مانند ہیں ان کے لکھنے کا انداز دوسروں سے یکسر مختلف ہے نئے افق کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ اس نے ہمیشہ اچھے لکھنے والوں کی پزیرائی کی سو فارس مغل کا ایک انوکھا ناول ''ہمجان'' نئے افق کے قارئین کے لیے قسط وار حاضر ہے یقیناً قاری اسے پسندیدگی کی سند عطا کریں گے بقول خالد شریف فارس مغل کا قلم معجزے تخلیق کرتا ہے وہ تر میں شاعری کرتا ہے دہلی انڈیا کے ڈاکٹر نگار عظیم کے مطابق فارس مغل نے ہمجان میں زبان و بیاں کو ایک نیا پیراہن عطا کیا ہے کرافٹ اور تکنیک نے اس موضوع کو کمال کا بنا دیا ہے بقول محمود ظفر اقبال ہاشمی فارس نے ہمجان کی کہانی کو کسی فول پروف پراجیکٹ پلان کی طرح کچھ اس مہارت سے تراشا ہے کہ ناول کے مطالعہ کا تجربہ کسی سپر ہٹ فلم کی طرح لگتا ہے۔

آیئے آپ بھی مطالعہ کیجیے اور اپنی رائے دیجیے کہ آپ نے اسے کیسا پایا



صبح کی تازہ ہوا میں پھولوں کی مہکار شامل تھی۔

'ایک خوبصورت سا پنک گلاب دینا' نابینا نوجوان نے پھول والے سے کہا۔

دکاندار کے پاس پنک گلاب دستیاب نہیں تھا لیکن اس نے دیکھا کہ گاہک چونکہ نابینا ہے چنانچہ اس نے اسے سرخ گلاب پنک کہہ کر تھما دیا۔نوجوان پیسے ادا کر کے وہاں سے آگے بڑھ گیا۔

......☆......☆......

اب وہ بس اسٹاپ پر ایک حسین نوجوان لڑکی کے ساتھ کھڑا تھا

'تم نے صبح فون کر کے کیوں پوچھا کہ میں آج کس رنگ کا لباس پہنوں گی؟' لڑکی نے مسکرا کر استفسار کیا

نوجوان نے کوٹ کی جیب سے سرخ گلاب نکال کر اسے پیش کیا 'اب تم اپنے اس پنک لباس کے ساتھ یہ پنک گلاب اپنی زلفوں میں لگاؤ گی تو مجھے یقین ہے مزید خوبصورت دکھائی دو گی۔آج تم کالج فنکشن میں گیت گانے والی ہو، ناں'

'اوہ۔۔تم نے یہ پھول کہاں سے خریدا ہے' لڑکی کو پھول کا رنگ دیکھ کر حیرت ہوئی لیکن وہ سمجھ گئی کہ پھول والے نے اسے دھوکا دیا ہے۔

'وہ پچھلی سڑک کے کنارے ایک پھولوں والی دکان سے۔۔کیوں؟۔۔۔پھول میں کچھ خرابی ہے؟؟' اس کا چہرہ اتر گیا

''نہیں۔'' لڑکی کو دکاندار پر شدید غصہ آیا لیکن وہ پی گئی۔

''یہ تو بے انتہا خوبصورت پھول ہے بالکل میرے لباس جیسا۔۔۔آئی لَو یُو'

نوجوان کا بجھا ہوا چہرہ یکدم کھل کر گلاب بن گیا۔

''آئی لَو یُو ٹو۔۔سویٹ ہارٹ''

اسی دوران لڑکی کی کالج بس آگئی

نوجوان اسے الوداع کہہ کر آگے بڑھ گیا 'اپنا بہت خیال رکھنا'

......☆......☆......

کالج میں لڑکی کی سہیلیوں نے اسے چاروں طرف سے گھیرا ہوا تھا

'آج تو غضب کی خوبصورتی تم پر مہربان ہے'

'نئی نویلی دلہن لگ رہی ہو'

'اُف۔۔تم پر نگاہ نہیں ٹِک رہی'

'لیکن۔۔اگر زلفوں میں بھی سرخ گلاب کی جگہ پنک گلاب ہوتا تو کسی میں کیا مجال تھی کہ ملکۂ حُسن کا خطاب لینے سے تمھیں روک سکتا'

لڑکی ان سب کی باتیں سن کر مسکرائی اور بالوں میں سجے سرخ گلاب کو چھوتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔

''یہ پنک گلاب ہی تو ہے''

سب سہیلیاں ہنسنے لگیں

''لیکن ہم سب کو یہ کیوں سرخ دکھائی دے رہا ہے''

''کیونکہ۔۔ابھی تم سب محبت کے رنگ سے نا آشنا ہو'' اس نے زلفوں سے پھول نکال کر اسے بوسہ دیا پنک لپ اسٹک کا نشان سرخ گلاب پر چمکنے لگا۔

ویرا کو یہ کہانی بہت پسند تھی!

......☆......☆......

محبت کی پہلی دستک

فن پاروں کی نمائش میں لڑکی بہت ہی دلچسپی سے اس فن پارے کو انہماک سے دیکھ رہی تھی جس پر sold کی پرچی چسپاں تھی اس کا مطلب تھا کہ فن پارہ فروخت ہو چکا ہے۔گیلری میں بیسیوں مصوری کے شہہ پارے دیواروں پر آویزاں تھے لیکن لڑکی کی نظریں اس پر جیسے جم سی گئی تھیں۔

اس فن پارے میں مصور نے ایک ریسٹورنٹ کی منظر کشی کی تھی جس میں ایک شفاف شیشے کی میز کے دائیں جانب خوبصورت دوشیزہ اپنی ٹھوڑی تلے ہاتھ جمائے اپنے مقابل بیٹھے ہوئے ایک خوبرو نوجوان کو محبت بھری نگاہوں سے دیکھ رہی تھی اور چائے کی چسکی لیتے ہوئے نوجوان کی نظریں دوشیزہ کے پرکشش چہرہ پر ٹکی ہوئی تھیں۔اس تمام منظر میں مصور نے کمال مہارت سے شیشے کی شفاف میز پر دونوں کے عکس کچھ اس طرح بنائے تھے کہ جہاں دوشیزہ کا عکس ہونا چاہیئے وہاں نوجوان کا عکس تھا اور اسی طرح نوجوان کے عکس کی جگہ دوشیزہ کی شبیہہ تھی۔

''کس قدر کمال کا شاہکار ہے'' لڑکی نے زیرِ لب کہا اور مسکرا دی

'مصور نے اس میں ہمجان کی تصویر کشی کی ہے' ایک انتہائی ملائم مردانہ آواز لڑکی سے مخاطب ہوئی

لڑکی نے مڑ کر عقب میں کھڑے سفید داڑھی والے قدآور شخص کو دیکھا جو اپنی وضع قطع سے انتہائی معزز معلوم ہوتا تھا

'آپ نے کچھ کہا؟'

آدمی نے مسکراتے ہوئے دوبارہ اپنی بات دہرائی۔

لڑکی چند لمحے غور سے اس کی طرف دیکھتی رہی اور پھر فن پارے پر نگاہیں جماتے ہوئے قدرے حیرت سے بولی ہمجان! آپ کا مطلب soulmate'

''بالکل''

''یہ سب فلمی باتیں ہیں'' لڑکی کے لبوں پر طنزیہ مسکراہٹ ابھر آئی

آدمی آہستہ سے قدم بڑھاتے ہوئے لڑکی کے برابر میں کھڑا ہو گیا۔لڑکی نے اسی مسکراہٹ کو برقرار رکھتے ہوئے اس کی طرف دیکھا تو اس نے اپنا تعارف کروایا۔

''میرا نام عبدالعلیم ہے اور انڈیا کی ایک یونیورسٹی میں فلسفہ کا پروفیسر ہوں''

لڑکی نے اپنا تعارف کروانے سے گریز کرتے ہوئے بے پروائی سے کہا۔

''یہ فن پارہ آپ نے خریدا ہے؟''

پروفیسر نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

''جی ہاں۔۔مگر اب سوچ رہا ہوں کہ اسے خرید کر بہت بڑی غلطی کر لی ہے''

لڑکی یوں عجیب نظروں سے فن پارے کو دیکھنے لگی جیسے اس میں کوئی نقص تلاش کر رہی ہو

''میں سمجھا تھا اگر جوڑے واقعی آسمانوں پر بنتے ہیں تو روئے زمین پر بسنے والے ہر ایک ذی روح کا ہمجان ضرور موجود ہو گا۔لیکن۔۔'' پروفیسر اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کچھ توقف کے بعد بولا۔

''لیکن آج مجھے پتہ چلا کہ یہ سب تو فلمی باتیں ہیں''

وہ یکدم کھلکھلا کر ہنس دی۔

''نہیں نہیں۔میں نے تو یونہی کہہ دیا تھا''

پروفیسر مسکراتے ہوئے اس کی جانب دیکھتا رہا لڑکی کی ہنسی بے قابو ہوتی چلی گئی اور اس سے پہلے کہ وہ پروفیسر سے معذرت کرتے ہوئے گیلری سے باہر نکل کر خوب قہقہے لگاتی پروفیسر نے اس کی ہنسی کو سرد خانے میں ڈال کر مقفل کر دیا 'کیا تم یہ جاننا چاہو گی پیاری لڑکی کہ تمھیں تمھارا ہمجان کب، کہاں اور کیسے ملے گا؟' پروفیسر کے ہونٹوں پر پُر اسرار مسکراہٹ پھیل گئی۔

لڑکی کو یوں محسوس ہوا جیسے اس کا سارا وجود زمین سے کئی فٹ اوپر ہوا میں معلق ہے اور وہ ہپناٹائزڈ ہو چکی ہے۔

''کبھی کبھی کچھ باتوں کے نہ جاننے میں ہی انسان کی عافیت ہوتی ہے لیکن اس کے باوجود میں تمھیں ایک ایسی ہی بات بتانا چاہتا ہوں۔۔آہ۔۔تم اسے میری مجبوری سمجھ لینا۔'' پروفیسر کے لہجے میں افسوس تھا

اس کی نگاہیں پروفیسر کے متحرک ہونٹوں پر جمی ہوئی تھیں اس وقت گیلری میں کافی تعداد میں لوگ موجود تھے لیکن اس بات سے بالکل بے خبر کہ ایک سفید ریش پروفیسر نے ایک نوجوان لڑکی کو ہپناٹائزڈ کر کے یرغمال بنا رکھا ہے

''سنو پیاری لڑکی!'' پروفیسر کی آنکھوں میں چمک بڑھ گئی 'شہر کی سب سے اونچی عمارت کی آخری منزل سے ہر شام کچھ دیر کے لیئے نیچے کی طرف دیکھتی رہنا جس شخص کا جوتا راہ چلتے ہوئے ٹوٹ جائے اور وہ اپنا جوتا ہاتھ میں لیے تمھاری جانب دیکھ کر مسکرائے تو سمجھ لینا وہی شخص تمہارا ہمجان ہے''

لڑکی بُت بن کر اس کے متحرک ہونٹوں کی طرف دیکھتی رہی

کچھ توقف کے بعد پروفیسر نے اپنی آنکھیں بند کرتے ہوئے افسوسناک لہجہ میں کہا۔

''کاش میں یہ سب کچھ تمھیں بتانے پر مجبور نہ ہوتا'' یہ کہتے ہوئے اس نے لڑکی کے چہرہ کے سامنے چٹکی بجائی۔جب اسے اپنے پاؤں زمین پر محسوس ہوئے تو اس کی نگاہیں فوراً لوگوں کے ہجوم میں ادھر اُدھر پروفیسر کو تلاش کرنے لگیں مگر پروفیسر جا چکا تھا اور دیوار پر آویزاں تصویر غائب تھی۔

اس نے کاؤنٹر پر بیٹھی سرخ لپ اسٹک والی خاتون

سے اس تصویر کے خریدار کے بارے میں دریافت کیا تو اسے معلوم ہوا کہ تصویر کا خریدار اسکی قیمت ادا کر کے جا چکا ہے!

لڑکی اگلے تین روز تک بخار میں مبتلا رہی، اس دوران پروفیسر کا چہرہ اس کی آنکھوں کے عدسوں پر مختلف اشکال میں پینٹ ہوتا رہا اور اس کی کہی ہوئی باتیں خانۂ ذہن میں ادھر اُدھر ٹکراتی رہیں۔ہمجان۔۔ہمجان۔۔ہمجان کی بازگشت سے اس کا سر پھٹنے لگتا کبھی کبھی نیند میں بڑبڑانے لگتی اور اچانک انجانی آوازوں کے شور کا طوفان اسکے دماغ میں داخل ہو کر سکون برباد کر کے لوٹ جاتا۔

خدا خدا کر کے جب چوتھے روز بخار ٹوٹا تو ذہن و دل کو شانتی ملی۔پروفیسر کا چہرہ اور اسکی باتیں ذہن کی سِل پر نقش ہو چکی تھیں ایسے ہی جیسے مانسہرہ میں شاہراہ ریشم کے قریب اشوک کے کتبوں پر اشوکا کے فرمودات نقش ہیں۔وہ جب بھی پروفیسر کی باتوں کی بابت سوچنے لگتی تو بے چین سی ہو جاتی اسے ایسا محسوس ہوتا جیسے کوئی اَن دیکھی طاقت ہے جو اسے یہ سب سوچنے پر مجبور کرتی ہے۔

'وہ پروفیسر تھا۔۔۔کہ جادوگر' ایک دن اس نے سوچا اور پروفیسر کی تصویر اپنی اسکیچ بک میں بنائی جس میں اس نے جادوگروں والا لمبا کوٹ اور سر پر وہ مخصوص ہیٹ پہنا ہوا تھا وہی ہیٹ جس کے اندر سے جادوگر عموماً کبوتر، خرگوش نکالتے پھرتے ہیں اس کے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی اور اسکیچ مکمل ہوتے ہی وہ یہ فیصلہ کر چکی تھی کہ وہ پروفیسر کی ہدایت پر عمل پیرا ہوتے ہوئے آج شام ہی شہر کی سب سے اونچی عمارت پر جائے گی' کیا خبر اس نے سب سچ کہا ہو، کیا خبر میرا ہمجان مجھے مل جائے، جوڑے آسمانوں پر بنتے ہیں لیکن زمین پر ہی تو ملتے ہیں۔میرا ہمجان my soulmate' اس کا چہرہ حیا کی سرخی سے تمتمانے لگا۔وہ ایک گہری اور معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ اسکیچ کو دیکھتی رہی اور پھر اس کے بائیں جانب جلی حروف میں 'پروفیسر جادوگر' لکھ کر اسکیچ بک بند کر دی۔

......☆......☆......

اس چھوٹے سے شہر کی سب سے بلند عمارت چار منزلہ تھی

چوتھی منزل کی چھت پر ایک کھلا ہوادار ریستوران تھا جہاں سے شہر کی معروف و مصروف شاہراہ صاف دکھائی دیتی۔شور مچاتی دھواں اڑاتی گاڑیوں کی بھاگم بھاگ کے ساتھ فٹ پاتھ پر تیز قدم راہگیر بھی جلدی میں دکھائی دیتے سب کو اپنی اپنی منزل پر پہنچنے کی عجلت تھی سب ایک دوسرے سے انجان اپنی اپنی دنیاؤں میں محو سفر تھے یوں تو شہر کی رونق دیدنی تھی لیکن اسکے باوجود تنہائی ساتھ ساتھ چلتی دکھائی دیتی۔

لڑکی پچھلے دو ماہ سے مسلسل روزانہ شام کو ریستوران میں آتی اپنی مخصوص نشست پر بیٹھ کر کافی سے لطف اندوز ہوتی اور شام ڈھلنے تک خاموشی سے نیچے سڑک کی بے ہنگم شور مچاتی زندگی کو اپنی اسکیچ بک میں ہمیشہ کے لیئے پُرسکون بنا کر لوٹ جایا کرتی۔اس معمول میں ایک دن کا بھی ناغہ شامل نہیں تھا

اس روز بھی رات دھیرے دھیرے اپنی سیاہ چادر سے سانولی شام کا بدن ڈھانپ رہی تھی لڑکی نے حسب معمول اسکیچ مکمل کر کے اسے غور سے دیکھا اور کچھ دیر سوچنے کے بعد فیصلہ کن انداز میں سر کو جنبش دیتے ہوئے مکمل شدہ اسکیچ تلے ''انتظار کی آخری شام'' لکھ کر ایک گہرا سانس لیا اور کرسی سے پشت لگا کر آنکھیں موند لیں۔۔وہ فیصلہ کر چکی تھی کہ اب وہ آئندہ یہاں نہیں آئیگی شاید پچھلے دو ماہ کے انتظار کا اثر تھا کہ وہ اپنے تخیل کے کینوس پر انتظار کی کیفیات میں رنگ بھرنے لگی 'ہم اپنی حقیقی زندگی میں سفر کا آغاز انتظار سے کرتے ہیں۔غربت میں امیری کا انتظار۔گمنامی میں شہرت کا انتظار۔بیماری میں شفایابی کا انتظار۔خشک سالی میں بارش کا انتظار۔اعلیٰ تعلیم کے بعد ملازمت کا انتظار۔دعاؤں کی قبولیت کا انتظار۔جسے زمانہ شاہکار کہہ سکے اس غزل، ناول، فن پارے، دھن کی تخلیق کا انتظار'' لڑکی کی سوچ گہری ہونے کے ساتھ ساتھ آسمان پر ستاروں کی تعداد بڑھنے لگی۔۔ہماری مشکل گھڑیاں آسودگی کے لمحات کی منتظر رہتی ہیں۔آرام کا انتظار ہمیں بے سکونی کی طرف دھکیل رہا ہے۔انتظار کا زہر روح میں اتر جائے تو آسمان سے تنہائی کا عذاب گلے لگانے زمین پر اترتا ہے۔انسان ایک چہرے پر بیسیوں چہرے رکھتا ہے لیکن اس کا اصل چہرہ انتظار کے وقفوں میں ظاہر ہوتا ہے۔۔لڑکی نے آنکھیں کھول کر نیچے سڑک پر دور تک رینگتی ہوئی لال پیلی بتیوں کی طرف اچٹتی ہوئی نگاہ ڈال کر آسمان پر ٹنگے ہوئے نقرئی چاند کی طرف دیکھا 'لیکن انتظار سے چھٹکارا ابھی تو ناممکن ہے'

یکایک چاند میں پروفیسر جادوگر کا چہرہ نمودار ہوا 'انتظار سے چھٹکارا ناممکن سہی مگر انتظار کے کرب سے چھٹکارا تو ممکن ہے'

لڑکی دم بخود تھی

'پیاری لڑکی، یاد رکھنا کہ انسان کی خواہش جتنی چھوٹی اور معصوم ہوگی اس کا انتظار اتنا ہی پُرکیف ہوگا'

پروفیسر کا مسکراتا چہرہ غائب ہو گیا

لڑکی کے ماتھے پر پسینے کی بوندیں چمکنے لگیں کچھ توقف کے بعد اس نے یوں حیران نگاہوں سے اپنے اطراف کا جائزہ لیا جیسے ابھی ابھی نیند سے جاگی ہو۔اس نے تیزی سے میز پر سے اپنی اسکیچ بک، پینسلز وغیرہ اکٹھی کر کے بیگ میں ڈالیں اور ابھی اٹھنے کا ارادہ ہی کیا تھا کہ اچانک اس کی نظر نیچے سڑک کے اس پار کھڑے ایک نوجوان لڑکے پر ٹھہر گئی یکایک اسے عجیب سا محسوس ہونے لگا حالانکہ گزشتہ دو ماہ سے وہ سیکڑوں لوگوں کو فٹ پاتھ پر کھڑے اور گزرتے دیکھ چکی تھی اور پھر لڑکی کی سانس ایک لحظہ کے لیے تھم کے رہ گئی۔فٹ پاتھ پر نصب کھمبے کی زرد روشنی میں نوجوان اپنا جوتا ہاتھ میں اٹھائے کھڑا تھا۔وہ نوجوان پر نگاہ جمائے ہڑبڑا کر کرسی سے اُٹھی اور آہنی جنگلے کے پاس کھڑی ہو گئی۔وہ اس کے چہرہ کے نقوش واضح طور پر دیکھنے سے قاصر تھی۔نوجوان اپنے ننگے پاؤں کو دوسرے پاؤں پر رکھے ٹوٹے ہوئے جوتے کو جوڑنے کی کوشش کر رہا تھا اچانک لڑکی کو اس کے عقب میں پروفیسر جادوگر وہی ہمجان والی پینٹنگ بغل میں دبائے بوجھل قدموں سے گزرتا ہوا دکھائی دیا لڑکی کی نگاہوں نے اس کا تعاقب شروع کر دیا فٹ پاتھ کے آخر میں پروفیسر ہوا میں ہاتھ لہراتا ہوا غائب ہو گیا تو اس کی نگاہیں ایک مرتبہ پھر نوجوان پر مرکوز ہو گئیں جب نوجوان جوتا جوڑنے میں بالکل ناکام ہو گیا تو اس نے ادھر اُدھر دیکھتے ہوئے چوتھی منزل پر مدہم سی روشنی میں کھڑی لڑکی کی طرف دیکھا اور اس کی طرف ایک بھرپور مسکراہٹ روانہ کر دی

’میرا ہمجان‘ لڑکی نے زیرِلب مسکراتے ہوئے کہااور دوسرے ہی لمحے ہاتھ کے اشارے سے اسے اپنے پاس بلایا۔وہ چاہتی تھی کہ اپنے ہمجان سے پہلی ملاقات اس کھلے ہوادار ریستوران میں کرے جہاں اس نے گزشتہ دو ماہ کی شامیں اس کے انتظار کے نام کی تھیں جہاں پُرنور ستاروں کے جھرمٹ میں چاند بطور گواہ موجود تھا

لڑکی نے دوبارہ ہاتھ ہلایا تو نوجوان نے اپنے اردگرد نگاہ دوڑائی جب اسے یقین ہوگیا کہ وہ اسی سے مخاطب ہے تو اس نے اپنا ٹوٹا ہوا جوتا ہاتھ میں لہراتے ہوئے اسے دکھایا لڑکی نے اسے اشاروں سے سمجھایا کہ وہ اس کی فکر چھوڑ کر بس اوپر اس کے پاس چلا آئے۔

نوجوان نے چند لمحے لڑکی کی جانب دیکھ کر کچھ سوچا اور پھر بخوشی اس پار جانے کے لیے فٹ پاتھ سے سڑک پر کود آیا۔سڑک کافی چوڑی تھی نوجوان تیز رفتار گاڑیوں سے بچتا بچاتا سڑک پار کرنے لگا۔ایک تیز رفتار بس کو آتا دیکھ کر وہ بیچ سڑک کے رُک گیا اور اپنا ٹوٹا ہوا جوتا ہوا میں لہراتے ہوئے ڈرائیور کی توجہ اپنی جانب مبذول کروائی اور ایک لمحہ کے لیے لڑکی کی طرف یہ تصدیق کرنے کے لیے دیکھا کہ وہ اپنی جگہ موجود بھی ہے یا اسے پاس بلا کر رفو چکر ہوچکی ہے لڑکی وہیں کھڑی تھی بس ڈرائیور نے رفتار آہستہ کرتے ہوئے نوجوان کو بھاگنے کا موقع دیا نوجوان ایک پاؤں میں جوتا نہ ہونے کی وجہ سے تقریباً لنگڑاتا ہوا تیزی سے بس کے آگے سے گزرا۔لڑکی نے ایک زوردار چیخ ماری جسے ٹریفک کے شور کے باعث نوجوان سننے سے قاصر تھا۔بس کو اوورٹیک کرتی ہوئی ایک تیز رفتار جیپ نوجوان سے ٹکرا گئی۔لڑکی کانپ اٹھی دل کی دھڑکن نے سینے میں حشر بپا کر دیا وہ ریستوران کی کرسیوں اور ٹیبلوں سے ٹکراتی سیڑھیوں پر نیچے کی جانب بھاگنے لگی شہر کی مصروف شاہراہ پر اب گاڑیوں کے بے ہنگم ہارنوں کے ساتھ لوگوں کی آوازوں کا شور بھی فضا میں شامل ہو چکا تھا دور سے کسی ایمبولینس کا سائرن چیخ اٹھا۔لڑکی اپنے گردونواح کی پروا کیے بغیر حواس باختہ ہجوم کی طرف بڑھی اچانک کسی سخت چیز سے اسے ٹھوکر لگی اس نے اک اچٹتی نگاہ اس پہ ڈالی تو وہ نوجوان کا خستہ حال جوتا تھا لڑکی نے لرزتے ہاتھ سے جوتا اٹھایا اور آہستہ قدموں سے چلتے ہوئے ہجوم میں رستہ بنا کر نوجوان کے پاس جا پہنچی اور جونہی اس کی نگاہ نوجوان کی مسخ شدہ نعش پر پڑی وہ بے ہوش ہو کر زمین پر گر گئی!

......☆......☆......

اُس لڑکی کا نام ویرا تھا

وہ ایک محرومی سے نبرد آزما لڑکی تھی چھ برس کی عمر میں ایک شدید بخار کے بعد دھیرے دھیرے اس کی قوتِ سماعت جواب دیتی چلی گئی اور ہر ممکن علاج کروانے کے باوجود سماعت بحال نہ ہوسکی خدا نے اس معصوم پر جتنا بوجھ ڈالا تھا اس سے کہیں زیادہ ہمت سے بھی نواز دیا کہ بلوغت کی حد کو پہنچنے تک اسے اپنی محرومی کے ساتھ رہنے کی عادت نہیں بلکہ محبت ہو چکی تھی۔اس کے پاس مختلف رنگوں کے آلہء سماعت تھے لیکن نیلے اور گلابی رنگ کے آلہء سماعت اسکے پسندیدہ رنگ تھے۔اس کی سہیلیاں قوتِ سماعت سے محروم نہیں تھیں جس کی اسے بے پناہ خوشی اس لیے تھی کہ وہ بیچاریاں اس کی طرح روزانہ نئے نئے رنگ کا آلہء سماعت لگا کر منفرد نظر آنے سے قاصر تھیں ان کے کانوں میں ہمیشہ سونے یا چاندی کی بالیاں منہ لٹکائے رہتیں۔ہائے بیچاریاں!

ویرا کی شخصیت جانِ محفل قسم کی تھی۔وہ لوگوں کے ملتے لبوں کو پڑھ کر بات سمجھنے والی لڑکی تھی۔خوبصورت بولتی ہوئی آنکھوں سے سب کی توجہ اپنی طرف کھینچتی ہوئی لڑکی۔پتلے پتلے لبوں سے دھیما دھیما مسکرانے والی لڑکی۔

وہ اکثر محفلوں میں اپنا آلہء سماعت شولڈر کٹ بالوں کے نیچے چھپا کر رکھتی اور جب کوئی انجان دل پھینک قسم کا لڑکا اس کی خوبصورتی سے متاثر ہو کر فلرٹ کرنے کی کوشش کرتا وہ یکدم اپنے کان کے اوپر سے بالوں کو پیچھے سمیٹ کر انگشت شہادت اپنے آلہء سماعت پر بجاتے ہوئے مسکرا کر یہ تاثر دیتی کہ ’تم اتنی دیر سے جو بھی بکواس کر رہے ہو مجھے کچھ سنائی نہیں دیا‘۔ایسا کرنے میں اسے بہت لطف آتا آن ہی آن میں فلرٹ کرنے والے لڑکوں کے رویوں میں اسے بدلاؤ محسوس ہونے لگتا جسے وہ اوروں سے تو چھپا سکتے تھے لیکن اُس انسان سے کیسے چھپا سکتے تھے جس کا روزانہ ایسے رویوں سے واسطہ پڑتا جس کی زندگی کے محدود دائرہ میں کسی ترس کھاتی ہوئی نگاہ کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔جس کی زندگی ایک ہی اصول پر رواں دواں تھی ’کہ ہمدردی انسان کو انسان سے ہو تو قابلِ تحسین لیکن وہ ہمدردی جو انسان سے اس کی محرومی کو دیکھ کر کی جائے ۔ناقابلِ برداشت!!

نوجوان کی حادثاتی موت نے ویرا کے اندر ایک خاص قسم کی سنجیدگی پیدا کر دی تھی ایک بے انتہا حسین وجمیل گملے میں اچانک کیکٹس کا پودا اُگ آیا تھا۔وہ مرنے والے کے ساتھ گویا مر چکی تھی اور اسکی روح دونوں کا سوگ منا رہی تھی۔وہ آئینہ بھی یوں دیکھتی جیسے آئینہ میں اس کا عکس کہیں کھو گیا ہو۔اس پر ایسی کیفیت طاری تھی جیسے قدرت نے کسی نو بیاہتا کو شادی کے اگلے روز ہی بیوگی کے عذاب میں مبتلا کر دیا ہو جو اپنے محبوب کے فراق میں کبھی دل کھول کر چیختی چلاتی، کبھی خاموشی سے ہولے ہولے کراہنے لگتی اور کبھی چہرہ پر خود فریبی کے میک اپ کی ہلکی سی تہہ جما کر سکون سے بیٹھ جاتی گویا محبوب کے لوٹ آنے کی اطلاع موصول ہوئی ہو!

ویرا کی زندگی اب یکسر بدل چکی تھی۔نوجوان کی مسخ شدہ نعش دیکھنے کے بعد وہ تقریباً پاگل ہوگئی تھی کئی ہفتوں تک شہر کے مشہور ماہر نفسیات سے اس کا علاج جاری رہا۔اس کا دکھ بہت بڑا، سزا بہت کڑی اور قصور کچھ بھی نہیں تھا۔انسان کے پاس تو اتنا سا اختیار بھی نہیں ہوتا کہ وہ کسی لمحے، کسی ناقابلِ برداشت تکلیف، کسی کرب انگیز یاد کو اپنی مرضی سے فراموش کر سکے، اپنی جلتی ہوئی آنکھوں پر اپنے سرد ہاتھ رکھ کر آنسوؤں کو برف کر سکے۔اپنے رستے ہوئے گھاؤ پر مرہم رکھ سکے لیکن آسمان والے کا حکم شاید یہی ہے کہ بیمار مسیحا اپنا علاج خود نہیں کرے گا۔اسے کسی اور مسیحا کا احسان بہر صورت اٹھانا پڑے گا!

......☆......☆......

پانچ روزہ کانفرنس پر ویرا کو اس کی بڑی بہن شیزا اپنے ساتھ زبردستی اسلام آباد لے گئی تاکہ کوئٹہ کے خشک موسم سے نکل کر اسلام آباد کی تر و تازہ آب و ہوا میں اس کی طبیعت مزید اچھی ہو جائے۔شیزا ایک بین الاقوامی آرگنائزیشن میں اچھے عہدہ پر فائز تھی۔بے اولادی کے جرم کی پاداش میں شوہر چھ برس پہلے چھوڑ چکا تھا۔والدین کے انتقال کے بعد شیزا نے ویرا کو بالکل اپنی اولاد کی طرح محبت دی۔دونوں بہنوں کے درمیان ایک بھائی نے بھی جنم لیا تھا لیکن کاتبِ تقدیر نے اس کی زندگی میں صرف دو بہاریں ہی لکھی تھیں وہ پیلے یرقان کا شکار ہو کر دو سال بعد وفات پا گیا۔اب گھر میں ویرا اور شیزا کے علاوہ ان کی ایک دیرینہ ملازمہ رہتی تھی۔

ویرا اپنے ہمجان کی موت کے بعد بہت حد تک سنبھل چکی تھی بلکہ ماہر نفسیات نے اس کے دماغ سے ہمجان جیسی خرافات باہر نکال پھینک دی اور اس کا ذہن اس کی بات کو قبول کر چکا تھا کہ دنیا میں لوگ ملتے ہی بچھڑنے کے لیے ہیں۔کوئی انسان آسمان سے اپنے اوپر کسی کے نام کی مہر لگا کر زمین پر نہیں اترتا، سب فرضی باتیں ہیں۔یہ ہمجان کی اصطلاح نجومیوں اور دست شناسوں نے اپنی دکانیں چمکانے کے لیئے اخذ کر رکھی ہیں ورنہ درحقیقت انسان کو دنیا میں وہی کچھ ملتا ہے جو اس کے نصیب میں لکھا ہوتا ہے!

کانفرنس کا پہلا دن تھا۔

ویرا کی آنکھ کھلی تو تکیے کے قریب ایک کاغذ رکھا ہوا تھا۔’ناشتہ کمرے میں منگوا لینا اور اس کے بعد سیدھی کانفرنس ہال میں چلی آنا‘

شیزا کا ہدایت نامہ پڑھ کر دوبارہ تکیے پر اچھال دیا۔اس کا ناشتہ کرنے کا بالکل موڈ نہیں تھا اور کانفرنس ہال جانے کا تو قطعاً نہیں۔وہ آرام سے تیار ہوئی اور کمرے سے باہر نکل کر نیچے ہوٹل کی لابی میں آگئی وہاں اچانک ایک خوبصورت پینٹنگ نے اس کی توجہ اپنی طرف مبذول کروائی ابھی وہ پینٹنگ کو انہماک سے دیکھ ہی رہی تھی کہ نیلی آنکھوں والا ایک نوجوان اپنا بائیاں ہاتھ پتلون کی جیب میں ڈالے اس سے چار قدم پرے کھڑا ہو کر پینٹنگ کی طرف دیکھتے ہوئے دائیاں ہاتھ ہوا میں لہرا لہرا کر باتیں کرنے لگا۔ویرا نے اس کے ہونٹوں کی طرف دیکھ کر اندازہ لگا لیا کہ موصوف پینٹنگ کے بارے میں اپنی آرٹسٹک رائے سے اسے نوازنے کی کوشش کر رہے تھے۔تھوڑی دیر بعد جب اس کے ہونٹ اور ہاتھ ساکت ہوئے اور اس نے باقاعدہ ویرا کی طرف دیکھا تو اس نے فوراً کان کے اوپر سے بالوں کو ہٹا کر اپنے گلابی آلہء سماعت کا دیدار کروایا۔نوجوان کے ہونٹوں پر پھیلی ہوئی مدھم سی مسکراہٹ پھیکی پڑنے کی بجائے مزید گہری ہوتی چلی گئی اور نیلی نیلی آنکھیں چمک اٹھیں ’اوہ آئی۔سی‘

اُسکا نام ماجد تھا!

'معذرت چاہتا ہوں' ماجد نے اپنے دونوں ہاتھوں کے اشاروں کے ساتھ اپنے ہونٹ ہلائے

ویرا کو بے اختیار ہنسی آ گئی "اشاروں کی ضرورت نہیں ہے میں ہلکا ہلکا سننے کیساتھ lip reading بھی بخوبی کر لیتی ہوں"

کسی سماعت سے محروم فرد کو یوں بولتا دیکھ کر اسے ایک اور دھچکا لگا لیکن وہ اسے ہلکے سے قہقہے میں صاف چھپا گیا۔

"مجھے آپ سے مل کر ایک دم سے خوشی ہوئی ہے" اس کی مسکراہٹ واقعی جاذب نظر تھی۔

"کیا آپ میرے ساتھ کافی پینا پسند کریں گی؟"

ویرا نے اب تک اپنی عمر کے نوجوان لڑکے عموماً لاابالی، کھلنڈرے ہی دیکھے تھے لیکن ماجد کے بات کرنے کا ڈھنگ اور وضعداری نے اسے مجبور کر دیا کہ وہ چپ چاپ اس کی آفر قبول کر لے۔"

دونوں ریستوران کی جانب چل دیئے

""آپ lip reading کے علاوہ اور کیا کرتی ہیں؟" ماجد نے کافی کی پیالی ہاتھ میں اٹھاتے ہوئے پوچھا۔

"ڈپلومہ اِن فائن آرٹس' ویرا کو اس کا اپنی ذات سے متعلق پہلا سوال بہت پسند آیا ورنہ لوگوں کا پہلا سوال ہی اس کے لیے پریشان کن ہوتا کہ آپ کے ساتھ یہ معذوری کب سے ہے، کیسے ہوئی، کیوں ہوئی۔ ہائے بیچاری!

"میں اپنی این۔ جی۔ او کے ساتھ اس کانفرنس میں شرکت کے لیے آیا ہوں لیکن میرا بالکل وہاں بیٹھ کر خود کو بور کرنے کا جی نہیں چاہ رہا۔"

اس نے ویرا کے پوچھنے سے پہلے ہی ہوٹل میں اپنی موجودگی کی وجہ بیان کر دی۔

"اچھا یوں ہوتی ہیں یہ کانفرنسز۔" وہ شرارت سے مسکرائی۔

ماجد نے خوبصورت سا قہقہہ لگایا

"مجھے تو کوئٹہ سے میری بڑی بہن زبردستی یہاں بور کرنے لائی ہیں۔ بھلا میرا ایسی خشک و بے رنگ قسم کے ایونٹس میں کیا کام۔"

"تو آپ اس وقت بور ہو رہی ہیں۔" اس نے وہاں سے ویرا کا جملہ پکڑ کر مکمل کر دیا کہ جس کے بعد بندہ، نہیں۔ ایسی بات نہیں۔ مجھے آپ سے مل کر خوشی ہوئی وغیرہ کہنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

ماجد کی دلچسپ باتوں سے بات نکلنے لگی۔ ویرا اپنے بالوں کو دونوں کانوں کے پیچھے سمیٹے اس کے ہونٹوں سے نکلنے والے الفاظ کو پوری قوت سے سننے میں مصروف تھی۔ اس کی باتوں میں جادو گھلا ہوا تھا تھوڑی دیر بعد ساتھ والی میزوں پر بہت سے لوگ آ کر بیٹھ گئے جس کی وجہ سے شور مزید بڑھ گیا ویرا کی توجہ فطری طور پر بٹ گئی اور اسے مجبوراً اٹھ کر ماجد کی ساتھ والی کرسی پر نشست اختیار کرنا پڑی وہ پر کشش مسکراہٹ کے ساتھ اپنی باتوں کا پنڈورا بکس کھولے بیٹھا تھا ویرا نے محسوس کیا کہ وہ اس کے ساتھ بالکل ایسے بات کر رہا ہے جیسے اسے بھول چکا ہو کہ وہ ایک قوت سماعت سے محروم فرد سے بات کر رہا ہے اور وہ خود بھی اس کی باتوں کی رو میں بہہ کر فراموش کر بیٹھی تھی کہ وہ اس کے ہونٹ نہیں پڑھ رہی بلکہ اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے مکمل طور پر اسکی آواز سن رہی ہے۔ اگر اس وقت بے دھیانی میں اس کے بال دوبارہ بھی اس کے کانوں کو ڈھانپ لیتے تو شاید اسے انہیں پیچھے سمیٹنے کی ضرورت محسوس نہ ہوئی۔

......☆......☆......

شام پانچ بجے شیزا کمرے میں داخل ہوئی تو بہت تھکی ہوئی دکھائی دیتی تھی لیکن اس کے باوجود اس کے چہرہ پر مسکراہٹ کھلی ہوئی تھی اور بدستور ویرا کو معنی خیز نظروں سے دیکھے جا رہی تھی اسے الجھن ہونے لگی۔

"باجی! کیا بات ہے' آخر اس نے پوچھ ہی لیا۔

"تم کیوں ایسی پھیکی پھیکی بیٹھی ہوئی ہو، چلو جلدی سے تیار ہو جاؤ کہیں باہر چلتے ہیں"

'کوئی خاص بات ضرور ہے' ویرا نے سوچا' ورنہ ایسا بہت کم ہی ہوتا ہے کہ تھکاوٹ بھی ہو اور باجی مسکرا بھی رہی ہوں'

اسی لمحے دروازے پر دستک ہوئی شیزا نے کرسی پر اپنا تھکا ہوا وجود گراتے ہوئے اسے دروازہ کھولنے کو کہا

'آپ؟' ویرا پر حیرت نے حملہ کر دیا

دروازے کے باہر ماجد کھڑا تھا

"کیا میں آپ کی اجازت کے بنا اندر آ سکتا ہوں؟" یہ کہتے ہوئے وہ اندر بھی آ گیا اور وہ اسے دیکھتی رہ گئی

ماجد اور شیزا ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرانے لگے

ویرا اپنے ذہن پر زور دے رہی تھی کہ اس نے تو ماجد کو اپنا روم نمبر نہیں بتایا اور نہ ہی دوبارہ ملاقات کا کوئی عہد کر کے رخصت ہوئی تھی پھر یہ موصوف یہاں کیسے ٹپک پڑے

"ان سے ملو یہ ہیں ماجد۔" شیزا نے حیران و پریشان کھڑی ویرا کی طرف دیکھتے ہوئے اس کا تعارف کروایا۔

"اور یہ ہیں مس ویرا۔ کیا آپ دونوں پہلی مرتبہ ایک دوسرے سے مل رہے ہیں؟" شیزا نے دونوں کی طرف دیکھ کر بناوٹ سے پوچھا۔

'ویرا آپ ابھی تک تیار نہیں ہوئیں؟' ماجد اسے مخاطب کرتے ہوئے کرسی پر مزے سے بیٹھ گیا۔

وہ بت بنی کھڑی دونوں کو بدھوؤں کی طرح دیکھے جا رہی تھی

آخر شیزا نے اپنی نشست سے اٹھ کر اس حیرت کی ماری کو گلے لگایا اور ماجد کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"چلو اب میری سوہنی موہنی کو زیادہ پریشان کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔"

"پریشان تو آپ نے انہیں کر دیا ہے۔" وہ چُنی آنکھوں سے ہنسنے لگا۔

"نیچے لابی میں انتظار کرو ہم تیار ہو کر آتے ہیں۔" شیزا نے حکم صادر کیا تو وہ معززانہ طریقے سے کرسی سے اٹھا اور 'او۔ کے باس' کہتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا

اس کے جانے کے بعد شیزا نے ویرا کو بتایا کہ دوران کانفرنس وہ اس کے پاس آیا اور انتہائی سنجیدگی کے ساتھ کہنے لگا 'میں آپ کی بہن کو کافی پلا کر آ رہا ہوں اس کا بل دے دیجیے۔"

دونوں نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔

ویرا کی طرح شیزا کو بھی ماجد کی شخصیت میں بظاہر کوئی نقص نظر نہیں آیا تھا ماجد کا تعلق جس آرگنائزیشن سے

مصنفین سے گزارش

☆ مسودہ صاف اور خوشخط لکھیں۔

☆ صفحے کے دائیں جانب کم از کم ڈیڑھ انچ کا حاشیہ چھوڑ کر لکھیں۔

☆ صفحے کے ایک جانب اور ایک سطر چھوڑ کر لکھیں' صرف نیلی یا سیاہ روشنائی کا ہی استعمال کریں۔

☆ خوشبوئے سخن کے لیے جن اشعار کا انتخاب کریں ان میں شاعر کا نام ضرور تحریر کریں۔

☆ ذوق آگہی کے لیے بھیجی جانے والی تمام تحریروں میں کتابی حوالے ضرور تحریر کریں۔

☆ فوٹو اسٹیٹ کہانی قابل قبول نہیں ہوگی۔ اصل مسودہ ارسال کریں اور فوٹو اسٹیٹ کروا کر اپنے پاس محفوظ رکھیں کیونکہ ادارہ نے ناقابل اشاعت کہانیوں کی واپسی کا سلسلہ بند کر دیا ہے۔

☆ مسودے کے آخری صفحہ پر اردو میں اپنا مکمل نام پتا اور موبائل فون نمبر ضرور خوشخط تحریر کریں۔

☆ کہانیوں پر آپ کے تبصروں پر مشتمل خطوط (گفتگو) ادارہ کو ہر ماہ کی 3 تاریخ تک مل جانے چاہئیں۔

☆ اپنی کہانیاں دفتر کے پتا پر رجسٹرڈ ڈاک کے ذریعے ارسال کیجیے۔

☆ خصوصی توجہ: ای میل سے کہانیاں ارسال کرنے والے مصنفین سے گزارش ہے کہ وہ کہانی کے اختتام پر اپنا اردو میں مکمل ایڈرس اور موبائل فون نمبر ضرور تحریر کریں۔

☆ نوٹ: 1:00 تا 2:30 نماز ظہر اور کھانے کا وقفہ ہوتا ہے لہٰذا اس دوران دفتر ٹیلی فون کرنے سے گریز کریں۔

7' فرید چیمبرز' عبداللہ ہارون روڈ' کراچی۔

تھااس کے بارے میں شیزا بخوبی آگاہ تھی اور اکثر سیمینارز اور کانفرنسز میں دونوں کا آمنا سامنا رہتا تھا اس کے علاوہ اسے دیرا کا اس کے ساتھ بیٹھ کر coffee پینا اچھا لگا تھا وہ بے حد خوش بھی تھی کہ اسکی بہن کم از کم اس ہمجان کے چکر سے تو پوری طرح نکل کر عام زندگی میں لوٹ آئی ہے

''این۔جی۔او سیکٹر میں کام کرتے ہوئے مجھے لوگوں کو پرکھنا آگیا ہے۔''شیزا نے اس کا چہرہ اپنے دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔

''وہ ہمیں اسلام آباد گھمانے کا کہہ رہا تھا تو میں نے اسے اپنا روم نمبر دے دیا''

''لیکن۔۔۔''دیرا نے لب کھولنا چاہے مگر اس نے خاموش کرادیئے

''تمھیں اپنا اعتماد واپس بحال کرنا ہوگا دیرا،اپنے اندر کے خوف پر قابو پانا ہوگا،جاؤ میری جان'شیزا نے اس کے ماتھے پر بوسہ دیا۔

''صرف میں؟''اس نے حیرت سے پوچھا۔

''مجھے تم پر اعتماد تھا،اور ہے،میں کسی اور کو نہیں جانتی۔بس''یہ کہتے ہوئے شیزا بیڈ پر دراز ہوگئی۔

''باجی مجھ سے تنہا نہیں جانے ہوگا''اس نے معصومیت سے کہا

'تیار ہو جاؤ ورنہ وہ دوبارہ ٹپک پڑے گا'اس نے تکیہ چہرے پر رکھ لیا۔

شیزا نے ہمیشہ اسے خوداعتادی کا درس دیا تھا اور اب بھی وہ یہی دیکھنا چاہ رہی تھی کہ اس میں وہ خوداعتادی باقی ہے کہ نہیں۔

بالآخر وہ تیار ہو کر نیچے لابی میں چلی گئی!

......☆......☆......

ماجد کا تعلق اسلام آباد سے تھا اور وہ بخوبی شہر کی تمام جگہوں سے واقف تھا اسے معلوم تھا کہ کن راستوں پر گاڑی سے اتر کر اونچے اونچے درختوں تلے پیدل چلنے میں لطف آتا ہے اور وہ کون سے view points ہیں جہاں کافی پینے سے اس کا ذائقہ مدتوں زبان پر مہکتا رہے گا۔

اس روز موسم بڑا رومانوی تھا۔ ہوا کے جھونکے پھولوں کے بدن سے ٹکرا کر پانی کے چھینٹوں کی طرح چہروں کو تر وتازہ رکھے ہوئے تھے،دور پہاڑ کے دامن میں شام اپنا سرخ آنچل سمیٹنے میں مصروف تھی۔

پہلے پہل تو ایک فطری جھجک نے دیرا کو باندھ کر رکھا لیکن جوں جوں سفر طے ہوتا رہا اس کے اندر اطمینان کی لہر سرایت کرتی چلی گئی وہ اسے یوں اسلام آباد گھماتا رہا جیسے ایک ماہر گائیڈ اپنے کلائنٹ کو مطمئن کرنے کے لیئے ہر ممکن کوشش کرتا ہے۔

ماجد کے مقناطیسی رویے اور اس کی سحر انگیز باتوں نے زندگی میں پہلی مرتبہ دیرا کو یہ احساس دلایا کہ اس کی باقی ماندہ شخصیت کے سامنے اس کی محرومی بہت چھوٹی اور بے معنی ہے۔

جب دو اجنبی ایک ساتھ محوِ سفر ہوتے ہیں تب ایک دوسرے کو کھوجنے کی بھرپور کوشش کرتے ہیں دیرا نے اسے ہمجان والا واقعہ سنایا تو اس کا ردِعمل بالکل نارمل تھا اس کے خیال میں دنیا ایک پراسرار جگہ ہے یہاں کچھ بھی ممکن ہوسکتا ہے کوئی بھی من گھڑت بات حقیقت کا لبادہ اوڑھ کر کسی بھی لمحے سامنے آسکتی ہے جیسے زمانہ قدیم میں الف لیلہ کی فرضی کہانیوں میں اُڑن قالین کا ذکر سن کر لوگ حیران ہوا کرتے تھے لیکن آج دیو قامت لوہے کے جہاز ہوا میں پرواز کرتے ہیں اُس زمانے کے لوگ آج یہ جہاز دیکھ لیں تو حیرت سے مرجائیں!

رات کے سائے طویل ہو چکے تھے تھکان کے باوجود دیرا کے چہرے پر تازگی تھی

''میں جانتا ہوں کہ یہ سوال نہایت ہی تھکا ہوا ہے لیکن پتہ نہیں کیوں آپ سے پوچھنے کو جی چاہ رہا ہے''ہوٹل واپسی پر ماجد نے اس کی ذات میں داخل ہونے کے لیئے درِدل پر پہلی دستک دی۔

دیرا نے ابروؤں کو اٹھاتے ہوئے کہا۔

''سوال کیا ہے؟''

کچھ سوچتے ہوئے وہ گویا ہوا۔

''کیا آپ اب بھی ہمجان پر یقین رکھتی ہیں؟''

دیرا نے آہستہ سے نفی میں سر ہلا دیا

اس کے بعد گاڑی کچھ دیر چپ چاپ سڑک پر رینگتی رہی اور خاموشی گنگناتی رہی

''تم عموماً lip reading ہی کرتی ہو یا پھر

اشارے بھی سمجھ لیتی ہو'ماجد نے موضوع بدلتے ہوئے اچانک 'آپ' سے 'تم' پر چھلانگ لگائی۔

'مجھے lip reading آسان لگتی ہے۔۔لوگوں کے متحرک ہونٹوں کی اپنی سائیکی ہوتی ہے۔''

''کیسی سائیکی''

''غور کریں تو لوگوں کے ہونٹ ان کے ذہن میں چلنے والی سوچوں اور دلی خیالات کی عکاسی کرتے دکھائی دیں گے۔''

''دلچسپ۔۔مثلاً۔''اس نے متاثر کن انداز میں کہا۔

دیرا اپنا سر سیٹ پر ٹکاتے ہوئے گویا ہوئی'میں لوگوں کے ہونٹوں سے اندازہ لگاسکتی ہوں کہ وہ کس قدر پریشان ہیں۔۔وہ جھوٹ بول رہے ہیں یا سچ۔۔کیوں سوچ سوچ کر بول رہے ہیں۔۔کیا مایوسیوں میں گھرے ہیں۔۔رونا چاہتے ہیں۔۔اندر سے ٹوٹے ہوئے ہیں۔۔ذہنی دباؤ کا شکار ہیں۔۔ان کی مسکراہٹ مصنوعی ہے۔۔بور ہو رہے ہیں۔۔شرمندہ ہیں۔۔بے سکون ہیں۔۔خوفزدہ ہیں۔۔کچھ کہنا چاہتے ہیں۔۔ان کی باتوں میں خلوص ہے یا۔۔فلرٹ کر رہے ہیں'

ماجد نے چہرہ اس کی جانب گھمایا اور مسکرادیا۔

''میرے بارے میں کیا رائے ہے''

دیرا نے آہستہ سے نفی میں سر ہلایا۔

''ابھی حتمی طور پر کچھ نہیں کہہ سکتی۔۔فی الحال آپ معقول انسان لگے ہیں''

''O,Really''اس نے یوں بناوٹ سے اپنے ہونٹ ہلائے کہ دیرا کو ہنسی آگئی۔اس نے اپنی بھرپور مسکراہٹ کے ساتھ اس کی ہنسی کو باندھ کر اسے ہوٹل ڈراپ کردیا۔

ساری رات دیرا کو درِدل پر ہونے والی پہلی دستک سنائی دیتی رہی!

......☆......☆......

اُس سے اگلی شام اور پھر اس سے اگلی شام وہ ماجد کے ساتھ بھی زندگی ایک نئی تصویر میں رنگ بھرتی رہی یہ تصویر ہمجان والی پینٹنگ سے زیادہ حسین اور دلکش تھی۔دونوں کے قدموں کی آہٹ سے سوئے رستے بیدار ہوتے چلے گئے،ان گنت قہقہے سرسبز درختوں نے سُنے،خاموشی کے وقفوں میں نگاہوں نے حسین مناظر کا طواف کیا،دیرا اس کے ہلتے ہوئے ہونٹوں سے نکلے ہوئے الفاظ کو پلکوں کی نوک سے چُنتی رہی اور اس کی آنکھوں میں شاموں کے ڈھل جانے کا افسوس دیکھتی رہی۔

'کاش یہ وقت یہیں تھم کر رہ جائے کاش یہ تصویر کبھی مکمل نہ ہو کاش یہ رستہ کہیں ختم نہ ہو کاش گفتگو کا سلسلہ کبھی منقطع نہ ہو کاش موسم بہار یہیں تھم جائے کاش ان مسکراہٹوں کو زوال کا خدشہ نہ ہو'دیرا کے اندر بیٹھی محبت نے اس کے کان میں سرگوشیاں کیں اور دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔

وہ کانفرنس کا چوتھا روز تھا۔

صبح گیارہ بجے دیرا کی آنکھ کھلی تو اسے یاد آیا کہ گزشتہ شام اسے ماجد نے صبح دس بجے اپنے ساتھ کافی پینے کی دعوت دی تھی،وہ جلدی سے تیار ہو کر نیچے لابی میں پہنچی تو ماجد نے اسے دیکھتے ہی گھڑی پر نگاہ ڈالتے ہوئے کہا۔

''دس منٹ بعد بارہ بج جائیں گے،گھڑی میں بھی اور میرے بھی''

وہ ہونٹوں کی جنبش سے sorry کہتے ہوئے اس کے سامنے کرسی پر بیٹھ گئی۔

''رات باجی سے کہا بھی تھا کہ صبح اپنے ساتھ ہی جگا دینا لیکن شاید وہ بھول گئیں''

''خیر،باجی سے بھی نبٹ لیں گے''اس نے ویٹر کو اشارہ کر کے پاس بلایا اور کافی آرڈر کی۔

دیرا نے بالوں کو کان کے پیچھے سمیٹا تو ماجد نے بہت دیر سوچنے کو بعد اسے مخاطب کیا

''تم بالوں کو اس انداز میں کیوں نہیں بناتی کہ تمھیں بار بار انہیں کان سے پیچھے ہٹانے کی زحمت نہ اٹھانی پڑے''

پہلے تو اس نے سوچا کہ اس سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے صرف مسکرانے پر اکتفا کرے لیکن نا جانے کیوں اس کے ہونٹ خود بخود بول پڑے۔

''اس کی وجہ یہ ہے کہ میں صرف قوتِ سماعت سے

محروم نہیں ہوں بلکہ قوتِ سماعت سے محروم ایک لڑکی بھی ہوں' اس کا لہجہ نہ چاہتے ہوئے بھی یکدم سخت ہوگیا۔

ماجد کو اپنے سوال پر پشیمانی ہوئی اور اس نے محسوس کیا کہ وہ اداس ہوگئی ہے "اگر تمھیں میرے سوال سے دکھ پہنچا ہے تو میں معذرت چاہتا ہوں لیکن۔۔ یہ ضرور کہوں گا کہ تم کیوں خود کو اس معمولی سی معذوری کے حوالے کر رہی ہو، پلیز بھول جاؤ کہ تمھارے ساتھ یہ محرومی ہے"

ویرا نے نفی میں سر ہلایا "میں بھولنے کی کوشش بھی کروں تب بھی نہیں بھول سکتی جس طرح کسی کالم نگار کو اس کے اردگرد کا ماحول قلم اٹھا کر کڑوے حقائق لکھنے پر مجبور کرتا ہے اسی طرح میرے آس پاس موجود لوگوں کی نگاہیں اور ان کے ترس آمیز رویئے مجھے اس محرومی کا احساس دلاتے رہتے ہیں' اس کا دل اب سچ مچ اداس ہونے کو چاہ رہا تھا 'یہ رویئے بہت تلخ ہوتے ہیں"

ریستوران کی فضا میں آنسوؤں سے بھرے بادل منڈلانے لگے اور اس سے پہلے بادل برستے افسردہ ماحول کو خوشگوار بنانے کے لیئے اچانک ماجد نے دھیمے سُروں میں گنگنانا شروع کر دیا 'وہ عشق جو ہم سے روٹھ گیا۔۔۔'

ویرا کو اس کی یہ حرکت بہت عجیب معلوم ہوئی

یونہی آہستہ سے گنگناتے ہوئے اس نے اپنی جیب سے دو سفید لفافے نکال کر اس کے سامنے رکھ دیئے۔

ویرا نے لفافے میں سے کارڈ نکال کر اس پر نگاہ دوڑائی۔

"یہ تو۔۔ فریدہ خانم جی کے ساتھ ایک شامِ غزل، کا انٹری پاس ہے۔"

"جی، آج شام تیار رہنا اس شامِ غزل کا انعقاد قریبی ہوٹل میں ہے"

اسے ایسا لگا جیسے ماجد نے اس کی محرومی کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔

"تم جانتے ہو کہ میں۔۔۔"

"میرے ساتھ کوئی ایسی ویسی بات مت کرنا پلیز"

اس کی آنکھوں میں ویرا کو اپنائیت کی چمک نظر آئی

"تمھیں اپنی اس محرومی کو یکسر نظر انداز کر کے جانا ہی پڑے گا اور ایسا میں چاہتا ہوں"

وہ ذرا دیر کارڈ پر نظریں جمائے بیٹھی رہی اور پھر اثبات میں سر ہلاتے ہوئے گویا ہوئی "اس کے لیے مجھے باجی سے اجازت لینا ہوگی"

اس نے کوئی احتجاج نہ کیا بس خاموشی سے اس کی آنکھوں کی کھڑکیوں پر اپنی لرزتی پلکوں سے دستک دیتا رہا۔ دوسری دستک!

......☆......☆......

ماجد، شیزا سے پہلے ہی اجازت لے چکا تھا

شام کو دونوں ہوٹل سے نکلے تو ویرا نے راستے میں اسے قدرے سنجیدگی سے مخاطب کیا۔

"میں تین چار غزلیں سننے کے بعد جلد ہوٹل واپس آنا چاہوں گی"

"ایسا کیوں؟" ماجد نے چونک کر اسکی طرف دیکھا۔

"بس مجھے یوں رات دیر تک بیٹھنا اچھا نہیں لگے گا"

"باجی نے جلد آنے کی تاکید کی ہے؟"

"نہیں ایسا کچھ نہیں کہا لیکن جس طرح کچھ باتوں کے لیے ہمیں اپنے پیاروں کی اجازت مطلوب ہوتی ہے اسی طرح کچھ فیصلوں کے لیے ہمارے پیارے ہماری طرف بھی دیکھتے ہیں"

ماجد سنجیدگی سے سر ہلا کر خاموش ہوگیا

"مسکرا کر میری بات کا جواب دو، پلیز" ویرا کو شام کے برباد ہونے کا اندیشہ تھا۔

"'آپ کے حکم کی تعمیل ہوگی" اس نے ادھار پر مانگی ہوئی مسکراہٹ سے اس کی طرف دیکھا۔

"فکر نہ کرو ہم جلد واپس آجائیں گے"

گاڑی میں خاموشی چھا گئی!

......☆......☆......

پروگرام ابھی شروع نہیں ہوا تھا

ہال میں پہنچ کر ماجد نے ویرا کو اگلی نشستوں کی جانب جانے سے روک دیا حالانکہ وہ تقریباً خالی تھیں اس نے وجہ پوچھی تو ماجد نے اسپیکرز کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"یہاں پیچھے اسپیکرز کے قریب بیٹھ کر تم باآسانی فریدہ جی کی آواز سے محظوظ ہو سکتی ہو"

"لیکن میں فریدہ جی کو قریب سے دیکھنا چاہتی ہوں" اس نے معصومیت سے کہا۔

"وہ یہاں اپنی آواز کا جادو جگانے آرہی ہیں۔ یہ کوئی فیشن شو نہیں ہے ناں" ماجد نے گھور کر اس کی طرف دیکھا تو وہ چپ چاپ وہیں بیٹھ گئی۔

آہستہ آہستہ ہال میں رش بڑھتا جا رہا تھا اور ویرا بار بار گھڑی دیکھتے ہوئے اس سے ایک ہی سوال کیے جا رہی تھی۔

"یہ فریدہ جی کہاں رہ گئیں۔

وہ آرام سے کرسی پر پشت ٹکائے بیٹھا اس کی بے چینی سے گویا لطف اندوز ہو رہا تھا کافی دیر بعد فریدہ خانم اسٹیج پر تشریف لائیں اور پورا ہال تالیوں سے گونج اٹھا۔ ویرا کے کان کے پردے پر ہلکا سا ارتعاش پیدا ہو کر ختم ہوگیا

"کالی ساڑھی میں فریدہ جی کتنی گریس فل لگ رہی ہیں ناں" اس کی نگاہیں یوں چمکتی تھیں جیسے ان میں ننھے ننھے دیئے روشن ہوں۔

اس کے دائیں جانب ذرا فاصلے پر ایک بڑا سا اسپیکر نصب تھا کچھ توقف کے بعد اس میں سے فریدہ جی کی مدھر آواز اپنی پوری رعنائیوں کے ساتھ برآمد ہوئی۔

'میں نے پیروں میں پائل تو باندھی نہیں۔۔'

کچھ توقف کے بعد گیت کے ساتھ ہی ماجد کا ہاتھ تھرکنا شروع ہوگیا۔

"یہ میری وجہ سے یہاں پیچھے بیٹھا ہوا ہے تاکہ مجھے آواز صاف سنائی دے' ویرا کا دھیان گیت سے ہٹ کر احساس میں ڈوب گیا' اور میں نے اس کے ساتھ کیا کیا کہ یہاں آنے سے پہلے ہی واپس جانے کی رٹ لگا دی۔ خود غرض' اس کے اندر سے چیخ ابھری۔

"دونوں جہان تیری محبت میں ہار کے"

گیت کے بعد غزل کا آغاز ہوا تو ماجد نے اچانک اپنے ہونٹ اس کے بائیں کان کے قریب لا کر سرگوشی کی "یہ فیض صاحب کی مشہور غزل ہے'

اس کی سرگوشی سے ویرا کو یوں محسوس ہوا جیسے ابھی اس کا آلۂ سماعت پگھل کر کان سے بہنا شروع کر دے گا وہ پہلی مرتبہ اس کے اتنے قریب ہوا تھا۔ اس غزل کے بعد ایک اور غزل کا آغاز ہوا اور ویرا کی توجہ اپنے بائیں کان پر مرکوز ہوگئی۔ اس نے دوبارہ سرگوشی کر کے اسے غزل کے شاعر کے بارے میں بتایا۔ آلۂ سماعت کا درجہ حرارت اور بڑھ گیا اور اسی طرح ہر غزل کے آغاز پر حرارت بتدریج بڑھتی چلی گئی اور جب درجۂ حرارت نقطۂ اشتعال کی آخری حد کو چھونے لگا ویرا نے اسے ہوٹل واپس چلنے کو کہہ دیا۔

"تھوڑی دیر اور رُک جاؤ" اس نے درخواست کی۔

لیکن وہ جانتی تھی کہ اگر ذرا اور یہاں ٹھہری تو راکھ بن کر اس کے قدموں مین بکھر جائیگی۔

"آج جانے کی ضد نہ کرو۔۔' فریدہ جی نے شاید ماجد کے دل کی صدا سن لی تھی لیکن ویرا اٹھ کر ہال سے باہر چلی گئی اس کے باوجود کہ اس نے پروگرام میں آنے سے پہلے ہی جلد واپس لوٹ آنے کا عندیہ دے دیا تھا لیکن اس وقت اسے سخت شرمندگی ہو رہی تھی۔ یا شاید پھر وجہ کچھ اور تھی جسے وہ جان بوجھ کر نظر انداز کرنا چاہتی تھی۔

دونوں واپس ہوٹل پہنچے تو گاڑی سے اترتے سمے ویرا نے اپنا کانپتا ہوا ہاتھ اس کے ہاتھ پر رکھ کر sorry کہا ماجد نے اسکا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ ویرا بنا کسی مزاحمت کے نگاہیں جھکائے بیٹھی رہی دونوں پر خاموشی طاری تھی دونوں کے درمیان آگ کے شعلے حائل تھے دل میں جذبات کا لاوا ابلتا محسوس ہوتا تھا اور اس سے پہلے کہ آتش فشاں پھٹ پڑتا وہ گاڑی سے نیچے اتر کر تیز تیز قدموں سے ہوٹل میں داخل ہوگئی۔

تیسری دستک نے اسے سر سے پاؤں تک جھنجوڑ کر رکھ دیا تھا!!

وہ رات دیر تک سوچتی رہی کہ اگر تیسری دستک پر بھی اس نے دل کا دروازہ نہیں کھولا تو کہیں دستک دینے والا ناراض ہو کر واپس ہی نہ لوٹ جائے۔

......☆......☆......

کانفرنس کا پانچواں اور آخری روز تھا!

صبح دس بجے ویرا جلدی سے تیار ہو کر نیچے لابی میں آئی لیکن یہاں وہاں کہیں بھی ماجد موجود نہیں تھا۔ وہ کافی ہال میں اس کا انتظار کرنے لگی 'ناراض ہوگا شاید۔ نہیں۔۔ یا آج کانفرنس کے آخری دن شاید مصروف ہوگا۔۔ مجھے کانفرنس ہال میں جا کر اسے دیکھنا

چاہیے۔نہیں۔۔شاید آج میں جلدی آگئی ہوں۔۔ہاں یہی بات ہوسکتی ہے۔۔شاید۔۔‘اسکا ذہن طرح طرح کے خیالات میں الجھا ہوا تھا۔

’’صبح بخیر‘‘ ماجد ایک سرخ گلاب ہاتھ میں لیے اس کے سامنے مؤدب کھڑا تھا۔

"This is for Princess Vera"

"ThankYou Prince Charming"

وہ بالکل اپنے اردگرد کی پروانہ کرتے ہوئے مسکرائی اور گلاب اس کے ہاتھ سے لے کر خوشبو کا ایک گھونٹ اپنی سانسوں میں اتارا۔

’’کتنی پیاری خوشبو ہے‘‘

’’سچ مچ بہت پیاری ہے۔‘‘ ماجد نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا اور بالکل اس کے مقابل کرسی پر بیٹھتے ہوئے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔

وہ سَر تا پا لرز اٹھی لیکن سوچ کا دھارا اسے کہیں اور ہی لے گیا ’تمھارے دل پر یہی ہاتھ دستکیں دے رہا ہے ویرا‘ سوچ مزید گہری ہوتی چلی گئی۔ایک لڑکی کو کسی مقام پر آکر ایسے ہی ہاتھ کی ضرورت محسوس ہوتی ہے جسے تھام کر وہ تمام زندگی گزار سکے۔ایک مضبوط توانا ہاتھ جس کی مٹھی ناقابلِ تسخیر قلعے کی مانند ہو‘

وہ بہت دھیرے سے اپنی انگلیوں کو اس کی کانپتی انگلیوں میں ہم آغوش کرنے لگا ویرا کی طرف سے کوئی مزاحمت نہ ہوئی۔ماجد کی نگاہیں اس کی جھکی ہوئی پلکوں پر ٹکی ہوئی تھیں۔

اچانک ویرا کے اندر اس کے ضمیر نے سر اٹھایا ’کیا یہ سب غلط نہیں؟۔گناہ نہیں؟۔بے وقوفی نہیں؟۔یہ واقعی محبت ہے؟‘ اس نے ماجد کی طرف نگاہ اٹھا کر دیکھا تو دل نے گواہی دی کہ۔۔ہاں یہ محبت ہے۔محبت ہے!

ویرا کی نظریں اس کے لبوں پر بیٹھیں اس محبت کے اظہار کی منتظر تھی جس کے بعد تمام عمر کی محرومیاں اسے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے الوداع کہہ کر رخصت ہونے والی تھیں اپنے اطراف سے یکسر بے خبر اس کی پوری کائنات اس کے خاموش ہونٹوں تک محدود ہو کر رہ گئی تھی۔جب کافی دیر گزرنے کے بعد بھی اس نے اپنے لب نہ کھولے اور ہاتھوں پر پسینے کی ننھی بوندیں چمکنے لگیں تو وہ اضطرابی کیفیت کو اس سے چھپاتے ہوئے بولی۔

’’کچھ کہو گے نہیں‘‘

دونوں خاموشی کی زبان سننے اور سمجھنے پر قادر تھے اس نے نفی میں سر کو جنبش دیتے ہوئے لب کھولے۔

’’نہیں ،ابھی نہیں‘‘ ماجد کا دائیاں ہاتھ اس کے بائیں ہاتھ میں تھا اور دونوں آزاد ہاتھوں سے کافی پینے لگے۔

’’کل صبح ہماری روانگی ہے۔‘‘ ویرا نے یاد دہانی کروائی۔

’’ہاں جانتا ہوں‘‘ اس نے گہرا سانس لیا۔

’’اچھا سنو!گزشتہ چار شامیں تم میرے ساتھ گزارتی آئی ہو اگر آج کی شام میں تمھارے ساتھ گزاروں تو تمھیں کوئی اعتراض تو نہیں ہوگا؟‘‘

’’وہ شاید محبت کے اظہار کی لمبی چوڑی تمہید باندھنا چاہتا ہے‘‘ اس نے سوچا اور نفی میں سر ہلاتے ہوئے آنے والی شام اسے دیدی۔

وہ سچ مچ بہت خوش تھی

دونوں ایک دوسرے کی نگاہوں میں گم کافی کی پیالیاں ہاتھوں میں تھامے مسکرانے لگے کہ اچانک ویرا کی نگاہ ماجد کے عقب میں دور ٹیبل پر بیٹھے ایک نوجوان جوڑے پر جا ٹھہری ،لڑکی کی کلائیوں میں سونے کی چوڑیاں اس بات کی غمازی کررہی تھیں کہ جوڑا شادی شدہ ہے۔

’’وہ دیکھو،دونوں جھگڑ رہے ہیں۔‘‘ اس نے ماجد کی توجہ ان کی طرف مبذول کروائی۔

اس نے گردن کو خم دے کر ان کی طرف دیکھا۔

’’تم کیسے کہہ سکتی ہو کہ دونوں جھگڑ رہے ہیں جبکہ ان کی آواز تو میں بھی نہیں سن پارہا۔‘‘

نوبیاہتا لڑکی کے ہونٹ کبھی کھلتے ،کبھی سمٹ جاتے، کبھی خاموش ہوجاتے تو کبھی دانتوں تلے کٹنے لگتے جبکہ ساتھ بیٹھے ہوئے اس کے شوہر کا رویہ ایسا تھا کہ جیسے اسے اس کی باتوں کی ذرا پروا نہیں۔۔اداسی کی ایک لہر تھی جو اس جوڑے اور ویرا کے درمیان سفر کررہی تھی۔

’’کیا اتنی دور بیٹھ کر کسی انجان شخص کے بارے میں کوئی حتمی رائے دی جاسکتی ہے کہ وہ کس دھن میں بیٹھا

ہے؟‘‘ شاید اس نے ویرا کے اندر اترتی ہوئی اداسی کی لہر کو محسوس کرلیا تھا۔

’’بالکل‘ ویرا نے سنجیدگی سے اس کی طرف دیکھا۔

’’کبھی ٹیلی وژن کی آواز بند کر کے اسے دیکھنا ،تم بھی یہ ہنر آہستہ آہستہ سیکھ جاؤ گے‘‘

’’نا بابا نا۔۔میں ایسا ہی ٹھیک ہوں‘‘

اس کا قہقہہ ویرا کے شیشہء دل پر لکیر کھینچ گیا لیکن اس نے شکایت نہیں کی۔

’’ضروری نہیں کہ حقیقت وہی ہو جو لازی ہمیں سنائی اور دکھائی دے‘‘ وہ نہیں جانتی تھی کہ اس وقت اسے کیا سمجھانا چاہ رہی تھی شاید اس پر نوبیاہتا لڑکی کی اداسی کا اثر طاری تھا۔’’اگر کبھی تم بہت دور سے کسے درخت کو گرتے ہوئے دیکھو تو یہ ہرگز مت سمجھنا کہ گرتے سمے وہ درد سے چرچرایا نہیں ہوگا‘‘

ماجد لاجواب سا ہو کر کافی کی چسکیاں لینے لگا۔

......☆......☆......

شام کو ویرا گنگناتے ہوئے تیار ہونے میں مصروف تھی اور شیزا بیڈ پر نیم دراز اسے بڑے اطمینان سے دیکھ کر مسکرائی رہی۔

’’بہت خوش دکھائی دے رہی ہو‘‘

’’آپ کو وجہ معلوم ہے باجی‘‘ وہ ذرا سا جھینپ گئی۔

’’میں تم سے زیادہ خوش ہوں۔۔ماجد اچھا لڑکا ہے، اگر تم دونوں کسی فیصلے پر پہنچتے ہو تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا‘‘

اس نے باقاعدہ مڑ کر شیزا کو دیکھا۔

’’باجی پتہ نہیں کیوں آج میرے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہورہے ہیں میں جتنی بھی بہادری کیوں نہ دکھاؤں لیکن میرے اندر یہ احساس نہیں مرتا کہ مجھے کوئی قبول نہیں کرے گا‘‘

شیزا اٹھ کر اس کے پاس چلی آئی اور اس کا چہرہ دونوں ہتھیلیوں میں لے لیا۔

’’کوئی انسان ایسا نہیں جس میں کوئی نہ کوئی کمی نہ ہو اور شکر ہے کہ انسان کا نصیب خدا نے اپنے ہاتھ میں رکھا ہے اس لیے تمہیں فکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔۔سمجھی؟‘‘

اس نے آہستہ سے سر ہلایا

"چلو شاباش جلدی سے تیار ہو جاؤ۔" شیزا نے اسکا ماتھا چوما۔

"ویسے باجی میں بھی انسان ہوں اور مجھ پر اتنا اندھا اعتماد کرنا بھی ٹھیک نہیں ہے۔" اس نے شرارت سے مسکراتے ہوئے آئینے میں اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

"تم میرا مان ہو میری جان، اگر تم ٹوٹ گئیں تو میں بھی ٹوٹ جاؤں گی اور اعتماد کیا نہیں جاتا اعتماد تو کمایا جاتا ہے۔"

ویرا تڑپ اٹھی اور بالوں میں برش کرتے کرتے ایک دم جا کر اپنی بہن سے لپٹ گئی!

☆......☆......

موسم نہایت خوشگوار تھا

شام کے ہاتھوں سے سورج دھیرے دھیرے پھسل کر دور اک پہاڑی کی جھولی میں بس گرنے ہی والا تھا

ماجد نے ایک بے حد خوبصورت view point پر گاڑی روک دی۔

جہاں حد نگاہ سبزے کا قالین بچھا ہوا تھا بہت کم لوگوں کو اس جگہ کا علم ہونے کی وجہ سے رش بھی بہت کم تھا تھوڑے تھوڑے فاصلے پر اکا دکا گاڑیاں کھڑی تھیں۔ ماجد نے پیار سے ویرا کے بالوں کو چھوا اور انہیں کان کے پیچھے سمیٹ دیا

"جب پہلی بار تمھیں دیکھا تھا بس وہی لمحہ اب تک میری آنکھوں میں مقید ہے۔ میں جب جب تمھیں ہوٹل ڈراپ کر کے واپس لوٹتا تو سارا سفر کانٹوں پر طے کرتا۔ اور پھر رات کی تنہائی ایسے ڈستی جیسے جسم سے جان کھینچ کر ہی دم لے گی"

ویرا کی ہتھیلیاں پسینے سے تر تھیں کہ اس کے لفظ لفظ میں رومانویت بھری ہوئی تھی

شام ڈھل چکی تھی لیکن اب تک اس نے محبت کا اظہار اور وفا کے وعدوں جیسی کوئی بات نہیں کی تھی۔ عمر بھر ساتھ چلنے جیسی کوئی اجازت نہیں مانگی۔ کوئی قسم اس کی انگلی میں نہیں پہنائی تھی

ویرا نے ہمت کر کے بالآخر پہل کر دی۔

"ماجد۔۔ میں بھی تمھیں پسند کرنے لگی ہوں" یہ کہتے ہوئے اس کا حلق سوکھنے لگا۔

ماجد نے ہاتھ میں پکڑی انرجی ڈرنک کی بوتل سے ایک گھونٹ لیا۔

"مجھے بھی تم سے محبت ہو گئی ہے میری جان"

ویرا کا سر حیا سے جھک گیا کہ بس یہی تو وہ سننے کے لیے بیتاب تھی۔

"تم اتنی حسین کیوں ہو؟" اچانک اس کی آنکھیں بوجھل ہو گئیں، سانسیں بے قابو اور ہاتھ بے حد گرم تھے۔

اس کی یہ کیفیت دیکھتے ہوئے بھی ویرا اس وقت کچھ نہ سمجھ پائی اور بیوقوفوں کی طرح اس سے پوچھنے لگی۔

"کیا تم سچ مچ مجھ سے محبت کرتے ہو ماجد؟" شاید اس وقت ہر لڑکی کی مانند اس پر بھی چاہے جانے کی تمنا باقی تمام آرزوؤں پر حاوی تھی

ماجد نے اسے اپنے قریب کھینچا اور اس کے دونوں شانوں پر اپنے ہاتھ جماتے ہوئے کہا۔

"بہت محبت کرتا ہوں میری جان۔" اس کی آنکھوں میں عجیب سی وحشت در آئی وہ اس کے اوپر جھکنے کی کوشش کرنے لگا لیکن ویرا نے اسے پیچھے دھکیل دیا۔ اس پہ جنون سا طاری تھا وہ اسے اپنے قریب کھینچنے لگا اور ویرا کا بدن اپنے بچاؤ میں لرزتا تھا 'نہیں۔۔۔ یہ محبت نہیں ہے' اس کے اندر سے کوئی آواز ابھری اور وہ انتہائی بے بسی کے عالم میں چیخ اٹھی "Stop..please Stop"

ماجد کی سانسیں پھولی ہوئی تھیں لیکن اس کے باوجود وہ چلایا۔

"تم خود کو سمجھتی کیا ہو؟؟؟" اسکی آنکھوں میں انگارے دہک رہے تھے۔

"دنیا صرف اس لیے تمہارے اشاروں پہ ناچتی رہے کہ خدا نے تمھیں اپاہج کر دیا ہے"

ویرا کے دل کا دروازہ پوری قوت سے بند ہوا اور اس کی گونج سے آنسوؤں کے سارے بندھ ٹوٹ گئے۔

وہ بولتا چلا گیا۔

"تم ساری عمر اپنی محرومی کے عوض لوگوں سے ہمدردیاں سمیٹتی رہو گی لیکن محبت کہیں نہیں ملے گی۔۔ شکر کرو کہ میں نے تمھیں محبت کے قابل سمجھا ورنہ تم چیز کیا ہو!"

"یہ محبت ہے؟" ویرا نے نم آنکھوں سے اسکی طرف

دیکھا۔

"ہاں! اور یہی میرا محبت کرنے کا انداز ہے میں تمھاری شرائط پر تم سے محبت نہیں کر سکتا۔" وہ غصہ میں پاگل ہو رہا تھا۔

"میں نے تو کوئی شرط نہیں رکھی ماجد" آنسو اسکی پلکوں سے رسنے لگے۔

"صرف عمر بھر تمھارے ساتھ رہنے کے علاوہ کوئی اور خواب میری آنکھوں نے نہیں دیکھا۔"

"جھوٹ کہتی ہو تم۔۔۔ بکواس کرتی ہو۔۔۔ تم بے انتہا خودغرض لڑکی ہو" اس کا انداز منہ پر تھوکنے جیسا تھا۔

وہ اسے بت بنی دیکھ رہی تھی اسے بھیگی آنکھوں سے اس کے ہونٹ بھی صاف طور پر دکھائی نہیں دے رہے تھے اور شاید اس کی ضرورت بھی نہیں تھی کیونکہ وہ ایسے چلا کے بات کر رہا تھا کہ ایک لمحہ کے لیے اسے گمان سا گزرا کہ شاید اس کی سماعت واپس لوٹ آئی ہو۔ وہ اپنی سسکیوں میں ڈوبی ہوئی تھی

وہ کچھ دیر خاموش رہا اور پھر اچانک اپنی انگلی سے اسکی ٹھوڑی کو اٹھا کر پیار بھری ہمدرد نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے بولا۔

"Please I need you...I Love you so much" اس کی آواز میں درد کا شائبہ اور آنکھوں میں خمار کی لہر تھی۔ بہت نازک لمحہ تھا۔۔ ہاتھ بھر کے فاصلہ پر یقین کی منزل بھی تھی اور رسوائی کی کھائی بھی۔۔۔ ایک جوا تھا۔۔ ویرا کے ایک ہاتھ میں اپنی بہن کا دیا ہوا پختہ اعتماد تو دوسرے ہاتھ میں چاہے جانے کا خواب دھرا تھا اور عزت داؤ پر لگی تھی۔

ماجد کی نگاہیں کھیل کے آخری فیصلہ کن پتے کی منتظر تھیں اور بالآخر ویرا نے وہ پتا پھینک دیا!!

☆......☆......

ویرا جب ہوٹل واپس لوٹی تو شیزا سو رہی تھی وہ خاموشی سے صوفے پر سمٹ کے بیٹھ گئی۔ ذرا سی دیر میں اسکی ہچکیوں کی صدا سن کر شیزا کی آنکھ کھل گئی۔ وہ جھٹ سے اس کے پاس آئی اور اسے اپنی آغوش میں لے لیا۔

"کیا بات ہے باجی کی جان؟" اُس کا دل بہت زور سے دھڑک رہا تھا

وہ کوئی جواب نہ دے سکی کہ جب ہچکیاں بولتی ہیں تو الفاظ گنگ ہو جاتے ہیں۔ اسے نہیں معلوم کہ وہ کتنی دیر تک بہن کے گلے لگ کر روتی رہی اور شیزا کا دل اندیشوں کا مسکن بنا رہا اس سے ویرا کے دل میں ایک ہی خیال اس کے ساتھ آنسو بہا رہا تھا کہ وہ بہن کو کیسے بتائے کہ جب معذوری محبت کے آڑے آتی ہے تو دل میں برپا ہونے والی قیامت کا شور سننے کے لیئے قوتِ سماعت کا ہونا بھی لازمی نہیں ہوتا۔۔۔ صرف وہی حقیقت نہیں ہوتی جو سنائی یا دکھائی دے۔۔۔ شاخ سے پھول اور سینے میں دل ٹوٹنے کی آواز نہیں آتی لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ خسارہ نہیں ہوا!!

صبح جب اس کی آنکھ کھلی تو شیزا اس کے قریب بیٹھی ہوئی تھی شیزا نے اس کے گال پہ بوسہ دیا لیکن کوئی بات نہیں کی۔ ویرا بھی خاموشی سے تیار ہونے لگی سامان پیک پڑا تھا۔۔ اچانک دروازہ پر دستک ہوئی 'شاید ماجد ہوگا' شیزا نے یہ کہتے ہوئے دروازہ کھولا تو باہر روم سروس کا آدمی تھا اس نے آدمی کو کچھ دیر بعد آنے کو کہا اور واپس بیڈ پر آ کر بیٹھ گئی۔

ماجد کا نام سن کر ویرا پر اُداسی ایک مرتبہ پھر حملہ آور ہو گئی اس نے بہن کے قریب جا کر آہستہ سے کہا۔

"ماجد اب یہاں کبھی نہیں آئے گا۔" ضبط کے باوجود بھی اس کی آنکھوں میں نم اتر آیا۔

شیزا نے استفہامیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا اس کی آنکھوں سے لگ رہا تھا کہ اس نے ساری رات اس کے سرہانے جاگ کر گزاری تھی۔

"کیا بات ہے ویرا مجھے بتاؤ"

"باجی۔۔۔ وہ۔۔۔ محبت کا آغاز ہونٹوں پہ ہونٹ رکھ کر کرنا چاہتا تھا" اس کی آواز شدتِ جذبات سے رندھ گئی شیزا کا چہرہ موم کی طرح سفید ہو گیا اور احساسِ جرم الگ سے در آیا کہ اس کی نگاہیں ماجد کو جاننے میں دھوکہ کھا چکی تھیں۔

"باجی اس نے اپنے ہونٹوں پر محبت کا بہت خوبصورت جال بُنا ہوا تھا جس کا ایک تار میری نگاہوں سے بندھا مجھے اپنی اور کھینچتا چلا گیا۔ میں اس کے ہونٹوں سے محبت کے پُر فریب لفظ چنتی رہی تھی' ویرا نے گویا اپنی حماقت کا اعتراف کیا۔

''ہاں باجی۔۔اور پھر کل شام میں نے اس کا لہجہ سنا اور اُس تار کو وہیں توڑ کر واپس لوٹ گئی''

شیزا نے یوں اطمینان کا سانس لیا جیسے جسم میں اب جان لوٹ کر آئی ہو اس نے ویرا کو اپنی بانہوں میں سمیٹ لیا۔

'باجی ۔۔ یہ لوگ کیوں نہیں مانتے کہ ہم محرومیوں میں گھرے لوگ بھی انسان ہوتے ہیں ہمارے سینے میں بھی کانچ کا دل ہوتا ہے۔۔ ہمیں بھی درد ہوتا ہے تکلیف ہوتی ہے۔۔ ہمارے اندر بھی جذبات ہوتے ہیں ہم لوگ بھی تمام عمر کسی سے نباہ کر سکتے ہیں، محبت کر سکتے ہیں ۔۔ ہم کیوں ان کی نگاہوں میں فقط ایک معذور جسم ہوتے ہیں ۔۔ قابلِ نفرت ہوتے ہیں۔۔ خود غرض ہوتے ہیں۔۔۔ اپاہج ہوتے ہیں۔۔ کیوں باجی آخر کیوں!!'

دونوں بہنیں ایک دوسرے سے لپٹ کر سسکیوں اور آہوں میں ڈوب گئیں۔

......☆......☆......

جب تنہائی سے ہماری روح کا دم گھٹنے لگتا ہے تب ہماری روح فرار کا رستہ ڈھونڈتی ہے۔ ایسا رستہ جس پر چلتے ہوئے منزل پر پہنچ کر اسے راحت اور تحفظ کا احساس ہو سکے اور یہ احساس ہماری روحوں کو محبت فراہم کرتی ہے۔ جب ایک روح دوسری روح میں مدغم ہو کر اچانک آزاد ہو جاتی ہے تو تنہائی باقی نہیں رہتی۔ وجود کی کھڑکی کھلتی ہے اور باہر سے محبت کی سنہری دھوپ اندر داخل ہو کر نیم مردہ خواہشات کو دوبارہ زندہ کر کے ان پر وجد طاری کر دیتی ہے۔ یکا یک چاروں سمت پرنور اجالے پھیل جاتے ہیں اندھیرا باقی نہیں رہتا لیکن بہت کم لوگ اس تجربہ سے گزرتے ہیں ایسا حقیقی محبت کے متلاشی لوگوں کے ساتھ ہوتا ہے بصورت دیگر عام طور پر جنسی خواہش کے نقطۂ عروج پر پہنچ کر ہی نوجوان ایک دوسرے کو 'آئی لو یو' کہتے ہیں اور خواہش کی تکمیل کے لمحہ بھر بعد ہی ایک دوسرے کے لیے محبت، پسندیدگی، چاہت کا خفیف سا احساس بھی محسوس نہیں کرتے۔ جنسی خواہشات سے تعمیر کردہ محبت دیرپا نہیں ہوتی۔ جونہی ہاتھ سے ہاتھ چھوٹتا ہے محبت بوسیدہ عمارت کی مانند زمین بوس ہو جاتی ہے۔ ہوس زدہ محبت کے اسیر ایک لمحہ کے لیئے بھلا دیتے ہیں کہ وہ کون ہیں؟ اپنی ذات اور مذہب کی راہیں کھو دیتے ہیں، زمان و مکان میں گم ہو جاتے ہیں، اپنے آپ میں نہیں رہتے، بے خود اور خود سر ہو جاتے ہیں، کائنات کے ساتھ ہم آہنگ ہو جاتے ہیں لیکن۔۔ محض چند لمحوں کے لیے۔۔۔ کچھ ایسی ہی محبت ماجد کو ویرا سے ہوئی تھی!

......☆......☆......

عشق کی پہلی بارش

غفران اپنی لڑکھڑاتی ٹانگوں پر باپ اور بھائی کا سہارا لیے بمشکل قدم اٹھاتا کمرے میں داخل ہوا۔

ڈاکٹر قدرت علی جو پہلے سے ہی کمرے میں موجود تھا۔ ایک طرف کھڑا ہو کر اس کا بغور جائزہ لینے لگا، جب اسے پلنگ پر بٹھا دیا گیا تو ڈاکٹر مسکراتے ہوئے اس کے بالکل سامنے کرسی پر بیٹھ کر گویا ہوا۔

''مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی ہے کہ تم ابھی تک چل پھر رہے ہو، سہارے لے کر ہی سہی لیکن ہمت نہیں ہاری۔''

غفران نے خاموشی سے سر ہلانے پر اکتفا کیا لیکن اس کے بھائی نے ڈاکٹر کو مخاطب کیا۔

''ڈاکٹر صاحب اتنا عرصہ گزر گیا کوئی بہتری نظر نہیں آ رہی، پہلے یہ دیواروں کا سہارا لے کر چلتا تھا اس کے بعد ایک شخص کے سہارے کے ساتھ اور اب تو دو افراد کا سہارا اسے درکار ہوتا ہے، آخر اسے ہوا کیا ہے؟ یہ کیا بیماری ہے جو اچانک نمودار ہو کر نہ دواؤں سے ٹھیک ہو رہی ہے اور نہ ہی دعاؤں سے۔''

غفران کا باپ اپنے ناتواں کاندھے جھکائے ایک کونے میں مغموم کھڑا تھا۔

ڈاکٹر نے تیزی سے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

''خبردار! جو یہاں کسی نے بھی مایوسی کی باتیں کیں، کون اپنی مرضی سے بیمار ہوتا ہے؟ تمام بیماریاں منجانب اللہ ہوتی ہیں اور کیا تم لوگوں کا اس بات پر ایمان نہیں کہ اس روئے زمین پر کوئی ایسی بیماری نہیں جس کا کوئی علاج نہ ہو، بیماری اتارنے سے پہلے خداوند قدوس اس کا علاج زمین پر اتارتا ہے، بس سمجھ لو کہ بیماری کی مدت یا آزمائش کا عرصہ صرف اور صرف اللہ کو معلوم ہے لیکن انسانوں کو مایوس نہیں ہونا چاہیے۔''

''آپ درست کہتے ہیں لیکن یہ جو ابھی بھی ہم سنتے ہیں کہ فلاں بیماری کا علاج نہیں۔۔ فلاں کو ڈاکٹروں نے لاعلاج قرار دے دیا۔۔ فلاں کو تین ماہ کا وقت بتایا ہے، اس کے بعد وہ مر جائے گا۔۔۔ یہ سب کیا ہے ڈاکٹر صاحب''

غفران کا بھائی شاید بحث کے موڈ میں تھا۔

''ٹھیک کہتے ہو تم'' ڈاکٹر نے اثبات میں سر ہلایا۔

''دراصل یہ بات پتھر پر لکیر جیسی ہے کہ ہر بیماری کا علاج موجود ہے مگر نوع انسانی اس معاملے میں قصوروار ہے کہ وہ تمام بیماریوں کا علاج دریافت کرنے میں ناکام رہی ہے، انسان نے نسلِ انسانی کی ہلاکت کا سامان تیار کرنے میں جتنی محنت کی ہے اگر اس سے آدھی محنت بھی نوع انسانی کی صحت پر کرتی تو آج اول تو یہ نت نئی بیماریاں جنم ہی نہ لیتیں اور۔۔ دوئم کوئی بیماری لا علاج نہیں ہوتی، ہمارے ملک کی مثال لے لو ہم نے دفاع کا بجٹ کتنا رکھا ہے اور صحت کا کتنا ہے اور پھر صحت میں بھی تحقیقات کے لیے کتنا مختص ہے؟۔۔ یاد رکھو کہ خدائے غفور و رحیم انسانوں سے بے پناہ محبت کرتا ہے انسان تو خود اپنی ہلاکت کے در پے ہے۔''

'آپ سو فیصد درست کہہ رہے ہیں ڈاکٹر صاحب''

اس بار غفران کے باپ نے مداخلت کی اور اس مداخلت کا مقصد اس بحث کو انجام دینا تھا۔

''اب آپ دونوں حضرات کمرے سے باہر تشریف لے جایئے میں ذرا اس بہادر لڑکے سے دو دو ہاتھ کر لوں۔'' ڈاکٹر نے مسکرا کر غفران کی طرف دیکھا تو اس کے لبوں پر بے جان سی مسکراہٹ ابھر کر غائب ہو گئی۔

اب کمرے میں دونوں کے سوا اور کوئی تیسرا فرد نہیں۔ وہ اپنے پلنگ پر ٹانگیں لٹکائے ایک گول تکیے سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا، پلنگ کے ساتھ بائیں جانب ایک چھوٹی الماری ادبی کتابوں سے کھچا کھچ بھری ہوئی تھی، دائیں طرف کمرے کا دروازہ اور سامنے کی جانب چار گز کے فاصلے پر باہری کھڑکی تھی جو کہ گھر کے برآمدہ میں کھلتی تھی کمرہ روشن اور ہوادار تھا

ڈاکٹر، دوا، بیماری، تسلیاں، پیروں فقیروں کے تعویز دم یہ سب غفران کی زندگی کا حصہ بن چکے تھے۔

قدرت علی شہر کا مشہور ڈاکٹر تھا اس کا طریقہ علاج عام ڈاکٹرز سے یکسر ہٹ کر تھا، وہ صرف مشکل سے مشکل ترین کیسز اپنے ہاتھ میں لیتا اور مایوس مریضوں کو امید کا ٹانک دے کر شفایاب کر دیتا غفران کا کیس بھی انہی میں سے ایک تھا۔

ڈاکٹر نے اپنے ہاتھ کی چھوٹی انگلی سے آہستہ سے اپنا سلیٹی گھنگریالے بالوں والا سر کھجاتے ہوئے اسے مخاطب کیا۔

''دوست میں کافی عرصہ سے تمہارا علاج کر رہا ہوں یوں کہہ لو کہ علاج کرنے کی کوشش کر رہا ہوں لیکن کوئی افاقہ نہیں ہو رہا، کیا میں ٹھیک کہہ رہا ہوں۔''

غفران نے ایک گہرا سانس لیا۔ ''بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں آپ۔۔ پتہ نہیں ڈاکٹر صاحب، میں عجیب کوفت اور چڑچڑے پن کا شکار ہو گیا ہوں سمجھ میں نہیں آتا کیوں یہ سب میرے ساتھ ہو رہا ہے حالانکہ بظاہر گھر کا ماحول اور سب کے رویے بھی میرے ساتھ نارمل ہیں اس کے باوجود آخر کیوں مجھے سکون نہیں مل رہا''

ڈاکٹر گہری سوچ میں ڈوب گیا اور کچھ توقف کے بعد گویا ہوا۔

''میں نے جو ورزشیں بتائی تھیں باقاعدگی سے کر رہے ہو''

''جی کرتا ہوں لیکن اس سے تھکان ہو جاتی ہے جسم بوجھل سا محسوس ہونے لگتا ہے۔''

''اچھا۔''

''لیکن شاید یہ انہی ورزشوں کا نتیجہ ہے کہ میں ابھی تک بے شک سہاروں کی مدد سے ہی لیکن اپنی ٹانگوں پر چل لیتا ہوں وہیل چیئر کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔''

''ورزش کرتے رہنا اسے چھوڑنا مت، میں جانتا ہوں کہ تم میں قوت ارادی بہت زیادہ ہے اور اسی قوت کی وجہ سے تم ایک دن ضرور انشاء اللہ شفایاب ہو جاؤ گے۔''

''جی۔۔ نہیں چھوڑوں گا''

دونوں خاموش ہو گئے۔

''اچھا، ایک بات بتاؤ۔'' ڈاکٹر نے اپنا چشمہ اتار کر ہاتھ میں تھام لیا۔

''جی''

”تمہاری اس بیماری کو تقریباً دو سال کا عرصہ ہوگیا ہے اور مجھے تمہارا علاج کرتے ہوئے تقریباً نو ماہ کا عرصہ بیت چکا ہے اس دوران دل میں کبھی خودکشی کرنے کا خیال آیا؟“

اسے ڈاکٹر کا سوال بہت عجیب معلوم ہوا۔

”نہیں تو، کبھی بھی نہیں، خودکشی تو مایوس لوگ کرتے ہیں۔ میں تو بس یوں ہی کبھی کبھی اس بیماری سے تنگ آ کر خدا سے چند شکوے کر کے خاموش ہو جاتا ہوں اور بعد میں پشیمان ہو کر معافیاں بھی مانگ لیتا ہوں، انسان ہوں ناں، اس لیے بعض اوقات شیطان بہکانے میں کامیاب ہو جاتا ہے“

”اچھا تو خدا سے کس قسم کے شکوے ہوتے ہیں، ہم بھی تو سنیں“

وہ یکدم جوش سے بولا۔

”میں ہی کیوں؟۔۔ میں ہی اس بیماری کے لیے کیوں چنا گیا، دنیا کی اتنی آبادی میں سے میں ہی کیوں معذور بنا دیا گیا اگر یہ آزمائش ہے تو پھر مجھ پر ہی کیوں نازل ہوئی، نہ میں کوئی ولی، نہ پیغمبر، نہ نبی، نہ ہی کوئی برگزیدہ بندہ، نہ پارسائی کا دعویدار نہ کوئی زاہد و عابد۔۔ اور اگر یہ سزا ہے تو کیا میں ہی اس دنیا کا سب سے بڑا گناہگار ہوں؟ کیا باقی تمام لوگ بے گناہ ہیں، پارسا ہیں، نیکوکار ہیں، فرشتہ صفت ہیں؟؟؟ اگر سب خطاکار ہیں تو پھر ساری دنیا میری طرح معذور کیوں نہیں کر دی جاتی۔۔ کیوں؟‘ وہ جذبات کی رو میں بہتا چلا گیا۔

”اچھا تو یہ بات ہے لیکن میری لغت میں تو معذوری کا مطلب Unique life style ہے یعنی منفرد طرز زندگی۔۔ جیسا کہ ہر انسان کا طرز زندگی دوسرے سے الگ ہوتا ہے مثلاً کوئی آدمی سائیکل پر دفتر جاتا ہے کوئی موٹر سائیکل پر، کوئی گاڑی پر اور کوئی پیدل۔۔ اسی طرح میں نے بہت سے معذور افراد دیکھے ہیں جو کہ ٹرائی سائیکل، بیساکھیوں یا خودکار وہیل چیئرز پر درسگاہوں، دفتروں اور دکانوں کی جانب رواں دواں ہوتے ہیں، تمام لوگ اگر عام کرسی پر بیٹھ کر کمپیوٹر کا کام کرتے ہیں تو فرق اتنا سا ہے کہ معذور فرد وہیل چیئر پر بیٹھ کر کمپیوٹر کو اسی طرح آپریٹ کرتا ہے۔۔ یہ اس کا لائف سٹائل ہے اور اسی طرح روز مرہ زندگی سے ہم سیکڑوں مثالیں دے سکتے ہیں“

”محتاج لوگوں کے المیے کو آپ اتنی آسانی سے بیان کر کے ان کی تکالیف کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔“

”کیا تکالیف تمہارے خیال میں معذور افراد ہی کو عطیہ ہوتی ہیں؟ کیا اس آدمی کی تکلیف کا تم اندازہ لگا سکتے ہو جو کئی شوگر ملز کا مالک ہے لیکن شوگر کے مرض میں مبتلا ہونے کی وجہ سے میٹھی اشیاء کو چھو بھی نہیں سکتا۔۔ یا وہ لوگ جنہیں خدا نے بے انتہا دولت سے نوازا ہے لیکن سکون کی نعمت سے محروم کر رکھا ہے یا وہ غربت کے ستائے لوگ جو پیسوں کے حصول کے لیے کبھی اپنے گردے اور کبھی اپنے بچے بیچ دیتے ہیں۔۔ دوست، انسان کی زندگی میں تکالیف آتی جاتی رہتی ہیں، سب کی تکالیف جدا ہوتی ہیں لیکن تکالیف کو صرف معذوری کے ساتھ منتھی کرنا حماقت ہے۔“

غفران خاموش ہوگیا

ڈاکٹر نے مسکراتے ہوئے اسے مخاطب کیا۔

”میں نے آج تک تم سے کبھی معذوری پر بحث نہیں کی، جانتے ہو کیوں؟‘

”نہیں“

”کیونکہ میں تمہیں معذور نہیں سمجھتا بلکہ کسی معذور کو بھی معذور تصور نہیں کرتا اور اس کی وجہ میں تمہیں بتا چکا ہوں“

”پھر آج آپ کو ان سب باتوں کا کیسے خیال آ گیا۔“ اس نے تیز نظروں سے ڈاکٹر کی طرف دیکھا۔

”آج۔۔“ ڈاکٹر نے کچھ سوچتے ہوئے نفی میں سر ہلایا۔

”خیر چھوڑو اچھا یہ بتاؤ ایم۔اے میں تمہاری کونسی ڈویژن آئی تھی‘

اسے ڈاکٹر کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں لگ رہی تھی

’فرسٹ ڈویژن تھی‘ اس کی نگاہیں بدستور ڈاکٹر کے چہرے کو پڑھنے کی کوشش کر رہی تھیں۔

"excelent ویسے یونیورسٹی کا دور شاید اسکول کے دور سے بھی زیادہ خوبصورت ہوتا ہے، انسان کا maturity level اس قابل ہو جاتا ہے کہ ہر گزرتے ہوئے لمحے کو خوشگوار بنا دے، ناقابل فراموش۔۔ کیوں ایسا ہی ہے ناں؟“

”سر جو آپ پوچھنا چاہ رہے ہیں پوچھ کیوں نہیں لیتے۔“ اس بار اس کا لہجہ بالکل سپاٹ تھا

”جواب دے پاؤ گے؟“

”یہ تو سوال پر منحصر ہے“

”محبت کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے۔“ ڈاکٹر نے اطمینان سے سوال کیا۔

وہ چند لمحے خاموش رہا۔

”میں آپ کی بات کا مطلب نہیں سمجھا، آپ کیا پوچھنا چاہ رہے ہیں“

”میں جاننا چاہ رہا ہوں کہ تمہاری زندگی میں محبت کی اہمیت کتنی ہے، تمہارے خیال میں محبت کتنی طاقت ور ہوتی ہے؟ یقیناً تمہیں میرے سوال بہت عجیب محسوس ہو رہے ہونگے لیکن آج پتہ نہیں کیوں مجھے ایک نوجوان قلمکار سے کچھ اس کی ذاتی زندگی کے بارے میں جاننے کو بھی چاہ رہا ہے“

”زندگی میں محبت کی ضرورت سانس لینے جیسی ہے اور محبت کی طاقت یہ ہے کہ اس سے موت بھی چھپتی پھرتی ہے، اسکے علاوہ میں اور کچھ نہیں کہنا چاہوں گا، سر“

ڈاکٹر کی آنکھیں مسکرا اٹھیں ”تمہیں بھی ایسی ہی سانس لینے جیسی محبت کی ضرورت ہے، جو تمہارے اندر نیم مردہ زندگی کو زندہ کرے اور اس زندگی میں خود اعتمادی شامل ہو کیونکہ خود اعتمادی کے بغیر انسان کبھی اپنی منزل تک نہیں پہنچ سکتا۔۔ اور کبھی کبھی محبت انسان پر اس قدر حاوی ہو جاتی ہے کہ وہ قریب المرگ ہو جاتا ہے“

اس نے سر جھکا کر آنکھیں بند کر لیں کمرے میں خاموشی چھا گئی

”کیا تم بھی ایسی ہی محبت کا شکار ہو؟۔۔ وہ محبت جو قریب المرگ کر دیتی ہے۔“ ڈاکٹر نے دھیمی آواز میں استفسار کیا۔

غفران نے کوئی جواب نہ دیا اس کی آنکھیں ہنوز بند تھیں۔

”میرا مقصد تمہیں تکلیف پہنچانا نہیں ہے بس دوران علاج تم سے میں ایک بہت ضروری بات پوچھنا بھول گیا تھا جو مجھے تمہارے ایک کزن سے تھوڑی سی پتہ چلی تو میں نے اپنی خوب سرزنش کی۔“ ایک معنی خیز مسکراہٹ ڈاکٹر کے لبوں پر کھیلنے لگی۔

اس نے آنکھیں کھول لیں لیکن خاموش رہا

”دوست، ہر انسان اپنا ماضی رکھتا ہے فرق صرف اتنا ہے کہ کچھ ماضی کے ساتھ جڑے رہ جاتے ہیں اور کچھ اسے فراموش کر دیتے ہیں بولو میں ٹھیک کہہ رہا ہوں“

وہ چپ رہا تو ڈاکٹر نے قدرے اونچی آواز میں کہا۔

”غفران، میں تم سے مخاطب ہوں، جواب دو“

”میں آپ کی بات سمجھ نہیں پا رہا، آج پتہ نہیں آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں‘ اس نے سر اٹھا کر بیزاری سے ڈاکٹر کی طرف دیکھا

”اور مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ تم سمجھنا نہیں چاہ رہے۔“

ایک مرتبہ پھر اس کی آنکھیں جھک گئیں

”دیکھو دوست، میں تمہارا معالج ہوں، کم از کم تم مجھ سے کوئی بات نہ چھپاؤ ورنہ تمہارا علاج نہیں ہو پائے گا۔“

غفران پر خاموشی طاری تھی۔

ڈاکٹر نے کرسی پر اپنی پشت درست کرتے ہوئے کہا۔

”اچھا چلو، میں تم سے ایک سوال پوچھتا ہوں تم بس مجھے اسکا جواب دیدو۔“

کچھ توقف کے بعد اس نے اپنے نیم جھکے ہوئے سر کو آہستہ سے اثبات میں ہلایا۔

”زرمین کون تھی؟“

ڈاکٹر کا سوال سن کر اسے ایسا محسوس ہوا جیسے دل پر تیز دھار کی چھری چلی ہو انسان بارش کے پانی سے ہونے والی تباہ کاریوں سے خود کو محفوظ تو رکھ سکتا ہے لیکن بارش کو آسمان سے برسنے سے روک نہیں سکتا اسی طرح انسان اپنے غم کے خلاف تو لڑ سکتا ہے لیکن لوگوں کے تحفظات اور سوالات پر روک نہیں لگا سکتا، ان کی زبانوں پر تالے لگانے سے قاصر ہوتا ہے

غفران کے زخمی دل سے نکلنے والے آنسو آہستہ آہستہ اس کی جھکی ہوئی پلکوں سے رسنے لگے۔ ڈاکٹر اس

کے ماضی کے ساتھ بندھی ہوئی کسی پرانی رفاقت کی گرہ کھولنے کی کوشش کرر ہا تھا، ڈاکٹر کو پہلے تو شک تھا کہ اس کی اس پراسرار بیماری کا سرا ضرور اس کے ماضی سے کہیں جاملتا ہے اور اب یوں اسے روتا دیکھ کر اس کا شک کچھ کچھ یقین میں بدل چکا تھا۔

ڈاکٹر اپنی نشست سے اٹھا اور اس کے پاس پلنگ پر بیٹھ کر اسے دلاسا دینے لگا ''زندگی کو جینے کے لیے پرانی رفاقتوں سے رخصت لے لینا ہی بہتر ہوتا ہے، دوست''

اس کے آنسو بہتے چلے جار ہے تھے

''کیا کروں کہ میں اپنے پیشے کے ہاتھوں مجبور ہوں، میرا تمھاری اس رفاقت کے بارے میں جاننا بہت ضروری ہے''

''میں بھی مجبور ہوں'' اس کی رندھی ہوئی آواز حلق سے ابھری

''میں اس بارے میں کوئی بات نہیں کرنا چاہتا''

ڈاکٹر خاموش ہو گیا اور اس کی حالت پر غور کرتے ہوئے کچھ توقف کے بعد بولا۔

''ٹھیک ہے جیسے تمھاری مرضی' اس کا لہجہ فیصلہ کن تھا 'میں باہر جا کر تمہارے گھر والوں کو بتا دیتا ہوں کہ تم ساری عمر محتاجی کی زندگی گزارنا چاہتے ہو، اس کی پروا کیے بغیر کہ تمہاری حالت کو دیکھ دیکھ کر تم سے پیار کرنے والوں کے دل پر کیا آفت گزرتی ہے۔''

''آپ میرا علاج کریں، آپ کو میرے ماضی سے کیا واسطہ' اس نے بھیگی آنکھوں سے ڈاکٹر کو دیکھا۔''

''واسطہ ہے اور کیسے نہ ہو کہ جب تم اپنے حال اور مستقبل دونوں کو ماضی کے حوالے کیے بیٹھے ہو۔

''آپ صاف کہہ دیجیے کہ آپ میرا علاج جاری نہیں رکھ سکتے اس خوامخواہ کی بحث سے میرا سر چکرا رہا ہے''

''تم جو جی میں آئے کہہ لو، اب میں یہاں سے ہلنے والا نہیں ہوں۔''

''سر، پلیز۔ کیا آپ یہ چاہتے ہیں کہ میں خودکشی کر لوں؟ تا کہ آپ سب کی جان چھوٹ جائے''

''تمھیں کون زہر لا کر دے گا اور خود تو تم سہاروں کے بنا ایک قدم نہیں چل سکتے۔'' ڈاکٹر کا تلخ لہجہ زہر میں بجھے تیر کی طرح اس کی سماعت میں پیوست ہوا۔

''سر، آپ خواہ مخواہ میرا دماغ خراب کرنے کی کوشش مت کریں؟'' میں کوئی بچہ نہیں ہوں جسے آپ جذباتی کرنے کی کوشش کرر ہے ہیں۔

''تم میرے کلائنٹ ہو اور میں اپنے کلائنٹ کو اپنا دوست سمجھتا ہوں اس بات سے قطع نظر کہ اس کی عمر کیا ہے۔''

''مجھے آپ کی ہمدردی کی ضرورت نہیں ہے اس کے لیے میرے گھر والے کافی ہیں۔''

''تمہارے گھر والے؟ تمہارے محتاج جسم کے سہارے؟ واہ بہت خوب۔''

''ہاں! ہاں! میری معذوری کے سہارے، بس۔''

وہ قریباً چیخ اٹھا لیکن اسے حیرت اس بات کی تھی کہ اس کی آواز سن کر گھر میں سے کوئی بھی اس کے کمرے میں خیریت دریافت کرنے نہیں آیا حالانکہ اس کی ماں تو ہلکی سی کھانسی کرنے پر بھی اس کے کمرے میں بھاگی چلی آتی تھی۔

''مجھے بتاؤ۔ یہ سہارے کب تک تمہارے ساتھ رہیں گے، آخر کب تک؟' ڈاکٹر نے اطمینان سے اپنی ٹانگ پر ٹانگ چڑھاتے ہوئے استفسار کیا۔

''جب تک خدا کو منظور ہوا اور اس کے بعد جو بھی خدا کا فیصلہ ہوا وہ مجھے منظور ہوگا۔''

''میں جانتا ہوں بطور قلمکار تم لفظوں سے کھیلنا خوب جانتے ہو لیکن۔۔' ڈاکٹر کچھ کہتے کہتے خاموش ہو کر دوبارہ گویا ہوا۔

''تم جانتے ہو کہ ایک دن ایسا بھی آنے والا ہے جب تم پانی پینے سے ڈرو گے۔''

غفران نے منہ پھیر لیا لیکن ڈاکٹر بولتا چلا گیا۔

''تم کھانا کھانے سے گریز کرو گے، کچھ بھی کھانے پینے کا خوف تم میں سرایت کرتا چلا جائے گا۔۔ کیا اس کی وجہ جانتے ہو؟'

اس نے آہستہ سے اپنا چہرہ ڈاکٹر کی طرف گھما کر دیکھا۔

''یہ دنیا بڑی ظالم جگہ ہے دوست، تم جن سہاروں کی بات کرر ہے ہو وہ ہمیشہ تمھارے ساتھ نہیں رہیں گے ۔آج تمھیں باپ اور بھائی کے سہارے میسر ہیں لیکن ایک

دن ایسا بھی آئے گا جب یہی لوگ تھک کر تمھارے بستر پر ربر کی شیٹ بچھا دیا کریں گے، تم پانی پینے سے ڈرو گے، اپنا من پسند کھانا کھانے سے بھی خوف کھاؤ گے کیونکہ رفع حاجت تمہارے لیے مسئلہ بن جائے گا، بار بار بیت الخلاء آنے جانے سے بہتر تم یہی سمجھو گے کہ بھوکا رہا جائے کہ تمھاری غلاظتوں کو صاف کرنے والا کوئی نہیں ہوگا، یہی سہارے تم سے گھن کھا کر تمھارا کام کریں گے، تم خود اپنے آپ سے بیزار ہو جاؤ گے، میرے پاس ایسے کئی مریض آئے اور گئے، میں جانتا ہوں کہ زندگی کتنی تکلیف دہ ہو جاتی ہے۔

غفران نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ ڈھانپ کر سر جھکا لیا

''تمہارے بوڑھے باپ کو اس وقت تمہارے جوان کاندھوں کی ضرورت ہے لیکن وہ اس ضعیف العمری میں بھی تمہارے بیمار جسم کا بوجھ ڈھو رہا ہے اور تم ہو کہ ماضی میں گم اپنے حال کا بوجھ اس پر لادے جار ہے ہو تمھیں اپنی مستقبل کی فکر نہ سہی لیکن تمہارے ماں باپ کی نیندیں بس یہی سوچ سوچ کر ختم ہو چکی ہیں کہ ان کے بعد تمہارا کیا ہوگا ؟۔۔تم ان کے لیے کچھ کر نہیں سکتے لیکن کم از کم احساس تو کر سکتے ہو۔'' ڈاکٹر اسے اموشنل بلیک میل کرر ہا تھا، یہ جانتے ہوئے بھی کہ بطور قلمکار وہ ان تمام داؤ پیچوں سے واقف ہے۔

اس کے ہونٹوں پر چپ سی لگ گئی۔ ڈاکٹر نے پاس رکھی ہوئی میز سے پانی کا گلاس اٹھایا اور اسے پیش کرتے ہوئے کہا۔

''یہ پانی پیو اور بالکل سکون میں آ کر میری باتوں پر غور کرو۔''

غفران نے ایک ہاتھ سے گلاس پکڑ کر دوسرے ہاتھ سے اپنا سر تھام لیا۔

ڈاکٹر پچھلے نو ماہ سے اس کے علاج میں مصروف تھا لیکن بہتری کی کوئی صورت نظر نہیں آ رہی تھی وہ جانتا تھا کہ میڈیکل سائنس نے اس بیماری کو موروثی کہہ کر لا علاج قرار دے رکھا ہے لیکن اس کے باوجود بھی وہ اس کا علاج کھوجنے میں جتا ہوا تھا اور آج ایک ہلکی سی امید کی کرن ڈاکٹر کو نظر آئی تھی جسے وہ کسی صورت نظر انداز کرنے پر آمادہ نہیں تھا کچھ دیر بعد جب غفران کے آنسو خشک ہو گئے تو اس نے پانی کے دو گھونٹ حلق میں اتار کر گلاس ڈاکٹر کو تھما دیا

''دوست میں وعدہ کرتا ہوں کہ تم جو کچھ مجھے بتاؤ گے وہ تمہاری زبان سے نکل کر میرے سینے میں دفن ہو جائے گا۔'' ڈاکٹر نے اسے اعتماد میں لینے کی کوشش کی تا کہ وہ ماضی کا بوجھ اپنے سینے سے اتار پھینکے، جس کا اسے بے صبری سے انتظار تھا۔

اس نے گہرا سانس لیا اور سنبھل کر کہا۔

''اگر ایک زخم کرید کر دوسرا زخم بھرنا ہی آپ کا مقصد ہے تو کسی وعدے کی کوئی ضرورت نہیں'

'تم خود سوچو، ایک تمہاری آنکھوں کے آنسو خشک ہونے کے ساتھ ہی تمہارے پیاروں کی آنکھوں کو بھی سکون مل جائے گا، اپنی محبت کی نعش سے نگاہیں اٹھاؤ گے تو تمھیں اپنے گھر میں چلتی پھرتی لاشیں نظر آئیں گی جنھیں تمہارے غم نے مار رکھا ہے، کیا محبت کسی فرد واحد میں سمٹی ہوئی ایک شے کا نام ہے، تم ادب شناس آدمی ہو بھلا تم سے زیادہ محبت کے مفہوم کو کون سمجھے گا'

غفران کا چہرہ ایک بار پھر دھند میں گم ہو گیا اس نے گہرے دکھ کے ساتھ اثبات میں سر ہلایا اور پھر پلنگ کے ساتھ ایستادہ الماری کے نچلے خانے میں سے کتابوں تلے دبی ہوئی ایک فائل بمشکل نکالی اور اس فائل میں سے کاغذوں کا ایک باریک سا پلندہ نکال کر ڈاکٹر کی طرف بڑھا دیا۔

''یہ کیا ہے۔'' ڈاکٹر اس کے ہاتھ سے پلندہ لے کر کاغذوں کو الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔

''نرمین'' اس کی آواز میں بلا کا درد تھا' یہ میری اور اس کی کہانی ہے، اس کا کوئی کردار فرضی نہیں ہے کوئی بات من گھڑت نہیں ہے ایک ایک حرف سچ پر مبنی ہے، سراسر حقیقت۔''

ڈاکٹر نے آہستہ سے سر کو جنبش دی

''سر، خدا کی قسم مجھ میں اتنی ہمت نہیں کہ میں آپ سے نرمین کا ذکر اپنی زبان سے کروں مجھے ایسا لگتا ہے کہ اگر میں یہ کہانی بیان کرنے لگوں گا تو بیچ کہانی کے ہی مر جاؤں گا لیکن میں مرنا نہیں چاہتا اس کی وجہ آپ کو اس کہانی

کو پڑھ کر معلوم ہو جائے گی ورنہ میرے لیے خودکشی کرنا بہت آسان ہے اور خودکشی کرنے کے لیئے صرف زہر ہی کارگر نہیں، اس کے لیے تو ہجر کے لمحات کو تواتر سے یاد کر لینا ہی کافی ہے کہ دل میں غم برداشت کرنے کی ایک حد مقرر ہے غم حد پھلانگ جائے تو جسم وہیں رہ جاتا اور روح غم کی ساتھ پرواز کر جاتی ہے۔

''میرا مقصد تمہارا علاج کرنے کے سوا اور کچھ بھی نہیں ہے میں ایک پیشہ ور انسان ہوں اور مجھے اپنے پیشے سے جنون کی حد تک محبت ہے اور میں اس محبت کے تقاضوں کو پورا کرنے پر مامور ہوں، میں امید کرتا ہوں کہ تم یونہی میری مدد کرتے رہو گے تا کہ مجھے اپنے مقصد میں کامیابی اور تمہیں شفایابی نصیب ہو''

غفران نے آرام سے گاؤ تکیے سے پشت لگا کر آنکھیں موند لیں ایک مرتبہ پھر اس کی پلکیں جھپکنے لگیں۔ اس سمے اسکی حالت دیکھ کر ڈاکٹر کو کچھ کچھ اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ کس کرب سے گزر رہا ہے!

......☆......☆......

ڈاکٹر نے اپنے گھر کے اسٹڈی روم میں غفران کی دی ہوئی کہانی پڑھنے کا آغاز کیا۔

وہ اپریل کے دن تھے۔

نہایت ہی دل پھینک قسم کا موسم تھا نیلگوں آسمان میں سورج کے رس گلے سے نرم دھوپ کی چاشنی ٹپکتی تھی۔ قریب نو بجے کا وقت تھا میں نے نرمین کو یونیورسٹی لان میں گھنے درخت تلے بیٹھا دیکھا تو یونہی دل میں خیال آیا کہ یہ اپنے اردگرد سے بے خبر گم صم سی گوری خوبصورت، بڑی بڑی غزال آنکھوں، ریشمی بالوں، سراپا نازک حسین لڑکی جس کے پاس وہ سب کچھ تھا جسے مصور کینوس پر پینٹ کر کے ایک مرتبہ پھر لیونارڈو ڈاونچی بن سکتا ہے، کتنے سکون سے بیٹھی ہوئی ہے۔

ہمارا نیا نیا ایم اے ایک ماہ پرانا ہو چکا تھا۔ کلاس میں لڑکے کم اور لڑکیوں کی تعداد زیادہ تھی۔

معلوم نہیں یہ موسم کی شرارت تھی یا کوئی فسوں تھا کہ میں نے یہ سوچ کر اسے دور سے عنابی گلابوں کی جھاڑ کے پاس سے گذرتے ہوئے ہاتھ ہلایا کہ اگر وہ جواباً مسکرا دی تو ڈیپارٹمنٹ کی جانب اُٹھتے ہوئے قدموں کو موڑ کر اداس آنکھوں اور مسکراتے لبوں والی مونا لیزا کو انتہائی قریب سے دیکھنے اور بات کرنے کا موقع ہرگز نہیں گنواؤں گا۔

نرمین نے میرے ہاتھ ہلانے سے پہلے ہی مجھے آواز دے کر اپنے پاس بلا لیا، میں تیز تیز قدم اُٹھاتا اس کے پاس آ پہنچا۔

''شکر ہے تم آ گئے۔'' نرمین نے اپنا دوپٹہ دھوپ سے بچنے کے لئے سر پر آگے تک کھینچ رکھا تھا

مونا لیزا بالکل میرے سامنے بیٹھی تھی گزشتہ ایک ماہ میں یہ پہلی بار تھی کہ میں نے اُسے اپنے سامنے اتنا قریب سے دیکھا تھا۔ وہ غضب کی خاموش لڑکی تھی۔ دھیمے دھیمے مسکراتے ہوئے باتیں کرنے والی۔۔۔ اپنی اجلی آنکھوں کو زیادہ تر پلکوں کے پردوں سے ڈھانپ کر رکھنے والی شرمو کل سی لڑکی!!

''میں تو روز آتا ہوں۔ ''میں نے مذاقاً کہا'' آج ایسی کیا خاص بات ہو گئی۔''

نرمین نے دھیما سے مسکراتے ہوئے کہا۔

''تم ہنسو گے تو نہیں؟۔۔۔ اور نہ کسی کو بتاؤ گے۔''

چونکہ میں نے بہت سی رومانوی فلمیں دیکھ رکھی تھیں اس لئے مجھے کچھ کچھ اندازہ ہو رہا تھا کہ اب یہ کیا کہنے والی ہے شاید مجھے پسند کرنے لگی تھی۔ ''نہیں ہنستا اور نہیں بتاتا کسی کو۔۔۔ اب بولو''

''وعدہ؟'' اس نے میری آنکھوں میں یوں دیکھا جیسے ابھی میری زندگی مانگ لے گی میں نے سر ہلاتے ہوئے حلف لینے کے انداز میں ہاتھ اُٹھا کر کہا۔ ''وعدہ۔ پکا وعدہ''

''بات یہ ہے کہ ۔۔۔۔'' اس نے اِدھر اُدھر آنکھیں گھماتے ہوئے کہا۔ ''میں ابھی تھوڑی دیر پہلے کلاس روم میں داخل ہوئی تو دیکھا وہ لال لال آنکھوں والا ہارون تنہا کلاس میں بیٹھا ہوا تھا۔۔۔ او خدایا میں اتنا ڈر گئی اور کلاس روم کے دروازے سے واپس آ کر یہاں بیٹھ گئی میرا ڈرائیور پوچھ پوچھ تھک گیا کہ آخر ہوا کیا ہے لیکن میں نے اُسے کچھ نہیں بتایا۔ کیا بتاتی؟'' اس نے معصوم انداز میں پلکیں جھپکتے ہوئے بات مکمل کی اور مجھ سے رہا نہ گیا میں نے ایک زوردار قہقہہ لگایا۔

''معافی چاہتا ہوں لیکن تم نے بات ہی ایسی کی ہے

لال لال آنکھوں والا ہارون۔'' میں اپنے وعدے کے بر خلاف ہنستا چلا گیا۔

''تم نہیں سمجھو گے کہ اُس وقت میری کیا حالت ہوئی تھی'' اُس نے بُرا سا منہ بناتے ہوئے کہا۔

''او ہو، تو تم لائبریری میں دیکھ لیتی شاید باقی ساتھی وہاں بیٹھے ہوں۔'' میں نے اپنی ہنسی پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

''نہیں ہے کوئی کیونکہ ابھی تک پوائنٹ نہیں آئی۔۔۔ دیکھتے نہیں کہ کیمپس کتنا پھیکا پھیکا اور خاموش دکھائی دے رہا ہے'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''ویسے یہ طلبا طالبات کو ڈھونے والی بس کو ''پوائنٹ'' کیوں کہتے ہیں؟'' میں نے جان بوجھ کر بے تکا سوال اٹھایا۔

اُس نے کچھ دیر سوچا اور پھر اپنے کاندھے اچکاتے ہوئے نفی میں سر ہلا دیا۔

''کبھی غور نہیں کیا''

''اچھا ایک بات بتاؤ'' ''میں ابھی اس گفتگو کو خوبصورت بنانے کے موڈ میں تھا لیکن اچانک رنگین پیراہنوں سے بھری ہوئی یونیورسٹی پوائنٹ گیٹ کے اندر داخل ہوتی دکھائی دی جس میں ہماری کلاس کی تمام لڑکیاں آتی جاتی تھیں سوائے نرمین کے۔

اس کا چہرہ یکدم کھل اُٹھا اور میری بات سنی اَن سنی ہو کر رہ گئی

''چلیں؟'' اس نے اپنی نوٹ بک گود میں درست کرتے ہوئے کہا

میں نے جان بوجھ کر بنا اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا'' ہاں چلو'' اور دو قدم آگے چل دیا

''پلیز ہیلپ می۔'' عقب سے اس کی نرم آواز سنائی دی

میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو وہ اپنی وہیل چیئر کے دونوں پہیوں پر ہاتھ رکھے ہوئے میری طرف درخواست گزار نگاہوں سے دیکھ رہی تھی

مجھے اپنی شرارت پر بے انتہا افسوس ہوا اور میں چپ چاپ اس کی وہیل چیئر کو دھکیلتا ہوا آہستہ آہستہ کلاس روم کی طرف چل پڑا'' برا مت منانا میں یونہی تم سے چہل کر رہا تھا۔''

وہ چپ چاپ بیٹھی رہی اور اس کی خاموشی مجھے چبھنے لگی تھی۔

راہداری میں ہمیں دیگر کلاس فیلوز مل گئے حال احوال کے بعد ہم سب ایک ساتھ کلاس روم کی جانب روانہ ہو گئے۔ مجھے اندازہ ہو چکا تھا کہ اسے میری حرکت بہت بری محسوس ہوئی تھی۔۔ شاید اس نے یہ سوچا ہو کہ میں نے اس کی معذوری کا مذاق اُڑانے کی کوشش کی ہے۔۔ میں اپنے ضمیر کے بوجھ تلے دبتا چلا جا رہا تھا

''مجھے اس سے معافی مانگنی چاہیے۔'' پہلے پیریڈ کے دوران میں پیچھے کی رو میں بیٹھ کر اُسے دیکھتا اور یہی سوچتا رہا لیکن سارا دن گزر گیا اور مجھ میں دوبارہ اس کا سامنا کرنے کی ہمت نہیں ہوئی۔

نرمین ایک معذور لڑکی تھی۔

اس کا تعلق معاشرے کے ایک ماڈرن طبقے سے تھا لیکن اس میں تیز طرار ماڈرن لڑکیوں کی طرح ابرو اٹھا کر بات کرنے والی کوئی عادت نہیں تھی۔۔ دورانِ لیکچر لڑکے اور لڑکیوں کے مابین ہونے والے سوال و جواب کی تکرار کو سن کے دھیمے دھیمے مسکرانا اس کا من پسند مشغلہ تھا کھلکھلا کر ہنسنا شاید اُسے آتا ہی نہیں تھا۔ لیے دیے سے رہنے والی معصوم صورت لڑکی جس کا چہرہ کلیسا کی مقدس موم بتیوں کی روشنی سے دمکتا رہتا۔۔ روز بہ روز نہ چاہتے ہوئے بھی میں اس کی سمت کھنچتا چلا جا رہا تھا اتنے مکمل حسن میں معذوری کا ادھوراپن اس کی آنکھوں میں موسم زرد کی مانند ٹھہرا ہوا تھا اور میں اس کی ادھوری ذات کو کھوجنے کا خواہاں تھا، اس کی زندگی کی اداس تصویر میں خوشیوں کے رنگ بھرنے کو جی مچلتا پھر وہ تصویر بھی عام نہیں تھی بلکہ ایسی مسکرا کر فریب دینے والی تصویر کہ جسے دیکھتے ہی انسان کا بلاوجہ اداس ہونے کو جی چاہنے لگے۔۔ فری پیریڈ میں جب تمام کلاس گول دائرے کی صورت میں بیٹھ کر ایک دوسرے کو شعر سنانے کا مقابلہ کرتی تو میرے لب پر خدا سے وقت کو روک لینے کی دعا کپکپانے لگتی کہ انہی لمحات میں مونا لیزا پیرس کے میوزیم میں نہیں بلکہ پینٹنگ سے نکل کر اپنے تمام رنگوں کے ساتھ میرے سامنے بیٹھی ہوتی تھی۔

اداس آنکھوں تلے...... وہی ہونٹ...... وہی مسکراہٹ!

کلاس کی سب سے باتونی لڑکی نرگس تھی اور حیرت کی بات یہ تھی کہ نرگس ہی نرمین کی بہترین سہیلی بن گئی۔ سب کی متفقہ رائے کے مطابق نرگس پورے کلاس کی روح رواں تھی لڑکے بیچارے ویسے ہی بہت کم تعداد میں تھے اس لئے کلاس میں لڑکیوں کی حکمرانی تھی

روزانہ کی طرح آج بھی آخری فری پیریڈ میں تمام کلاس دائرے میں بیٹھی ایک دوسرے کو شعر اور لطیفے سنانے میں مصروف تھی۔ میں نرمین کے بالکل سامنے والی نشست پر براجمان تھا۔ ایک دو مرتبہ جب بے ارادہ اُس کی نگاہیں میری نگاہوں سے ٹکرائیں تو میں نے محسوس کیا جیسے وہ نروس ہوگئی ہے حالانکہ اس سے پہلے بھی میں کئی بار یونہی دائرے میں بیٹھا اُس کی طرف دیکھا کرتا لیکن آج پتہ نہیں کیوں میں بھی احتیاط سے اس کی جانب دیکھ کر نظریں پھیر لیتا۔

اچانک نرگس کی آواز نے مجھے خیالات کے بھنور سے باہر کھینچ نکالا۔ وہ محبت کے عنوان کے تحت لکھی ہوئی اپنی نظم سنانے لگی نظم میں کچھ ایسے پوشیدہ جذبات کی تصویر کشی کی گئی تھی جسے سن کر کسی نے بھی داد دینے کی زحمت نہیں کی بلکہ لڑکے کن اکھیوں سے ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرانے لگے اور لڑکیاں باقاعدہ ایک دوسرے کے کان میں ہنسنے لگیں۔

"تم سب تو ایسے react کر رہے ہو جیسے ابھی ابھی میٹرک سے direct کالج فرسٹ ائیر میں آئے ہو۔" نرگس نے تنک کر کہا۔

"یہ ٹھیک ہے کہ ہم ایم اے کی کلاس میں بیٹھے ہیں لیکن۔" نوید اپنی ہنسی کو بمشکل روکتے ہوئے کچھ کہتے کہتے رکا تو نرگس نے ہاتھ لہراتے ہوئے پوچھا۔

"لیکن کیا؟ بولو بولو"

"لیکن کنٹرول باجی کنٹرول"

قہقہوں سے کلاس روم گونج اٹھا جس میں نرگس کا اپنا قہقہہ بھی شامل تھا۔ میں نے اُس دن نرمین کو پہلی مرتبہ ہونٹوں کے آگے نوٹ بک رکھ کر باقاعدہ ہنستے ہوئے دیکھا ہنستے ہنستے اُس کی آنکھیں نم ہو چکی تھیں اور میرا قہقہہ اس کی آنکھوں میں کہیں گم ہو کر رہ گیا——— بہت دیر تک کلاس کشتِ زعفران بنی رہی اس دوران میں نے فیصلہ کر لیا کہ اگر میری زندگی میں یہ وہیل چیئر پر بیٹھی مونالیزا شامل نہ ہو سکی تو پھر میری زندگی کے تمام مقاصد فوت ہو جائیں گے مجھے ہر حال میں اس پینٹنگ کو اپنے گھر میں سجا کر درو دیوار کو انمول بنانا ہے

نرمین کے علاوہ چونکہ تمام لڑکیاں یونیورسٹی پوائنٹ پر ہی آتی جاتی تھیں اس لئے جونہی ایک لڑکی گھڑی پر نگاہ ڈالتے ہوئے چیخی "ہائے پوائنٹ نکلنے میں صرف پانچ منٹ رہ گئے ہیں" سب لڑکیاں جلدی جلدی نرمین کو گلے لگا کر "خدا حافظ" کا نعرہ لگاتے ہوئے، جنگلی بلیوں کی طرح ایک دوسرے سے ٹکراتی کلاس روم سے تقریباً بھاگتے ہوئے نکلیں کلاس روم کے باہر نرمین کا ڈرائیور اس کا منتظر تھا۔ وہ روزانہ اُسے کلاس روم سے گاڑی تک لیجانے پر مامور تھا لیکن اس روز میں اس کے ڈرائیور کو گاڑی مرکزی دروازے پر لانے کا کہہ کر، خود اس کی وہیل چیئر کو دھکیلتا ہوا باہر کی جانب چل پڑا۔ اس نے کوئی مزاحمت نہیں کی۔ ہم دونوں آرام آرام سے راہداری میں مرکزی دروازے کی طرف بڑھنے لگے

"میرے پاس آٹومیٹک وہیل چیئر بھی ہے جسے میں خود چلا سکتی ہوں بغیر کسی کو تکلیف دیئے لیکن اسے گاڑی میں رکھنا کافی مشکل ہے اس لئے۔۔۔" اس کا لہجہ معذرت خواہانہ تھا شاید اسے میرا وہیل چیئر کو دھکیلنا بُرا لگ رہا تھا لیکن میں نے کوئی جواب نہیں دیا اور یونہی چلتا رہا جب مرکزی دروازہ سامنے آ گیا تو میں نے اُسے مخاطب کیا "نرمین"

"جی" اُس نے فوراً جواب دیا

میں چند لمحے خاموش ہو گیا تو اُس نے دوبارہ "جی" کہا

میں نے ذہن کی بجائے دل کو آزاد چھوڑ دیا "مجھے تم سے محبت ہو چکی ہے"

اُسے جیسے سانپ سونگھ گیا کاٹو تو خون نہیں کے مصداق جسم ساکت تھا اس نے کوئی جواب نہیں دیا گاڑی سامنے کھڑی تھی وہ ڈرائیور کی مدد سے چُپ چاپ گاڑی کی پچھلی سیٹ پر منتقل ہو گئی جونہی ڈرائیور اُس کی وہیل چیئر کو

فولڈ کر کے گاڑی کی ڈکی میں رکھنے کے لئے پچھلی طرف گیا تو وہ میری طرف دیکھتے ہوئے دھیمی آواز میں بولی "معذور لوگ محبت کے نہیں بلکہ ہمدردی کے مستحق ہوتے ہیں اس بات کو کبھی مت بھولیئے گا"

میں خاموش کھڑا اسے دیکھتا رہا اس نے آہستہ سے "خدا حافظ" کہا اور کچھ اس انداز سے میری طرف دیکھا کہ میں پسینہ پسینہ ہو کر رہ گیا اُس کی گاڑی کب روانہ ہوئی مجھے کچھ ہوش نہ رہا

......☆......☆......

شاید میں اس کا بات کا فیصلہ حتمی طور پر نہیں کر پایا تھا کہ مجھے نرمین سے واقعی محبت ہو چکی تھی یا میں فقط اُس کی ذات کو کھوجنے کا تمنائی تھا یا اُس کی اداسی کو اپنے اندر سمونے کا خبط تھا یا پھر میں اُس کی رفاقت میں رہ کر اُسے معذوری کا احساس بھلانے میں اُس کی مدد کرنے کا خواہاں تھا۔

انسان تو ایسے بھی ازل سے متجسس واقع ہوا ہے اگر انسان میں تجسس کا مادہ نہ ہوتا تو وہ کبھی غاروں کے اندھیروں سے نہ نکل پاتا ترقی مادی یا روحانی دونوں ہی انسان کے تجسس سے عبارت ہیں۔۔ انسانی دل و دماغ میں خدا کی کھوج ہی خدا کی موجودگی کی دلیل ہے اور انسان کی اپنی ذات سے محبت ہی مادی ترقی کا عروج!!

بہت دنوں تک میری خاموش محبت جس کا صرف نرمین کو علم تھا قبولیت کی چوکھٹ پر کسی سوالی کی طرح بیٹھی رہی۔ میں جب بھی باقی تمام کلاس فیلوز سے بچ بچا کر اُس کی جھولی میں محبت کا سوال ڈالتا تو وہ زور سے آنکھیں میچتے ہوئے اپنے ہاتھ کو ہوا میں ذرا سا بلند کر کے "پلیز" کہہ کر وہیں میرے سوال کو جھولی سے اور مجھے اپنی ہی نظروں میں گرا دیتی۔

اس کے پنکھڑیوں جیسے ہونٹوں پر صرف یہی ایک جواب ہوتا کہ "معذور افراد سے صرف ہمدردی کی جا سکتی ہے محبت نہیں" لیکن میں اس کے جواب کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے ہر روز اپنی محبت کا اظہار کرنے لگا یہاں تک کہ ایک دن ہمارا گروپ لان میں بیٹھا چاٹ سموسے کے پیالوں کو خالی کرنے میں مصروف تھا تب بھی میں نے پاس کیاری میں لگا سُرخ گلاب توڑ کر نرمین کو پیش کیا۔ اُس نے پھول میرے ہاتھ سے لئے بغیر انتہائی غصے کے عالم میں دیگر کلاس فیلوز کے سامنے مجھے بُری طرح جھاڑ کے رکھ دیا وہ وہیل چیئر پر بیٹھی آگ بگولہ ہو رہی تھی اور میں اُس کے سامنے گلاب کو سینے پر رکھ کر لان میں مزے سے نیم دراز تھا

"تم آج تک وہیل چیئر پر بیٹھی کسی غریب لڑکی سے محبت کا اظہار کیوں نہ کر پائے غفران عالم خان؟"

تمام کلاس فیلوز کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا اور وہ حیرانگی سے ہم دونوں کی شکلوں کو دیکھنے لگے

"کہیں تمھاری نظر میرے باپ کی دولت پر تو نہیں ہے؟ یا بغیر کام کاج کئے گھر داماد بن کر عیاشی کی زندگی گزارنے کا خیال تو دل میں نہیں سمایا ہوا؟"

یہ مونالیزا اندر سے اتنی تلخ بھی ہو سکتی ہے اس کا اندازہ مجھ سمیت کسی کو بھی نہیں تھا چند لمحوں کے لئے اُس کے الفاظ نے میرے اندر ایسی دو دھاری تلوار چلائی کہ میرے دل کے کئی ہزار ٹکڑے ہو کر میرے جسم کے درو دیوار سے چپک گئے لیکن میں نے ایک گہرا ٹھنڈا سانس لیا اور کوئی ردِعمل نہ دیا کیونکہ میں جانتا تھا کہ اس کے اندر محرومیوں نے ڈیرہ ڈال رکھا ہے اور کسی محرومیوں میں گھرے ہوئے انسان کو باہر نکالنا اتنا آسان عمل نہیں ہے سو وہ شدت جذبات کی رو میں بہتی چلی گئی

"اگر تمھیں اس خیال سے ترس کھانے کو جی چاہ رہا ہے کہ مجھ سے شادی کون کریگا، تو کان کھول کر سُن لو کہ میرے لئے رشتوں کی کوئی کمی نہیں ہے اس لئے تمھیں ہیرو بننے کی کوئی ضرورت نہیں ہے"

نرگس نے اک نگاہ میری طرف دیکھا اور اسے مخاطب کیا "محبت کا اظہار کرنا گناہ تو نہیں ہوتا نرمین——— please control yourself———"

"ہاں، بالکل نہیں ہوتا گناہ۔۔ لیکن یکطرفہ محبت ۔ محبت نہیں حماقت ہوتی ہے۔" اس نے فٹ سے جواب دیا۔

نرگس خاموش ہوگئی

"محبت، جنس، شادی——— کیا اس کے علاوہ دنیا میں اور کچھ کہنے، کرنے کو نہیں رہ گیا۔۔ میں گھر سے یہاں

اس لئے آتی ہوں کہ لوگوں کی ہمدردیاں سمیٹ سکوں؟ــــــ نہیں چاہیئے مجھے ترس کے رویئے اور کسی کی ہمدردیوں میں لپٹی ہوئی محبتوں کی بھیک" اُس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر انتہائی بے دردی سے اپنی بات مکمل کی۔

اُس کے ذلت آمیز رویئے کے باوجود مجھے اُس کی آنکھوں میں ناجانے کیوں بے بسی کا تاثر نمایاں طور پر دکھائی دے رہا تھا جیسے دل،زبان کے رویئے پر شرمندہ ہو!

......☆......☆......

اگلی صبح جب ڈرائیور اس کی وہیل چیئر کو دھکیلتا ہوا کلاس روم کی طرف روانہ تھا تو میں نے اس کے ڈرائیور کے ہاتھوں سے وہیل چیئر تھامتے ہوئے اُسے واپس جانے کو کہا۔۔نرمین نے یوں مجھے دیکھا جیسے کہہ رہی ہو کہ "تم بہت ڈھیٹ انسان ہو "لیکن منہ سے کچھ نہ بولی۔میں اُس کی وہیل چیئر کو دھکیلتا ہوا کلاس روم کی بجائے لان کی طرف چل پڑا اُس نے احتجاج کیلئے لب کھولنا چاہے لیکن پھر اپنا سر پکڑ کر خاموشی سے بیٹھی رہی ۔لان میں پہنچ کر میں بالکل اُسکے پاؤں کے سامنے آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا اُس نے شعلہ بار نظروں سے میری طرف دیکھا تو میں نے مسکراتے ہوئے کہا" سنو قلوپطرہ! پہلی بات تو یہ ہے کہ تم ہو مونا لیزا لیکن خانخواہ قلوپطرہ بننے کی کوشش کر رہی ہو دوسری بات یہ کہ مجھ پر تمہارے کل کے جلالی لیکچر کا کوئی اثر نہیں ہوا تم نے میری محبت کو جو سمجھنا ہے سمجھو"

اُس کی نگاہوں کے شعلے مزید دہک اٹھے لیکن میں اس کی پروا کیئے بغیر بولتا چلا گیا۔

"اور تیسری بات یہ ہے۔۔ مجھے اب بھی تم سے محبت ہے"

میں نے کل والا وہی سرخ گلاب اپنی کتاب سے نکال کر زبردستی اس کی نوٹ بک میں رکھ دیا اُس نے ابرو سکیڑ کر مجھے ایسا کرتے ہوئے دیکھا لیکن چُپ رہی۔

"چوتھی بات یہ کہ میں تم سے شادی سے پہلے اسٹامپ پیپر پر لکھ کر دونگا کہ نرمین احمد بنتِ منیر احمد کی جائیداد میں سے مجھے تادم آخر کوئی حصہ نہیں چاہیئے اور نہ ہی میرا اُس کے باپ دادا ، پڑدادا کی دولت سے کوئی واسطہ ہے "میں نے اُس کی نگاہوں میں نگاہیں جماتے ہوئے کہا تو آہستہ آہستہ اُسکی نگاہوں میں شعلوں کا منظر خزاں کی اُداسی میں بدلنے لگا لیکن اُس نے فوراً سر کو جھٹکتے ہوئے لب کھولے"چھوڑو، ان بچگانہ باتوں کو اور کلاس میں چلو پلیز" اُس کی آنکھیں کسی بھی جذبے سے خالی تھیں۔

"مجھے سچ مچ تم سے محبت ہوگئی ہے نرمین میرا یقین کر لو خدا کے لئے۔" اُس کی آنکھوں کا خالی پن دیکھ کر ناجانے کیوں میرے اندر کی ساری بے چارگی اُس کے قدموں میں ڈھیر ہوگئی۔

"میں کوئی ٹین ایجر نہیں ہوں کہ بنا سوچے سمجھے کوئی فیصلہ کر کے بعد میں پچھتاتا پھروں۔۔میں جو کچھ بھی تم سے کہہ رہا ہوں اس میں میرا دل اور دماغ دونوں شامل ہیں۔" میں سر جھکائے اُس کے آگے بیٹھا تھا خاموشی کا وقفہ طویل ہوگیا تو اُس نے آہستہ سے میرے سر پر اپنا ہاتھ رکھا میں نے اُس کی طرف نگاہیں اُٹھائیں تو اُس کے گالوں پر آنسو پھسل رہے تھے میں نے اُس کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں تھام کر عقیدت سے اپنی آنکھوں سے لگا لیا کچھ توقف کے بعد اس نے میرے ہاتھوں سے اپنا ہاتھ تیزی سے کھینچتے ہوئے کہا۔

"اب کلاس روم میں چلیں ۔پلیز" اُس نے آنسو پونچھتے ہوئے اپنے اردگرد نظر دوڑائی اور میں سمجھ گیا کہ اسے یکدم احساس ہوا ہے کہیں کوئی اسے روتا ہوا دیکھ نہ لے اور وہ بھی میرے سامنے یوں ہاتھوں میں ہاتھ لئے۔

ہم کلاس روم کی طرف روانہ تھے آج پہلی مرتبہ مجھے راہداریوں میں آتے جاتے طلباء اور اساتذہ کی نگاہوں میں معنی خیز باتیں پڑھنے کو ملیں عجیب چبھتی ہوئی نظریں تھیں جس کا نرمین کو روزانہ سامنا کرنا پڑتا تھا۔اُس سمے میرے دل میں صرف یہی ایک خیال چیخ رہا تھا کہ کتنا مشکل ہوتا ہے کسی معذور کے ساتھ چلنا لیکن اُس دن میں نے خود کو ایک بات سمجھادی کہ یہ معاشرہ کوئلہ کا دلال ہے اگر کسی نے اجلی بے داغ پوشاک پہن رکھی ہے تو صرف پوشاک کی پروا کرتے ہوئے دور سے گزر جانے میں ہی عافیت ہے اس کے بعد میں نرمین کے ساتھ یوں کلاس روم میں داخل ہوا جیسے کوئی فاتح شہر میں داخل ہوتا ہے فتح کے خمار میں چُور اپنے اردگرد سے بے نیاز سراپا مغرور!!

اسی روز اتفاق سے اس کی گاڑی وقت پر نہیں پہنچی ۔۔نرمین اور میں لان میں بیٹھے گاڑی کا انتظار کرنے لگے باتوں باتوں میں اچانک اس نے سوال کیا'میں کیسے مان لوں کہ تمہیں مجھ سے ہمدردی نہیں بلکہ محبت ہے' ہلکی سی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں کے کونوں سے جھانکنے لگی۔

"اس کا جواب تو شاید میں نہ دے سکوں لیکن اتنا ضرور جانتا ہوں ہمدردی کے مستحق وہ لوگ ہوتے ہیں جن کی آنکھوں سے بے چارگی جھلکتی ہے ترس کی متلاشی آنکھیں۔۔لیکن تمہاری آنکھوں میں اداسی ہے کوئی تصویر ادھوری سی ہے جس میں محبت کا رنگ بھر کے اسے مکمل کیا جا سکتا ہے"

مسکراہٹ کا گلابی رنگ اس کے ہونٹوں کے کونوں سے نکل کر دائیں بائیں پھیل گیا اس کا چہرہ تازہ کلی کی مانند کھل اٹھا لیکن آنکھوں میں اداسی کا سایہ ہنوز اپنی جگہ برقرار تھا۔

'اگر تم برا نہ مانو تو ایک بات پوچھ سکتا ہوں' پتہ نہیں کیوں مجھے اس کی معذوری کا سبب جاننے کا جی چاہا۔

مجھے muscular dystrophy ہے۔۔ یہ پورے جسم میں پھیلا ایک قسم کا روگ ہے'اس کا چہرہ کسی قسم کے تاثر سے عاری تھا

'تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ میں تمہاری معذوری ۔۔میرا مطلب ہے بیماری۔۔' مجھے سمجھ نہ آیا کہ اسے معذور کہوں یا بیمار۔۔کتنے اذیت ناک الفاظ ہیں کتنا کٹھن ہے یہ سب ان لوگوں سے پوچھنا جو کسی طور کسی سے کم تر نہیں ہوتے بلکہ اندر اور باہر سے بہت خوبصورت ہوتے ہیں۔۔کتنے بے کار روّیوں کو ہم نے معاشرے میں رواج دے رکھا ہے کہ کچھ الفاظ زبان سے ادا کرتے ہوئے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ہم گالی بک رہے ہوں

'ایسے سوال میں گذشتہ دس برسوں سے لوگوں کے چہروں پر پڑھتی آ رہی ہوں اس لیے مجھے زیادہ دقت نہیں ہوئی اسے تمہارے چہرے پر پڑھتے ہوئے۔"

میں جانتا تھا کہ وہ ایک مرتبہ پھر مجھے یہ باور کرانے کی کوشش کر رہی ہے کہ مجھے اس سے محبت نہیں بلکہ ہمدردی ہوئی ہے لیکن میں نے اس کی کوشش کو یکسر نظرانداز کرتے ہوئے کہا 'اس کا مطلب ہے دس برس پہلے تم بالکل نارمل تھی۔"

"نارمل تو میں اب بھی ہوں ۔۔کیا تمہیں میں ابنارمل لگتی ہوں۔"

"نہیں میرا مطلب ہے۔" میں بری طرح الفاظ کے چناؤ میں الجھ کے رہ گیا۔

اس نے میری حالت دیکھ کر ایک خوبصورت سا قہقہہ لگایا اور میں اس کے سامنے ایسی اداکاری کرنے لگا جس سے اسے یقین ہوجائے کہ میں واقعی ایک بدھو ہوں اور اس وقت کھسیانہ سا ہو رہا ہوں۔

"دس برس پہلے میں 'غیر معذور' تھی گو کہ اس نے میری تصحیح کی تھی لیکن اس کے باوجود مجھ پر لفظ معذور ناگوار سا گزرا۔

'پندرہ سال کی عمر تک میں وہیل چیئر کے نام سے بھی ناواقف تھی اور آج دیکھو وہیل چیئر کے بغیر ادھوری ہوں'وہ شاید اداس ہونے کے بہانے ڈھونڈ رہی تھی۔

"کوئی ایکسیڈنٹ ہوا تھا۔"

"نہیں۔" یہ کہہ کر وہ کچھ دیر کے لیے خاموش ہوگئی اس کے چہرے کا رنگ بدل گیا تاثرات سے عاری چہرے پر یکدم غصے اور نفرت کا ملا جلا رنگ اتر آیا۔

"یہ میرا وجود جس نے تخلیق کیا ہے۔۔یہ روگ بھی اسی کا دیا ہوا ہے'اس کے لہجے میں کڑواہٹ تھی'میں نہیں جانتی یہ خدا کی طرف سے آزمائش ہے یا سزا۔اس کی محبت ہے یا نفرت کہ میں ٹھیک سے اپنے ہاتھ سے اپنے ہی آنسو نہیں پونچھ سکتی۔"

میں چاہتا تھا کہ آج وہ پہلی اور آخری مرتبہ اپنی معذوری کے سوالات کے جوابات مکمل طور پر باہر نکال کر پھینک دے۔۔میں ہمہ تن گوش تھا لیکن اچانک مجھے اس کا ڈرائیور تقریباً بھاگتا ہوا آتا دکھائی دیا جب وہ ہمارے قریب پہنچا تو نرمین نے مجھ سے اجازت طلب کی لیکن وہ میرا نفی میں ہلتا سر دیکھ کر حیران رہ گئی کہ میں نے صاف الفاظ میں اجازت دینے سے انکار کردیا۔

"یہ کیا بات ہوئی کہ جب تک اپنا مطلب تھا مجھے اپنے ساتھ بٹھائے رکھا اور اب جبکہ گفتگو ہو رہی ہے تو ایک دم چل پڑی تھوڑی سی اور دیر ہوگئی تو کیا قیامت آ جائے

گی۔''

اس نے مجھے 'ڈھیٹ' کا لقب تو پہلے ہی نواز رکھا تھا سو بادل نخواستہ اس نے ڈرائیور سے گاڑی میں انتظار کرنے کو کہا۔۔ڈرائیور مجھے گھورتے ہوئے وہاں سے چلا گیا۔

میں نے جان بوجھ کر ایسا کیا تھا کہ بڑی مشکل سے قلوپطرہ بغیر جلالی ہوئے گفتگو کرنے پر آمادہ دکھائی دیتی تھی۔

'تمہیں ہوا کیا تھا جس کی وجہ سے تم وہیل چیئر پر بیٹھ گئیں۔''' میں نے وہیں سے بات کا آغاز کیا جہاں سے سلسلہ منقطع ہوا تھا

''یہ تو مجھے خود بھی نہیں معلوم لیکن ڈاکٹر اسے موروثی بیماری کہتے ہیں اس میں عضلات آہستہ آہستہ کام کرنا چھوڑ دیتے ہیں اور پھر ایک دن انسان اس بیماری کے ہاتھوں دنیا سے کوچ کر جاتا ہے۔۔بے بسی بھی کتنی ظالم ہوتی ہے ناں؟ انسان خود کو قطرہ قطرہ مرتے دیکھتا ہے لیکن کچھ کر نہیں پاتا۔'' پھیکی طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ اس نے اپنی بات مکمل کی

''ویسے تم خوش نصیب ہو کہ معذوری کے باوجود تمہیں دنیا بھر کی آسائشیں میسر ہیں کسی چیز کی کمی نہیں ہے' میں جانتا تھا کہ میری اس بات پر وہ مزید کڑوی ہو جائے گی اور وہی ہوا

وہ مجھے کوئی پرلے درجے کا احمق سمجھتے ہوئے گویا ہوئی۔

''دس ہزار روپے کے سینڈل خرید کر بے جان پیروں میں پہننے کا کیا فائدہ جبکہ یہ معلوم ہو آپ کے پاؤں وہیل چیئر پر رکھے ہوئے شو پیس کے سوا اور کسی کام کے نہیں۔۔کن آسائشوں کی بات کر رہے ہو؟ معذور جسم امیر ہوتے ہیں نہ غریب۔۔معذور جسم صرف معذور جسم ہوتے ہیں۔۔ایک جیسا روگ۔۔ایک جیسا درد۔۔ایک جیسی اذیتیں'

''یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ نئے ماڈل کی گاڑی میں آنے والی زمین اور ٹین کی تپتی ہوئی چھت تلے رہنے والی کسی غریب معذور لڑکی کی زندگیوں میں فرق تو بہرحال ہے۔۔کہیں تو شکر کا مقام بھی آتا ہوگا۔''

''ہاں بالکل آتا ہے۔۔جب ماں کی گرم آغوش میں چھپتی ہوں تو خدا کا شکر ادا کرتی ہوں کہ اس کائنات میں کوئی تو ایسا ٹھکانہ موجود ہے جہاں دل کا غبار باہر نکال سکتی ہوں۔۔بے لوث محبت کا مفہوم سمجھاتی ماں کی خوشبو جب سانسوں میں اترتی ہے تو کتنا سکون ملتا ہے بس انہی چند گھڑیوں میں زندگی پر پیار آتا ہے اس کے علاوہ نئے ماڈل کی کار میں بیٹھی ہوئی زمین اور ٹین کے تپتے ہوئے چھت تلے بیٹھی ہوئی کسی بھی معذور لڑکی کے احساسات میں کوئی فرق نہیں۔۔ہم دونوں کا درد مشترک ہے''

کچھ دیر کے لیے میں اس کے چہرے کو تکتا رہا اداسی کے ساتھ اب مجھے اس کے چہرے پر بے چینی کے آثار نمایاں ہوتے ہوئے دکھائی دیئے اس کی آنکھیں دھیرے دھیرے بوجھل ہوتی چلی گئیں اور ہونٹوں پر خشکی کی پتلی سی تہہ چڑھنے لگی بالآخر اس نے ایک بار پھر درخواست کی۔

''پلیز اب مجھے جانے دو صبح سے لے کر اب تک وہیل چیئر پر بیٹھے بیٹھے جسم میں درد سا محسوس ہونے لگتا ہے اور پاؤں بھی سوجنے لگتے ہیں''

میں نے اس کے سوجے ہوئے پیروں کی طرف دیکھ کر نفی میں سر ہلایا۔

''نہیں تم نہیں جا سکتیں آج میری خاطر تمہیں ذرا سا درد برداشت کرنا ہی پڑے گا''

وہ بے بس نگاہوں سے مجھے دیکھنے لگی میں اپنی ضد پر اڑا رہا مجھے معلوم تھا کہ میں جسے ذرا سا درد کہہ رہا ہوں وہ یقیناً اس کیلئے بہت زیادہ تکلیف دہ ہے۔۔اذیت کے آثار اس کے چہرے سے عیاں تھے۔

''کبھی تم نے مستقبل کے بارے میں سوچا ہے؟ میرا مطلب ہے آنے والے وقت کے بارے میں۔۔کیسا ہوگا 'میں اس انداز سے سوال پوچھ رہا تھا جیسے کہ مجھے رتی بھر احساس نہیں کہ وہ کتنی مجبور ہو کر اس وقت میرے سامنے بیٹھی ہوئی تھی۔

اس نے ذرا سی زبان نکال کر اپنے خشک لبوں پر پھیری اور کچھ توقف کے بعد گویا ہوئی۔

''نہیں۔۔لاحاصل کے بارے میں نہیں سوچتی' حاصل کرنے کی لگن ہو تو کچھ بھی حاصل کیا جا سکتا ہے' جب میں اپنے بچپن کے بارے میں سوچتی ہوں تو ہونٹوں کی

مسکراہٹ میرا حال مجھ سے چھین لیتی ہے اور جب کبھی مستقبل کا سوچا تو ڈر اندر سمٹ آیا۔

''کیسا ڈر۔''

''بہت سے ڈر۔'' اس نے ایک گہرا سانس لیا۔

''یہ معاشرہ جس میں ہم تم سانس لے رہے ہیں انتہائی بے حس معاشرہ ہے یہاں شادی کے لیے کالی لڑکی پر گوری لڑکی کو فوقیت حاصل ہے لمبے، درمیانے قد والی لڑکیوں کا مقام چھوٹے قد والی لڑکیوں سے اونچا ہے یہاں لوگ آنکھوں پر نظر کا چشمہ چڑھانے والی لڑکیوں کا مذاق اڑانے سے باز نہیں آتے تو وہ لڑکیاں کیسے ان لوگوں کے نشانے سے بچ سکتی ہیں جو میری طرح وہیل چیئر پر یا کسی دوسری معذوری کا شکار ہیں؟ مجھے لوگوں کے رویوں سے ڈر لگتا ہے مجھے اس معاشرے سے گھن آتی ہے''

فضا میں خاموشی طاری ہو گئی میں نے اس کے لرزتے ہاتھوں پر ہاتھ رکھ دیئے۔

''تمہارے یہ تمام شکوے میری محبت دور کر دے گی زمین۔مجھ پر بھروسہ رکھو۔''

''یہ شکایتیں بھی مشترکہ ہیں اور یہ اذیتیں بھی۔'' اس کی آواز بیٹھ گئی 'تم کیا سمجھتے ہو کہ دنیا کی تمام معذور لڑکیوں کو تم جیسے لوگ محبت کے رنگ میں رنگنے کے لیے کہیں نہ کہیں سے ضرور آ نکلتے ہونگے۔'' اس نے تیزی سے نفی میں سر ہلایا۔

''نہیں۔ایسا نہیں ہوتا اس اذیت کو تم کبھی محسوس نہیں کر سکتے جب ایک معذور بے بس لڑکی کے سامنے اس کی چھوٹی بہن کی شادی کی بات طے پا رہی ہوتی ہے اور وہ ان سب کے درمیان کرچی کرچی دل کے ساتھ ہونٹوں پہ معنوعی مسکراہٹ سجائے بیٹھی ہوتی ہے کسی کو اس کے ارمان اور خواہشات کا انبار نظر نہیں آتا ہاں بس نظر آتا ہے تو فقط ایک معذور جسم'

میرا دل اتنا زور سے دھڑکا جیسے ابھی سینے سے باہر نکل آئے گا اس کی آنکھوں میں نمی اترنے لگی، چہرہ پر کرب کے آثار نے اس کی ازلی مسکراہٹ کو فنا کر دیا میں نے اس کے آنسو پونچھے اور اس کی وہیل چیئر کو بوجھل قدموں کے ساتھ دھکیلتا ہوا گاڑی تک لے گیا اس نے بوڑھے ڈرائیور کی مدد سے اپنے وجود کو وہیل چیئر سے گاڑی کی پچھلی سیٹ پر بمشکل منتقل کیا اور خاموش نم آلود آنکھوں سے میری طرف دیکھا گاڑی کا دروازہ بند ہو گیا لیکن اس کی آنکھوں کا پانی پلکوں سے رس رس کر گالوں پر گرتا چلا گیا۔میں اپنی جگہ پتھر بنا کھڑا تھا۔۔گاڑی روانہ ہوگئی اور یکا یک مجھے اپنا وجود وہیل چیئر پر پڑا محسوس ہوا اور میں وہیں تپتی ہوئی زمین پر بیٹھ گیا۔

......☆......☆......

دراصل میں اس کے درد تکلیف اور کرب کو اپنے اندر جذب کرنا چاہتا تھا میں کہ ساری عمر اسے خوش رکھنے کا تہیہ کیے بیٹھا تھا اور صرف آدھے گھنٹے میں ہی اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کا سبب بن بیٹھا 'کیا میں ساری زندگی اس کے درد کا احساس کرنے کے قابل ہوں؟' اس سوال نے مجھے جھنجوڑ کے رکھ دیا۔ اس سوال کا جواب کھوجنے میں ساری رات گزر گئی اور فجر سے پہلے شاید غنودگی کے عالم میں میرے ذہن میں ایک آواز آئی 'محبت تو خود ایک آزمائش ہے تم کہاں محبت کو آزمانے چلے تھے' اذان کے ساتھ ہی میری آنکھ کھل گئی اور پھر آہستہ آہستہ مجھ پر منکشف ہوا کہ مجھے زمین سے شدید ترین محبت ہے اور اب مجھے اس شدت میں ذرا سی کمی لانا ہوگی تاہم یہ ذرا سی کمی بھی ناممکن نظر آئی۔اب تک میری محبت نے مجھے فائدہ ہی دیا تھا اسی محبت کی بدولت مجھے اس کے قریب ہونے کا شرف حاصل ہوا شدید محبت کیے بغیر اس کا قرب حاصل کرنا کیسے ممکن تھا؟ میرا پُرجوش اندازِ محبت ہی میرے دل کو مطمئن کرتا لیکن اب کسی نہ کسی طرح خود کو تبدیل کرنا ضروری تھا کیونکہ میں جان چکا تھا کہ میرا جوشِ محبت، میری دیوانگی، زمین کی تکلیف کا موجب بن سکتی ہے اسے مجھ سے بیگانہ کر سکتی ہے اگر میں اپنی طرز محبت میں ترمیم نہ کر سکا تو آنسوؤں اور پچھتاووں کے سوا دامنِ دل میں کچھ بھی نہ رہے گا۔

اس دن کے بعد دھیرے دھیرے میری افسردگی ختم ہوتی چلی گئی میں نے محبت میں حاصل کرنے کی خواہش والا حصہ ترک کر دیا میں نے اسے زندگی میں صرف جیتنے کی خواہش کے ساتھ مار دیا مجھے اپنے مد مقابل کو ہمیشہ زیر کرنے کی خواہش نے بے چین رکھا لیکن زمین کے ساتھ چلنے میں، میں نے اس خواہش کو محبت کی راہ میں رکاوٹ

جانا چنانچہ اس سے چھٹکارا پانا ہی تھا حالات بدل چکے تھے اور زمین کو کھو دینے کے خوف سے میں تو بالکل ہی بدل چکا تھا اور مجھے اس کا رتی برابر بھی افسوس نہیں تھا۔

اس دن کے بعد دھیرے دھیرے ہم دونوں کے بیچ کا فاصلہ کم ہوتا چلا گیا لیکن اس کے ساتھ ہی زمین کی محبت اداسی بن کر مجھ پر چھانے لگی میں سردیوں کی اس بارش میں بھیگ رہا تھا جس سے بچ کر لوگ گھروں میں دبک کر بیٹھ جاتے ہیں لیکن نہ جانے کیوں مجھے ایسا محسوس ہوتا کہ اسی ٹھنڈی بارش کے کسی ایک قطرے میں محبت کا امرت چھپا ہے۔

میں دن میں سو سو بار اس سے محبت کا اظہار کرتا نہ تھکتا لیکن ہر بار وہ اپنی اداس آنکھیں جھکا لیتی ہم پہروں ہاتھوں میں ہاتھ لیے باتیں کرتے رہتے۔ میں اکثر بینچ پر بیٹھ کر اسے اپنے سامنے بٹھا لیتا لیکن مجھے اس وقت عجیب سا سکون ملتا جب میں اس کے منع کرنے کے باوجود اس کی وہیل چیئر کے بالکل سامنے پیروں کے آگے آلتی پالتی مار کر بیٹھ جاتا جیسے کوئی پجاری اپنی دیوی کے سامنے عجز و عقیدت سے اس کے چرنوں میں بیٹھ کر دنیا و مافیہا سے ناتہ توڑ لیتا ہے جب بھی اس کی باتوں پر اداسی کی شام چھانے لگتی میں اپنے ہاتھ پر اس کے ہاتھ کا دباؤ محسوس کر کے اس کے غم کی گہرائی کا اندازہ لگا لیا کرتا۔

......☆......☆......

اس دن آسمان پر بادلوں کی ٹکڑیاں سورج کے سامنے سے گزر کر دھوپ چھاؤں کا کھیل رچائے ہوئے تھیں شہر میں ٹرانسپورٹرز کی ہڑتال کی وجہ سے طلبہ کی کثیر تعداد یونیورسٹی نہ آ سکی اس لیے کلاسز خالی تھیں۔ میں اور زمین لان میں بیٹھے خوشگوار موسم کو اپنے اوپر طاری کیے ایک دوسرے کو لطیفے سناتے چلے گئے۔ قلوپطرہ دوبارہ مونالیزا میں بدل چکی تھی اور اس کی مکمل دلفریب مسکراہٹ اور ہلکے ہلکے قہقہوں کی جل ترنگ سے موسم اور بھی دلکش ہو چکا تھا۔

کافی دیر بعد جب لطیفے ختم ہو گئے تو دھیرے دھیرے خاموشی کے طویل ہوتے ہوئے وقفے پر اداسی کا رنگ کہیں سے آ کر حملہ آور ہو گیا مسکراہٹ اس کے لبوں پر پھیلی ہوئی تھی لیکن میں نے اپنے ہاتھ پر اچانک اس کے ہاتھ کا دباؤ محسوس کیا تو مجھے اندازہ ہوا کہ وہ سچ مچ اندر سے اداس تھی

''جانتے ہو جب انسان اندر سے ویران ہو تو ہلکی سی ہنسی بھی گونج کر قہقہہ بن جاتی ہے ایک بے معنی ۔۔ڈراؤنا۔۔ دل دہلا دینے والا قہقہہ' اس کی مسکراہٹ مدھم ہو گئی۔

''لوگ بیچارے بھی جنموں کے اندھے ہیں چہروں پر سجی مصنوعی مسکراہٹوں سے فریب کھا جاتے ہیں کاش! انہیں غم شناس نگاہیں عطا ہو جائیں'

میں جانتا تھا کہ وہ اس وقت کوئی کڑوی حقیقت بیان کرنا چاہتی ہے جس کی کڑواہٹ نے اسے ہنسی کے میٹھے ذائقے سے اچانک محروم کر دیا تھا اس نے بے خیالی سے میری طرف دیکھا۔

''میں نے آج تک تمہیں اپنے کتنے غم بتائے ہیں کیا تم پر کبھی کوئی غم کوئی دکھ نہیں گزرا جسے تم مجھ سے بانٹ سکو؟''

''ہاں۔ غم تو بہت گزرے ہیں لیکن کوئی کمبخت مستقل ٹھہرا ہی نہیں۔'' میں نے بات ٹالتے ہوئے کہا۔

''بہت خوش نصیب ہو۔۔۔ بہت بہت خوش نصیب ہو۔''

''ہاں، اپنے ہاتھوں میں تمہارے ہاتھ دیکھ کر مجھے ماننا پڑے گا کہ میں واقعی بہت خوش نصیب ہوں۔'' میں نے اس پر چھائی ہوئی اداسی کی شام کو اس رومانوی دن میں واپس کھینچ کر لانے کی کوشش بھی کر دیکھی لیکن بری طرح ناکام رہا

'تم کتنے اچھے ہو جو میری فضول دکھی باتیں چپ چاپ سنتے رہتے ہو'

ہم دونوں کچھ لمحوں کیلئے خاموش ہو گئے

بلوچستان یونیورسٹی کے بیچوں بیچ سے ریلوے لائن گزرتی ہے دور سے ریل گاڑی کی سیٹی کی آواز فضاء میں بلند ہوئی اور اس کی نگاہیں فوراً اس جانب اٹھ گئیں جہاں سے آواز ابھری تھی جبکہ میری نظریں اس کے چہرے کا طواف کرنے میں مگن تھیں میں اس درد کا منتظر تھا جو اس کے لبوں پر بس آیا ہی چاہتا تھا جوں جوں ریل گاڑی سیٹی بجاتی قریب آ رہی تھی اس کے ہاتھوں کا دباؤ بڑھتا چلا جا

رہا تھا اس کا پسینہ میرے ہاتھوں کو نم آلود کر چکا تھا اداسی اتنی گہری محسوس ہوئی جیسے وہ آنکھوں سے نہیں بلکہ ہاتھوں سے رو رہی ہو!

'تمہیں ایک بات بتاؤں'' اس کی آواز میں لرزش تھی

میرا انتظار ختم ہو گیا اچانک جونہی ریل گاڑی یونیورسٹی میں داخل ہوئی تو اس نے زور سے اپنی آنکھیں بھینچ کر سر جھولی میں ڈال دیا میں نے اس کے ہاتھ کی انگلیوں کو اپنی انگلیوں میں مضبوطی سے پھنسا لیا جب تک فضاء سے ریل گاڑی کی گڑگڑاہٹ کا شور مکمل طور پر ختم نہ ہو گیا اس وقت تک اس نے اپنی جھولی سے سر نہ اٹھایا

دھیرے دھیرے فضاء پر ایک مرتبہ پھر سکوت سا طاری ہونے لگا

''پچھلے سال کی بات ہے کچھ لوگ میری چھوٹی بہن ثانیہ کے رشتے کے سلسلے میں ہماری گھر آئے ہوئے تھے' اس کی نگاہیں ہوا میں لہراتے ہوئے انجن کے کالے دھوئیں پر مرکوز تھیں 'ڈرائینگ روم میں سب لوگ بہت خوشگوار موڈ میں باتیں کر رہے تھے لیکن صرف اس وقت تک جب تک میں اپنی وہیل چیئر پر رینگتی ہوئی ڈرائینگ روم میں داخل نہیں ہوئی تھی مجھے دیکھتے ہی تمام مہمانوں پر جیسے موت کا سناٹا چھا گیا سب ایک دوسرے کو معنی خیز نگاہوں سے دیکھنے لگے'' زمین کا چہرہ پوری طرح بجھ چکا تھا ''غفران یہی تو وہ مقام، وہ لمحے ہوتے ہیں جب لوگوں کے تضحیک آمیز خاموش رویے بھی چیختے ہوئے سنائی دیتے ہیں اور انسان کو اپنے وجود سے نفرت ہونے لگتی ہے۔''

میں خاموش رہا کہ میرا حلق خشک ہو چکا تھا لیکن وہ بولتی چلی گئی۔

''اس روز شام کو ان لوگوں نے ایک بڑا ہی قیامت خیز عذر پیش کر کے رشتہ کرنے سے معذرت کر لی اور جانتے ہو وہ قیامت خیز عذر کیا تھا؟'' اس نے لرزتی ہوئی پلکیں اٹھا کر مجھے کچھ یوں دیکھا کہ ایک لمحے کے لیے میری سانس رک سی گئی

میں نے آہستہ سے نفی میں سر ہلایا ایک زہریلی مسکراہٹ اس کے لبوں پر پھیل گئی۔

انہوں نے کہا کہ آپ لوگ کیا اس بات کی گارنٹی دیتے ہیں کہ شادی کے بعد ثانیہ کے ہاں ہونے والا کوئی بچہ معذور پیدا نہیں ہو گا۔۔ یا آگے چل کر معذور نہیں ہو گا جیسے آپ کی بڑی بیٹی معذور ہوئی ہے۔''

ایک آنسو میری آنکھ سے گر کے گال پر رینگ گیا لیکن اس کی آنکھیں خشک تھیں

''کہو، قیامت ہے ناں۔۔ مٹی کا بنا ہوا انسان گارنٹیاں مانگ رہا ہے جس کا اپنی ہی سانسوں پر اختیار نہیں وہ اپنے حال کی فکر چھوڑ کر مستقبل کے غم میں مبتلا ہے۔'' وہ چند لمحوں کے لیے خاموش ہو گئی۔

میرے پاس اسے تسلی دینے کیلئے الفاظ کا جم غفیر تھا لیکن میں خود یہ چاہتا تھا کہ وہ اپنے دل کا بوجھ مکمل طور پر اتار کر پھینک دے چنانچہ میں اس کے لب کشا ہونے کا منتظر تھا۔

وہ دور خلاؤں میں ٹکٹکی باندھے ہوئے گویا ہوئی۔

''شاید یہ تو میں نے تم سے قیامت صغریٰ کا ذکر کیا ہے اصل قیامت تو اس کے بعد آئی تھی' اس کے ہاتھ پاؤں میں ہلکی سی لرزش شروع ہو گئی۔

''اس رات میرے باپ نے میری ماں پر اپنا غصہ نکالا کیونکہ رشتے سے انکار کرنے والے بہت بڑے زمیندار اور صنعتکار تھے میرا باپ اتنا زور سے چیخ رہا تھا کہ اس کے منہ سے نکلا ہوا ایک ایک لفظ گھر کے بند دروازوں کو توڑتا ہوا کمروں میں گرتا چلا گیا پہلا اعتراض میرے سگے باپ کو اس بات پر تھا کہ میں ڈرائینگ روم میں کیوں آئی تھی جبکہ کسی نے مجھے وہاں آنے کو کہا بھی نہیں تھا۔۔ ہاں یہ بھی سچ ہے کہ اگر منع کر دیتے تو خدا کی قسم اپنی بہن کی خوشی کیلئے اپنے کمرے سے کبھی باہر نہ نکلتی۔''

اس نے قسم کچھ اس ادا سے اٹھائی کہ مجھے گمان سا گزرا کہ خدا ابھی اسی وقت کہیں اس پورے شہر کو تباہ کر کے نہ رکھ دے اس کی آواز کا درد، اس کا شکستہ لہجہ، اس کی معصومیت، اس کی بے بسی دیکھ کر میری بھیگی آنکھیں جھک گئیں۔

''اور سنو، میرا سگا باپ میری ماں سے کہتا ہے کہ میں اپنی معذوری اس کے پیٹ سے لے کر آئی ہوں میں بڑی اولاد ہونے کے ناتے اپنے باقی بہن بھائیوں کے لیے رکاوٹ بنتی جا رہی ہوں پڑھنے لکھنے کے باوجود مجھ میں اتنی عقل نہیں کہ جہاں مہمان بیٹھے ہوں وہاں وہیل چیئر کو گھسا

کر ہمدردیاں بٹورنے نہیں پہنچتے۔۔ ہاں میرا باپ کہہ رہا تھا کہ مجھے معذوری خدا نے دی ہے اس میں باقی گھر والوں کا کیا قصور ہے مجھے شکر کرنا چاہیے کہ میں گھر میں ایک پُرآسائش کمرے میں رہتی ہوں نہ کہ ان معذوروں کی طرح ہوں جو سڑکوں پر بھیک مانگتے پھرتے ہیں‘‘

اس نے جونہی اپنی آنکھیں بند کیں تو دو آنسو اس کی سیاہ پلکوں سے گر کر میرے ہاتھوں پر پھیل گئے۔

’’تم ہی بتاؤ غفران، میری معذوری میں اگر ان کا قصور نہیں تو میرا بھی تو نہیں ہے‘‘

اس کے لرزتے ہاتھ میرے ہاتھوں میں جکڑے ہوئے تھے

’’اس شب قیامت میں، میں بہت روئی تھی اور ثانیہ مجھ سے لپٹی ہوئی تھی وہ اس لیے رو رہی تھی کہ ابو کے غصے کی وجہ سے شرمندہ تھی اور میرے آنسو اس لیے جاری تھے کہ میں اس کے رشتے کے انکار کی وجہ بنی تھی مجھے اپنا آپ اس سے مجرم محسوس ہوا تھا جی چاہ رہا تھا کہ خودکشی کرلوں۔۔ آہ! یہ بہنوں کا بھی کتنا اٹوٹ بندھن ہوتا ہے ناں۔‘‘ اچانک ہلکی سی مسکراہٹ اس کی گیلی پلکوں پر نمودار ہو کر غائب ہوگئی۔

میں نے سوچا کہ اب مجھے ضرور اس کی تسلی کے لیے لب ہلانے چاہیے ورنہ کہیں وہ ٹوٹ کر کہیں بکھر ہی نہ جائے لیکن مجھ سے پہلے اس کے لب ایک مرتبہ پھر وا ہوئے ’پتہ نہیں کیوں ہم زندگی میں اپنی مرضی کے برخلاف کوئی کام ہوتا نہیں دیکھ سکتے حالانکہ ہمیں اچھی طرح معلوم ہے کہ یہاں مرضی صرف خدا کی چلتی ہے ہم سب تقدیر کے تابع ہیں حکم الٰہی کے پابند ہیں معذوری سے پہلے میری ماں اکثر مجھے بتایا کرتی تھی کہ میرا باپ شہر کے ایک اونچے تاجر خاندان میں میرا رشتہ کرنے کا ارادہ رکھتا ہے جو باپ شفقت اور محبت سے میرے سر پر ہاتھ رکھ کر میری فرمائشوں اور ضروریات کا مجھ سے پوچھا کرتا تھا میری معذوری کے بعد اب مجھ پر محض ترس کھا کر میرے سر کو تھپتھپاتے ہوئے گزر جاتا ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ میرے باپ نے میرے علاج میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی مگر جب میرے علاج کی ہر کوشش ناکام ہوتی چلی گئی تو وہ بھی شاید علاج کا خرچ اٹھانے کو اپنا فرض سمجھ کر اس کے بعد میرے معاملے سے یا شاید پھر میری زندگی سے دستبردار ہو گیا۔‘‘

اب اس کی آنکھوں سے آہستہ آہستہ باقاعدہ آنسو اترنے لگے۔

’’صرف اپنے باپ کے ترس آمیز رویّے کی وجہ سے مجھے اپنی ماں بہن بھائیوں کی محبت بھی محبت نہیں بلکہ محض ہمدردی محسوس ہونے لگی حالانکہ میں جانتی ہوں میں غلط ہوں کہ وہ سب مجھ سے بے پناہ محبت کرتے ہیں لیکن مجھ میں شاید محبت کرنے کی سکت باقی نہیں رہی شاید میں نے خود ہی محبت کی بہاروں پر سردیوں کے موسم کو آواز دے کر بلایا اور قبول کیا ہے۔۔ جانتے ہو ان تمام باتوں کے باوجود ایک مان، ایک آس، ایک امید باقی تھی کہ وہ دن ضرور پلٹ کر آئے گا جب ایک بار پھر میرا باپ میرے سر پر اپنا ہاتھ رکھ کر اپنی شفقت اور محبت میری وجود میں اتار کر مجھے اپنے سینے سے لگائے گا لیکن۔۔‘‘ آواز اس کے گلے میں اٹک کر رہ گئی اور وہ کچھ توقف کے بعد بولی۔

’’لیکن اس شب قیامت میں میرا سارا مان چکنا چور ہو گیا کتنی مختصر تھی میری خوش فہمی کی عمر۔۔ کاش۔ کاش۔ کاش میں نے جس گھڑی یہ آس امید لگائی تھی اسی لمحے مجھے موت آجاتی کم از کم میری خواہش کا بھرم ہی رہ جاتا۔‘‘

میں نے اس کے ہینڈ بیگ سے ٹشو پیپر نکال کر اسے دیے تو اس نے بمشکل اپنا ہاتھ اپنی آنکھوں تک اٹھاتے ہوئے آنسو پونچھے۔

میں بالکل خاموش بیٹھا چپکے چپکے اس کا زہر پی رہا تھا۔

وہ کچھ دیر آنکھوں پر ٹشو رکھے ہولے ہولے سسکیاں لیتی رہی اور پھر اچانک عجیب وغریب لہجہ میں کہا۔

’’ڈاکٹرز کہتے ہیں کہ مجھے اپنا بہت خیال رکھنا چاہیے بہت دیر تک ایک ہی کروٹ لیٹنے کی وجہ سے میرے جسم پر زخم بن سکتے ہیں اور اگر یہ زخم بگڑ گئے تو موت واقع ہوسکتی ہے۔‘‘

میں ایک لمحہ کے لیے سانس لینا بھول گیا کہ اتنی بڑی بات بات وہ کتنی آسانی سے کہہ گئی لیکن وہ بغیر میری پروا کیے بولتی چلی گئی۔

’’کاش میں تمہیں اپنے جسم پر وہ زخم دکھا سکتی جنہیں میں بخوشی پال رہی ہوں میں انہیں زخم نہیں بلکہ اپنا نجات دہندہ سمجھتی ہوں‘ اس کی آنکھیں یک دم چمکنے لگیں

میرا جسم کانپ اٹھا گویا کہ اس کا زہر میرے پورے وجود میں اپنا اثر کر رہا تھا لیکن اس کے باوجود میں نے بڑی مشکل سے اپنے خشک حلق کو بولنے پر آمادہ کرتے ہوئے کہا۔

’’یہ خودکشی ہے زمین۔‘‘

یہ سنتے ہی اس کی سانسیں بے قابو ہوگئیں وہ کھانسنے لگی لیکن اس نے کوئی جواب نہیں دیا میں نے اسے سمجھانے کی غرض سے لب کھولے۔

’’خودکشی حرام ہے۔۔ زندگی سے فرار بزدلی ہے۔‘‘

’’میں مانتی ہوں کہ خودکشی حرام ہے۔‘‘ وہ میری بات کاٹتے ہوئے چلائی۔

’’ہاں! ہاں! خودکشی حرام ہے لیکن صرف زندہ لوگوں کیلئے۔‘‘

میری رگوں میں دوڑتا گرم خون برف ہوگیا

اس کی آنکھوں میں وحشت اتر آئی۔

’’زندگی ان کو مبارک جنہیں زندگی کی نعمتیں عطا ہوں لیکن جو لوگ جیتے جی مر جائیں ان پر خودکشی کیسے حرام ہوسکتی ہے؟۔۔ بولو‘ اسکی آنکھوں کی سرخی سے دل کی جلن کا اندازہ بخوبی ہوتا تھا۔

میں نے ایک مرتبہ پھر اس کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے کر بہت ہی عجز کے ساتھ اسے خدا، قرآن اور رسول کے واسطے دیے کہ وہ ایسی باتیں نہ سوچا کرے لیکن وہ کسی اور ہی عالم میں تھی کہ درد خود بخود اس کی زبان پر آتا اور بہتا چلا جا رہا تھا ’لوگ سمجھتے ہیں کہ ان اونچے اونچے محل نما بنگلوں میں رہنے والی نسل اپنے والدین کے حد سے زیادہ لاڈ پیار سے بگڑ کر معاشرے میں خرابی پیدا کرتی ہے باپ کی جائز ناجائز دولت پر عیش کرنے والی اس خودسر ضدی نسل کو کیا خبر کہ غم کیا ہوتا ہے؟ زمانے والوں کو ہر سال اپنی گاڑیوں کے ماڈلز بدلنے والوں پر ہی خدا مہربان نظر آتا ہے لیکن ان نادان لوگوں کو کون سمجھائے کہ ان قیمتی کوٹھیوں میں سے ایک کوٹھی میں میری جیسی لڑکی بھی رہتی ہے۔ دولت کے ڈھیر کے نیچے دبی ہوئی لڑکی، لاڈ پیار اور توجہ کی ترسی ہوئی لڑکی، وسیع وعریض کمروں میں گھٹی ہوئی لڑکی، ایک ہی چھت تلے رہتے ہوئے والدین سے کٹی ہوئی لڑکی، ایسی سہمی ہوئی معذور لڑکی جو اپنی جھوٹی شان وشوکت کا لبادہ اوڑھ کر زمانے کو مرعوب کرتی پھرتی ہے لیکن درحقیقت وہ اندر سے بالکل مفلس ہے۔ خالی ہے۔ قریب المرگ ہے‘

میرا جی چاہ رہا تھا کہ بنا کسی کی پروا کیے اس کا ہاتھ اپنے لبوں سے جوڑ لوں اور اس کے بدن سے سارا زہر چوس کر باہر پھینک دوں!

......☆......☆......

اس دن کی گفتگو کے بعد میں کئی راتیں سو نہیں سکا عجیب سی غمگین کیفیت میرے اوپر حاوی رہنے لگی تھی

اسکندر رومی کی فتوحات کا راز

اسکندر رومی سے پوچھا گیا۔ آپ نے مشرق ومغرب کے ملکوں کو کس طرح فتح کیا؟ اس لیے کہ آپ سے پہلے بادشاہ آپ سے زیادہ خزانے، ملک، عمر اور لشکر رکھتے تھے مگر ان کو ایسی کامیابی حاصل نہیں ہوئی سکندر نے فرمایا۔ اللہ بزرگ و برتر کی مدد سے میں نے جس سلطنت پر قبضہ کیا اس کی رعیت کو ستایا نہیں اور پچھلے بادشاہوں کی خیرات کے طریقوں کو بند نہیں کیا اور ان بادشاہوں کا نام ہمیشہ بھلائی سے لیا برائی سے کبھی کسی کا تذکرہ نہیں کیا۔

فائدہ: جو لوگ دنیا سے چلے گئے ہیں ان کے نیک نام کو ضائع مت کرو تاکہ تمہارا نام دنیا میں باقی رہے۔

انتخاب: زرینہ الیاس......شیخوپورہ

مجھے اپنے جسم پر کبھی کبھی مفلوج ہونے کا شائبہ ہوتا۔ تنہا کمرے میں گھنٹوں کرسی پر بیٹھ کر اپنے توانا بدن میں زمین کے معذور جسم کو محسوس کرتا رہتا کبھی اس کی اداس باتوں کو سوچ سوچ کر اپنا خون جلاتا اور کبھی خیالوں میں اس کے ساتھ شادی کر کے مستقبل کے خواب بننے لگتا اسکا سہارا بن کر اس کے تمام غموں کو مٹا دینے کے خواب دیکھا کرتا تھا میں خود اپنی اس حالت پر حیران تھا۔

ستمبر کے مہینے میں یونیورسٹی کی رونقیں اپنے عروج پر تھیں۔ سیڑھیوں، کھلے لانوں، راہداریوں، کینٹینوں اور درختوں تلے ہر جگہ طلبہ و طالبات طوطا مینا کی جوڑیوں کی طرح سر ملائے بیٹھے دکھائی دیتے تھے۔

ایک دن میں اور میرا دوست عفی یونیورسٹی مین گیٹ سے ڈیپارٹمنٹ کی طرف روانہ تھے۔

چلتے چلتے عفی نے ایک اداس لیلی مجنوں کی جوڑی کے پاس سے گزرتے ہوئے کہا' یہ محبت وحبت کے چکر میں زیادہ تر ہمارے مڈل اور لوور مڈل کلاس کے لونڈے لونڈیاں ہی تم کو گرفتار نظر آئیں گے'

میرے چلتے قدم یکدم رک گئے اور میں نے اس کی طرف گھور کر دیکھا۔

''کیوں بھئی محبت بھی تم کو کسی خاص طبقے کی میراث نظر آتی ہے؟ کوئی اونچی ذات نظر دکھائی دیتی ہے؟ کم از کم محبت کو تو معاف کر دو'

اس نے ہلکا سا قہقہہ لگایا اور میرا بازو پکڑ کر مجھے دوبارہ چلنے پر آمادہ کرتے ہوئے کہا۔

''حد ہے یار۔ اسکولوں، کالجوں، یونیورسٹیوں، ٹیوشن سینٹرز، لینگویج کمپیوٹر سینٹرز، پارکوں، ریسٹورینٹوں جدھر نگاہ ڈالو وہاں ہیریں چوری کھلا رہی ہیں اور رانجھے بانسری بجا رہے ہیں'

میں نے اپنا ہاتھ سر پر مارتے ہوئے کچھ کہنا چاہا مگر وہ باقاعدہ ارد گرد اشارہ کرتے ہوئے بولتا چلا گیا۔

''اپنے معشوقوں کے ساتھ بیٹھی ہوئی ان لڑکیوں کے چہروں کو ذرا غور سے دیکھنے کی کوشش کرو تمہیں تمام لڑکیوں کے چہروں پر جلی حروف میں 'ضرورت رشتہ' کا اشتہار چسپاں نظر آئے گا۔''

اس کی بات پر میرا بے اختیار قہقہہ لگانے کو جی چاہا لیکن میں نے خود کو ایسا کرنے سے باز رکھا۔

''جبکہ ان کے ساتھ بیٹھے ہوئے لڑکوں کی آنکھوں میں دیکھو تمہیں شادی کے جھنجٹ کے علاوہ باقی تمام آرزوئیں نظر آئیں گی' اس نے ایک انتہائی بے ہودہ قسم کا اشارہ کرتے ہوئے بات مکمل کی۔

'واہ! کیا بکواسی ماری ہے۔۔ غلیظ انسان' میں نے بات مذاق میں اڑاتے ہوئے رفتار تیز کر دی۔

''او بھائی میاں میں بکواس نہیں کر رہا' اچانک وہ کسی مرے ہوئے بوڑھے پروفیسر کی روح سے ٹکرا گیا' ہم مڈل کلاسیے جو پچھلی نصف صدی سے اشرافیہ کے ظلم وستم کا رونا چلے آ رہے ہیں ناں۔۔ تو ایک نظر ہمیں اپنے کرتوتوں پر بھی ڈالنی چاہیے۔۔ او بھائی درسگاہوں کو ہم لوگوں نے ہی فلرٹ مارکیٹس بنا رکھا ہے۔

میرے پاس دلیلیں بہت تھیں لیکن چونکہ عفی کا تعلق بھی مڈل کلاس سے تھا اس لیے میں نے اس کی باتوں کی قطعاً پرواہ نہ کی بلکہ محض اسے تنگ کرنے کی غرض سے جوابی کارروائیاں وقفے وقفے سے جاری رکھیں 'کل جب ان سب کی شادیاں ہو جائیں گی تو تمہارا یہ سارا فلسفہ دھرے کا دھرا رہ جائے گا'

اس نے اپنے سر پر مکا مارتے ہوئے کہا' او۔ محبت کو شادی سے مشروط کرنے والے عاشقو، سدھر جاؤ، محبت آزاد ہوتی ہے یہیں سے تو مڈل کلاسیے مار کھا جاتے ہیں سنو بھائی، کاندھے سے کاندھا ملا کر بیٹھنے سے ہوس رگڑ کھاتی ہے اور لکھ لو کہ ہوس کی چنگاری سے محبت کا شعلہ نہیں نکلتا'

'پھر محبت کے جن کو کیسے قابو کریں سامری صاحب اس پر بھی ذرا روشنی ڈالیں' مجھے ابھی تک اس کی باتیں اندر سے گدگدا رہی تھیں

''یہ محبت وحبت سب فضول کی بکواس ہے جو لوگ تعلیم کے ساتھ مخلص نہیں رہ پائے جس کے ساتھ ان کا اور انکی آنے والی نسلوں کا مستقبل وابستہ ہے وہ محبت خاک کریں گے سب ٹائم پاسی ہے جگر' اس نے سگریٹ سلگاتے ہوئے بات جاری رکھی 'بڑے پتے کی بات کہنے لگا ہوں ذرا غور سے سننا' اس نے دو انگلیوں کے درمیان جکڑی ہوئی سگریٹ میرے سامنے لہراتے ہوئے کہا 'مغرب کا سرخی پاؤڈر ہماری اشرافیہ نے اتنا استعمال نہیں کیا ہو گا جتنا آج یہ ہماری مڈل کلاس اور لوور مڈل کلاس کی لڑکیاں اپنے منہ پر مل رہی ہیں اندھا دھند تھوپ رہی ہیں اور آئینے میں اپنا آپ دیکھ کر خود ہی چیخ مار کر مرتی بھی جا رہی ہیں' اس نے ایک گہرا کش لیتے ہوئے میری طرف دیکھا

میں اسکی بات کا مطلب اچھی طرح سمجھ گیا تھا کہ سرخی پاؤڈر سے اس کی کیا مراد ہے لیکن میں اس پر ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا اور نہ ہی کوئی رائے دینے یا بحث کے موڈ میں تھا اس لیے میں نے مذاقاً کہا 'بناؤ سنگھار، سرخی پاؤڈر تو لڑکیوں کا پیدائشی حق ہے یار'

'اور وہ لڑکے جو انکے چہروں سے یہ سرخی پاؤڈر صاف کرتے پھر رہے ہیں تو کیا یہ لڑکوں کا پیدائشی حق ہے۔ الو' اس نے ترکی بہ ترکی جواب دیا اور ساتھ ہی لچر قسم کی آنکھ مار کر مسکرا دیا

'کاش یہ ڈیپارٹمنٹ یونیورسٹی گیٹ سے اتنا دور نہ ہوتا' میں نے زیر لب بڑبڑاتے ہوئے کہا۔

عفی کسی امیر طالبعلم کی قریب سے گزرتی ہوئی لش پش گاڑی کو دیکھتے ہوئے ایک بار پھر بے قابو ہو گیا 'بھائی سو باتوں کی ایک بات یہ ہے کہ تم مڈل کلاسیے نہ مشرقی ہو نہ مغربی ہو بلکہ بیچ میں لٹکی ہوئی کوئی چمگادڑ نما چیز ہو جبکہ ہمارے ایلیٹ طبقے کی نسل کا طرز زندگی مکمل طور پر مغربی ہے وہ جسمانی بھوک کو محبت کے ڈھونگ سے مشروط نہیں کرتے بس جہاں بھوک لگی منٹوں میں فاسٹ فوڈ کی طرح یہ کھایا۔۔ وہ گیا۔۔ وقت ضائع کرنا ان کے مسلک میں حرام ہے سرکار۔ وہ تم لوگوں کی ان پکنک پوائنٹ نما درسگاہوں کی طرف دیکھتے بھی نہیں بلکہ ہارورڈ، آکسفورڈ اور کیمبرج جیسی درسگاہوں سے تم لوگوں کو اپنا غلام رکھنے کا ہنر سیکھ کر آتے ہیں انکی توجہ اپنے باپ دادا کی دولت کو ضرب دینے پر مرکوز رہتی ہے اسی لیے نصف صدی پہلے کے امراء کا شمار آج بھی رئیسوں میں ہوتا ہے وہی چند خاندان جو قیام پاکستان سے لے کر آج تک حکمران چلے آ رہے ہیں آج بھی لاٹھی ہلا رہے ہیں۔ بھائی میاں یاد رکھو! دولت سمیٹنے والے ہاتھ اپنے ہاتھوں کو بغیر میلا کیے ہوئے پیسہ کمانے کا گر اپنی آل اولاد کو سکھا کر کفن اوڑھتے ہیں یہ سالے آسانی سے جلدی مرتے بھی نہیں' عفی نے پے در پے سگریٹ کے تین کش لیتے ہوئے بات جاری رکھی 'جس وقت تم مڈل کلاسیے کیمپس کی سیڑھیوں پر ایک دوسرے کی آنکھوں میں گم محبت کا راگ الاپ رہے ہوتے ہو ٹھیک اسی لمحے یہ ینگ فیوڈل لارڈز کرنسی نوٹوں پر قائداعظم کی جگہ اپنی تصویر چھاپنے کے خواب دیکھ رہے ہوتے ہیں۔ اونچے عہدوں اور ایوانوں تک پہنچ کر بائیس کروڑ عوام کو اپنے جوتوں تلے رکھنے کا پلان اپنے وسیع وعریض شاندار ڈرائنگ روموں کی میزوں پر پھیلائے سر جوڑ کر بیٹھے ہوتے ہیں'

جونہی ہم ڈیپارٹمنٹ کی طرف مڑے عفی نے سگریٹ کا آخری کش لیتے ہوئے فلٹر پھینک دیا

میں نے دل میں شکر کا کلمہ پڑھا۔۔ وہ لیکچر پورا کرنے کے موڈ میں تھا لیکن میں اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونس کر تقریباً بھاگتے ہوئے کلاس روم میں جا گھسا

میں نے جان بوجھ کر اس کی باتوں میں دلچسپی ظاہر نہیں کی کیونکہ ان میں مجھے کہیں بھی زمین دکھائی نہیں دی اسکا تعلق نہ تو مڈل کلاس سے تھا اور نہ ہی اسکے خوابوں میں کسی اونچے عہدے تک پہنچنے کا خواب شامل تھا۔۔ بچپن سے لے کر اب تک وہ اپنی کسی بھی خواہش کے پورا نہ ہونے کے خوف سے آزاد رہی تھی لیکن اس کے باوجود محرومیوں نے اسے چاروں اطراف سے گھیر رکھا تھا یقیناً جس دن اس کا جنم ہوا ہو گا اس وقت محبت بانٹنے والے فرشتے نے اس کے گھر میں شادیانے، منہ میں سونے کا چمچ، ارد گرد خاندان والوں کی مسرتوں کا شور، ملازموں میں نقدی اور غریب غرباء میں صدقات تقسیم ہوتے دیکھ کر یقیناً سوچا ہو گا کہ اس بختاور کو محبت کی کیا ضرورت اور اس کے حصے کی محبت کسی چھوٹی سی بستی میں پیدا ہونے والے بچے کو اضافی دے دی ہو گی جسکے باپ کے پاس دائی کو دینے کیلئے سو روپے بھی جیب میں نہیں ہونگے شاید یہی وجہ ہے کہ اکثر اونچے طبقے کی نوجوان نسل نچلے طبقے کے لڑکے لڑکیوں میں دلچسپی لیتے ہوئے نظر آتے ہیں اور اپنے حصے کی محبت پاتے ہیں۔

(ان شاءاللہ باقی آئندہ ماہ)

محبت مجھے اسیر کردو

بحیرہ نیلم

محبت انسان کو کب کس سے ہو جائے اس پر کسی کو اختیار نہیں رہا ہے جب ہی ہر ذی روح اس سے بچنے کی سعی ضرور کرتا ہے مگر یہ تاق میں رہتی ہے اور اپنا اسیر کرتی مجنوں بنا دیتی ہے ایک ایسا ہی قصہ جس میں اس کے پاس محبت کے الفاظ تو تھے مگر سامنے ادھورا وجود تھا۔

قارئین افق کیلئے بطور خاص

آج وہ اس کے سامنے تھی، پورے دس سال تین ماہ اور پانچ گھنٹوں کے بعد...... اس دن کا سجل حسن نے بڑی شدت سے انتظار کیا تھا۔

وقت بہت ظالم شے ہے یہ انسان کو اسی مقام پر لا کھڑا کرتا ہے۔ جس مقام پر اس نے کبھی کسی اور کو کھڑا کیا تھا۔ یہ دنیا تو مکافات عمل ہے، انسان جو بوئے گا وہی کاٹے گا۔ انسان کیوں بھول جاتا ہے کہ وہ اپنے اعمال کی کچھ سزا اس دنیا ہی میں بھگت کر جائے گا اور دوسروں کا برا چاہنے والا بھلا خود کیسے خوش رہ سکتا ہے۔

اس کے بے رونق چہرے کی اداسی گزشتہ دس سالوں کی تھکن کی عکاسی کررہی تھی، گویا وہ اس سے سب کچھ چھین کر بھی تہی دامن تھی۔ وہ نرمین احمد جس نے اس سے اس کا سب کچھ چھین لیا تھا۔ سب کچھ پا کر بھی وہ آج خالی ہاتھ تھی۔

''مجھے معاف کردو سجل، میں...... میں تمہاری قصور وار ہوں۔'' آنسوؤں کے دو قطرے چپکے سے سجل کے رخسار بھگو گئے تھے۔

......☆☆......

''محبت کیا ہے؟'' ہال میں ایک پُر شوق آواز، گونجی۔

سجل نے ڈائس پر کھڑے ہوئے اس آواز کے تعاقب میں نظریں دوڑائیں۔ پولیٹکل سائنس فائنل سمسٹر کا طالب علم حارب مصطفیٰ اس سے مخاطب تھا۔ اس نے پل بھر کو آنکھیں موندیں جیسے محبت کو محسوس کرنا چاہ رہی ہو اور دوسرے ہی پل اپنی ازلی خود اعتمادی سے گویا ہوئی۔

''عمدہ سوال۔ محبت...... محبت گیلی مٹی کی اس خوشبو کی مانند ہے جو انسان کی سانسوں کو مہکا دیتی ہے، اس طرح کے بعض اوقات ہمیں اس کا ادراک ہی نہیں ہو پاتا۔'' اس کا ایک ایک لفظ گویا دل سے نکل رہا تھا۔ اس کی پُر فریب آواز نے پورے ہال میں سکتہ سا طاری کردیا تھا۔

''محبت اس احساس کا نام ہے جو ہمیں اپنا پسندیدہ گلاب کا پھول توڑتے وقت ہوتا ہے، ایک خوب صورت احساس، اسے بے حد پسند کرنے اور پانے کی چاہت رکھتے ہوئے بھی ہم توڑتے نہیں اسے تاکہ مرجھا نہ جائے۔ محبت پرندے کی اس اڑان کا نام ہے، جو آسمان کی بلندیوں پر اڑتا ہے تو ہمارے دل میں اسے پانے کی خواہش ابھرتی ہے، لیکن ہم اس کے پر کاٹ کر اسے اپنے پاس قید نہیں کرتے بلکہ ہواؤں میں اسے رقص کرتا دیکھ کر، اسے خوش و آزاد دیکھ کر اسے چھونے یا پکڑنے کی خواہش دل میں دبا لیتے ہیں۔ محبت اپنی ذات میں مکمل ہوتی ہے، سمندروں سی وسعت رکھتی ہے اور اپنی وسعت سے دوسرے کو بھی مکمل کردیتی ہے۔ یہ



کسی کے وجود سے نہیں ہوتی...... محبت میں کوئی خامی کوئی کمی اہمیت ہی نہیں رکھتی۔ معنی رکھتا ہے تو صرف محبتوں سے بھرا دل...... اور اگر ایسا نہ ہو تو ہمارے پیارے نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم بلال حبشی سے اس قدر محبت نہ کرتے۔ کیوں کہ محبت تو اس ایمان کی مانند ہے جو بن دیکھے اپنے اللہ پر رکھتے ہیں۔'' پورا ہال زور دار تالیوں سے گونج اٹھا تھا۔

اس ہال میں دو انسان اور بھی موجود تھے، ایک وہ جس کے دل میں محبت کی اس ملکہ کے لیے دیے جل اٹھے تھے اور کوئی ایسا بھی تھا جس کے دل میں اس کے لیے حسد کے سائے اور گہرے ہوگئے تھے۔ آنے والے وقت میں کیا ہونے والا تھا یہ کوئی نہیں جانتا تھا۔

......☆☆......

اور اگلے ہی روز حارب مصطفیٰ نے سجل کے سامنے اپنے دل کا حال بیان کردیا۔ جسے سجل نے کمال بے نیازی سے ٹھکرا دیا تھا۔ بے حد اصرار کے ساتھ وہ اپنا فون نمبر کاغذ کی چٹ پر لکھ کر اس کی گود میں رکھ گیا تھا۔ اور کہا تھا کہ وہ اس بارے میں سنجیدگی سے سوچے۔

کیونکہ زندگی کے بائیس سالوں میں کبھی بھی کسی لڑکی نے اسے اتنا متاثر نہیں کیا تھا، جتنا ان چند دنوں میں سجل حسن نے کردیا تھا۔ وہ اس کے لیے بہت مخلص اور اسے اپنا بنانا چاہتا تھا۔

وہ تھی ہی ایسی...... شوخ و چنچل سی، بادِ صبا جیسی، روشن پیشانی، ذہانت سے بھرپور آنکھیں، ستواں ناک، متناسب ہونٹوں کے نیچے ٹھوڑی سے ذرا اوپر بھورا تل...... کسی طلسم کی طرح اپنی طرف کھینچتا ہوا، دودھ سے دھلی رنگت، نین نقش ایسے گویا اللہ نے بہت فرصت سے بنایا ہو۔

شہر کی سب سے مشہور یونیورسٹی جس کے اخراجات آسمان کو چھوتے تھے، وہ اسکالرشپ کی بنیاد پر آئی تھی اور یہیں ہاسٹل میں رہائش پذیر بھی تھی۔ اکنامکس اس کا جنون تھا اور وہ فرسٹ سمسٹر میں تھی۔ پہاڑ جیسا حوصلہ رکھنے والی وہ لڑکی اپنی منزل کو جلد حاصل کرنا چاہتی تھی اور منزل تھی بھی بہت قریب۔ ظاہری خوبصورتی کے ساتھ ساتھ، وہ اندرونی خوبصورتی سے بھی مالا مال تھی۔ ہر کوئی اس کی اچھائی اور ذہانت کا قائل تھا۔ اس کا اعتماد اس کی صلاحیتوں اور ذہانت کا منہ بولتا ثبوت تھا، اس پر بلاشبہ رشک کیا جاسکتا تھا۔

کیا کسی کی زندگی اتنی بھی مکمل ہوسکتی ہے۔ اس کی زندگی پر حسد کرنے والے بھی بے شمار تھے۔ انہی میں ایک وہ بھی شامل تھی۔ اس کی بہترین سہیلی...... زرمین احمد اور یوں یونیورسٹی کے سب سے حسین اور قابل طالب علم حارب مصطفیٰ کے دل میں بھی سجل نے بسیرا کرلیا تھا چونکہ سجل کو اس کی شادی کی پیشکش میں کوئی دل چسپی نہیں تھی۔

سو اس نے کاغذ کو دو تین حصوں میں تقسیم کیا اور گراؤنڈ میں پڑے گملے میں پھینک کر آگے بڑھ گئی۔ وہی کاغذ کے ٹکڑے کسی اور نے اٹھا لیے اور انھیں جوڑ کر نمبر اپنے موبائل میں محفوظ کرلیا تھا۔ شیطان اپنی چال چلنے والا تھا۔

......☆☆......

سجل سے اس کی ملاقات یونیورسٹی کے پہلے روز ہوئی تھی۔ یونیورسٹی کی سب سے حسین لڑکی اس معمولی سی شکل و صورت اور سانولی رنگت کی حامل زرمین احمد کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھائے گی۔ اسے یقین نہ تھا...... اتفاق سے ان کے ہاسٹل میں ان کا کمرہ بھی ایک تھا سو جلد ہی وہ اچھی دوستیں بن گئیں۔ لیکن اپنی ازلی احساس کمتری نے جلد ہی اسے سجل سے متنفر کردیا تھا۔

''ہونہہ اللہ نے سب اسے ہی کیوں دے دیا ہے؟'' وہ جلتی کڑھتی رہتی تھی۔

''سجل حسن......'' ٹیچرز، سے لے کر طلباء تک۔ نصابی سرگرمیوں سے لے کر ہر مشغلے میں اس سے بڑھ کر کوئی نہ تھا۔ ہر کوئی اس کے گن گاتا، وہ بس ہنستی رہتی، زرمین اندر تک جلتی رہتی۔ زرمین شاید نہیں جانتی تھی کہ جب ہم کسی سے حسد کرتے ہیں تو درحقیقت اپنا ہی نقصان کررہے ہوتے ہیں اور اس طرح خود کو بہت پیچھے لے آتے ہیں۔

لیکن یہ باتیں اس کی سمجھ سے باہر تھیں حسد کی چنگاری تو پہلے ہی اس کے دل میں جل رہی تھی اس چنگاری نے آگ تب پکڑی، جب زرمین احمد کی پہلی محبت حارب مصطفیٰ...... بھی سجل حسن کا طلب گار نکلا۔ شاید زرمین نے سجل کی ذات کا صرف ایک رخ دیکھا تھا۔ اگر دوسرا دیکھ لیتی تو اس کی روح تک کانپ جاتی۔ اس کی ذات کا دوسرا رخ کون سا تھا...... کون جانتا تھا۔

......☆☆......

دو دن بعد زرمین نے اپنا کھیل شروع کردیا تھا اور حارب کو کال ملائی اور کہا کہ وہ سجل ہے اور اسے بھی حارب سے پہلی نظر میں محبت ہوگئی تھی۔

حارب کے تو پاؤں ہی زمین پر نہیں ٹک رہے تھے۔ ہو تو خوشی سے پاگل سا ہوگیا تھا، اگلے چند دنوں میں گویا معمول بن گیا تھا۔ روزانہ لمبی لمبی فون کالز پر بات کرنا۔ اعتراف و اقرار کے سلسلے بڑی تیزی سے عبور ہو رہے تھے۔

''اچھا مجھے یہ سمجھ نہیں آتی کہ یونی میں، میں جب بھی آتا ہوں تم تو میری طرف ایک نظر ڈالنا بھی گوارا نہیں کرتی...... کیا میں اتنا برا دکھتا ہوں۔'' حارب نے الجھن زدہ لہجے میں پوچھا۔

''ارے نہیں...... نہیں تم تو جانتے ہو نہ حارب یونی میں میری کتنی عزت ہے۔ میں نہیں چاہتی کہ کوئی مجھے تمہارے ساتھ دیکھ کر غلط سمجھے۔ کیونکہ ہمارا رشتہ بہت پاکیزہ ہے...... تم سمجھتے ہو ناں اور پلیز تم یونی میں مجھے کبھی مخاطب کرنے کی کوشش نہ کرنا۔''

''مگر سجل......'' وہ الجھا۔

''تمہیں میری قسم۔'' وہ فوراً سے پیشتر بولی۔ ''مجھے فخر ہے اپنی محبت پہ جو کہ اتنی پاکیزگی رکھتی ہے کہ کسی کی غلط نظر بھی اپنے پیار پر پڑنا پسند نہیں کرتی۔'' وہ مطمئن

یمن کے بادشاہ کی حاتم طائی سے دشمنی

مجھے یہ یاد نہیں یہ حکایت مجھ سے کس نے کہی یمن میں ایک دولت مند بادشاہ تھا' اس کو بخشش کا بادل کہا جاتا تھا اس لیے کہ اس کے ہاتھ درہم کی بارش برساتے تھے۔ کوئی آدمی اس کے سامنے حاتم کا نام لیتا تو بہت غصہ ہو جاتا کہ اس کی باتیں کیا حقیقت رکھتی ہیں جس کے پاس نہ ملک ہے' نہ حکم ہے اور نہ خزانہ ہے۔ ایک مرتبہ بھری محفل میں اس نے لوگوں سے حاتم کی تعریف سنی تو حسد نے دشمنی پر آمادہ کردیا۔ ایک شخص کو حاتم کے قتل پر مقرر کیا کہ جب تک یہ میرے زمانہ میں ہے میرا نیک نام مشہور نہیں ہوگا۔ اس بدبخت نے اس مشہور سخی کو قتل کے ارادہ سے بنی طے کا راستہ لیا۔ راستہ میں ایک نوجوان نے اس کا استقبال کیا جس سے اس کو محبت کی بُو آئی' خوب صورت عقل مند شریں زبان۔ وہ اس رات اس کو اپنے گھر مہمان بنا کر لے گیا۔ مہمان کے ساتھ شرافت برتی' غم خواری کی اور خدمت میں کوتاہی کی معافی چاہی' نیکی سے اس دشمن کا دل جیت لیا۔ صبح کو اس کے ہاتھ پیر پر بوسے دیئے اور کہا: ہمارے پاس چند روز اور ٹھہر جاؤ۔ یمن والے نے کہا: میں اب رک نہیں سکتا اس لیے کہ مجھے ایک بڑا کام کرنا ہے۔ میزبان نے کہا: اگر آپ بتائیں تو میں ایک دوست کی طرح پوری کوشش کروں گا۔ اس نے کہا: اے بہادر! دھیان سے سُن اس لیے کہ بہادر پردہ پوش ہوتے ہیں۔ اس علاقہ میں شاید آپ حاتم کو جانتے ہوں گے جو مبارک نام نیک سیرت ہے' اس کا سر یمن کے بادشاہ نے مانگا ہے' مجھے معلوم نہیں کہ ان کی کیا دشمنی ہے۔ آپ کی مہربانی سے مجھ کو یہ امید ہے کہ اس کی جگہ جہاں وہ رہتا ہے مجھے بتادیں۔

نوجوان میزبان ہنسا کہ حاتم تو میں ہی ہوں' سر حاضر ہے' تلوار اٹھا اور تن سے جدا کرلے۔ ابھی رات کا وقت ہے اپنا کام پورا کرلے ورنہ پھر صبح ہونے کے بعد تجھے کوئی نقصان پہنچے یا تُو ناامید ہو۔ جب حاتم نے دل کھول کر اپنا سر پیش کردیا تو وہ شخص چیخ پڑا' زمین پر گر گیا اور اٹھا کبھی زمین چومی' کبھی حاتم کے ہاتھ پیر چومے تلوار پھینک دی اور ترکش رکھ دی پھر غلاموں کی طرح باادب سامنے بیٹھ گیا اور کہا: اگر میں تیرے جسم پر ایک پھول بھی ماروں تو میں مرد نہیں ہوں بلکہ مردوں کی اصطلاح میں عورت ہوں' اس کی دونوں آنکھیں چومیں اور بغلگیر ہوا اور وہاں سے یمن کی طرف روانہ ہوگیا۔

بادشاہ اس کی پیشانی سے سمجھ گیا کہ اس نے کام نہیں کیا ہے پوچھا کیا خبر ہے؟ شکار دان میں سر کیوں نہیں باندھا شاید حاتم نے تجھ پر حملہ کردیا اور تُو مقابلہ نہیں کرسکا' چالاک بہادر نے زمین کو بوسہ دیا بادشاہ کی تعریف کی اور آداب بجالایا پھر کہا: اے بخشش اور ہوش والے بادشاہ! حاتم کے بارے میں یہ خبر سُن' میں نے اس کو ہنرمند' بہادر اور خوش اخلاق دیکھا' اس کی مہربانی نے میری کمر توڑ دی' احسان اور بڑائی کی تلوار سے اس نے مجھے مار ڈالا' اس نے اس کے جو اخلاق دیکھے تھے بتائے' بادشاہ نے قبیلہ طے والوں کی تعریف کی' قاصد کو انعام دیا کہ سخاوت حاتم کے نام پر ختم ہوگئی' اس کی حقیقت اور شہرت ساتھ ساتھ ہیں اگر لوگ اس کی تعریف کریں تو وہ اس کا بالکل حق دار ہے۔

مرسلہ: عظیم راہی...... ملتان

ہو گیا تھا۔

"تم کبھی مجھے چھوڑو گے تو نہیں نہ حارب؟" غالباً اس کے دل میں بچھڑنے کا خدشہ تھا۔

"ارے بالکل بھی نہیں...... پاگل ہو گیا...... تمہارے بغیر جینے کا تو میں تصور بھی نہیں کر سکتا۔ میں ممی پاپا سے بات کرتا ہوں کہ اب وہ پاکستان آئیں اور بیٹے کے سر پر سہرا سجا دیں اور پھر ہم ایک ہو جائیں گے کبھی نہ جدا ہونے کے لیے، سجل حسن صرف میری ہو جائے گی۔" اس کے لفظ لفظ میں سچائی تھی۔

"ارے نہیں...... نہیں اتنی جلدی بھی کیا ہے ہماری پڑھائی تو مکمل ہونے دو۔" وہ سٹپٹائی۔

"جس طرح آپ کہیں ویسا ہی ہو گا ملکہ عالیہ۔" وہ چاہت سے بولا۔ پر قدرت کو شاید کچھ اور ہی منظور تھا۔

......☆☆......

آنے والے دن بہت اذیت ناک تھے۔ ایک طرف نرمین حارب مصطفیٰ کی محبت میں پور پور ڈوب چکی تھی اور دوسری طرف اس بات کا بھی ڈر رہی تھا کہ جب اسے سچائی معلوم ہو گی تو کیا ہو گا۔

"کیا وہ اسے چھوڑ دے گا؟ نہیں...... نہیں میں تو مر جاؤں گی اس کے بغیر......" بچپن سے ہی اس نے سب کچھ کھویا ہی تو تھا۔

پہلے والدین، بہن بھائیوں کی محبت، شکل و صورت ہر طرح سے وہ کم تر تھی اور اب حارب مصطفیٰ اس کی ضد بن چکا تھا۔

"ہونہہ...... سب کچھ تو ہے سجل کے پاس...... ایک حارب کو میں حاصل کر لوں تو اس کا کیا جائے گا۔"

"سجل......" وہ رات کو دوپٹہ اتار کر ایک سائیڈ پہ رکھنے کے بعد کمبل کھولتے ہوئے سونے کی تیاری کر رہی تھی۔ جب نرمین نے اسے پکارا۔

"ہوں بولو۔" اب وہ لیٹ کر کمبل اوپر اوڑھ چکی تھی۔

"حارب مصطفیٰ تمہیں کیسا لگتا ہے......؟" وہ چھت پر نظریں جمائے گویا کسی غیر مرئی شے کو تلاش کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

ایک پل کو سجل کی آنکھوں میں روشنیوں کے دیے جل اٹھے تھے، لیکن اگلے ہی لمحے گویا ویرانیاں سمٹ آئی تھیں۔

"اچھا ہے......" اس نے لاپروائی سے جواب دیا۔

گو کہ سجل حارب کی آنکھوں میں اپنے لیے سچے جذبوں کی شدت کو بخوبی دیکھ چکی تھی۔ جو اکثر گزرتے وقت ایک نرم سی مسکراہٹ اسے پاس کر دیتا تھا۔ چھ فٹ لمبے قد کے ساتھ کسرتی بدن اور رعب دار شخصیت کا حامل حارب مصطفیٰ بلاشبہ متاثر کن انداز کا حامل تھا۔

مگر جانے کیوں وہ خاموش تھی۔

"پسند کرتی ہو کیا...... اگر وہ تم سے شادی کرنا چاہے تو کرو گی کیا؟" وہ ہنوز چھت کو تک رہی تھی۔

"کیا بکواس ہے نرمین...... حد ہوتی ہے بات کو کہاں سے کہاں لے جاتی ہو۔" سجل کو خوامخواہ ہی غصہ آ گیا تھا۔

"میں جو پوچھ رہی ہوں وہ بتاؤ کرو گی یا نہیں؟" نرمین جواب حاصل کرنے پہ بضد تھی۔

"ہرگز نہیں کروں گی...... سن لیا اب سونے دو بہت نیند آ رہی ہے۔" یہ کہہ کر اس نے فوراً لائٹ بند کی اور رخ موڑ لیا مبادا وہ اس کی آنکھوں پہ اٹکے موتیوں سے اس کے دل کا حال نہ جان لے۔

وہ کیسے بتاتی کہ حارب کو تو وہ پہلی نظر میں اپنا دل دے چکی تھی۔ وہ اسے بہت اپنا اپنا سا لگا تھا دل کے بہت قریب لیکن جانے کیا بات تھی کچھ سوچ کر اس کی آنکھیں بھیگ گئی تھیں۔

"اللہ تمہیں ہمیشہ خوش رکھے حارب مصطفیٰ......" اس نے دل سے دعا دی تھی۔

"کوئی اتنا بھی مجبور ہوتا ہے کیا؟"

......☆☆......

اور اگلے ہی دن وہ حارب سے پوچھ رہی تھی۔

"اگر کوئی تمہیں مجھ سے بھی زیادہ چاہے تو؟"

"تو چاہتا رہے میرے دل کی سیج پر تو صرف اور صرف سجل حسن براجمان ہیں اور یہ جگہ کسی اور کو نہیں مل سکتی مادام......" وہ شوخ ہوا تھا۔

وہ چپ سی ہو گئی آنے والے دنوں میں کیا ہونے والا تھا۔ تین زندگیاں بالکل بدلنے والی تھیں۔ کسی کو اندازہ نہیں تھا۔

"جو بھی ہو حارب میں تمہیں حاصل کر کے ہی رہوں گی اور اس میں اللہ بھی میرا ہی ساتھ دے گا۔" وہ خود سے مخاطب تھی۔

ایک سال یونہی آنکھ مچولی میں گزر گیا۔ یونیورسٹی میں سجل کو مخاطب نہ کرنے کی اس، نے قسم اٹھا رکھی تھی اور دوسری طرف فون کالز کے ذریعے اس نے حارب کو مکمل اپنے زیر اثر کر لیا تھا۔ حارب کا آخری سمسٹر مکمل ہوا اور وہ پوری سنجیدگی کے ساتھ سجل کے ساتھ شادی کے بارے میں سوچنے لگا تھا۔

ان دونوں کا ابھی ایک سمسٹر باقی تھا اور سجل کو پڑھائی مکمل ہونے کے بعد اپنے خوابوں کی تعبیر ملنی تھی۔

"صورت کا کیا ہے سیرت سے تو مجھے ہی چاہتا ہے نہ اور شادی کے بعد میں اسے اپنی محبت سے بدل لوں گی...... اپنا بنا لوں گی۔" وہ مکارانہ چالیں سوچ سوچ کر خوش ہوتی رہتی اب بس تاش کے دو پتے کھیلنے باقی تھے۔

سجل کو کسی طرح یہاں سے بہت دور کرنا اور حارب مصطفیٰ کو اپنا بنانا، منزل اس کے بہت قریب تھی۔

......☆☆......

وہ بہت عام سا دن تھا۔ ماحول کی سوگواری شاید آنے والی قیامت کی پیش گوئی کر رہی تھی۔ آخری سمسٹر کے امتحانات ہو رہے تھے ابھی ایک سمسٹر باقی تھا، سجل بہت مطمئن تھی کیونکہ اس نے تمام سوالوں کی تیاری بہت اچھے طریقے سے کی تھی۔ کمرہ امتحان میں سب طلباء اپنی اپنی باتوں میں مگن تھے۔ کوئی نوٹس کھولے رٹ رہا تھا۔ کوئی بے فکر بیٹھا ہنس رہا تھا۔ سجل نے یہ منظر دیکھا اور اپنی کرسی پر رول نمبر دیکھ کر باہر آ گئی، ابھی تھوڑا وقت باقی تھا۔

ہلکی دھوپ نکلی ہوئی تھی وہ وہی گھاس پر بیٹھ گئی اور انگلیوں کی پوروں سے سبز گھاس پر موجود شبنم کے قطروں کو محسوس کرنے لگی۔ یہ جانے بغیر کہ کلاس روم میں شیطان اپنی چال چل رہا تھا۔

......☆☆......

وہ ہال میں آئی تو ممتحن صاحب نے باری باری سب میں سوالیہ پرچے تقسیم کیے اور جب سب اپنے اپنے پرچوں کی طرف جھک گئے، تو ممتحن صاحب نگرانی کی غرض سے چکر کاٹنے لگے۔

تقریباً آدھا گھنٹا یونہی گزر چکا تھا کہ اچانک ان کی نظر رول نمبر 37 کی کرسی پر پڑی۔ اس کے اوپر لگی آرم کے نیچے سے کچھ سفید چیز دکھائی دے رہی تھی وہ فوراً ادھر آئے اور اس کاغذ کو باہر نکال لیا اور پڑھنے کی دیر تھی کہ غصے سے ان کے چہرے کی رگیں تن گئیں۔

"واٹ از دس مس سجل حسن۔" وہ کاغذ اس کی جانب بڑھاتے ہوئے پوچھ رہے تھے سجل کو کسی انہونی کا احساس ہوا تھا۔ اس نے دھڑکتے دل سے وہ کاغذ ہاتھ میں لیا۔

زمیں آسمان اس کی نگاہوں کہ آگے سے گھوم گئے۔

تمام سوالات کے فارمولے اس پر درج تھے۔

"بتایئے مس سجل واٹ دا ہیل اٹ از......"

"سر...... سر...... یہ مم...... میرا نہیں ہے اللہ کی قسم مم...... میں نے نہیں رکھا یہاں سر میرا...... میرا یقین کیجئے۔" بے یقینی سے وہ بامشکل اپنی صفائی دے پائی تھی۔

"تو اس کا مطلب ہے یہ ہم نے رکھا ہے ادھر؟ بہت ہی نامعقول حرکت کی ہے آپ نے' آپ اپنی غلطی چھپانے کے لیے ہم پر الزام لگا رہی ہیں۔" ہال میں موجود سبھی طلباء متوجہ ہو گئے تھے۔

"جی...... میرا یہ مطلب نہیں۔" اس کی آواز گلے میں اٹک گئی تھی۔

"ایک تو چوری اوپر سے سینہ زوری۔" شور کی آواز، سے امتحانی عملی کمرہ میں داخل ہوا تھا۔ اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ اپنی بے گناہی کا ثبوت کیسے دے۔

"سر...... سر...... دیکھیں، آپ تو جانتے ہیں نہ مجھے...... میری تعلیمی کارکردگی کا بھی پتا ہے' میں نے بہت اچھی تیاری کی ہوئی ہے۔" وہ منمنائی۔ خدارا میرا

یقین کیجئے۔ اسے لگ رہا تھا آج اس کا آخری دن ہے۔
"شٹ اپ سجل حسن۔" پروفیسر خالد غرائے۔
"ہمیں آپ سے یہ امید بالکل بھی نہیں تھی...... میں تو آپ کو ایک ہونہار طالبہ سمجھتا تھا۔ آپ نے ہمارے ڈپارٹمنٹ کا نام شرم سے جھکا دیا ہے بہت شرم ناک حرکت کی ہے آپ نے اور اس کی سزا آپ کو بھگتنی پڑے گی۔" وہ گویا اس کی کوئی بات سننے کو تیار ہی نہ تھے۔
"ڈپٹی آفتاب اصغر امتحان میں نقل کا پرچہ برآمد ہونے کے جرم میں تین سال تک کے لیے ان کی ڈگری منسوخ کردی جائے۔ یہ کسی بھی ادارے سے امتحان دینے کی اہل نہ رہیں۔" سجل کا دماغ ماؤف ہوگیا تھا۔
"ایسے طالبات کے ساتھ یہی ہونا چاہیے تاکہ دوسروں کے لیے عبرت ہو۔" اس کی موت کا فیصلہ سنا دیا گیا تھا۔
"سر اللہ کی قسم میرا یقین کیجیے...... کیسے یقین دلاؤں آپ کو میں...... میں نے نہیں کیا یہ سب...... میری ڈگری منسوخ نہ کیجیے۔ میں برباد ہو جاؤں گی۔" وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔
"یہ ہمارا حتمی فیصلہ ہے، مس سجل، آپ اب جا سکتی ہیں۔" حتمی فیصلہ سنا دیا گیا تھا۔ ہر طرف چہ میگوئیاں ہو رہی تھی۔
ایسی لگتی تو نہیں تھی...... کوئی کہہ رہا تھا شکل دیکھو کام دیکھو۔ مجھے تو لگتا ہے ذہانت کا نراڈھونگ ہی تھا کوئی کہہ رہا تھا۔
انسان بہت عجیب ہے اگر کسی میں وہ ایک خامی بھی دیکھ لے تو اس کی سب اچھائیاں بھول جاتا ہے...... اس کا دل کر رہا تھا وہ زمیں میں سما جائے۔ اس نے تو آج تک کسی کا برا بھی نہیں چاہا تھا پھر اس کے ساتھ کس نے کیا ایسا...... اس کا دماغ شل ہوگیا تھا۔
یونیورسٹی کی پوری عمارت اسے اپنے اوپر گرتی محسوس ہوئی اس کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا تھا۔

......☆☆......

شام کے سائے گہرے ہو رہے تھے...... ابھی ایک اور قیامت ڈھلنا باقی تھی۔
اس نے فون پکڑا اور حارب مصطفیٰ کو کال ملائی۔ رابطہ ہونے پر ڈرامہ شروع ہوگیا۔
"حارب...... حارب...... کہاں ہو تم...... میں...... میں بہت بڑی مصیبت میں ہوں...... مجھے بچالو حارب پلیز مجھے بچالو۔" وہ مگرمچھ کے آنسو بہا رہی تھی۔
"کیا ہوا سجل خیریت تو ہے تم رو کیوں رہی ہو جلدی بتاؤ مجھے۔" وہ بہت فکر مند ہوگیا تھا۔
حارب تمہیں ابھی اسی وقت مجھ سے نکاح کرنا ہوگا۔ اس نے فوراً کہا۔
"سجل ریلیکس رہو، میں نے ممی پاپا سے بات کرلی ہے وہ اگلے ہفتے آرہے ہیں۔ پھر سب کی موجودگی میں ہمارا نکاح ہوجائے گا اور رخصتی تمہاری پڑھائی پوری ہونے کے بعد کرلیں گے۔" اس نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔
"نہیں میرے پاس زیادہ وقت نہیں حارب میں نے تمہیں بتایا نہیں میرے چچا چچی بہت ظالم اور لالچی لوگ ہیں...... میں ان کے ساتھ رہتی ہوں۔ وہ میری شادی 45 سالہ امیر بڑھے شخص سے کروانا چاہتے ہیں۔ وہ بہت برا انسان ہے، میں تمہارے سوا کسی اور کو سوچ بھی نہیں سکتی۔ ہم نکاح کے بعد سب کو راضی کرلیں گے حارب تمیں ابھی مجھ سے نکاح کرنا ہوگا۔ ورنہ...... ورنہ میں جان دے دوں گی۔" آخری دھمکی کارگر ثابت ہوئی۔
"ٹھیک ہے سجل میں تمہارے بغیر جینے کا تصور بھی نہیں کرسکتا تم کہاں ہو میں ابھی آتا ہوں۔" وہ فکر مندی بولا۔
"میں گلشن ٹاون کے بلاک 5 میں ہاؤس نمبر 8 میں ہوں اپنی سہیلی کے گھر۔"
"میں نے نکاح کا بندوبست کرلیا ہے جلدی آؤ اس سے پہلے کے دیر ہو جائے۔" اس نے اپنا آخری پتہ پھینکا تھا۔
"میں پندرہ منٹ میں پہنچتا ہوں۔" اس نے گاڑی کی چابی اٹھائی اور اپنی بربادی کی طرف روانہ ہوگیا۔

......☆☆......

عجلت میں نکاح پڑھا دیا گیا۔ شاید وہ پاگل ہوگئی تھی، اپنی ضد پوری کرنے میں اور صحیح غلط کی پہچان کھو بیٹھی تھی۔ دلہن کو گھونگٹ میں بٹھایا ہوا تھا۔
"شادی مبارک ہو......" اس کی دوست ان دونوں کو کمرے میں چھوڑ کر خود باہر چلی گئی۔
"آ ہمم...... اب تو چہرا دیکھا دو جان من، اب تو میں پورے حقوق کے ساتھ حاضر ہوں۔" اس نے بہت پیار سے گھونگٹ اٹھایا۔ "زرمین تم......!" وہ جھٹکے سے پیچھے ہوا، گویا بجلی کی ننگی تار کو چھولیا ہو۔
"ہاں حارب میں تمہاری بیوی۔" وہ سرشاری بولی۔ قیامت آکر گزر چکی تھی۔
"یہ کیا بکواس ہے...... سجل کہاں ہے؟" وہ حیرانی کے عالم میں بولا۔
"حارب...... سجل نہیں ہے...... آج تک میں ہی تم سے بات کرتی رہی جسے تم سجل سمجھتے رہے...... اور میں تم کو اتنا پیار دوں گی اتنا کہ تم بھول جاؤ گے اسے وہ تم سے پیار نہیں کرتی بلکہ نفرت کرتی ہے...... میں تم سے پیار کرتی ہوں اور تمہیں بہت پیار دوں گی اتنا کہ تم اندازہ نہیں کرسکتے۔" وہ آگے بڑھی اور دیوانوں کی طرح اس کے سینے سے لگ گئی۔
"بکواس بند کرو کمینی عورت۔" اس نے اسے خود سے الگ کرتے ہوئے ایک زوردار تھپڑ مارا۔ رخسار پر انگلیوں کے نشان ثبت ہوگئے تھے۔
"تم جیسی گھٹیا لڑکی جو اپنی خوشی کے لیے دوسروں کو برباد کرسکتی ہے، کیا جانے محبت کیا ہوتی ہے، میں نے اس کی اچھی سوچ' اس کے لفظوں کی سچائی سے محبت کی ہے۔ تم جیسی حاسدانہ ذہن کی مالک عورت کبھی میرے دل تک رسائی حاصل نہیں کرسکتی۔ لعنت بھیجتا ہوں میں تم پہ جا رہا ہوں میں اپنے پیار کے پاس۔"
"تت...... ممم مجھے چھوڑ کے نہیں جاسکتے میں...... میں تمہاری بیوی ہوں اب۔" اس نے حارب کو روکنا چاہا۔
"نہیں مانتا میں اس دھوکے کے رشتے کو چھوڑو مجھے۔" اس نے اپنا آپ اس سے چھڑوایا۔
"حارب وہ چلی گئی بہت دور تم...... اب صرف میرے ہو...... صرف میرے۔" حارب پاگل سا ہوگیا۔
"ہٹو پیچھے۔" اس نے اسے دھکا دیا۔

......☆☆......

جانے دنیا کے کس کونے میں جا چھپی تھی۔ حارب پاگلوں کی طرح اسے دن رات ڈھونڈتا رہا...... اسے رہ رہ کر زرمین پر غصہ آتا۔
وہ عورت پہ ہاتھ اٹھانے کا قائل نہیں تھا مگر زرمین کی اس گھٹیا حرکت نے اسے مجبور کردیا تھا۔
"پہلے میں نے سوچا تھا کہ تمہیں طلاق دے دوں۔ لیکن نہیں میں تمہیں ایسی سزا دوں گا کہ تمہاری روح تک کانپ جائے گی...... موت سے بھی بدتر حالت ہوجائے گی تمہاری...... موت مانگو گی پر تمہیں وہ بھی نہیں مل سکے گی۔" اس نے اسے بالوں سے پکڑ کر جھنجوڑا۔
"تم نے میری سجل کو مجھ سے دور کیا...... اس کی زندگی میں زہر گھولا...... میں تمہیں کہیں کا نہیں چھوڑوں گا، نہ تم میری ہوسکو گی اور نہ کسی اور کی ہو پاؤ گی ساری عمر یونہی سڑتی رہو گی۔ اسی کی سزا کی تم مستحق ہو۔" زرمین اندر تک کانپ گئی تھی۔
یہ کہیں سے بھی وہ حارب مصطفیٰ نہیں لگ رہا تھا۔ جو اس پر جان لٹانے کے دعوے کرتا تھا، یہ تو کوئی محبتوں میں لٹا ہوا دیوانہ لگ رہا تھا، اس نے اسے زور سے بیڈ پر پٹخا تھا۔
اور سنو...... خبر دار جو کبھی اپنی منحوس شکل لے کر میرے پاس آنے کی یا بات کرنے کی جرات بھی کی تو ورنہ جان سے ہاتھ دھو بیٹھو گی۔" لال بھبھوکا آنکھوں سے اس نے اسے انگلی کے اشارے سے وارننگ دی۔
"اور اس گھر سے باہر قدم بھی نکالنے کی کوشش نہ کرنا یہ میرا حکم ہے۔ آخر بیوی ہو تم میری۔" آخر میں وہ طنزیہ مسکرایا۔
زرمین کو لگا کہ اس کی زندگی کو کسی مظلوم کی آہ اسے لگ گئی ہے۔

......☆☆......

وقت کو گزرنا ہوتا ہے وہ گزر ہی جاتا ہے...... اچھا ہو

یا برا۔

حارب نے اسے کہاں کہاں نہیں ڈھونڈا تھا لیکن اسے نہ ملنا تھا نہ ملی اور اسی دوران حارب کے والدین کینیڈا کی فلائٹ کریش ہونے کے باعث اس دنیا سے کوچ کر گئے تھے، حارب کی بزنس سیٹنگ کی وجہ سے وہ کراچی شفٹ ہوگئے تھے۔

زمین کو ایک بے جان چیز کے علاوہ اس گھر میں اور کوئی اہمیت نہیں مل پائی تھی۔ گھر کاٹنے کو دوڑتا جس سے وحشت ہوتی تھی اندر سے باہر چکر لگا لگا کے وہ پھوٹ پھوٹ کر رویا کرتی اس نے کیسی محبت کی تھی کہ اپنی محبت سے ہی اس کی خوشی چھین لی' کتنی خودغرض تھی وہ جس نے اپنی سہیلی کو بے عزت کیا تھا جو اسے سب سے زیادہ اپنا مانتی تھی۔

''خوشیاں کبھی بھی چھین کر حاصل نہیں کی جاسکتیں، ہم کسی دوسرے کی گود خالی کرکے اپنی گود کیسے بھر سکتے ہیں؟ دس سال تک وہ یونہی نامراد رہی تھی اپنی زندگی کی سب سے بڑی خواہش پوری کرکے بھی وہ خالی ہاتھ رہی تھی۔ حارب اپنی بات پر پورا کھرا اترا تھا۔ اس نے ان دس سالوں میں کبھی اسے ایک بے جان چیز سے زیادہ نہ دی تھی۔ جب بھی وہ بلانے کی کوشش کرتی وہ سخت لہجے سے بولتا کہ اس کی روح تک کانپ جاتی۔

وہ دن بھر گھر میں تنہا بھٹکی روحوں کی طرح چکر لگاتی رہتی۔ اسے بار بار سجل کا معصوم چہرہ یاد آتا۔ جس سے اس نے سب چھین لیا تھا، کبھی وحشت میں آکر چیزیں اٹھا اٹھا کر پھینکتی خودکشی حرام نہ ہوتی تو جانے کب کی کرچکی ہوتی۔ پھر اس کے دل کو سکون آنے لگا جب اس نے رب سے رابطہ استوار کرلیا۔ نمازیں لمبی ہونے لگیں۔

''بس ایک بار مجھے اس سے ملوادے یارب۔'' وہ رو رو کر دعا کیا کرتی۔ ''مجھے میرے گناہوں سے بری کردے اے اللہ مجھ میں اب اور ہمت نہیں رہی۔''

......☆☆......

اور پھر شاید اللہ نے اس کی سن لی تھی۔ دس سال بعد اس نے حارب سے سجل کا واسطہ دے کر اس سے جاب کرنے کی اجازت مانگی آخر زندگی کے دن بھی تو پورے کرنے تھے۔ جسے حارب نے بے دلی سے اجازت دے دی تھی۔

شاید زندگی میں پہلی بار اسے اس پہ کچھ رحم آیا تھا۔ اخبار میں 'ایچ ایس ملٹی نیشنل کمپنی' میں جاب کا اشتہار پڑھا۔ وہ نہیں جانتی تھی وہ جس ماضی سے بھاگ رہی ہے وہ اس کے سامنے آنے والا ہے آخر جو کیا تھا اس کا حساب بھی تو دینا تھا۔

......☆☆......

اور اگلے دن جب انٹرویو کے لیے آفس میں داخل ہوئی تو زمین آسمان اس کی آنکھوں کے سامنے گھوم گئے، وقت اتنی جلدی گزر گیا تھا۔ اس کا اندازہ اسے آج ہوا تھا۔

وہ آج بھی اتنی حسین لگ رہی تھی بلکہ وقت کی تمازت نے اسے مزید پُروقار بنادیا تھا، اور اسے ہر طرح سے برباد کردیا تھا، آج بھی وہ اس کے سامنے کامیاب کھڑی تھی۔

''ایچ ایس ملٹی نیشنل کمپنی'' کی اکلوتی مالک اور یہ سب اس نے اپنی ذہانت، انتھک محنت، صبر اور لگن سے حاصل کیا تھا۔ جبکہ اس کے پاس کیا تھا۔

''سجل......! سجل مجھے معاف کردو...... پچھلے دس سالوں سے میں اذیت میں مبتلا ہوں، تمہارا سب کچھ چھین کر بھی مجھے سکون نہ مل سکا۔ ہمیشہ یہی دعا مانگی کہ ایک بار تم مل جاؤ۔ میں حسد کی آگ میں پاگل ہوگئی تھی، اپنے حواس کھو بیٹھی تھی یہ برداشت نہ کرسکی کے تمہارے پاس سب کچھ ہے حارب بھی تمہارا ہے۔ میں اسے تم سے دور کرنا چاہتی تھی، اس کے دل میں اپنی محبت پیدا کرنا چاہتی تھی۔ لیکن میں غلط تھی سجل۔ اس دن تمہاری سیٹ کے نیچے وہ پرچہ بھی میں نے ہی رکھا تھا تاکہ تم ہماری زندگی سے دور ہو جاؤ ہمیشہ کے لیے۔'' اس کی روتے روتے آواز دب گئی۔

جبکہ سجل آرام سے بیٹھی سب کچھ سن رہی تھی، گویا سب جانتی ہو۔

''میں نے دھوکے سے حارب سے شادی کی...... سوچا تھا اسے اپنی محبت اور چاہت سے اپنا بنالوں گی، لیکن میں غلط تھی سجل بھول گئی تھی کے محبت میں محبوب کے علاوہ باقی کچھ بھی کرنا کفر کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ جیسے خدا کو چاہنے میں شرک کی اجازت نہیں ویسے ہی محبت بھی ان تمام خامیوں سے پاک بلکہ شفاف ہوتی ہے۔ وقت کے گزرے دس سال بھی اسے میرا نہ کرسکے سجل وہ آج بھی تمہارا ہے دل و جان سے اسے اپنا لو سجل...... وہ آج بھی تم سے بے انتہا محبت کرتا ہے۔ خدارا مجھے معاف کردو میں تم دونوں کی مجرم ہوں۔'' وہ اس کے قدموں میں گر گئی تھی۔ رو رو کے اس کی آواز بیٹھ گئی تھی۔

سجل آگے بڑھی اور زمین کو اٹھایا۔

''جاؤ میں نے تمہیں معاف کیا زمین......'' وہ ایسی ہی تھی سمندروں سا ظرف رکھنے والی۔

''میں نے کسی عدالت کا در نہ کھٹکھٹایا بلکہ اپنا فیصلہ اپنے رب کی عدالت میں داخل کردیا تھا، تم اپنے کیے پر شرمندہ ہو میرے لیے یہی بہت ہے۔ شاید اس وقت تم ایسا نہ کرتی تو جس مقام پر میں کھڑی ہوں شاید یہاں نہ ہوتی۔ اس حرکت نے میرے تن بدن میں آگے بڑھنے کی آگ لگادی تھی اور انتظار کی بھٹی میں، میں جل جل کے کندن بن گئی تھی۔'' اس نے زمین کو گلے لگایا' وہ اس کی بہترین سہیلی رہ چکی تھی۔

حارب مصطفیٰ آج بھی اس کی آنکھوں کے جھروکوں میں بستا تھا۔

......☆☆......

''وہ مل گئی......'' آج پہلی بار حارب کو مخاطب کرتے ہوئے زمین کے لہجے میں بلا کا سکون تھا۔

''کون مل گئی؟'' حارب نے شوز کے تسمے بند کرتے ہوئے طنزیہ لہجے میں کہا۔

''سجل حسن......'' وہ آہستہ سے بولی ایک پل کو حارب کی دل کی دھڑکن رک سی گئی تھی، اس کا تسمے باندھتا ہاتھ رک گیا تھا۔

''ک......ک......کہاں ہے وہ جلدی بتاؤ۔'' وہ فوراً اس کے قریب ہوا اور اسے کندھوں سے پکڑ کر پوچھنے لگا۔

خوشی کی رمک آج دس سال بعد اس کے چہرے سے عیاں ہورہی تھی، آج دس سال بعد وہ پہلے جیسا حارب لگ رہا تھا۔

''اوہ حارب مصطفیٰ دس سالوں میں تم آج تک میرے اتنے قریب نہیں آئے، جتنا آج اس کا نام سن کر آئے ہو۔ وہ جیت گئی تھی۔''

''ایچ ایس ملٹی نیشنل کمپنی...... کی آنر ہے وہ۔'' اس نے ہولے سے کہا اور کمرے سے باہر نکل گئی، حارب کے چہرے پر زندگی لوٹ آئی تھی۔

اور اگلے دن ہی وہ اس کے آفس سے ایڈریس لے کر اس کے گھر جا پہنچا...... طبیعت خراب ہونے کے باعث وہ آفس نہیں گئی تھی۔ شاید ماضی کی یادوں نے اسے ہلا کر رکھ دیا تھا، اسے ڈرائنگ روم میں بٹھایا گیا۔ گھر کی خوبصورتی اور بناوٹ اس کے اعلیٰ ذوق کا ثبوت تھی۔

چند لمحوں بعد دل کی دھڑکنیں تھم گئی تھیں۔ وہ سامنے آئی تو ایسا لگا جیسے وقت رک سا گیا ہو۔ وہ دشمنانِ زیست آج اس کے سامنے موجود تھی۔

''آؤ حارب......'' وہ کہتے ہوئے صوفے پر بیٹھ گئی۔

وہ چہرہ جس نے حارب کو اپنا دیوانہ بنایا ہوا تھا' آج بھی اتنا ہی حسین لگ رہا تھا بلکہ اور زیادہ پُرکشش اور پُراعتماد ہوگیا تھا۔ حارب کو لگا جیسے دس سال درمیان میں آئے ہی نہ ہوں۔

''کیسی ہو؟'' وہ دھیرے سے بولا۔

''اچھی ہوں۔'' وہ سرسری سا جواب دے کر صوفے پر لگی فال کو ناخنوں سے کھریدنے لگی۔

''اور تم۔'' چند لمحوں کے بعد وہ بولی۔

''بہت برا ہوں......'' بلاشبہ اس کے چہرے پر دس سالہ جدائی کا غم نمایاں تھا۔ چہرے پر بڑھی شیو اور مرجھایا ہوا چہرہ اس کے نامکمل ہونے کی عکاسی کررہا تھا۔

''اور کیسے آنا ہوا......؟'' ملازم لوازمات کی ٹرے رکھ گیا تھا۔

''میں آج وہ کہانی پوری کرنے آیا ہوں جو آج سے

دس سال پہلے اپنی بے وقوفی کی وجہ سے چھوڑ گیا تھا۔ سنو سجل تم میری پہلی اور آخری محبت ہو میں نے تمہیں دل سے چاہا ہے۔ تم نے مجھے اپنی محبت کے جال میں جکڑ لیا تھا جس سے میں آج تک نکل نہیں پایا تم ساحرہ ہو...... سجل تمہیں بھولنا مجھے کفر کے مترادف لگتا تھا اور دیکھ لو میری سچی محبت جس وجہ سے تم آج مجھے واپس مل گئی۔ میں آج بھی تمہیں اپنانے کے لیے تیار ہوں۔'' وہ بے تابی سے اپنے دل کا حال سنا رہا تھا۔

''بس کہہ لیا اب جاؤں میں......'' چند لمحے سوچنے کے بعد اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

''کیوں کر رہی ہو ایسا سجل؟ تمہاری دوست نے مجھ سے شادی کی تھی دھوکے سے سجل بن کر...... پر مجھ تک رسائی حاصل نہ کر پائی۔ آج تک...... آج تک وہ میرے گھر میں بے جان شے کی طرح پڑی ہے آج تک نہیں اپنایا میں نے اسے کیونکہ میں تم سے پیار کرتا ہوں کاش میں اس وقت تم سے ایک بار پوچھ لیتا اور اپنی محبت کا اعتراف کروالیتا تو آج یہ دن نہ آتا میرے صبر کا اب اور امتحان نہ لو اب میں تم بن جی نہ پاؤں گا۔'' اس کے لہجے میں بلا کا درد تھا۔

''تم کیوں کر رہی ہو خود پر ظلم آخر ایسی بھی کیا مجبوری تھی کے دس سال ایسے جیسے کھو ہی گئی تھی۔ ایک بار بھی تم نے موڑ کر نہیں دیکھا۔ ایک بار مجھے میری محبت کا انتظار کا ثمر دے دو سجل اور میری زندگی میں آجاؤ میرے دل اور گھر میں کب سے جگہ سونی پڑی ہے آج تک کسی کو وہ حق نہیں دے پایا۔ آکر اسے سجادو۔'' وہ نرم لہجے میں بولا۔

''سنیے مسٹر حارب مصطفیٰ۔ میری طرف سے کل بھی انکار تھا اور آج بھی انکار ہے مجھے بھول جاؤ اور نرمین کو دل سے قبول کرلو یہی بہتر ہے ہمارے لیے۔'' یہ کہہ کر وہ فوراً اٹھ کر جانے لگی گویا وہ اس کے پلکوں میں اٹکے موتیوں سے اس کے دل کا حال نہ جان جائے۔

''کوئی اتنا سنگ دل کیسے ہوسکتا ہے۔'' حارب کو حیرت ہوئی۔

''جانتا ہوں تم بھی میرے لیے وہی جذبات رکھتی ہو جو میں رکھتا ہوں، اگر ایسا نہ ہوتا تو تمہارا چہرہ تمہارے الفاظ کی نفی نہ کر رہا ہوتا......'' وہ بھی کوئی جادوگر تھا شاید جو آنکھوں سے دل کی بات جان لیتا تھا۔

شاید محبت کرنے والوں میں یہ حس موجود ہوتی ہے کہ وہ اپنے محبوب کی بات احساس بن کہے جان لیتے ہیں۔

''ضروری نہیں محبت ہر کسی کو مل جائے بعض اوقات کھو دینے کا نام بھی محبت ہوتا ہے اور دل جلوں کے دل جلنے میں بھی تو اپنا ہی مزا ہے اور اس درد کا مزہ محبت کو حاصل کرلینے والے کیا جانیں۔ جو لذت لاحاصل میں ہوتی ہے۔'' وہ محبتوں کی پجارن آج بھی اپنے الفاظ سے امرت اس گھول رہی تھی۔ لیکن آج اس کے الفاظ میں درد اور کھو دینے کا احساس تھا۔

''دیکھو سجل میں صرف اتنا ہی جانتا ہوں کہ تم صرف میری ہو اس کا واضح ثبوت یہی ہے کہ تم نے آج تک شادی نہیں کی تم آج بھی اتنی ہی خوبصورت ہو جتنی دس سال پہلے تھی کیا میں اس کی وجہ جان سکتا ہوں۔'' وہ محظوظ ہوتے ہوئے بولا۔

''پتہ نہیں......'' وہ الجھن کا شکار ہو رہی تھی۔

''لیکن مجھے پتہ ہے تم نے آج بھی اپنے دل میں مجھے بسا رکھا ہے اور تم یہ جگہ کسی اور کو دے ہی نہیں پائی...... میں نے درست فرمایا نا محترمہ۔'' وہ شوخ ہوا۔ شاید محبت ہی انسان کو خوش گمان بنا دیتی ہے۔

''میں نے کہہ دیا نہ کہ ہماری شادی نہیں ہوسکتی تو نہیں ہوسکتی۔''

''اللہ کے لیے...... بس کر دو اب...... پلیز۔'' اسے اب غصہ آرہا تھا وہ اس کے صبر کا امتحان لیے جا رہی تھی۔ حارب کا ماتھا شکنوں کے جال میں سے بھر گیا تھا۔

''کیوں نہیں ہوسکتی تم میری؟ کوئی ایک وجہ بتاؤ۔'' اس نے اسے کندھوں سے پکڑ کر جھنجھوڑتے ہوئے پوچھا۔ ''کیوں خود پر اور مجھ پر بھی ظلم کر رہی ہو۔'' شاید محبت کے انکار پر وہ جنونی ہوگیا تھا۔

''کیونکہ میری شادی کسی سے بھی نہیں ہوسکتی......'' بلا ارادہ ہی اس کے ہونٹوں سے پھسلا اور فوراً ہی اس نے اپنا نچلا لب دانتوں تلے دبا لیا تھا۔

''کیوں نہیں ہوسکتی ہماری شادی بولو؟'' وہ ٹھٹکا۔

''کیونکہ...... کیونکہ......'' اس نے خشک ہوتے گلے کو تر کرتے ہوئے کہا۔

''میں مکمل عورت نہیں...... میں ادھوری ہوں...... میں خواجہ سرا ہوں......'' ضبط کے سارے بندھن ٹوٹ گئے تھے۔ گلے میں آنسوؤں کا پھندا بن گیا تھا۔

آنسو پلکوں کی سرحد توڑ کر بہنے کو تیار تھے۔ لیکن اس نے ہمیشہ کی طرح خود کو سنبھال رکھا تھا کیونکہ وہ خود کو کمزور نہیں ثابت کرنا چاہتی تھی۔ اس کی زندگی کی سب سے بڑی حقیقت جسے آج تک وہ سب سے چھپاتی آئی تھی۔ آج پل بھر میں اسے بتا گئی تھی۔ اسے گویا بچھو نے کاٹ لیا تھا وہ جھٹکے سے دو قدم دور ہوا۔

ایک پل کو در و دیوار ہل گئے، وقت تھم گیا گھڑی کی سوئیاں ٹک ٹک کرنا بھول گئیں دلوں کی دھڑکنیں رک گئیں، حارب مصطفیٰ کو ایسا محسوس ہوا جیسے پورے بنگلہ کا ملبا اس پر آن گرا ہو۔

''بس اتنا ہی پیار تھا نہ...... حارب مصطفیٰ دل والوں کی محبت بس یہیں آکے ختم ہوجاتی ہے۔ ادھورے لوگوں کو کوئی نہیں اپناتا...... ہم جیسوں کے لیے محبت کوئی معنی نہیں رکھتی ہم اس دنیا میں اکیلے جینے کے لیے آتے ہیں اور قبر کی دیوروں تک یہ اکیلا پن ہمارے نصیب میں رہتا ہے۔ کوئی ہمیں اپنانے کے لیے تیار نہیں ہوتا، ہمارا کوئی ساتھی نہیں بنتا سوائے اللہ کی ذات کے...... ہم اس دنیا میں ایک گالی کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں میں نے سوچا تھا کہ میں ایک کامیاب انسان بن کر عام انسانوں جیسا بن کر دکھاؤں گی۔ یہ دکھاوں گی کہ ہمارا وجود محض دھتکارے جانے اور مذاق کا نشانہ بنانے کے لیے نہیں ہے۔ ہمارے سینے میں بھی دل دھڑکتا ہے۔ سوچا تھا، اپنی پہچان بناؤں گی۔ پر میں شاید غلط تھی...... میں کل بھی ادھوری تھی...... آج بھی ہوں اور ہمیشہ رہوں گی۔ ادھورے انسانوں کے ساتھ محبت کون کرتا ہے میں بھول گئی تھی کہ ہمیں تو محبت کرنے کا کوئی حق ہی نہیں۔ اپنوں نے تو کب کا چھوڑ دیا ہے کیونکہ ہم کسی کے ساتھ کے قابل نہیں ہوتے تم بھی آج چلے جاؤ حارب مصطفیٰ اور کسی ایسے انسان کو اپناؤ جو مکمل ہو جو تمہیں زندگی کی ہر خوشی دے سکے۔ جس میں کوئی کمی نہ ہو، مجھ جیسی ادھوری اور نامراد انسان تمہیں کچھ نہیں دے پائے گی۔ کچھ بھی نہیں۔ امید ہے اب سمجھ جاؤ گے۔ جاسکتے ہو۔'' وہ ایک جھٹکے سے اٹھی اور باہر نکل گئی۔ اور وہ بت بنا کھڑا رہا تھا۔

''خواجہ سرا......'' اس نے زیر لب ان دو لفظوں کو دہرایا کتنا درد و کرب تھا، کتنی شدت تھی، عمر بھر کا روگ تھا، محض ان دو لفظوں میں۔

......☆☆☆......

سجل اپنی زندگی کا ایک مقصد لے کر آگے بڑھی تھی بے شک وہ ایک نامکمل لڑکی تھی لیکن اس بات کو لے کر وہ دنیا سے کٹ نہیں گئی اور نہ کہیں چھپ کر بیٹھی بلکہ اس نے اس نامحرمی کے ساتھ دنیا کا مقابلہ کیا اور آج ایک اچھی پوسٹ پر فائز تھی۔

حارب مصطفیٰ جانتا تھا کہ ان دونوں کا ملاپ کسی صورت ممکن نہیں لیکن وہ پھر بھی اس کا ساتھ چاہتا تھا دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر اور محبت کا احترام کرتے ہوئے اس نے سجل کے ساتھ ایک مدرسے کی بنیاد رکھی تھی جہاں اس نے محبت کی شمع کو علم کی روشنی دے کر ہر ذی روح کو تعلیم کے زیور سے آراستہ کرنا تھا۔

نرمین کی دعائیں بھی قبول ہوگئی تھیں، حارب مصطفیٰ کا دل اب پوری طرح نہ سہی لیکن اس کی طرف مائل ہونے لگا تھا اور اس کے لیے یہ بھی بہت تھا اس لیے اب وہ بھی ان دونوں کے ہم قدم تھی۔



حصار

مریم جہانگیر

آخری حصہ

مریم جہانگیر خواتین رائٹروں میں ایک بڑا نام ہے اس ماہ انہوں نے بطور خاص نئے افق کے لئے قالم اٹھایا ہے وہ نئے افق کے قارئین کو کس حد تک متاثر کرتی ہیں اس کا اندازہ آپ کی آرا سے ہوگا انہوں نے روایات سے ہٹ کر موضوع کا انتخاب کیا ہے ان کی تحریر میں آپ کو اسرار بھی ملے گا اور سسپنس بھی ان کا ناول طویل ہونے کے باعث ہم دو حصوں میں شائع کر رہے ہیں۔

پڑھ کر اپنی رائے دینا نہ بھولیے گا



بستر پر کروٹیں لے کر وہ تھک گئی تو بلآخر موبائل تکیے کے نیچے سے نکالا دیکھا تو میسج کا نوٹیفکیشن آیا ہوا تھا کھولا تو مسکراہٹ چہرے پر آ گئی حیدر کا میسج تھا۔

سو جائیں آپ تھک گئی ہوں گی ناں اللہ کے حوالے۔

ماہ: مجھے نینو نہیں آ رہی اب۔

حیدر: کیوں کہاں گئی نینو؟ اٹھ کے کارٹون دیکھ لیں

ماہ: پہلے دیکھا کرتی تھی اب ٹائم نہیں ملتا پاور پف گرلز، ٹام اینڈ جیری، ڈیکسٹرز لیبارٹری اور سکوبی ڈوبی جو اچھے لگتے ہیں

حیدر: اور؟ حیدر جی والے اچھے نہیں لگتے؟

ماہ: الو

حیدر: الو نہیں حیدر جی

ماہ نے موبائل رکھ دیا پانچ منٹ بعد دوبارہ اٹھایا

حیدر: ماہ آپ کو اکیلے میں ڈر نہیں لگتا؟

حیدر: آپ کے پاس آ جاؤں

حیدر: دیکھنا ہے نا آپ کو

ماہ: نہیں

ماہ: بندہ بنیں

حیدر: ماہی باتیں کریں نا مجھ سے صرف

ماہ: کر رہی ہون ناں

حیدر: تم سے ملنا باتیں کرنا بڑا اچھا لگتا ہے

اہ: حیدر۔۔۔۔انسان بنیں

حیدر: بھلا وہ کیسے وہ پل جو میرے بن ہے تو بتا چکا

اہ: فری نہ ہو میرے ساتھ دو نمبر گانے نہ سنائیں مجھے

حیدر: کچھ ٹوٹ گیا ہے اف

ماہ: کیا

حیدر میرا دل

ماہ: جوڑیں بیٹھ کر

حیدر: ماہی جی

ماہ: حیدر آنکھیں بند کریں سو جائیں

حیدر: نہیں سونا آپ بس باتیں کریں

ماہ: میں سو رہی ہوں خررر۔۔۔۔خررر

حیدر: یہ کیا کر رہی ہیں آپ؟

ماہ: خراٹے لے رہی ہوں

حیدر: آپ کو نہیں آتے خراٹے

ماہ: آپ کو کیسے پتہ؟

حیدر؛ اس لیے کہ آپ روز ساتھ ہوتی ہیں

ماہ: نہیں ہوتی ہوں ناں نہیں کریں

حیدر: ہوتی ہیں روز ہوتی ہیں آپ کو کیا پتہ؟

ماہ: کیا ہوتی ہوں؟

حیدر: روز سلاتی ہیں مجھے

ماہ: کیسے؟

حیدر: میرے اتنے پاس ہو کر کہ آپ کے بال میرے چہرے پر ہوتے ہیں

ماہ: حیدر سو جائیں پلیز

حیدر: آپ بالوں میں بہت آرام سے ہاتھ پھیرتی ہیں

ماہ: حیدر کیا ہو گیا ہے آپ کو سو جائیں ناں

حیدر: اپنے ہاتھ سے میری آنکھیں بند کرتی ہیں پھر میں آپ کا ہاتھ پکڑ لیتا ہوں کہ کوئی چھین کر لے نہ جائے

ماہ: حیدر کیا کر رہے ہیں؟

حیدر: آپ جواباً مسکرا کر کہتی ہیں ہمیشہ ایسے ہی رہنا

ماہ: we are not a couple

حیدر: جی لیکن وہ بھی آپ سے ملتی ہے چہرے سے، فطرت سے، خیال رکھنے کی عادت سے

ماہ: کون؟

حیدر آپ۔

ماہ: اف آپ پاگل ہو گئے ہیں ظاہر ہے میں اپنے آپ سے ہی ملوں گی ناں

آپ جاگ جائیں یا سو جائیں اس حالت سے

tunneling کریں پلیز میری heartbeat رکی ہوئی ہے

حیدر: میں بھی اپنے دل کی دھڑکنیں روک لیتا ہوں جب آپ مجھے سلاتی ہیں میں ان لمحات کو محفوظ کرنا چاہتا ہوں روک لینا چاہتا ہوں

ماہ: آپ جان بوجھ کر تنگ کر رہے ہیں مجھے

حیدر: پتا نہیں کیا جادو ہے اس کے ہاتھوں میں وہ ہاتھ رکھتی ہے اور میں سو جاتا ہوں

ماہ: پھر تو آپ کو سلانا آسان ہے ایک ہاتھ رکھنے سے سو جاتے ہیں بچوں کو جھولے دینے پڑتے ہیں لوری سنانی پڑتی ہے پلکوں پہ انگلیاں پھیرنی پڑتی ہیں ماتھے پہ پیار دینا پڑتا ہے آپ سے تو سستے میں جان چھوٹ جاتی ہے بس سر پر ہاتھ رکھ دو تو سو جاتے ہیں

حیدر: جب ان کو لگتا ہے میں سو گیا ہوں اور پریشان ہوں تب میرے ماتھے پر پیار کرتی ہیں بہت ہی کم ایسا ہوتا ہے میں بتاتا بھی نہیں لیکن وہ جان جاتی ہیں

ماہ: آپ کا دماغ جگہ پر آ جائے تو مجھے بتا دینا میں سو رہی ہوں

حیدر: کیوں کیا ہوا ہے مجھے؟

ماہ: پتا نہیں کہاں لے جاتے ہیں آپ مجھے

حیدر: مجھے خود نہیں پتا میں کہاں ہوں

ماہ: واپس آ جائیں نا۔نکل آئیں۔پھنس جائیں گے

حیدر: نہیں آنا واپس کیوں بلا رہی ہیں؟ کچھ دیر تو خوش رہنے دیں

ماہ: واپس جانا ضروری ہے

حیدر: میری دنیا وہی ہے

ماہ: اچھا نہیں بلاتی میں سو رہی ہوں۔

حیدر: اب وہ سونے لگی ہیں میں دل کی دھڑکن کی رفتار کم کر لیتا ہوں

ماہ: حیدر پاگل! invduntary action ہے

حیدر: آپ کے بال بھی ان جیسے ہیں آئیں میری دنیا میں آپ کو ان سے ملواوں

ماہ: حیدر کے بچے وہ کوئی چڑیل ہو گی سارا دن غائب رہتی ہے رات میں آ جاتی ہے

حیدر: ماہی کو کچھ کہنے کی اجازت آپ کو بھی نہیں ہے سمجھی؟

ماہ: کیا کون اب میں؟

حیدر: میں خفا ہو رہا ہوں۔

ماہ نے اپنے ان دیکھے جذبے سمیٹے اور تکیے کے اندر منہ چھپا لیا اب سونا ضروری تھا سکون کہتا ہے محبت چھپائی جا سکتی ہے؟ نیند سے پہلے کچھ نہیں ہوتا اور جب نیند اپنی نرم بانہوں میں سمیٹنے لگتی ہے تو کاش ایسا ہو جاتا سامنے آ کر کھڑا ہو جاتا ہے ان دونوں سٹیٹس کے درمیان امیجنیشن گیلری ہے جس میں اچھی بری تصویریں ہیں کچھ خواب ہیں کچھ امیدیں ہیں کچھ روگ ہیں کچھ سنجوگ سب کی اپنی اپنی یادیں اپنی اپنی نیند اپنی اپنی دنیا کون جانے کس کے آسمان کا چاند کون ہے؟

حیدر: ماہ

علی الصبح ہی موبائل بجا تھا

ماہ: جی

حیدر: رات میں کیا کہتا رہا ہوں میں نے ابھی ہلکا سا دیکھا نہ سر نہ پیر لایعنی باتیں

ماہ: چھوڑ دیں اس پر بات بھی نہ کریں۔

حیدر: میں ایک دفعہ رات کے سارے میسجز پڑھ لوں؟

ماہ: نہیں

حیدر: پلیز پڑھنے دیں ناں

ماہ: نہیں آپ کو میری قسم

حیدر: اف کچھ برا لگا ہو تو معذرت میں نہیں کہنا چاہتا تھا وہ سب پتہ نہیں کیا کیا کہا میں آپ مجھے پڑھنے دیں تا کہ اسی حساب سے تلافی کروں

ماہ: میں نے کہانا میری قسم

حیدر: اچھا میں چپ

ماہ: شاباش

پھر سارا دن موبائل نہیں بجا کچھ باتیں جوانسان اپنے آپ سے چھپائے رکھتا ہے وہ نجانے کیسے ہاتھوں سے نکل جاتی ہے یہ پہلی دفعہ تھا جب حیدر نے ماہ کو اپنے آئیڈیل کی جگہ قابل رسا کے طور پر سوچا تھا اور وہ پچھتا رہا تھا کے نجانے اب ماہ اس کے ساتھ پہلے کی طرح بات کر سکے گی یا نہیں محبت کہیں دور کھڑی حیدر کی پریشان حالی پر مسکرا رہی تھی آج تک کون چھپا پایا ہے محبت کو؟ اس کی خوشبو کس نے قید کی ہے؟ یہ آنکھوں میں چمکتی نظر آتی ہے لمس سے زندگی پاتی ہے تعلق محبت کو مضبوط کرتا ہے اور رشتہ محبت میں ضروری ہوجاتا ہے کون جانے محبت حیدر اور ماہ پر کتنی مہربان تھی ؟ محبت نے انہیں صرف ایک دوسرے سے آشنا کرنا تھا یا پھر ان دونوں پر قسمت نے بھی مہربانی دکھانی تھی اور ان دونوں کا نصیب جڑنا تھا قسمت اب محبت پر مسکرا رہی تھی

......☆❁☆......

رات گہری ہوتی گئی اور دکھ کے سائے اس کے اعصاب پر سوار ہوتے گئے بائیں ہاتھ سے اپنے سینے کو مسلا مگر سکون کا سانس نہ ملا سکا وہ بغیر آواز کے اٹھی اور کمرے سے باہر نکل آئی پیچھے سوئی ہوئی اسری نیند میں کروٹ بدلی اور زرانہ کسمسائی سکون کا سانس لے کر قاسم کے کمرے سے آتی ہلکی روشنی پر نظریں ٹھہر گئیں اللہ میں تجھ سے تیری ایک زمین سے یہ ایک کمرہ مانگتی ہوں اور بس اس ایک شخص کا ساتھ یہ میرے لیے میری دنیا ہے اس نے کمرے کے دروازے پر اپنے ناخن سے ہلکی سی دستک دی وہ بیمار تھی اور یہ بچپن کا دوست اس سے عشق عشق کھیلنے والا اس سے آکر ایک دفعہ بھی خیریت نہ پوچھ سکا وہ پشیمان ہوئی دنیا اس شخص پر ختم نہیں ہوجاتی پھر میں کیون اس کو حرف آخر مان بیٹھی ہوں شاید مڑ ہی جاتی مگر دروازہ کھلا وہ سامنے تھا انہی گہری نظروں اور لمبی بھنوؤں کے ساتھ اس کے مضبوط ہاتھ جن کی نمایاں رگیں روزی کے دل میں مدوجزر کی لہروں سا تلاطم برپا کردیتی تھی۔

ہاں دنیا اسی شخص پر ختم ہوجاتی ہے وہ کچھ دیر پہلے کی سوچ کو جھٹلاتی اندر بڑھی

''کیا چاہتی ہو؟'' قاسم نے تیکھے انداز میں کہا۔

''تمہیں۔'' روزی کی آنکھوں میں سپردگی کی تمام علامتیں نمایاں تھی

قاسم جواباً مسکرایا اور بانہیں وا کردی

''آ و چاہ لو۔''

دور کہیں چیل ننھے چوزے پر ٹوٹ پڑی تھی اس کی بھوکی آواز نے فضا میں اتنی شورش پیدا کردی کہ سبھی کیڑے مکوڑے نکل کر مردار کو چھڑوانے دوڑ پڑے۔ چوزے کا بھنبھوڑا ہوا گوشت چیل کے پنجوں میں شانت ہو گیا۔

مجھ سے شادی کرلو قاسم۔ وہ اس کے پیروں پر ہاتھ رکھتے بولی

دماغ خراب ہوگیا ہے تمہارا۔ قاسم نے بچکانہ حیرت سے کہا

دماغ تمہارا خراب ہوگا جو تم نے میرے سوا کسی کو اپنا بنانے کا سوچا میری طرح بھلا تمہیں کوئی چاہ سکتا ہے؟ روزی کے انداز میں مان تھا

چاہنا ہے اور؟ قاسم کی آنکھوں میں کمینگی تھی روزی ٹھٹکی ہوش بہت دیر سے آیا تھا

''تم میرے ساتھ ایسا نہیں کرسکتے''۔ روزی تڑپی۔

''میں تو تمہارے ساتھ کچھ بھی ایسا یا ویسا نہیں کرنا چاہتا۔'' وہ سپاٹ تھا۔

میں۔۔۔۔روزی کے الفاظ منہ میں رہ گئے

اپنی بکواس بند کرواتنی دیر سے تمہاری منحوس آواز سن رہا

ہوں ہر بات شادی پر آکر ختم ہوتی ہے تمہارے جیسی لڑکیاں ہر دوسرے تیسرے کے تلوے چاٹتی نظر آتی ہیں جسے دیکھتی ہیں دوڑ کر سینے سے لگ جاتی ہیں تم اس دنیا کی آخری لڑکی بھی ہوئی تو شادی کم از کم تم سے نہیں کروں گا

ریجیکشن کے احساس نے بخار میں تپتے جسم کو مزید دہکا دیا اس کے جلتے آنسوؤں کے ساتھ اسری کا وعظ بخارات بن کر اڑ گیا وہ کمرے سے خود سے وعدہ کرتی نکلی قاسم تمہیں میرا ہونا ہی ہوگا تم نے آج ایک روپ دیکھا فدا ہونے والا اب میں تمہیں فدا کروں گی اور تمہیں خدائی بھول جائے گی چاہے اس کے لیے مجھے کوئی بھی راستہ کیوں نہ اپنانا پڑے۔

اسائنمنٹ ملا حیدر نے سکون کا سانس لیا یہ سائنمنٹ اکیلے تیار کرنے والا نہیں تھی فلم gravity میں فزکس کے جتنے اصول بیان ہوئے ان کو سمرائز کرنا تھا ماہ روز اور حیدر کا گروپ اتفاقیہ طور پر بن گیا اب مسئلہ یہ تھا کہاں دیکھی جائے یونیورسٹی میں میل اور فی میل سیٹنگ ایریاز کے بورڈ لگے ہوئے تھوڑی دیر کے لیئے بات ہونا ممکن تھا ساتھ چلنا بھی ممکن تھا لیکن دو گھنٹے یا اس سے زیادہ ساتھ بیٹھ کر فلم دیکھنا اس کا سیدھا سیدھا مطلب رفاہ یونیورسٹی میں stuck off تھا۔

اتنی پرانی فلم تو سینما ہال میں بھی نہیں چل رہی ماہ روز نے پریشانی سے کہا

آپ میرے ساتھ سینما جائیں گی حیدر نے حیرت سے دیکھا۔

اس میں کیا بری بات ہے چلی جاوں گی ماہ روز نے سکون سے کہا

اسے یقین تھا کہ فلم سینما میں لگنا بہت مشکل ہے کیوں کہ فلم سینما مٰن وہی لگتی ہے جسے دیکھنے کے لیے شائقین ہوں اگلے ہی دن وہ اگلے ہفتے کی ٹکٹس لے آیا۔

یہ کہاں سے لے آئے آپ؟ ماہ روز کی آنکھیں پوری کی پوری کھلی۔

ہاہاہا سینما سے لایا ہوں نا بندی اعتبار تو کرتی ہی نہیں ہے دراصل میرا دوست وہاں کام کرتا ہے اس لیئے مجھے یہ فلم لگوانے کے لیئے زیادہ پاپڑ نہیں بیلنے پڑے حیدر نے ہنستے ہوئے کہا ماہ روز نے نظریں جھکا لی یہ لڑکا ہنستے ہوئے بھی نظروں کا ارتکاز نہیں توڑتا کیا مصیبت ہے اس کو 30 نومبر ان دونوں کے سب پیغامات اسی دن کے متعلق باتوں میں گزر گئے حیدر نے کہا تھا بارہ بجے سینما میں فلم لگے گی وہ جب بارہ بجے جناح پارک کے گیٹ پر پہنچی حیدر سامنے کھڑا تھا نیلی جینز اور کالی اور سفید چیک والی شرٹ ماہ روز کو ہنسی آگئی اس نے ایک دفعہ اس شرٹ میں حیدر کی تعریف کی تھی حیدر بھی دھیرے سے مسکرایا ماہ روز نے کالے رنگ کا فراک پہنا تھا جس کے گلے، دامن اور آستین پر مختلف رنگوں کی کڑھائی تھی کالے شیفون کے ڈوپٹے کے کناروں پر گلابی رنگ کی لیس لگی ہوئی تھی۔

آئیں حیدر نے کہا اس کی آواز میں لرزش تھی جیسے طبیعت کی خرابی کا اثر ہو سامنے موجود بینچ پر بیٹھتے ہی ماہ روز نے زپ کھولی اور بیگ میں سے پانی کی بوتل نکالی الٹے ہاتھ سے دوائیوں کا شاپر نکالا اتنا بڑا شاپر دیکھ کر حیدر حیران رہ گیا اتنی دیر میں پیناڈول ہتھیلی پر رکھ کر حیدر کے آگے رکھی اور پانی کی بوتل بھی بڑھائی حیدر نے اپنی ہتھیلی پھیلا دی وہ چاہتا تو اپنی انگلیوں سے بھی اٹھا لیتا لیکن ماہ روز سے اس قسم کا فائدہ وہ خواب میں بھی نہیں اٹھا سکتا تھا ماہ روز کو فخر ہوا کے وہ اس شخص کے ساتھ بیٹھی ہے

''اسلام وعلیکم۔''

''چلیں فلم دیکھنے۔'' ماہ روز نے پوچھا۔

''کونسی فلم حیدر کے انداز میں شرارت تھی

اللہ کے بندے مار نہ کھا لینا مجھ سے۔ ماہ روز تپی

''فلم ڈھائی بجے شروع ہونی ہے آپ کو جلدی اس لیے بلایا کے Quanturo کا sessional بھی تو

تیار کرنا ہے۔" حیدر نے بہت آرام سے کہا جیسے جناح پارک میں بیٹھ کر پڑھتے وہ عجوبے نہیں لگیں گے ماہ روز نے اپنے ماتھے پر ہاتھ مارا وہ کچھ نہیں کرسکتی تھی اب یہاں سے جاتی اور پھر آتی یہ کہاں ممکن تھا

کھولیں کتابیں ماہ روز نے حکم دیا حیدر کی جان میں جان آئی ماہ روز سے بعید نہ تھا کہ وہ اگلے ہی لمحے اٹھ کھڑی ہوتی اس نے فوراسے بیشتر اپنی کتابیں نکالی بینچ کے ساتھ لگے درخت کے پتے تیز ہوا سے ہلنے لگے ان کی آواز نے فضا میں موسیقیت پھیلا دی ماہ روز کوئی سوال سمجھانے لگی حیدر نے اپنے دونوں ہاتھ گالوں پر رکھے اور کہنیاں گھٹنوں پر جمائے وہ اسے دیکھنے لگا ماہ روز کو محسوس ہوا حیدر کی نظریں رجسٹر پر نہیں ہیں وہ اس کی آنکھیں دیکھتا رہا جھکی ہوئی آنکھیں اور خم دار پلکیں ماہ روز کی پلکیں لرزی نگاہیں اب گالوں پر آن ٹھہری روئی کے گالوں کی طرح ہلکے گلابی گال حیا سے لال پڑھ گئے وہ اب کان دیکھنے لگا ماہ روز نے اپنا ڈوپٹہ کھینچ کر آگے کیا تا کہ کان ڈھک سکے حیدر کو ہنسی آئی۔

"ادھر دیکھیں۔" ماہ روز غصے سے چیپٹر کی طرف اشارہ کر کے بولی۔

"دیکھ ہی تو رہا ہوں۔" حیدر اس کی حیا سے محظوظ ہوا۔

میں آپ کو رجسٹر پر دیکھنے کو کہہ رہی ہوں۔ ماہ روز کو احساس ہوا کے شاید یہ میری جھکی نظریں دیکھ کر تنگ کر رہا ہے اس نے پلکیں اٹھا کر حیدر کی آنکھوں میں جھانکا جیسے بتانا چاہتی ہو میں آپ سے نہیں شرماتی لیکن مقابل کی آنکھوں میں خوابوں کی دنیا آباد تھی اور خواہشوں کے طلسم ماہ روز کو بانہیں وا کیے ڈوب جانے کی تاویلیں کرنے لگے تین سیکنڈ سے بھی کم وقت میں اس نے پلکیں واپس جھکا لی قلم اس کے ہاتھ سے گر گیا تھا۔

"اچھا یہ لیں اب میں سمجھ رہا ہوں۔" حیدر نے اسے قلم پکڑاتے ہوئے رجسٹر کو دیکھ کر کہا ماہ روز سوال حل کروانے لگی لیکن اس کے ماتھے پر پسینے کی چمکتی بوندیں بتا رہی تھیں کہ حیدر اس کے چہرے کے تل گن رہا ہے۔

ایک ٹھوڑی پر ایک گال پر اب وہ پلکوں کا ہلنا دیکھ رہا تھا پھر اس کی نگاہیں ہاتھوں پر جم گئیں چھوٹے چھوٹے پیارے پیارے ہاتھ اب ناخن اس شخص کو کوئی ایکسرے مشین کیوں نہیں کہتا ماہ روز نے پہلو بدلا ڈھیروں ڈھیر پتے دونوں پر آ کر گرے ماہ روز نے حیدر کو دیکھا جیسے یہ اس کی شرارت ہو حیدر نے مسکرا کر آنکھوں ہی آنکھوں میں درخت کی طرف اشارہ کیا ہوا چلی تھی اور درخت مہربان ہوا تھا یہ افسانوی سا ماحول کیون بن رہا ہے ماہ روز نے دانتون تلے زبان دی اور انگلیاں چٹختے ہوئے سوچا حیدر کو اس پر پیار آ رہا تھا اتنا پیار کے اگر وہ اس کی آنکھوں میں دیکھ لیتی تو اس بھنور سے کبھی نہ نکل سکتی اس نے اتنے چھوٹے ناخنوں کو شیپ کیسے دی ہوگی حیدر سوچ کر ہنسنے لگا ماہ روز کے کالے بال جن پر دھوپ کی ہلکی سی چمک انہین سنہرا کر دیتی اور اسلیے عکھون کی روشنی اور بالوں کی چمک میں سے مشکل ہو جاتا کے بندہ کس کو دیکھے۔

آپ بلش آن لگا کر آئی ہیں ناں حیدر نے پوچھا حیا سے ماہ روز کے گال اور سرخ ہوئے یہ شخص کیا چیز ہے۔

انسان کیوں نہیں بنتے آپ؟ ماہ روز تنک کر بولی۔

انسان نہیں ہوں کیا میری طرف دیکھ کر بتائیں۔ وہ پھر شرارت پر آمادہ تھا۔

اٹھیں چلیں شو کا ٹائم ہو گیا ہے ماہ روز نے اسے اشارہ کیا حیدر گھڑی کو دیکھ کر حیران ہوا کے کتنی جلدی گزرتا ہے وقت جب دل چاہتا ہے کے وقت رک جائے۔

اب دونوں ساتھ ساتھ سینما کی طرف جا رہے تھے حیدر پیچھے اور ماہ روز آگے حیدر خود اچنبھے کا شکار تھا کے ماجرا کیا ہے وہ ہمیشہ کچھ کھانے کو بھی دینا چاہتی تو بغیر کھائے پہلے حیدر کو دیتی اسے ایسے لگتا تھا کہ پہلے مردوں کے کھانے سے برکت ہوتی ہے باہر سے سخت نظر آنے

والی اندر سے روایتی عورت اور آج یہ روایتی عورت ساتھ چل رہی تھی خیر سینما ہال کے قریب جا کر وہ رک گئی۔

"میرا تو کوئی جاننے والا نہیں جس کے دیکھنے یا نہ دیکھنے سے مجھے کوئی فرق پڑتا ہو لیکن کہیں میری وجہ سے آپ کو کوئی مسئلہ نہ پیدا ہو جائے۔" اس نے حیدر کے کندھے کو دیکھتے ہوئے کہا وہ دوبارہ گہری آنکھوں کو دیکھنے کا رسک نہیں لے سکتی تھی۔

"کھانے کو کیا لوں۔" حیدر نے ہنستے ہوئے اس پاگل لڑکی کی بات کے جواب میں سوال کیا وہ کیسے سمجھاتا کے اگر کسی نے دیکھنا ہوتا تو وہ تو پارک میں بھی دیکھ سکتا تھا اور اگر کوئی دیکھ لے تو یہ بات اسکے لیئے حیرت کا باعث ہو گی لیکن میرے لیئے تو یہ فخر کی بات ہوگی کے میری ساری دنیا میرے پہلو میں آن بیٹھی ہے۔

"پاپ کارن اور کوک۔ ماہ روز نے جواب دیا اور اس کے عین پیچھے کھڑی ہو گئی حیدر کی گردن پر آتے ذرا سے بال یعنی جیسے آج ہی ترشوائے ہوں اور ان بالوں میں ہلکی سی چاندی یہ لڑکے بھی جیل کے چکر میں بالوں کا رنگ اڑا کر رکھ دیتے ہیں ماہ روز کو ہنسی آئی حیدر دیکھنے میں بالکل بھی بوڑھا نہ لگتا بوڑھا لگنا تو دور کی بات وہ تو مکمل طور پر اپنی عمر کا بھی پر تو نہیں تھا اس کے چہرے پر بچوں کی سی بے ساختگی اور بوڑھوں سی متانت تھی لیکن اتنی معصومیت اتنی معصومیت کے جی چاہتا اس کے دونوں گال کھینچ لیے جائیں لیکن ایسا تب ہی ممکن تھا جب اس شخص کی آنکھیں بند ہوں اس کی مقناطیسی آنکھوں کے سامنے چھیڑ چھاڑ کر پانا ممکنات میں سے ہی ہی نہیں۔

وہ دونوں چلتے چلتے ہال میں گئے اور اپنی قطار میں بیٹھ گئے ہال میں ان کے علاوہ صرف اکا دکا ہی لوگ تھے وہ بھی نہ جانے graicty میں کیا دیکھنے آئے تھے فلم شروع ہوئی تھوری دیر بعد ماہ روز کو اپنے بائیں کندھے پر کسی چیز کا بوجھ محسوس ہوا اس نے بہت آہستگی سے چہرہ موڑ کر دیکھا یہ حیدر کا کندھا تھا اس نے غیر محسوس طریقے سے اپنا کندھا اس کے کندھے کے بوجھ سے آزاد کروانا چاہا لیکن نہ ہوسکا اس نے حیدر کو دیکھا وہ ہنس رہا تھا اس کا مطلب یہ شرارت ہے۔

حیدر کندھا ہٹائیں ماہ روز نے ہار مانتے ہوئے لہجے میں کہا۔

ہٹا ہوا ہی تو ہوں حیدر نے ہنستے ہوئے جواب دیا اور تھوڑا مزید اس کے پاس آ گیا حیدر اپنی کرسی کے بالکل اس کنارے پر بیٹھا تھا جو ماہ روز کی کرسی کو لگتا ماہ روز کی کرسی کے ہینڈل پر وہ اپنی کہنی ٹکائے مکمل طور پر آگے ہو کر بیٹھ گیا ماہ روز کا تنفس تیز ہوا اس نے سانس روکنے کی کوشش کی کیوں کے حیدر کا چہرہ اتنا پاس تھا کہ حیدر اس کی سانسوں کی حدت محسوس کر لیتا حیدر کے دماغ سے صحیح غلط کا فرق مٹا ہوا تھا محبت نادانیان کروانے پر تلی ہوئی تھی کتنی ہی دیر ایسے گزر گئی ماہ روز کا کندھا درد کر رہا تھا اپنے آپ کو سکیڑنے کی کوشش میں اس کے کندھے کے عضلات سخت پڑ گئے تھے معنی خیز سی خاموشی ہال کے اندھیرے میں گونجنے لگی interval آ گیا حقیتا دونوں میں سے کوئی نہیں جانتا تھا کے اب انٹرول آنے والا ہے ہال میں روشنی ہو گئی۔

حیدر نے چہرہ موڑ کر ماہ روز کے چہرے کے سامنے کیا وہ ایک دوسرے کی سانسوں کی حدت کو محسوس کر سکتے تھے ماہ روز گنگ سی اس کی خوبصورت آنکھوں کو دیکھے گئی پھر احساس ہوا کے یہ کیا ہو رہا ہے اور سر جھکا کر بولی۔

ایسے نہ دیکھیں حیدر پلیز حیدر شرافت سے پیچھے ہوا اس کے بعد خاموشی بولتی رہی ماہ روز کا چہرہ یوں سرخ ہوا کہ جیسے شادی کے بعد اس کا شوہر اس سے کوئی رومانوی بات کہہ رہا ہو اور حیدر یوں ہی چہکتا رہا کہ جیسے اسے خوش قسمتی پر یقین آ گیا ہو۔

گھر پہنچتے ہی ماہ روز کو حیدر کا اک میسج ملا۔

مجھے آپ کے چہرے پر بھوئیں ایسے لگتا ہے جیسے آپ بنوا کر آئی ہیں اور مصنوعی ہیں مگر یہ فطری ہیں اور بہت پیاری ہیں آپ کی مسکراہٹ جو مجھے دیکھ کر آپ کے چہرے پر آتی ہے خاص طور پر جب آپ مجھے دیکھتی ہیں جیسے کچھ دن پہلے آپ نے کلاس میں مجھ سے پوچھا۔

کچھ سمجھنا ہے؟ اور میرے جواب دینے پر آپ کی مسکراہٹ جان سے مارنے والی۔

آپ کے بالوں کی وہ ہلکی سی چمک جو صرف سورج کی روشنی میں نظر آتی ہے آپ کہتی ہیں کے آپ کے ہاتھ چھوٹے ہیں حالانکہ لڑکیوں کے اتنے ہی ہوتے ہیں آپ کے ہاتھ اتنے نرم لگتے ہیں کہ مجھے ڈر ہے کبھی ہاتھ تھاما تو کہیں میرے ہاتھوں کے نشان نہ پڑ جائیں آپ کی آنکھیں تھوڑی گول اور تھوڑی بادام سی اس وقت زیادہ اچھی لگتی ہیں جب آپ بولتی ہیں آپ کے لفظوں کا ساتھ دیتی پیاری آنکھیں۔

آپ جب دل سے مسکراتی ہیں تو ڈمپلو بنتے ہیں لیکن صرف اس مسکراہٹ سے جو آپ دل سے کریں آپ کا سادہ رہنا بہت پسند ہے آپ میں کشش ہے۔۔۔۔ بہت کشش۔۔۔۔اپنی طرف کھینچنے والی۔۔۔۔لوگ آپ کی ذہانت یا کامیابی سے متاثر ہوتے ہیں جو ان دو چیزوں سے بچ جائیں وہ خوبصورتی کے جال میں پھنس جاتے ہیں عام لڑکیوں میں پائی جانے والی خاص خوب صورتی۔۔۔۔جو آسانی سے مل جاتی ہے

جو چیز آپ کو عام لڑکیوں سے نمایاں کرتی ہے اور مجھے پسند ہے وہ آپ کی وفا ہے

اپنے سے جڑے رشتوں سے کی جانے والی وفا غیر محسوس وفا

ماہ روز ساکت سی بیٹھی رہی یہ شاید زندگی میں آنے والا پہلا شخص تھا جس کو اس کے ڈمپلو نظر آئے۔۔۔۔وہ لاکھ کوشش کرتی مگر چاہنے کے باوجود اپنی کسی سہیلی کو بھی نہ دکھا پائی۔۔۔۔یہ شخص قیامت کی نظر رکھتا ہے

......☆❁☆......

اگلے دن روزی واپس اپنے گھر آ گئی معمول کے کام کیئے جامن کے درخت اور واش روم کے دروازے کو دیکھ کر پراسرار انداز میں مسکرائی کالی چادر کو اپنے گرد لپیٹا اور اللہ والی مسجد کی طرف قدم بڑھا دیئے راستے میں وہی بابا اوندھے منہ پڑا تھا اس کی مندی آنکھوں سے کوئی جذبہ عیاں نہ تھا۔

اوں اوں اس کی ہلکی سی آواز آئی روزی رک گئی آج اس کا بھاشن بھی سنتی ہی جاؤں سرکش سوچوں نے اس کے دماغ میں جنگ وجدل کا سماں بنا رکھا تھا۔

''آ آ اے اوں اوں' یہ کچھ بولتا کیوں نہیں کیا اوں اوں لگا رکھی ہے روزی جھنجلائی پھر اپنے قدم گلی کی طرف بڑھا دیئے مطلوبہ مکان کے سامنے نظر اٹھائی چوکھٹ ہی غائب تھی سامنے مزدور لگے اس بیٹھک اور ملحقہ گھر کو ڈھا رہے تھے اب آنکھیں پوری کی پوری کھل گئی اس نے کونے میں بیٹھے مزدور کو آواز دی

''بھائی۔'' مزدور نے ساتھ بیٹھے ساتھی کو کہنی ماری۔

''تجھے بلا رہی ہے۔'' ساتھی کو شاید ترس آیا تھا۔

''بول بی بی۔''

یہاں ایک پیر جی کا آستانہ تھا روزی کی آنکھوں میں سوال تھے اور دل میں بے چینی ہائے میرا قاسم تک پہنچنے کا اکلوتا راستہ۔

''جی وہ کوچ کر گئے آپ جاؤ گھر۔'' اس شخص نے بے زاری سے کہا روزی دو منٹ تو اس بدلی ہوئی جگہ کو دیکھتی رہی اور پھر واپس مڑی۔

''ابے اسے بتا دیتا کہ پولیس پکڑ کر لے گئی ہے۔''

پہلے مزدور نے ہمدردی دکھائی۔

''تیری اتنی سگی لگتی تھی تو خود بتا دیتا۔'' دوسرا بولا اور اس کے بعد خاموشی چھا گئی۔

واپسی پر روزی کے قدم دو دو من کے ہو گئے

اب میں کس سے رہنمائی لوں گی؟ اب میں کیا کروں گی؟ کہاں جاؤں گی؟ عجیب وغریب سوالات نے دماغ شل کر دیا۔

ہائے یہ گونگا بابا تو بیچارہ مر گیا اوئے بول کر اپنی تکلیف بھی کسی کو نہیں بتا سکتا تھا عجیب سی آنکھوں والے بوڑھے کے پاس کئی لوگ جمع تھے روزی ساکت رہ گئی صرف ذہنی طور پر وہ اس جگہ بالکل بھی نہیں رک سکتی تھی۔

یہ ضرور اللہ کی طرف سے بھیجی گئی مدد تھی روزی کے دل میں یقین پیدا ہوا اللہ نے اس گونگے کو زبان دی میرا راستہ متعین کیا وہ کچھ اور ہی سوچ رہی تھی

انسان کتنا پاگل ہے شر اور خیر میں فرق نہیں کر پاتا شر ملے تو شکر کرتا ہے خیر ملے تو واویلا۔۔۔۔بے شک انسان خسارے میں ہے وہ کون سی ولی تھی کے اللہ اسے راستے دکھانے کو گونگے کو زبان دیتا چکر کچھ اور تھا عقل سے ماورا سمجھ سے باہر۔

گھر آ کر اس نے اپنے ارادے کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کی جامن کا پیڑ شروع سے پسند تھا لیکن پچھلی ہولناک کیفیت سے اس کا دل دھڑکا دیا اس نے اپنے بستر پر سفید رنگ کی چادر بچھائی۔

نیم حکیم خطرہ جان نیم ملا خطرہ ایمان

آج وہ اپنی کیمسٹری کا اطلاق کرنے والی تھی ہم کیوں خود کو عقل کل سمجھتے ہیں کچھ مسئلے کچھ باتیں ہماری سوچ اور ہماری فکر کے دائرہ کار سے باہر ہوتی ہیں جو فیصلے اوپر لکھے جا چکے ہیں اس کے لیے زمین پر ضد لگانے والے کہیں کے نہیں رہتے وہ اپنے آپ کے بھی نہیں رہتے اس نے پسا ہوا کافور کمرے میں چھڑکا اور زعفران کو تیل میں ملا کر لالٹین کو روشن کیا شام نے اپنے سارے پر پھیلا دیئے نحوست کہیں دور تاک لگائے بیٹھی رہی روزی باپ کا کھانا بیٹھک میں رکھ کر اندرونی دروازے کو بند کر کے بستر پر آئی

عموماً ایسا ہی ہوتا ہے روز کے جب پیپر ہوتے یا کوئی اور کام ہوتا کسی اسائنمنٹ کی تیاری یا پھر جلدی سونا وہ کھانا بیٹھک میں رکھ کر یوں ہی اپنے کمرے میں آ جاتی بیٹھک میں موجود واش روم ظفر صاحب رفع حاجت کے لیے استعمال کر لیتے کھانا کھاتے اور لمبی تان کر سو جاتے۔

جن معاملوں میں آنکھیں کھلی رکھنی چاہیے ہم وہیں بند رکھتے ہیں وہ بستر کے بالکل درمیان میں آ کر بیٹھ گئی ہاتھ میں رہی بابا جی کی پرچی تھی جب چیزوں کو گم جانا چاہیے زائل ہو جانا چاہیے وہ کیوں کبھی معدوم نہیں ہوتی؟ وہ اب ورد کر رہی تھی پرندے باہر درختوں سے اڑ گئے چاند یکا یک سیاہ ہوا وہ اندر بیٹھی یہ سب چیزیں محسوس کر رہی تھی نہیں ڈرنا نہیں ہے قاسم چاہیے اور ہر صورت میں چاہیے tempetation بڑی مضبوط تھی وہ آنکھیں بدن کر کے ورد کرنے لگی سامنے تھوری سی چینی رکھی تھی کے جب منہ خشک ہو جائے تو منہ میں ڈال لے اس نے چٹکی سے چینی کے دانے پکڑے ہاتھ قریب لائی تو اسے لگا کوئی کالا کیڑا اس کے ناخنوں کو چھو کر گزر رہا ہے اس نے انگلیاں ایک دوسرے سے جدا کر دی یہ سانپ جیسی کوئی پتلی چیز تھی جو ہتھیلی پر بل کھا رہی تھی اور انگلیاں اس کے لیے زمین تھی ڈرنا نہیں ہے اس نے ایک دفعہ پھر خود کو دلاسہ دیا اور ہاتھ کو جھٹکا مگر وہ گندی مخلوق چپکے جا رہی تھی یہاں وہ ہاتھ جھٹک رہی تھی وہاں تیز ہوا چلی کالی آندھی کا آخری جھونکا۔

لالٹین جھٹکے مار رہی تھی روشنی جل رہی تھی بند ہو رہی تھی یون جیسے کوئی بلب ہو کمرے میں موجود سب سامان اپنی جگہ کو central point مان کر آگے پیچھے حرکت کرنے لگا وہ وہیں تھا ہاتھ میں سرسراتا ہوا خوفناک آواز نکالتا ہوا یکا یک اس کا جسم کھردرا ہوا وہ پھر بھی پڑھتی رہی ہوا نے لالٹین کو اچھال کر اس کی طرف پھینکا لالٹین روزی کی پیشانی سے ٹکرائی اور وہ بے ہوش ہو گئی وہ کسمسائی اپنے بستر سے اٹھنے کی کوشش کی لیکن اٹھ نہ پائی پھر ہوا آئی پھر

دلدل ـــــ پھر وہ مخلوق ـــــ اٹھی تو چہرے پر کھرونچوں کے نشان تھے۔

......☆❁☆......

ماہ روز ایسی لڑکی تھی جسے دیکھ کر صرف گھر بسانے کا خیال آتا حیدر کافی عرصے سے سوچ رہا تھا کے وہ ماہ روز کو اپنے جذبوں کی شدت سے واضح طور پر آگاہ کردے لیکن کوئی موقع ہی نہیں مل سکا آخری سمسٹر شروع ہوا ایک عجیب قسم کی گہما گہمی کونوں کھدروں سے نکلتی اور مچلتی نظر آنے لگی ان دونوں کے آپسی تعلقات دیکھ کر دیکھنے والوں نے باتیں بنانا شروع کردی تھی اگر حیدر نے صرف وقت گزارنا ہوتا تو وہ لوگوں کو باتیں کرنے دیتا ان باتوں سے لطف اندوز ہوتا لیکن ایسا کیسے ہوسکتا تھا کسی کی ہمت نہیں تھی وہ حیدر کے سامنے اس ان کہے رشتے کے حوالے سے کوئی سوال کرے لیکن بولنے والے پیٹھ کے پیچھے سے اپنی زبان کا چسکا پورا کر لیتے وہ سوچنے والوں کی سوچ نہیں بدل سکتا تھا آج وہ ارادہ باندھ کر گھر سے نکلا چاہے کچھ بھی ہوجائے میں نے آج ہر صورت ماہ روز کو اپنی سنجیدگی سے آگاہ کرنا ہے کلاس میں بیٹھے مختلف سوچوں سے لڑتے اسے احساس ہوا کے ماہ روز کلاس میں موجود ہی نہیں ہے اس سے پہلے کے وہ موبائل نکال کر ماہ روز سے رابطہ کرتا موبائل خود بولنے لگ گیا.نکال کر دیکھا تو ماہ روز کی کال آ رہی تھی۔

السلام علیکم جی۔ ماہ روز وہ آہستہ سے بولتا کلاس سے باہر نکل آیا۔

آپ کہاں ہیں حیدر ماہ روز کی پریشان سی آواز کانوں سے ٹکرائی۔

میں یونیورسٹی میں ہوں آپ کہاں ہیں حیدر بھی جواباً شپٹا گیا

آپ پلیز گولڑہ موڑ تک آجائیں دراصل میں لوکل آئی ہوں اور آگے ایک گھر کی تعمیر کی وجہ سے کافی مزدور ہیں مجھ سے اکیلے نہیں آیا جائے گا لڑکیاں کتنی بھی بے باک کیوں نہ ہوجائیں ان کے اندر کی جھجک کبھی نہیں جاتی ماہ روز کی آواز سے حیا بولتی نظر آئی حیدر زیر لب مسکرایا۔

بائیک لے آؤں اب وہ شرارت کر رہا تھا کے بائیک پر تو ماہ روز نے کبھی ماننا نہیں تھا۔

آپ خود آجائیں تو ٹھیک ہے ورنہ میں خود آجاتی ہوں ماہ روز نے غصہ کیا

اچھا اچھا آرہا ہوں حیدر نے فون کاٹا ضرور کوئی رکشہ ٹیکسی نہیں ملی ہوگی تبھی ماہ روز نے مجھے فون کیا ہے یا پھر میری دعائیں اللہ نے سن لی اور مجھے موقع فراہم کیا اوہ آسمان کی طرف دیکھ کر شکرادا کرتا تیز تیز نکل پڑا۔

گولڑہ موڑ پر دوسرے کنارے پر ہلکے نیلے رنگ کے سوٹ میں دھوپ سے تمتماتا ہوا چہرہ لیے ماہ روز کھڑی تھی دسمبر کی دھوپ کتنی بھلی لگتی ہے لیکن جب تین چار گاڑیاں بدل کر آنا پڑے تو اچھے اچھوں کے پسینے نکل آتے ہیں حیدر کو سمجھ آگئی مسلہ پیدل آنے کا نہیں تھا بلکہ مسلہ اتنی بڑی روڈ کراس کرنے کا تھا اس نے ہاتھ بڑھایا ماہ روز نے جواباً بازو پر زور سے موبائل دے مارا وہ ہنسا اور گاڑیاں جس طرف سے آرہی تھی اس طرف خود ہوگیا دوسری طرف ماہ روز کو کیا ساتھ ہی ساتھ ماہ روز کے بیگ کو احتیاط پکڑ لیا تاکہ ضرورت پڑنے پر کھینچ کر سڑک پارک کروالے پھر اسی طرح دوسری سڑک بھی کراس ہوئی

شکریہ ماہ روز نے دھیرے سے کہا اور حیدر نے خفگی سے اسے دیکھا

بات سنیں میری آج میں بولوں گا اور آپ سنیں گی مجھے آپ سے پہلی نظر میں محبت نہیں ہوئی بلکہ محبت مجھے آپ کو دیکھنے سے بھی پہلے ہوگئی جب میں نے آپ کی صرف آواز سنی آپ کی آواز کی کھنک اور آپ کے لہجے کی خوبصورتی نے مجھ سے میرے ہونے کا غرور چھین لیا ہے. مجھ میں اگر کوئی خواہش باقی ہے تو صرف اتنی سی کے میں اپنی زندگی آپ کے ساتھ گزاروں۔

ماہ روز کی رفتار دھیمی پڑگئی اور چال میں لڑکھڑاہٹ آگئی حیدر بول رہا تھا آہستہ آہستہ بات آواز سے محبت تک رہتی تو ٹھیک تھا لیکن میری نظریں آپ کے چہرے سے ہٹ ہی نہیں پاتی میں نے جتنی بار آپ کو دیکھا ہے اتنی بار محبت میں گرفتار ہوا ہوں

لاشعوری طور پر بچپن سے میرے ذہن میں شریک حیات کے لیے ایک خاکہ تھا اور آپ اس پر پوری اترتی ہیں میں آپ سے زیادہ کچھ نہیں چاہتا میری محبت کو قبول کر لیں مجھ سے شادی کرنے میں کیا فائدہ ہے؟ میں نے یہ سوال کئی بار خود سے کیا میں کوئی ایسی وجہ آپ کو دینا چاہتا تھا کہ میری درخواست کا وزن بڑھ جائے ایک ہی وجہ مجھے سمجھ آئی مجھ سے شادی کے بعد آپ کو خود کو بدلنا نہیں پڑے گا آپ جو ہیں جیسی ہیں ویسی ہی رہنا اتنی ہی اچھی اتنی ہی پیاری۔'' حیدر نے پھر شرارت کی اور سینے تک آتی لڑکی کو جھک کر کن اکھیوں سے دیکھا۔

لیکن میرا ماضی ـــــ ماہ روز کی مری ہوئی آواز نکلی لیکن حیدر نے اس کی بات کو کاٹ دیا۔

جی آپ کے ابا جی کے ساتھ بیٹھ کر میں نے خالی آپ کے ہاتھ کی کافی ہی نہیں پی بلکہ یہ بھی جانا ہے کے ماضی میں ان کی روزی نے تنہا کن حالات کا مقابلہ کیا ہے یقین جانیے اس غیر مرئی مخلوق سے لے کر قاسم کے وجود تک مجھے کسی شے سے سروکار نہیں میں نے آپ سے پیار کیا ہے آپ کے ماضی کی کسی بات سے میرا کوئی تعلق کوئی واسطہ نہیں اگر ایسا ہوتا تو شادی کے بعد لڑکے اپنا نام بدل لیتے تو میں شوق سے اپنا نام بدلتا آپ کا حوالہ مجھے معتبر بنا دیتا ہے میں لوگوں کو بتانا چاہتا ہوں کہ دیکھو میں ماہ روز کا حیدر ہوں دنیا کی نظروں میں پتھر سی سخت لڑکی میری نظروں میں محبت سے موم ہوگئی ہے آپ کو اب پچھلی باتوں کو کبھی یاد کرنے کی ضرورت نہیں پیش آنے والی میں آپ کو ہمیشہ کے لیے خوش دیکھنا چاہتا ہوں اور پتہ نہیں کیوں ماہ روز مجھے لگتا ہے آپ کو مجھ سے زیادہ خوش کوئی نہیں رکھ سکتا۔

محبت حیدر کے لہجے میں ٹھاٹھیں مار رہی تھی رام کتھا سنتے کب یونیورسٹی کا گیٹ آگیا دونوں کو پتا ہی نہیں چل سکا ماہ روز کے چہرے سے اس کے احساسات و جذبات کا اندازہ لگانا مشکل تھا حیدر نے لمبی لمبی سانس لی اور اپنے قدم آہستہ کر لیے یونیورسٹی کے اندر ماہ روز اکیلی داخل ہوئی لیکن وہ اکیلی کب تھی کسی کی سپردگی اور دیوانگی نے اس کے قدموں میں ایسا توازن پیدا کردیا تھا کہ وہ رقص کرتی نظر آئی محبت کی کرنیں وسوسوں کے بادل کو چیرتی ہوئی نکلی اور ساری زمین پر اجارہ داری قائم کرتی ہوئی دکھائی دی حیدر کو یقین تھا کہ سچی لگن اور نیک نیتی دل میں گھر بنالے گی اس کے اعتراف نے اس کو ہلکا کردیا وہ آج بہت عرصے بعد اتنے کم وقت میں اتنا زیادہ بولا تھا بچپن میں جب والدین زندہ تھے وہ لڑتا تھا بولتا تھا خواہشوں کا اظہار کرتا تھا لیکن پھر وہ خاموش ہوگیا اس کے اندر باہر خاموشی نے ڈیرے ڈال لیے جوانی نے اس کو کوئی رنگ نہ دیا۔ وہ رنگین یا شوقین ہونے کے بجائے اپنے دائرے میں محدود ہوتا گیا نپے تلے چند لفظ بولتا بہت زیادہ سوچتا بحث نہ کرتا لیکن پھر محبت آئی اور اس کی دستک نے حیدر کے اندر کے بچے کو زندہ کردیا وہ خواہش کرنے لگا اور اس نے ماہ روز کو مانگنا شروع کردیا پہلے اللہ سے اور آج ماہ روز سے بھی زبان پر لگے قفل ٹوٹے اور عشق کے گھنگھرو بجنے لگے۔

لائیاں لائیاں میں تیرے نال ڈھولنا

......☆❁☆......

ثمینہ تو بیاہ کر گاؤں چلی گئی اور اسری تو کب سے مکان خالی کر کے دوست کو تنہا کر گئی محلے میں کسی اور کے ساتھ روزی کے دیرینہ مراسم نہ تھے کہ ظفر صاحب اس معاملے میں کسی پر بھروسہ نہیں کرتے تھے ان کا رابطہ اپنی عمر کے

لوگوں کے ساتھ رہتا تھا جن کے ساتھ وہ ایسے مسائل ڈسکس کرتے کے جن کے ڈسکس ہونے یا نہ ہونے سے فرق نہیں پڑتا جیسے مہنگائی ایک مسلمہ حقیقت ہے جسے لوگوں کی چہ مگوئیوں سے فرق نہیں پڑتا ثمینہ کی شادی کے موقع پر روزی کی طبعیت کی خرابی نے حالات کو دشوار کیا لیکن ہڈیوں کا بخار بنا کر ظفر صاحب نے لوگوں سے حقیقت چھپالی اب ان کا بیشتر وقت گھر پر گزرنے لگا روزی کی عجیب وغریب حالت نے انہیں باہر نکلنے کے قابل نہیں چھوڑا نماز پڑھتے رہتے اور روزی پر دم درود کرتے رہتے کبھی کبھی وہ بھلی چنگی ہو جاتی لیکن آنکھوں کا بنجر پن ان کے دل میں انی کی طرح گڑا رہتا کبھی ایسی عجیب وغریب حرکتیں کرتی کہ ظفر صاحب کے دل میں خیال آتا کہ زہر لا کر اس کو اور خود کو مارلیں لیکن انسان باتیں تو بہت بڑی کر سکتا ہے جان نہیں لے سکتا وہ لوگ جو انسان کی جان لے سکیں ان میں جذبات اور حسیات اس قدر سرد ہو چکے ہوتے ہیں کہ دوسروں کی جان لینا آسان ہو جاتا ہے ایسے انسانوں کو انسانوں کی فہرست مرتب کرتے وقت بالکل بھی دھیان میں نہیں لانا چاہیے ظفر صاحب کے لیے زندگی میں اور کوئی کشش نہ تھی لیکن پتہ نہیں کیوں انہیں لگتا تھا کہ اس ذہنی الجھن سے وقت باہر نکال لائے گا ان کے اندر کوئی شے بولتی تھی کہ یہ نفسیاتی گرہیں ہیں جو کھل کر روزی کے وجود کو ڈھیلا کر دیں گی اور پھر وہ انہی ہم عمر نوجوان لڑکیوں کی طرح ہلکی پھلکی ہواؤں کے ساتھ اڑتی پھرے گی اس کے چہرے پر بچپن کی ہنسی ایک مرتبہ پھر دیکھنے کا خیال ظفر صاحب میں زندگی بھر دیتا سات کے بجائے اکتالیس مرتبہ سورۃ فاتحہ پڑھنے لگتے جب ہم اپنے حصے کی ساری لاپرواہی برت چکے ہوتے ہیں اور کوتاہی کر چکے ہوتے ہیں تب ہمیں اللہ یاد آتا ہے اور شدت سے یاد آتا ہے ہمیں یقین ہونے لگتا ہے کہ وہ ذات ہمیں گرنے ڈوبنے نہیں دے گی حالانکہ اللہ تعالی پتھر میں کیڑے کو رزق ضرور پہنچاتا ہے لیکن وہ بھوکے بندے کے منہ میں نوالے بنا کر نہیں ڈالتا وہ وسیلے بنانے والا ہے نوازنے والا ہے کچھ ہاتھ پیر ہمیں خود بھی ہلانے ہوتے ہیں چیزوں میں صرف اتنا بگاڑ پیدا کرنا چاہیئے جس کو واپس سدھارا جا سکے اب اگر یہ کہا جائے کہ بگاڑ ہی پیدا نہ کریں تو یہ غیر فطری سی بات ہے ہم انسان ہیں چاہتے یا نہ چاہتے ہوئے بھی غلطیاں کر جاتے ہیں لیکن غلطیاں کتنی کرنی ہیں اس کا تعین درست وقت پر کرنا ہی ضروری ہے۔

انکل۔ مانوس سی آواز پر ظفر صاحب نے خود کو پرسکون کرنے کی کوشش کرتے ہوئے سر اونچا کیا سامنے اسری کھڑی تھی ہمیشہ کی طرح خوش باش کانوں میں سونے کے جھمکے اس کی زندگی میں آنے والی کسی بڑی تبدیلی کی چغلی کھا رہے تھے ظفر صاحب کو اس پر بے ساختہ پیار آیا۔

اوہو آج میری گڑیا آئی ہے تم لوگوں نے تو پلٹ کر نہیں دیکھا اور میرے بیٹے کا سلام کدھر رہ گیا ہے آج وہ کھڑے ہو کر اسری کو ساتھ لگاتے بولے

السلام وعلیکم انکل بس زندگی بڑی نا قابل بیان سی شے ہے قاسم بھائی جب سے باہر گئے ہیں ابو بیمار رہنے لگے پھر میری بھی شادی کر دی اب اب قاسم بھائی کے لیے لڑکی ڈھونڈ رہے ہیں اسری اپنی شادی کی بات پر ذرا سا شرمائی لیکن پھر اعتماد سے بولی

''بیٹا قاسم تو شادی کر چکا تھا نا باہر ہی اور میرا یار فیضی کہاں ہے؟ وہ نہیں آیا ساتھ۔'' ظفر صاحب نے استفسار کیا۔

قاسم بھائی واپس آگئے ہیں آپ کو پتہ تو ہے مغرب میں چکا چوند تو ہے لیکن وفا کی خوشبو کا کوئی جھونکا نہیں ان کا ایکسیڈنٹ ہوا تھا لاہور کے شیخ زید اسپتال میں زیر علاج ہیں ان کو گھر بسانے کی چاہت جاگی تو ابو اور میرے دماغ میں پہلا خیال روزی کا ہی آیا اسری نے کمال مہارت سے

اپنے پتے پھینکے وہ یہ بات چھپا گئی کہ قاسم درحقیقت rehabiletation سینٹر میں داخل ہے اور پچھلے کچھ عرصے سے نشہ آور اشیاء کے مستقل استعمال اور نشے میں آکر الٹی سیدھی حرکتوں کی وجہ سے اس کا پاسپورٹ کینسل ہو گیا تھا وہ شاید کبھی روزی کے لیے اس رشتے کا سوچتی اسے بھائی عزیز تھا لیکن اس کی روزی سے بھی کوئی دشمنی نہ تھی قاسم کے جانے کے بعد اسے قاسم کی الماری سے خوشبوؤں میں بسے ڈھیروں خط ملے جن میں سے اکثر روزی کی خوبصورت لکھائی اور اور جذبوں کا تلاطم سچائی کی چاشنی لیے موجود تھا اگر اس کے بکھرے اور بگڑے بھائی کو اب کوئی چیز سنبھال سکتی تھی تو وہ محبت تھی ایک آخری آپشن ظفر صاحب حالات کی سنگینی سے بے خبر خوش ہو گئے کے چلو پہلا پتھر تو آیا

بیٹا میں کیا کہوں تم خود روزی سے بات کر لو ہر باپ کی خواہش ہوتی ہے کہ بیٹی کا گھر بس جائے تمہارے بھی بہت ارمان تھے کہ تم ڈاکٹر بنو لیکن مجھے یقین ہے کہ تمہیں بیاہ کر فیضی کو جو سکون ملا ہو گا اس نے تمہارے اندر سے ڈاکٹر بننے کی کسک نکال دی ہو گی ظفر صاحب اسری کو کندھے سے پکڑ کر باتیں کرتے صحن میں آگئے صحن میں جامن کے پیڑ کے نیچے روزی ان دونوں کی طرف پشت کیے بیٹھی اس کے کھلے بال گلے میں پڑے تھے اور بازو کی حرکت سے لگ رہا تھا کے وہ گود میں کسی چیز کو سہلا رہی ہے اسری کو قوی امکان لگا کہ یہ کوئی بلی کا بچہ ہو گا اس نے ظفر انکل کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور سرپرائز دینے کی غرض سے روزی کے عین سامنے جا کر کھڑی ہو گئی لیکن اگلے ہی لمحے اسری کی چیخوں سے سارا گھر گونجنے لگا ظفر صاحب نے آگے بڑھ کر اسے خاموش کروانے کی کوشش کی ان چیخوں کا سبب ان کی سمجھ سے بالاتر رہا یہاں تک کے ان کی نظر روزی کی گود پر پڑی وہ ہل کر رہ گئے یہ کوئی بلی کا بچہ نہیں بلکہ مکروہ شکل کی زرد رنگ والی گندی سی چھپکلی تھی جس کے سر سے دم تک بہت پیار سے روزی اپنی انگلیاں چھوتی وہ انسیت سے دم ہلاتی ان چیخوں سے زرد آنکھیں ایک جگہ ٹھہر گئیں وہ اسری کو تک رہی تھیں اسری کا چیخیں مارنا جائز تھا ظفر صاحب کو لگا اگر یہ لمحہ طویل ہوا اور روزی کا لمس اس چھپکلی سے آشنا ہوتا رہا تو وہ ہمیشہ کے لیے اپنی بیٹی کو کھو دیں گے انہوں نے آگے بڑھ کر زور سے روزی کے کندھے کو جھنجھوڑا اس نے آنکھیں اٹھا کر باپ کو دیکھا شناسائی کی کوئی رمق نہ تھی کالی کالی گول گول آنکھیں زرد تھیں بالکل زرد ----- انہوں نے پوری قوت سے روزی کو اٹھایا چھپکلی اس کی گود سے نکلتی الٹے پیروں سرکتی برگد کے پیڑ پر چڑھ گئی اس کی آنکھیں وہیں تھیں روزی پر ------ روزی وحشت سے چلائی۔

جاؤ جاؤ واپس جاؤ مجھے چھوڑ دو میری دنیا نہ برباد کرو میرا حصار نہ توڑو میں آگ لگا دوں گا اس کے دماغ کی کھینچی ہوئیں طنابیں اس کے چہرے کے تاثرات سے نظر آرہی تھیں اس کے حلق کی رگیں بھی واضح طور پر دیکھی جا سکتی تھی یہ وہ نہیں بول رہی تھی یہ کوئی اور تھا یہ جو کوئی بھی تھا اسے ظفر صاحب یا اسری نہیں جانتے تھے

میں قاسم تک لے جانے والے کسی شخص کو نہیں چھوڑوں گا یہ میرا احصار ہے یہ میری ذات ہے یہ میری ہے یا کسی کی بھی نہیں ہے بھاری آواز گونجی روزی کبھی ناخن لمبے نہیں کرتی تھی لیکن آج جب اس نے اپنے دائیں ہاتھ سے گردن کو چھوا تو خون بہنے لگا اسری کی چیخیں پھر بلند ہوئیں اور وہ بیٹھک کی طرف بھاگی اسری کو بھاگتے دیکھ کر روزی کی وحشت کو سکون سا مل گیا وہ ساکت ہوئی اور وہیں گر سی گئی ظفر صاحب نے ایک نظر روزی اور اس کے بہتے ہوئے خون کو دیکھا خراشیں بہت گہری نہیں تھیں لیکن اسری اگر گھر سے باہر نکل جاتی تو جس بات کو اس گھر کے در و دیوار آہستگی سے کہتے سنتے تھے اسے منڈیروں پر چڑھنے میں دیر نہ لگتی فوراً سے بیٹھک میں گئے اسری

دروازہ کھول کر باہر نکلنے ہی والی تھی

رکو بیٹا تمہیں اللہ کا واسطہ ہے آج جو دیکھا ہے وہ کسی کو نہ بتانا کسی سے نہ کہنا ظفر صاحب گھگھیائے اسری خود بری طرح ڈری ہوئی حواس باختہ ہونے کی وجہ سے اس کے منہ سے سب نکل گیا

قاسم بھائی نے کچھ نہیں کیا آپ کو تو پتا ہے لڑکے ایسی نادانیاں کر جاتے ہیں میں نے روزی کے خط ان کی الماری میں ان کے جانے کے بعد دیکھے تھے ان دونوں کو ایک دوسرے کے ساتھ محبت تھی نہیں محبت شاید صرف روزی کو تھی آپ کو شاید یاد ہوگا روزی بیمار بھی ہوئی تھی وہ بیماری بھی دراصل اسی محبت کی وجہ سے تھی دراصل میں سمجھ نہیں سکی اس نے مجھے ٹوٹا پھوٹا سا قصہ سنایا تھا وہ کسی پیر بابا کے پاس بھی گئی تھی الٹی قرآنی آیات پڑھنے جیسا وظیفہ لے کر آئی مجھے پتا ہوتا کہ وہ اس راستے پر خود جا رہی ہے اپنی کہانی سنا رہی ہے تو میں اس کو ضرور روکتی لیکن میں نہیں سمجھ سکی جب وہ ہوش میں آئے تو اسے کہنا میرے بھائی قاسم کو معاف کر دے میرے بھائی کو معاف کر دے۔"

اسری نے روتے ہوئے دروازہ کھولا اور باہر چلی گئی ظفر صاحب میں اسے روکنے کی ہمت نہ تھی اور نہ ہی ضرورت ان کی ناک کے نیچے کیا سے کیا ہوتا رہا اور وہ خاموش رہے انہیں پتہ ہی نہ چل سکا انہیں خود پر غصہ آیا وہ سوچنے لگے ہو سکتا ہے کسی ذہنی الجھن نے روزی کو اس مقام پر پہنچا دیا ہو وہ خود ایسا کیسے کر سکتی ہے اگر اس کی شروعات کوئی ذہنی الجھن ہے تو اس کا اختتام بھی آسانی سے ہونا عین ممکن ہے لیکن پھر وہ مکروہ سی چھپکلی؟ ۔۔۔۔ یوں ہی بھی تو ہو سکتی ہے کوئی اتفاق بھی تو ہو سکتا ہے سوچتے سوچتے وہ صحن میں آئے نیم مردہ روزی کے زخموں کو صاف کیا اور اسے اس کے کمرے میں لے جا کر چھوڑا۔

بے شک اللہ اولاد سے آزماتا ہے بے شک اولاد فتنہ ہے۔

انسان اللہ سے اولاد مانگتا ہے اگر اولاد کو تکلیف پہنچے یا اولاد نہ ملے تو شکایت کرتا ہے انسان کو قرآن بھول جاتا ہے اور قرآن میں حضرت موسیٰ کا قصہ بھول جاتا ہے کہ جب وہ خضر کی راہنمائی میں ایک جگہ پہنچے اور خضرؑ نے ایک بچے کو مار دیا اس وقت حضرت موسیٰؑ سمجھ نہ سکے اس بچے کے والدین بھی نہ سمجھے ہونگے انہوں نے بھی غم منایا ہوگا یہ سوچے بغیر یہ سمجھے بغیر کہ اس کو مرنا ہی ہے اولاد اللہ کی عطا ہے وہ جسے چاہتا ہے بیٹیوں سے نوازتا ہے اور جسے چاہتا ہے بیٹے عطا کرتا ہے ہم صرف اولاد مانگتے ہیں صالح اولاد نہیں مانگتے۔

......☆❁☆......

یونیورسٹی میں ماہ روز کے چہرے پر نا قابل بیان قسم کے تاثرات رہے حیدر پڑھنے کی ناکام کوشش کرتا رہا گھر جا کر بھی اس نے سوچا ماہ روز کو پیغام بھیجے لیکن پھر چھوڑ دیا محبت زبردستی کا سودا نہیں ہے یہ دوسرے شخص کو جو ہے جیسا ہے کی بنیاد ہے پر آزادی دینے کا نام ہے یہ تحفظ ضرور دیتا ہے لیکن کسی کو رواتیوں اور رواجوں کے شکنجوں میں بندھے رہنے کی ترغیب ہرگز نہیں دیتا وہ کون سی محبت ہے جس میں کوئی نادانی نہ ہو لیکن حیدر اپنے حصے کی ساری نادانیاں کر چکا تھا اب اسے جواب کا انتظار تھا شدید انتظار۔

ماہ روز ہواؤں میں اڑتی پھر رہی تھی آپ کسی چیز کو دیکھتے ہیں اور سوچتے ہیں کہ وہ آپ کو مل جائے لیکن نہیں ملتی پھر ایسا بھی ہوتا ہے کہ کوئی شے اپنے تمام تر حسن کے ساتھ اپنے جلوے آپ کے سامنے بکھیرتی ہے آپ کو لبھاتی ہے اور پھر اپنے آپ کو آپ کے دربار میں سر جھکا کر تحفتاً پیش کر دیتی ہے کچھ لوگ زندگی میں ان میں سے ایک حالت میں گزرتے ہیں اور کچھ دونوں میں سے بہرحال پہلی حالت سے بہت بہتر دوسری حالت ہے جو ذہن و دل کو ایک طے کردہ راستے پر پوری آزادی سے چلنے دیتی ہے

اور انسان مکمل ہونے لگتا ہے ماہ روز کو لگ رہا تھا وہ بھی مکمل ہونے لگی ہے وہ چاہتی تھی کہ فی الفور اپنے جذبات کا اظہار کر لے لیکن لڑکی ہونے کی بیڑیاں اس کے لفظوں کو تھامے بیٹھی رہی حیدر کے فون پر اس کے دل میں جلترنگ سی بج اٹھی تھی یوں لگا کہ موسیقی کے دھیمے دھیمے سر خوشی کی سرگم میں مستانے ہوں گئے اس نے دھڑکتے دل پر ہاتھ رکا اور فون ریسیو کیا حیدر کی پریشان سی آواز اسپیکر سے ابھری۔

ماہ روز ایک کام کریں گی میرے گھر چلی جائیں ایڈریس میں بھیج دیتا ہوں بڑی باجی اسپتال میں ایڈمٹ ہیں میں ان کے پاس ہوں بس شام تک آپ کا تعاون درکار ہے۔

پہلی دفعہ اس نے بغیر سلام کیے بات کی تھی اور اتنا فارمل لہجہ تھا کے اس کا لہجہ کسی ڈر کی چغلی کھاتا لگا ماہ روز نے کچھ بھی وضاحت نہ مانگی بس اتنا بولی

ایڈریس بھیج دیں اور بے فکر ہو جائیں وہ واقعی ایڈریس دے کر بے فکر ہو گیا

ماہ روز دیئے گئے ایڈرس پر پہنچی سفید رنگ کے گیٹ پر پھیلی ہوئی بیل یوں بھلی لگتی جیسے سبز رنگ کے خوبصورت کھلے کھلے سے بوٹے سفید بادلوں پر اٹھکیلیاں کر رہے ہیں ماہ روز کے دل میں شدت سے خواہش ابھری کہ وہ مصور ہوتی اور اس گھر کو اپنے ہاتھوں سے پینٹ کرتی اس کی دہلیز پر گرے مختلف رنگوں کے پھولوں میں اپنے پیار کے رنگ بھرتی میں بھی کتنی پاگل ہوں نا یہ گھر تو میرا گھر ہوگا میں اس کی تمام بیلوں کو اپنے خون سے سینچوں گی اور یہ جو گھنٹی کے پاس سے رنگ اترا ہوا ہے تو میں اس کو خود رنگ کروں گی گیٹ کا کلر سفید کے علاہو سرخ بھی تو ہو سکتا ہے اور سرخ گیٹ پر سبز بیلیں کتنی بھلی لگیں گی جب حیدر اس دروازے سے اندر آئیں گے تو ان کی توجہ بیلوں پر لگے پھولوں پر جا ٹھہرے گی اور وہ چند پھول توڑ کر میرے لیے اندر لے آئیں گے میں انہیں کہوں گی۔

بیلوں کو میں نے پانی دیا ہے اور پھول آپ دے کر اپنے نمبر بنا رہے ہیں وہ جواب میں کہیں گے

تم بھی تو میرے ہی پیسوں سے مجھے ہی تحفہ دے کر خوش ہوتی پھرتی ہو کیا وہ مجھے کبھی تم کہہ کر پکاریں گے؟ ان کے منہ سے تو آہی بھلا لگتا ہے لیکن ان سارے تکلفات سے بالاتر ہو کر میں ان کی بے تکلفی کا مزہ بھی چکھنا چاہتی ہوں اف کتنی پاگل ہوں نا میں کیا الٹا سیدھا سوچنے لگ گئی ہوں ماہ روز نے اپنی سوچوں کو بمشکل روکا اور بیل بجائی۔

"کون ہے۔" اندر سے معصوم سی ننھی سی آواز آئی جس میں حیدر کی سی فکر گھلی ہوئی تھی۔

"دروازہ کھولیں۔" ماہ روز نے اتنا ہی کہا اسے سمجھ نہیں آئی اپنا تعارف کیسے کروائے

"ماہ روز آپی۔" اندر سے آنے والی آواز میں اشتیاق اور مسرت کا جہاں آباد تھا دروازہ جوں ہی کھلا وہ معصوم سی پری اس کے گلے لگ گئی ماہ روز کو حیدر کی خوشبو پھوٹتی محسوس ہوئی اس نے پیار سے الگ کیا۔

"کیسے پہچانا مجھے گڑیا؟"

ہاہاہا آپ کو کیسے نہیں پہچانوں گی بھائی اتنی باتیں کرتے ہیں گڑیا نے ہنستے ہوئے بولا ماہ روز ساتھ چلتی ڈیوڑھی سے صحن تک آئی بائیں طرف کی دیوار ڈھیروں مختلف بیلوں سے ڈھکی ہوئی تھی اگر دیوار نہ ہوتی تو بھی معلوم نہ لگتا بیلوں کا جال اتنا گھنا اور گہرا تھا چھوٹے چھوٹے پیارے پودے جن کا پتا پتا لہرا رہا تھا چمک رہا تھا۔" پتہ گھر والوں کے ذوق کا نمائندہ تھا نم مٹی کی خوشبو اور پودوں پر مختلف رنگوں کے نرم پھول ہوا کو معطر کر رہے تھے ماہ روز کو لگا وہ تو کبھی کسی اور جگہ رہی ہی نہیں وہ تو جانے کب سے یہیں تھی اسی چار دیواری میں انہی بیلوں اور پودوں کے پاس ماہ روز سیدھی پودوں کے پاس جا کر کھڑی

ہوئی اور گہرا سانس لیا حیدر یہاں سانس لیتا ہے اور پھر دو گہرے سانس مزید لیے صحن میں پڑی چارپائی پر وہ بیٹھ گئی اس نے کہاں خود سے بیٹھنا تھا گڑیا نے ہاتھ تھام رکھا تھا

میں کھانا کھا چکی ہوں اور سندس اور منیٰ سکول سے آ کر سو گئی تھیں اس لیے آپ سکون سے بیٹھیں کچھ کھانا ہے تو مجھے بتائیں گڑیا اس کو پرشوق نگاہوں سے دیکھتی بولی

اف ان سب کو دیکھنے کا کتنا شوق ہے ماہ روز کو ہنسی آئی

وہ سدرہ باجی کو کیا ہوا ہے؟ ماہ روز کو اچانک سے یاد آیا تو پوچھ بیٹھی

سچ بتاؤں یا جھوٹ؟ گڑیا نے شرارت سے کہا

خاندانی بیماری ہے میرا خیال ہے گھما پھرا کر بات کرنے کی بجائے سیدھی طرح سچ سچ بتاؤ ماہ روز نے گڑیا کا ناک دبایا۔

آپ نے حیدر بھائی کو تب تک نہیں بتانا جب تک وہ خود آپ سے بات نہ کرلیں۔ یاد دہانی کے طور پر گڑیا نے آنکھیں مٹکا کر ماہ روز کو دیکھا اور اپنی بات جاری رکھی

آپ کو پتا ہی ہوگا امی ابو کی وفات کے بعد گھر میں سب سے بڑی سدرہ باجی تھی جن کا رشتہ ماموں کے گھر دیا ہوا تھا اور وہ ایم اے کا امتحان دے رہی تھی امی ابو کی وفات نے ہم سب کو ہلا کر رکھ دیا ہم تو خیر چھوٹے ہی تھے سدرہ باجی نے حیدر بھائی سے لے کر منیٰ تک سب کو سنبھالا صبح اسکول جوائن کیا شام میں اکیڈمی میں پڑھانے چلی جاتی اور پھر رات گئے گھر میں بھی بچے آئے ہوتے حیدر بھائی کا گریجویشن ہوا تو ساتھ ہی انہوں نے ماسٹرز میں داخلہ لینے سے پہلے باجی کی شادی کروادی وہ نہیں چاہتے تھے کے بہن بھائیوں کو پالے ہماری باجی اسی دہلیز پر بالوں میں چاندی اتار لیں ہم میں سے کسی کو پتہ نہیں چل سکا کہ کیسے گھر میں وہ جگہ جو امی ابو کی تھی وہ سدرہ باجی نے سنبھالی اور پھر حیدر بھائی نے لے لی ہم چھوٹے تو ہمیشہ سنبھالے گئے لیکن ہمارے بڑے چکی میں پسنے لگ گئے راوی چین ہی چین لکھتا اگر سدرہ باجی کے شوہر میں رشتہ دار ہونے کی خوبی کے علاوہ کوئی بھی انسانوں والی خصلت ہوتی لیکن ایسا نہ ہوا حیدر بھائی اتنے بڑے نہ تھے کے منوں مٹی سوئے بڑوں کے فیصلے میں ردو بدل کر سکتے در حقیقت انہیں اندازہ ہی نہیں تھا پہلے پہل سدرہ باجی کی ٹیوشن اور نوکری جاری رہنے کا سبب بہن بھائیوں کی سپورٹ کو گردانا گیا لیکن پھر وقت نے گزرتے گزرتے سبق دیا کے النصر بھائی کا پیٹ اتنی آسانی سے بھرنے والا نہیں وہ لڑکی جو اپنے میکے میں رہ کر اپنی غیر شادی شدہ زندگی کو پیسے کمانے کے چکر میں بے رونق کر سکتی ہے اس لڑکی کو بھلا اپنی شادی شدہ زندگی کو بچانے کے لیے سسرال میں رہ کر نوکری کرنے پر کیا اعتراض ہو سکتا ہے؟ سدرہ باجی گرہستی سنبھالتے کمانے، کھلانے اور پکانے کے چکر میں گھن چکر بن گئی لیکن ہم نے اس کو عنایت جانا لیکن النصر بھائی کی لالچی نگاہیں اب حیدر بھائی کی کمائی پر پڑنے لگ گئیں یہ بات بھلا سدرہ باجی کو کیسے برداشت ہوتی انہوں نے بھرپور احتجاج کیا جس کا نتیجہ یہ نکلا کے حیدر بھائی اب چھپ چھپ کر النصر بھائی کی مٹھی گرم کر دیتے اور راوی چین لکھنے لگ جاتا آپ سمجھ رہی ہوں گی کے اب کہانی ختم ہو گئی ہے لیکن نہیں ماہ روز آپی ابھی تو کہانی شروع ہوئی ہے ہمارے گھر میں امی ابو کی وفات ہونے کے بعد ہر شخص کی آنکھوں میں بے رونقی تھی قہقہے مر گئے تھے اور بے ترتیبی، بے سکونی کے اژدھے نے نارمل گھروں والے ماحول کو اپنے شکنجے میں لے لیا تھا پھر آپ آئیں ماہ روز آپی آپ ---------- حیدر بھائی کی زندگی میں ترتیب آ گئی وہ ہنسنے لگے بولنے لگے ذمہ دار پہلے بھی تھے اب خوش مزاجی سے ذمہ داریاں سنبھالنے لگے کوئی ایک شخص آپ کی زندگی میں ایسا آتا ہے تا کے آپ کے اردگرد سارے اندھیرے اس کے ہونے سے اپنی موت آپ مر جاتے ہیں آنکھیں روشن ہوتی ہیں اور

لب گنگنانے لگتے ہیں ایک سچی خوشی آپ کو ہوا میں لیے پھرتی ہے ہم نے بھائی کی ہواؤں کا تعاقب کیا وجہ آپ کی صورت میں ملی ہم بہت خوش ہوئے عرصہ دراز بعد ایک سچی خوشی نے ہمارے بوسیدہ دلوں پر دستک دی تھی ہم دروازہ کیسے نہ کھولتے لیکن غموں کو بھی شاید ہماری چوکھٹ سے انسیت ہو گئی تھی ان سے اس خوشی کا آنا برداشت نہ ہوا النصر بھائی کی صورت میں ہماری خوشی وقتی ثابت ہوئی انہوں نے نیا مطالبہ سامنے رکھا کہ حیدر کو ان کی معذور بہن آنسہ باجی سے شادی کرنا ہو گی ہم ششدر رہ گئے حیدر بھائی خاموش ہو گئے لیکن سدرہ باجی آخر کب تک اپنے بیٹوں جیسے بھائی کو قربانی کا بکرا بنے رہنے دیتی خاموشی سے گرم کی گئی مٹھیوں نے بھی ان کے دل میں ندامت کے الاؤ بھڑکا رکھے تھے کل بھی دراصل سدرہ باجی اور النصر بھائی میں اسی بات پر گرما گرمی ہوئی اور انہوں نے باجی کو جلانے کی کوشش کی اسی لیے حیدر بھائی ان کے ساتھ اسپتال ہیں لیکن آپ بالکل بھی پریشان مت ہونا میری تفصیلی بات ہوئی ہے سدرہ باجی سے بھی اور حیدر بھائی سے بھی اس دفعہ النصر بھائی کا مطالبہ ماننے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اگر اس دفعہ بھی ان کی سن لی گئی تو وہ خود کو خدا سمجھ کر ہمیشہ ہمیں آزمائشوں میں مبتلا کرتے رہیں گے حیدر بھائی شش و پنج میں مبتلا رہے لیکن اپنے اوپر پردے ڈالنے کے فن سے آشنا ہونے کی وجہ سے آپ کے سامنے بھی شرمندہ نہیں ہوئے النصر بھائی بھی تقریباً خاموش ہو گئے تھے لیکن کل رات پھر بات بگڑ گئی۔'' گڑیا ساری بات سناتے ہوئے کئی جگہ جذباتی ہوئی کبھی آنکھوں کے کنارے گیلے ہوئے اور کبھی ہلکی سی سسکی آئی لیکن ساری بات بتا کر وہ خاموش ہو گئی ماہ روز نے اسے گلے سے لگا لیا وہ ہلکی ہلکی سسکیاں بھرنے لگی ماہ روز نے اسے جی بھر کر آنسو بہانے دیئے پھر خود سے الگ کر کے منہ دھونے بھیجا شام کے پرندوں نے دھیرے دھیرے اپنے سرمئی پروں سے دن کی کھلکھلاہٹ کو چھپا لیا ماہ روز کو باجی کی فکر ستانے لگی اسی اثناء میں دروازہ کھلا اور حیدر سدرہ باجی کو لیے گھر میں داخل ہوا سامنے چارپائی پر ماہ روز اور اس کی تینوں بہنیں بیٹھی تھیں کتنا مکمل منظر تھا حیدر کا دل چاہا کے وقت کی لگامیں اپنے ہاتھوں میں لے لے اور ماہ روز کو اپنی چھوٹی سی دنیا سے ایک پل کو بھی نہ جانے دے اچانک ماہ روز اٹھی تو حیدر کو احساس ہوا کہ وقت کی لگامیں تھامی نہیں جا سکتیں مسلسل اس لڑکی کو دیکھا نہیں جا سکتا حقیقت خواہشوں کو نہیں سمجھتی حقیقت ہر پل بدلتی ہے وہ اب سدرہ کا دوسرا بازو تھامے درحقیقت حیدر کی مدد کر رہی تھی سدرہ کے پاؤں پر بینڈیج ہوئی تھی یا شاید دوائی کی ہی تہہ تھی لیکن صد شکر کے پاؤں ٹھیک نظر آ رہا تھا سدرہ باجی نے چارپائی پر بیٹھتے ہی اپنے ہاتھوں کے پیالے میں ماہ روز کا چہرہ لیا اور اس کے ماتھے کو چوما۔

''سدا خوش رہو ہنستی مسکراتی رہو اللہ تمہیں بہت سی خوشیاں دے سارے راستے آسان کرے ماہ روز شرمندہ ہو گئی۔

آپ کیسی ہیں۔ ماہ روز آہستگی سے بولی

''میں ٹھیک ہوں ایک دم فٹ فاٹ الحمدللہ۔ سدرہ باجی کے ہشاش بشاش سے جواب سے ان کی بہنوں کے چہروں پر بھی مسکراہٹ آ گئی۔

بہنوں کا رشتہ ایسا ہی ہوتا ہے جیسے ایک ہاتھ کی ساری انگلیاں بے شک ایک دوسرے سے جدا ہوتی ہیں لیکن اگر ایک کو چوٹ لگ جائے تو دوسری اس کی ذمہ داریاں سنبھال لیتی ہے۔

''ماہ روز آئیں آپ کو گھر چھوڑ آؤں۔'' حیدر نے اسے کہا تو وہ مسکرا دی۔

''یہ شخص آخر کیوں مجھے آزمائش میں نہیں ڈالتا مجھے روک سکتا تھا ضد کر سکتا تھا لیکن پھر بھی اس کو میرے لیے آسانیاں پسند ہیں وہ اٹھی تو سدرہ باجی نے اٹھ کر ملنے کی

کوشش کی اس نے بمشکل انہیں بٹھایا دروازے کے باہر جا کر بولی۔

"آپ نہ چھوڑنے جائیں میں چلی جاؤں گی۔"

"پاگل میں ہوں لیکن پاگلوں والی باتیں آپ خود کرتی ہیں۔" حیدر نے ہنس کر اس کی طرف دیکھا اور کہا۔

"اچھا ٹھیک ہے چھوڑنے چلے جائیں لیکن روڈ تک جانا ہے گلی سے میں خود چلی جاؤں گی۔" ماہ روز اب قطعیت سے بولی حیدر نے سر اثبات میں ہلایا یعنی اسے مانتے ہی بنی۔

کچھ لمحے کچھ ساعتیں کبھی نہ بھولنے کے لیے ہوتی ہیں وقت آگے بڑھ جاتا ہے اور انسان وہیں رکا رہتا ہے انہی لمحوں کی قید میں انہی ساعتوں کے حصار میں حیدر کو ابھی بھی اپنی خوش قسمتی پر بھروسہ نہیں ہو رہا تھا کے ماہ روز اس کے گھر میں آئی اور سارا دن رہی گھریلو حلیے میں اس کی شرارتی لٹیں بار بار اس کی پلکوں کو چوم رہی تھیں اور اس کی آنکھوں کی چمک جیسے اندھیرے میں جگنو۔

وہ اس کی زندگی کی روشنی ہے حیدر کے اندر یقین سانس لینے لگا۔

......☆❀☆......

صبح ظفر صاحب نے کمرے کا دروازے کو کھولا تو دوسری طرف سے بند ملا وہ پریشان ہوئے اس وقت تک روزی جاگ چکی ہوتی ہے باہر سے کسی کو بلاتے اور گھر کے داخلی دروازے سے اندر جانے کی کوشش کرتے تو سارا محلہ ساتھ اکٹھا ہو جاتا دل کھٹکنے لگا کچھ گڑبڑ کا احساس ہوا خاموشی سے بیٹھک کے راستے سے باہر گئے دو مکان چھوڑ کر ایک گھر زیر تعمیر تھا وہاں سے چپکے سے اینٹ اٹھائی کسی صاحب نے پوچھا۔

"خیریت ظفر صاحب؟"

"بس اخروٹ توڑنے تھے لیکن میری ہتھوڑی کا ہینڈل الگ ہو گیا۔" وہ صدیوں سے کمزور لگے۔

بیٹھک میں داخل ہو کر باہر کی طرف کا دروازہ بند کیا کنڈی اوپر کی طرف تھی وہاں اینٹ سے ضرب لگانا شروع کی ٹھک ٹھک ٹھک۔

دل انہونی کے احساس سے فشار خون کو سنبھال نہ رہا تھا انہوں نے اینٹ رکھی اور دروازے سے ٹیک لگا لی ساتھ ہی دروازہ کھلا ساتھ ہی ان کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں کاش ان کی آنکھیں یہ کبھی نہ دیکھتیں اس سے بہتر دروازہ بند ہی رہتا سامنے روزی کھڑی تھی کھلے بال ماتھے پر کسی ضرب کا نشان واضح تھا اور چہرے پر کھرونچیں؟

کون غاصب تھا؟ اس سوال نے سر اٹھایا ظفر صاحب کی نگاہیں جھک گئیں روزی کے پیروں میں بڑے بڑے گھنگرو بندھے تھے وہ تو کبھی پائل نہ پہنتی تھی اور یہ گھنگرو۔

انہوں نے چوکھٹ کا سہارا لے کر کھڑا ہونے کی کوشش کی آج صبح سے اپنے جسم اور ذہن پر یہ پہلی کوشش کامیاب ہوئی ایسی اولاد کا گلا دبا کر مار دینا چاہیے وہ ہاتھ بڑھاتے اس سے پہلے روزی نے ان آنکھوں میں دیکھا۔

"شش میں حصار کے حصار میں ہوں۔" وہ بھاری آواز میں بولی ظفر صاحب چونکے انہوں نے اس کے پیچھے دیکھا کے شاید کوئی اور بولا ہو اور روزی کے صرف ہونٹ ہلے ہوں لیکن پیچھے کوئی نہیں تھا کوئی نہیں تھا نظریں جب پیچھے سے واپس روزی کی نظروں سے آن ملی تو اس میں نظر نہ تھی صرف زردی تھی اور لبوں پر وحشیانہ مسکراہٹ۔

"شش......!" روزی نے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اشارہ کیا۔

ظفر صاحب پورے قد سے گرے تھے آج انہیں وقت نے اس مقام پر لا کھڑا کیا تھا یہ معاملہ ان کے ہاتھوں سے باہر تھا انہوں نے اپنا سینہ مسلا روزی پلٹ کر برآمدے کی طرف جا رہی تھی چھن چھن کی آواز نے ان

کے کانوں میں پگھلا ہوا سیسہ انڈیلا تھا درد کی شدت سے انہوں نے آنکھیں بند کر لیں۔

روزی کی عجیب حالت تھی کبھی جامن کے درخت سے چپکی کھڑی ہوتی کبھی ایک ہاتھ سے بھاری بھرکم بستر گھسیٹ لیتی کبھی دو انگلیوں کے زور سے کارنس پر پڑے سارے برتن بجتے بجتے نیچے آ گرتے کبھی ایسی نخیف و نزار کہ ظفر صاحب سنبھالنے کی کوشش کرتے اور وہ ہاتھوں کے درمیان سے نکل کر زمین بوس ہو جاتی جب اس کے گھنگرو اتارنے کی کوشش کرتے وحشی بن جاتی اپنی انگلیوں کے لمبے ناخن اپنی گردن پر مارنے لگتی اپنا سینہ نوچنے لگتی وہ اس عمر میں بیٹی کی برہنگی کیسے دیکھتے دور ہو جاتے کبھی ہاتھ سیدھا ان کی داڑھی پر مارتی اور یوں لگتا داڑھی پر آریاں چل رہی ہیں اور پھر وہ حلق میں اتر رہی ہیں اور اب پھر یہ سینے میں اتر گئی۔

وہ کتنے بھی پردہ پوش بن جائیں اس محلے میں یہ بات چھپا نہیں سکتے تھے اسری نے یہ حالت اپنی آنکھوں سے دیکھی اور پھر اس کے گھر سے کوئی لوٹ کر نہیں آیا قاسم کو پھر کوئی اور پری اپنے پروں میں سمیٹ کر سمندر پار لے گئی اس کی بہن اور باپ بھی گئے وقت میں کون ساتھ دیتا ہے؟ چھاؤں بھی دھوپ بن کر جسم کو چبھنے لگتی ہے کسی کو کیا خبرا س جوگن کا جوگ کس کی نظر کے فریب سے شروع ہوا وہ چھوٹے سے محلے میں نشان عبرت بن گئی وجہ کون تھا؟ کوئی نہ جان سکا۔

ظفر صاحب نے ماضی کے نام پر وہ پرتیں کھولیں یاد آیا اولاد کے نام پر بیٹا جسے بیوی کی وفات پر دھکے دے کر نکالا تھا وہ چیختا رہا

"بابا مجھے امی نے معاف کر دیا تھا وہ کل رات مجھے کہہ رہی تھیں شمع کو گھر لے آؤ میں ساری رات اس کی پائنتی پر بیٹھا رہا بابا آپ کو اللہ کا واسطہ مجھے گھر سے نہ نکالیں مجھے میری ماں کی یادوں کے ساتھ زندہ رہنے کا حق دے دیں بابا میں ہاتھ جوڑتا ہوں میں پاؤں پکڑتا ہوں مجھے میری ماں کے جنازے میں شریک ہونے دیں کل رات میرا چہرہ ان کے ہاتھوں میں تھا انہوں نے کہا میرے شہزادے میری صفدر مجھے میرے آخری مقام پر اپنے ہاتھوں سے چھوڑ کر آنا بابا مجھ سے میرا حق مت چھینیں۔ لیکن ظفر صاحب پر بھوت سوار تھا صفدر کو گھر سے نکال باہر کیا۔

اس کا جرم ہی کیا تھا؟

اپنی پسند کی شادی۔۔۔۔

نہیں صرف یہ نہیں بلکہ اس نے ان کے بھائی کی بیٹی کو بھی مسترد کر دیا تھا

ایک اکلوتا بھائی۔۔۔۔۔۔

جس نے اس کے بعد سارے رشتے توڑ لیے۔ بہو ابھی تک ظفر صاحب کی آنکھوں کے سامنے نہیں آئی تھی صفدر نے اسے دوست کے گھر رکھا ہوا تھا ان کی بیگم ٹی بی کی مریضہ تھیں جنہیں کل رات صفدر منانے آیا اور صبح نو بجے کے وقت ان کی روح پرواز کر گئی جانے والی نے معاف کر دیا دنیا میں رہنے والے نے گھر میں رہنے کا حق بھی چھین لیا صفدر سالہا سال کوشش کرتا رہا لیکن کوئی روزن نہ مل سکا نہ کبھی خیریت مل سکی بہن کی اور نہ ہی کبھی باپ کا دل پگھلا۔

......☆❀☆......

ماہ روز تیز تیز قدم اٹھاتی گلی میں داخل ہوئی اس کا دل مختلف احساسات سے دوچار تھا کچھ ہو جانے کا ڈر اور کچھ اپنائیت کا وزن اس کے دل کو ڈبو رہا تھا اس نے دروازے کو کھٹکھٹانے کے لیے ہاتھ اٹھایا اور دروازہ اسی لمحے کھل گیا ایک نوجوان ابا جی کو تھامے گھر سے باہر جانے لگا ماہ روز کی چیخ ہی نکل گئی۔

"ابا جی میرے ابا جی نوجوان پر اس بے قراری کا کچھ اثر نہ ہوا وہ اسی تیزی سے نکل گیا ماہ روز کے ہاتھ پاؤں پھولے ابا جی بے ہوشی سے ساتھ گھسیٹے چلے جا رہے تھے۔

''بیٹا۔'' گھر سے ایک مشفق سی آواز آئی وہ چونکی یہ کیا ہو رہا ہے ایک کے بعد ایک اجنبی۔

''بیٹا ظفر صاحب کی طبیعت خراب ہوگئی ہے یہ میرا بیٹا ہے ہم انہیں اسپتال لے کر جا رہے ہیں آپ ہمارے ساتھ چلو۔'' ان کے پیچھے شال اوڑھے ایک اور خاتون بھی تھی ایک اور اجنبی۔

اجنبی اجنبی ہی ہوتے ہیں آپ ان کے تاثرات نہیں جان سکتے ان کے چہرے نہیں پڑھ سکتے انہیں سمجھ لیا جائے تو ہی دل میں اترتے ہیں لیکن سمجھنے کے بعد اجنبی اجنبی بھی تو نہیں رہتے۔

حواس باختہ سی ماہ روز ان انکل اور خاتون کے ساتھ ان کی کالی گاڑی میں بیٹھ گئی کالا رنگ اسے ہمیشہ پراسرار ہی لگا وہ اس رنگ کو گہرا سمجھتی تھی لیکن اس کی زبان کو سمجھ نہ سکتی تھی گاڑی چلنے لگی وہ رونا چاہتی تھی لیکن نہیں روئی اجنبی کی کالی گاڑی میں بیٹھ کر وہ خود کو اتنا کمزور نہیں ثابت کر سکتی تھی ایک دل چاہا کہ حیدر کو فون کرے لیکن دل کی اس نے اب نہیں سنی تھی وہ یہ فیصلہ حیدر کے گھر چارپائی پر بیٹھے کر چکی تھی اسپتال جا کر پتہ لگا کہ اباجی کو دل کا دورہ پڑا ہے ڈاکٹرز نے پیس میکر لگانے کی کوشش شروع کر دی اچانک ایک ڈاکٹر تیزی سے باہر نکلا۔

''ماہ روز حیدر کون ہے؟'' ماہ روز چونکی۔

ماہ روز تک تو ٹھیک تھا اگرچہ اباجی نے اسے کبھی ماہ روز کہہ کر نہیں پکارا ہمیشہ روزی ہی کہتے لیکن یہ اس کا نام تھا وہ اس نام کو ہضم کر سکتی تھی لیکن ماہ روز حیدر کہہ کر پکارنا وہ آنسو پونچھتی اندر کمرے میں گئی۔

''میرے پاس وقت کم ہے بیٹا حیدر کو بلوا لو۔'' اباجی اکھڑتی سانسوں کے درمیان بولے۔

'اباجی وہ نہیں آسکتا' ماہ روز کے آنسو نکل پڑے۔

''وہ آجائے گا ماہ روز میری روزی وہ آجائے گا۔'' ان کی نکلتی جان میں یقین تھا۔

''اباجی وہ نہیں آسکتا۔'' وہ بھی بھی نہیں آسکتا' ماہ روز اب باقاعدہ سسکنے لگی۔

''پھر اس لڑکی کو بلواؤ۔'' اب اباجی کی ہاری ہوئی آواز نکلی۔

ماہ روز نہیں جانتی تھی کہ خاتون کون ہیں لیکن اسے اتنا پتہ تھا کہ باہر موجود تین نفوس میں سے خاتون ایک ہی ہیں وہ انہیں اندر لے آئی اباجی نے ماہ روز کا ہاتھ تھام کر اس عورت کے ہاتھ میں دے دیا۔

''میری چلتی سانسوں میں ہی ماہ روز کو لے جاؤ۔'' ماہ روز کے پیروں کے نیچے سے زمین اور ٹانگوں سے جان نکلی وہ اس اجنبی عورت کے سامنے ایک حرف بھی نہیں نکال سکتی تھی۔

وہ بیٹھی تھی اسے مان رکھنا تھا سر جھکا دیا آناً فاناً اس جھلک دیکھے نوجوان کیساتھ اس کا نکاح ہو گیا حیدر کی شبیہ اس کے ذہن پر سوار رہی لیکن وہ سر جھٹکتی رہی اس نے اپنا موبائل آف کر دیا رات کے کسی پہر سوتے ہوئے اسے خبر ملی کے کچھ ہو گیا ہے کوئی اس کو کندھے سے پکڑ کر جھنجوڑ رہا تھا اور وہ آنکھیں نہیں کھولنا چاہتی تھی۔

یہ اباجی کی موت کی خبر تھی۔

زندگی حسرتوں کا نام ہے زندگی حادثوں کا نام ہے ایک ہی پل میں دنیا بدل سکتی ہے ایک ہی لمحے میں دل میں اترنے والے دل سے اتر جاتے ہیں ایک سیکنڈ کے اندر ایک جیتا جاگتا چلتا پھرتا انسان ڈھیر ہو جاتا ہے ہماری پلاننگ ہماری خواہشوں کی ذرہ برابر بھی اہمیت نہیں ہے ضروری ہے کچھ تو وہ اچھے نصیب ہیں کوئی قسمت میں ہے تو وہ خوش قسمت ہے کوئی اگر نہیں ہے تو یہ قسمت کی ستم ظریفی ہے زندگی خود ایک بہت بڑی آزمائش ہے کون کہتا ہے زندگی کچھ پا لینے کا نام ہے زندگی سب کچھ کھو کر بھی زندہ رہنے کا نام ہے ماہ روز زندگی کو سمجھتے سمجھتے بے ہوش ہو گئی

روزی جیسے نیند سے اٹھی اس کا سارا جسم تھکا ہوا تھا اس نے بمشکل اپنے آپ کو گھسیٹا رات کی رانی کے چرنوں میں بیٹھے بیٹھے اس کا وجود مہک رہا تھا لیکن سارے بال کھلے گلے میں پڑے زبوں حالی کی داستان سناتے رہے اس کو اپنی ہڈیاں چٹختی ہوئی محسوس ہوئی زانوں سے لے کر پاؤں کے گھٹنوں تک بہت عجیب سا کھنچاؤ تھا جیسے کوئی اندر اترا ہو اور اس نے چیر کے رکھ دیا ہو چارپائی کو ہاتھ سے تھام کر وہ گھسیٹ کر کمرے کے دروازے تک آئی اسے تھوڑا رکنا پڑا سانس چڑھ گئی اور آنکھوں کی سرخی محسوس ہونے لگی۔

پورے جسم کو زبردستی گھسیٹا گیا سامنے پڑے شیشے کے ٹیبل کا سہارا لیا اور وہ آگے بڑھی اب وہ شیشے کے سامنے کھڑی تھی دونوں ہاتھوں نے سارا بوجھ لکڑی کے سپرد کیا گردن کسی ان دیکھے خوف سے ایک جگہ جم گئی اسے خود کو دیکھنے کی خواہش نے پاگل کیا۔

کیا محبت نے میرے اندر باقی کچھ چھوڑا ہے؟ اسے اب بھی اپنے اوپر ہونے والا ظلم محبت کا لگ رہا تھا پلکیں اٹھائی اور نظریں اپنے عکس سے ملی وہ حیران ہوئی اس کے جسم کے زرد کپڑے آہستہ آہستہ سرخ ہونے لگے اس نے سسکیاں بھری وہ اس عذاب سے نکلنے کو مر رہی تھی لیکن یہ عذاب چاروں طرف سے اس کے وجود کو اپنے شکنجے میں لینے کو بے تاب تھا گھنے لمبے بال جو اپنی چمکیلی تازگی کو اس کے شانوں پر بکھیر کے ہواؤں سے اٹکھیلیاں کرتے پھرتے تھے اور آج ان کی بدرونقی سے مسکراہٹ کی موت ہو گئی اس نے الٹے ہاتھ کو شیشے پر جما کر رکھا اور سیدھا ہاتھ کنگھی کی طرف بڑھایا اپنے عکس کے اوپر کوئی سایہ دیکھ کر اس کی جان نکل گئی اس نے سائے کے وجود کو دیکھا وہ لمبی بدہیئت سی مخلوق وہی تھی صرف چھپکلی کہنا اس کی پراسراریت کو کم کر دیتا روزی نے جھرجھری لی زرد رنگت کی ڈراؤنی آنکھوں نے کوئی راز سا منتقل کیا کنگھی ہاتھ سے جا گری اس نے لپ اسٹک اٹھائی۔ اسے یاد آیا کے اچھے وقت میں ثمینہ کے ساتھ جا کر اس نے یہ سرخی لی تھی تاکہ جب قاسم کے سنگ اپنی زندگی بتائے گی تو خود کو رنگ سکے لاشعور میں آئی اس یاد نے وحشت سی پھیلا دی وہ لپ اسٹک رکھنے کی کوشش رائیگاں گئی اس کے دماغ پر بوجھ بڑھا لپ اسٹک اس کے ہونٹوں تک آئی وہ نہیں لگانا چاہتی تھی اس نے نہیں لگائی تھی لیکن اس کے اختیار میں کب تھا کے وہ اس پاگل پن سے چھٹکارا حاصل کر سکے زرد آنکھوں نے دماغ پر مزید بوجھ ڈالا سایہ اس کے وجود سے زندگی کی رمق چھیننے لگا سرخی کناروں پر لگاتے لگاتے وہ گال تک جا پہنچی زرد آنکھیں چمکی ان میں جیت کا مزہ ہلکورے لینے لگا روزی نے ہاتھ مار کر سارے پرفیومز کو نیچے گرا دیا سیدھا ہاتھ شیشے کی میز پر جا پڑا اس نے خود کو سنبھالنے کی کوشش کی لیکن وہ اپنے آپے میں کہاں تھی اس کا جسم اس کے قابو سے باہر یہاں وہاں گرنے لگا ہڈیاں جسم کے خول سے باہر آنے کو بے تاب تھی ہاتھ میز کے نیچے سے اوپر گیا شیشہ چکنا چور ہو گیا کرچیاں ہاتھوں میں لگیں اور ایک دو چبھی رہ گئیں وہی ہاتھ بالوں کو نوچنے لگا اور ماتھے پر آن پڑا خون کی لکیریں فرش رنگین کرنے لگی وہ زرد آنکھیں اب ناچ رہی تھی سایہ پورے کمرے پر حاوی ہو گیا۔

روزی کی گھٹی گھٹی سی چیخیں نکلتی اپنے آپ بچانے کی ناکام کوشش انگڑائیاں لیتی لیکن یہ عالم کوئی اور عالم تھا سننے کا رواج نہیں تھا صرف سزا تھی روزی کے پیلے پاؤں میں پڑے گھنگھرو سارے کے سارے بیڑیاں بن گئے وہ لہو کو باہر نکالنے لگے پاؤں اور ٹانگیں تکلیف سے شل چلنا محال آواز نکلنے سے قاصر ظفر صاحب نے برآمدے سے دیکھا وہ کمرے کے دروازے میں پڑی تھی ہاتھوں اور پاؤں سے لہو رس رس کر زمین کی پیاس بجھانے میں مگن اور کھڑکی کا تیزی سے ہلتا پردہ کسی کے ابھی ابھی جانے کے راز سے پردہ اٹھا رہا تھا وہ باریش آدمی کچھ لمحوں کے لیے واقعی

ڈر گیا آگے بڑھ کر اسے سیدھا کیا وہ بھاری تھی بہت بھاری۔۔۔ چنیوٹ کی الماری کا بھی وزن شاید اتنا نہ ہو وہ سیدھا نہ کر سکا ایک طرف سے روزی کے گالوں پر لگی ہوئی سرخی پر نظر پڑی وہ حیران ہوا اس نے اپنے ماتھے پر ہاتھ مارا پھر سینے پر اب زار و قطار رونے لگا۔

مجھ سے کیا ہو گیا؟ مجھ سے ایسا کیوں ہوا؟ جوان ہوتی بیٹی مجھے نظر کیوں نہیں آئی میں اس کو چھوٹی سی گڑیا سمجھتا رہا نہ کبھی روکا نہ کبھی ٹوکا مجھے کیا خبر تھی کے یہ ننھی سی کونپل کبھی یوں میرے سامنے آن کھڑی ہو گی کاش اس کی ماں زندہ ہوتی وہ میرا شانہ تھپتھپاتی اور کہتی۔

اے صفدر کے ابا آنکھیں بند کیے بیٹھے ہو؟ گڑیا اب بڑی ہو گئی ہے کچھ تو کرنا ہے کچھ تو سوچنا ہے میں اسے کہتا۔

میری ننھی سی گڑیا ہے تجھے کیسے اتنی بڑی لگنے لگ جاتی ہے اس کے لمبے بالوں کو نہ دیکھ اس کی شرارتی آنکھیں دیکھ اس کے نرم نرم ہاتھ دیکھ یہ بھلا گھر کے کام سنبھالنے کے لیے کہاں بنے ہیں؟ وہ آگے سے مجھے جھنجوڑتی۔

ابھی ہوش کے ناخن لیں بیٹیاں تو پیغمبروں کے گھر نہیں بیٹھی آپ کیسے بیٹھا لیں گے اگر یہیں بیٹھے بیٹھے بالوں میں چاندی اتر آئی تو اس کی ہنستی آنکھیں چپ ہو جائیں گی خاموشی برداشت کر لیں گے؟

لیکن نہیں وہ نہیں رہی شریک حیات تھی اور بے وفا نکلی اتنی جلدی واپسی کا سفر طے کیا کہ میں اس دنیا میں اس کی یادوں کو ڈھونڈتا تنہا رہ گیا مجھے نہ کوئی یہ بتا سکا کے میری بچی جوان ہو گئی نہ ہی میں اپنی بچی کے نرم ہاتھوں کو گھر کے کام کاج سے دور رکھ سکا میں ناکام ہوں اور ساری ناکامی کی وجہ صفدر ہے اس کے ضدی فیصلے نے مجھ سے میری ہمدم کو دور کیا اور اسی کی کرنی کا سلسلہ آج روزی کی ہڈیوں کا رس نچوڑ رہا ہے میں اکیلا سنبھال لوں گا میں اسے آواز نہیں دوں گا میں اسے کبھی نہیں بلاؤں گا بوڑھا شخص اپنی انا کو ٹوٹتے دیکھتا رہا اجڑی بیٹی کا ماتم کرتا رہا اس کے کھوکھلے لفظ اس پر ہنس رہے تھے اب صفدر سے مدد لینا ضروری تھا۔

......☆❁☆......

اس نے آج آخری دفعہ اپنے گھر آئی آنٹی کو کہا آخری دفعہ اپنے گھر سونا چاہتی ہوں ماتم کی وجہ سے رخصتی تو ہو نہیں سکی تھی لیے دیے میں رہنے والی آنٹی نے اسے اکیلا چھوڑ دیا وہ سوچ کر آئی تھی کہ اپنا سب سامان ساتھ لے کر جائے گی یہ پرپل رنگ کا کوٹ اس سے حیدر کی جیکٹ پچ ہوئی تھی۔

یہ نیلے رنگ کی ڈائری۔۔۔ حیدر نے پڑھنے کو لی تھی

یہ چوڑیاں۔۔۔۔ ان میں سے تین حیدر نے مانگ لی تھی

یہ کتاب۔۔۔۔ اس پر حیدر نے کچھ اشعار لکھے تھے

اسے بے طرح وہ یاد آیا وہ سسکنے لگی موبائل آن کیا ساتھ ہی حیدر کالنگ اسکرین پر جگمگانے لگا اس نے فون اٹھایا اور اپنی آواز کو کمپوز کر کے ہیلو بولا۔

''کہاں ہو ماہی میں پاگل ہو گیا ہوں تمہارا گھر بند پڑا ہے موبائل نمبر مل نہیں رہا آس پاس کے گھروں میں سے کسی کو بھی نہیں پتا کے تم کہاں ہو تم کہاں چلی گئی تھیں تمہیں پتا تو ہے کے تمہارے ساتھ سے میری آنکھیں روشن رہتی ہیں میری آنکھوں میں اندھیرا دیکھنا چاہتی ہو؟ مجھ سے دور کیا سوچ کر جا رہی ہو؟ کدھر گئی تھیں؟ میری غلطی ہے کہ میں نے صرف پرپوز کیا تمہیں مجھے چاہیے تھا کہ سیدھا سیدھا اٹھا کر لے جاتا تمہاری دونوں کلائیوں کو ہاتھ سے تھامتا اور تمہاری آنکھوں میں جھانک کر تمہارے اور قریب آتا اور وہ بے تابانہ کہہ رہا تھا وہ بھول گیا تھا کہ اس نے ماہ روز کو کبھی تم کہہ کر نہیں پکارا تھا۔

''میرا نکاح ہو گیا ہے حیدر......!'' ماہ روز کی ٹھنڈی آواز اسپیکر سے نکلی تو حیدر نے کان سے موبائل ہٹا کر دیکھا۔

جان کیسے نکلے گی؟ جب باریک کپڑوں کو سوئیوں کے بستر پر بچھا کر کھینچا جائے۔۔۔۔۔۔ وہ اس کی جان تھی اور وہ کب اس کے اندر سے نکل گئی اسے پتا کیوں نہ چلا۔

ابا جی فوت ہو گئے تھے اسی رات جب آپ نے آخری بار گاڑی کے دروازے سے میرا ڈوپٹہ چھڑایا اور مجھے کہا تھا جائیں میں ہمیشہ کے لیے آ گئی۔ خاموشی اچھی نہیں ہوتی میں خاموش نہیں رہوں گی مجھے بتانے دیں گے کہ محبت ایک بار ہوتی ہے اور میں اپنی ایک بار کی محبت آپ سے پہلے ہی کر چکی۔ خیر کل صبح میں اپنے شوہر کے ساتھ کینیڈا جا رہی ہوں آپ اپنا بہت سا خیال رکھیے گا اپنی بہنوں کو بہت سا خوش رکھیے گا انہیں کبھی والدین کی کمی محسوس نہ ہو اور آپ کے گھر میں نئی پلانٹ کی بیل والے پودوں میں ایک بٹوہ رکھا ہے آپ کے لیے خریدا تھا اسے پیسوں سے بھر کر رکھیے گا آپ کی بہنوں کی کوئی خواہش ادھوری نہ رہے۔

اللہ حافظ وہ فون رکھ چکی تھی وہ جا چکی تھی حیدر سن ہو گیا بالکل سن۔

وہ سمجھتا تھا اس نے اپنے سارے دکھ جھیل لیے ہیں اب خوشیاں دستک دینے والی ہیں لیکن آج اسے اپنی زندگی کا سب سے بڑا دکھ ملا تھا اس کا گلا پیاس سے چیرا جا رہا تھا وہ سر بسجود زمین پر رونے لگا۔

''میرے اللہ اس سے چھوٹی آزمائش بھی تو ہو سکتی تھی اس سے کم درد بھی تو ہو سکتا تھا تو نے مجھ سے میرے والدین کا سایہ چھین لیا لیکن میں بالکل بھی نہ ٹوٹا کے وہ تیری عطا تھے اور ان کے بچھڑ جانے میں تیری کوئی بہتری ہو گی میں نے اس تکلیف پر صبر کیا کیوں کہ مجھے لگا تھا اس سے بڑی آزمائش اور کوئی ہو ہی نہیں سکتی اس آزمائش پر مجھے ثابت قدم رہنا تھا میں مضبوط ہو گیا پھر تو نے مجھے ماہ روز سے ملوایا اسے دیکھ کر مجھے لگا کہ اب میں مکمل ہو جاؤں گا میرے زخموں کے مدہم سے نشان بھی باقی نہ رہیں گے لیکن نہیں یارب یا الرحم الراحمین تو رحم کرنے والا ہے تو نے مجھے ناسور دے دیا میری نیت میں بھی کھوٹ نہ تھی میں مانتا ہوں میں نے تیری حدود کو پھلانگا میں نے اسے چھوا اسے دیکھا لیکن اللہ جی میری نیت صاف تھی میں نے اسے اپنانا تھا اللہ جی کیا آپ گواہ نہیں ہیں کے میں نے سجدوں میں گر گر کر بس ایک اس کا نام لیا تو مجھے ایک وہ دے دیتا مجھے بڑا مان تھا کہ میرا اللہ مجھے سب دیتا ہے سب عطا کرتا ہے پھر اتنی بڑی محرومی۔

......☆❁☆......

والدین کی وفات نے حیدر کو ذمہ دار بنا دیا تھا اور ماہ روز کی جدائی سے وہ بردبار بن گیا تھا پہلے بھی کم گو تھا اب اور بھی سوچ سمجھ کر بولتا بولتے ہوئے اتنا ٹھہرتا کے اگلے کو محسوس ہوتا وہ چپ ہو گیا ہے الفاظ ناپ تول کر منہ سے نکالتا جب ماہ روز کی یاد آتی۔ یاد تو کب نہیں آتی تھی پودوں کو دیکھتے ہوئے وہ یاد کرتا ماہ روز اس کے گھر کے پودوں کو دیکھنے کے لیے کتنی ایکسائیٹڈ تھی پرانی طرز پر بنا ہوا گھر اور اس کی لکڑی کی کھڑکیوں پر Caremal کلر اسے ہمیشہ تصویروں میں لبھاتا لیکن یہ کیسا گھر ہے وہ ایک دفعہ اس میں آئی اور پھر مجھ سے ہر رشتہ توڑ کر چلی گئی وہ اسے سوچتا تو یاد آتا کہ آخری بات اس نے صرف یہی کہی تھی اپنے بٹوے کو پیسے سے بھر کر رکھنا وہ کام میں جت جاتا صبح سے رات ہو جاتی اتنا کام کرتا کے جسم کا رواں رواں تھک جاتا پھر بستر پر پڑتے ہی سو جاتا اگر وہ کچھ دیر بھی اکیلے بیٹھتا تو ماہ روز کا تخیل حقیقت کا روپ دھار لیتا اس کی یادیں سینے کو زخمی کر دیتیں بہنیں شکوہ کرتے نہ تھکتیں۔

'بھائی اتنا کام کیوں کرتے ہیں؟' وہ جواباً اتنا کہتا۔

''سونا بھی تو ہے' اس سے زیادہ نہ وہ سوال کرتیں نہ یہ بولتا بولنے سننے کی ضرورت ہی نہیں تھی کبھی کسی نے اس کا گھر بسانے کی بات نہیں کی کیوں کہ ماہ روز سے اس کی

محبت کی شدت کو سب نے محسوس کیا تھا ان لمحوں کو اس گھر کے درو دیوار نے برتا تھا سب جانتے تھے کہ حیدر شادی نہیں کرے گا کہیں نہ کہیں انہیں بھی عادت سی ہونے لگ گئی اسے معروف دیکھنے کی خود سے لاتعلق دیکھنے کی اور اس عادت سے نبھا کرنا ان کی مجبوری بن گیا دو سال اسی طرح گزر گئے وہ اپنے اور دوسروں کے گھر میں ٹیوشن پڑھاتا رہا پھر وقت کا پانسہ پلٹا وہ جو نیچے کی طرف تھا اوپر کو آ گیا ایک پرائیویٹ فرم میں نوکری ملی باس تھوڑا اناڑی تھا پیسے لگاتا لیکن منصوبہ بندی نہ کر پاتا اس کا اپنا اسٹاف ہی اسے دھوکا دے کر پیسے میں ہیر پھیر کر لیتا حیدر کا معصوم چہرہ اسے اتنا بھایا کے اس نے آزمانے کا فیصلہ کر لیا حیدر آزمائشوں کا عادی وہ آزمائش میں پورا اترا۔

پرائیویٹ فرم کے اثر ورسوخ بڑھ گئے اس کے باس کی دولت میں اضافہ ہوا اور حیدر کو چھپڑ پھاڑ کر ملنے والے محاورے کا مطلب سمجھ میں آیا وہ رہتا آج بھی اسی گھر میں تھا لیکن بہترین گاڑی اور مختلف سہولیات نے زندگی کو سہل ترین بنا دیا تھا وہ زندگی گزار رہا تھا ایسی زندگی کہ جسے گزارنے کی لوگ خواہش کرتے کرتے مر جاتے ہیں زندگی جینے کی کسک وہیں باقی تھی وہ بے نام سی اداسی سرد راتوں میں اب بھی اس کے وجود کو ٹھنڈا کر دیتی کافی پیتے پیتے اسکے گلے میں پھندا لگ جاتا رات کو سوتے سوتے اسے وہ یاد آتی وہ جاگ اٹھتا اس کی پیاس آج بھی باقی تھی اس کی طلب پوری نہیں ہوئی وہ مطمئن نہیں تھا اس نے اللہ جی سے جھوٹ کہا تھا کہ وہ اسے بھول جائے گا وہ اسے بھول نہیں سکا جب کبھی موری دیکھنے جاتا دو ٹکٹس لیتا اور اپنے ساتھ والی کرسی خالی چھوڑے رکھتا لوگ دو دو کر کے آتے جاتے اسے تکلیف پہنچتی لیکن اسے اس تکلیف سے لطف آنے لگا تھا میں نے اسے کہا تھا مجھ سے زیادہ اسے کوئی خوش نہیں رکھ سکتا۔ کیا فضول وجہ ڈھونڈی تھی شادی کے لیے وہ آج خوش ہے جہاں بھی ہے مجھے یقین ہے وہ خوش ہے اور اگر یہ جھوٹ اس سے بولا تھا تو مجھے زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں ہے وہ خود کلامی کرتا اس کی یاد دن سے تصویروں سے باتیں کرتا اس کے قریبی لوگوں کے لیے وہ عجوبہ بن گیا۔

محبت میں لڑکیوں کو جوگ لیتے دیکھا گیا تھا وہ ایک نام پر مر جاتی ہیں لیکن لڑکے وہ ایسے روگ کب پالتے ہیں؟ لیکن وہ لڑکا کب تھا؟ وہ عاشق تھا کتنی دفعہ ماہ روز اس کے پاس کھڑی ہوتی وہ اسے تھام سکتا تھا لیکن یہ ڈر کے اس کے ہاتھوں پر میرے ہاتھوں کے نشان ہی نہ پڑ جائیں اسے چھونے نہیں دیتا تھا اسے بڑھنے نہیں دیتا تھا وہ اسے موم کی گڑیا لگتی جو اس کی تیز سانسوں سے بھی پگھل جائے گی وہ فاصلہ رکھ کر کھڑا ہوتا لیکن کبھی اس کی خوشبو اتنی تیزی سے اس کی سانسوں سے ٹکراتی کے وہ بنا سوچے بنا سمجھے اس کے قریب چلا جاتا اس کو دیکھتا رہتا اس کو پڑھتا رہتا وہ لمحے کتنے معتبر تھے وہ لمحے واپس آ سکتے ہیں؟

نہیں ----------اسے یوں ہی جینا تھا تنہا اس کی یادوں کا سہارا لیے ------- وہ خوش تھا کہ لوگ اسے عاشق سمجھتے ہیں خوشی عاشق ہونے پر نہیں بلکہ ماہ روز کا عاشق ہونے کی تھی ماہ روز آرام سے کہا کرتی تھی۔

'محبت وحبت کچھ نہیں ہوتی سب کو وقت سب کچھ بھلا دیتا ہے آپ مجھے دیکھتے ہیں تو کشش آپ کو محبت لگتی ہے بھلا ایسے بھی محبت ہوتی ہے؟ وہ دھیمے دھیمے ہنستا۔

''میں کرتا ہوں محبت آپ نہیں کرتی تو نہ کریں وہ آگے سے چڑ ہی جاتی۔

''مجھے پتا ہے آپ مجھ سے محبت نہیں کرتے آپ مجھے زچ کرنے کے لیے ایسے کہتے ہیں۔ کتنی دفعہ اس کے اظہار کو ماہ روز نے چٹکیوں میں اڑایا تھا وہ اب سوچتا اور اس کے تخیل سے سوال کرتا اگر یہ محبت نہیں ہے تو کیا ہے؟ تمہیں گئے عرصہ گزر گیا لیکن تمہارے نشان میرے اندر سے مدہم نہیں ہوتے ہاں تم سچ کہتی تھی مجھے تم سے محبت نہیں ہے مجھے تم سے عشق ہے۔

......☆❁☆......

روز چیلیں صحن میں آ کر بیٹھیں اور اڑ جاتیں اپنی چونچ میں گوشت کا ننھا سا لوتھڑا بھی ساتھ لاتیں جس سے خون نکل رہا ہوتا دن کی گرمی اور سڑے ہوئے گوشت کی باس نے فضا میں موت کو رقص میں مبتلا کر رکھا تھا ظفر صاحب موت کے پنجوں سے سراسیمہ تھے انہوں نے الماری سے لوح قرآنی کا فریم نکالا اور صحن میں اسے آویزاں کرنے کی نیت سے بڑھے لوح قرآنی لے کر جیسے ہی صحن میں قدم رکھا گوشت کے ٹکڑوں سے نکلنے والا خون ختم گیا یہ چیز ذہنی الجھن سے کہیں بڑھ کر ہے انہوں نے دل ہی دل تسلیم کیا میز کو دیوار کے ساتھ جوڑ کر رکھا ساتھ ہی روزی کے کمرے سے چیخنے کی آواز آئی انہوں نے لوح قرآنی کو وہیں چھوڑا اور کمرے کی طرف بھاگے کمرے کے ہر کونے سے ہر دیوار سے مکروہ چھپکلیاں نکلی چلی جا رہی تھیں ان سب کی آنکھیں زرد تھیں ایک کونے میں روزی دبکی کھڑی تھی اور وہ سب روزی کے اوپر چڑھتی جا رہی تھیں ظفر صاحب نے غور سے روزی کی آنکھوں کو دیکھا آنکھیں زرد نہیں تھیں یہ ان کی بیٹی کی آنکھیں تھیں ڈری ہوئی سہمی ہوئی التجا کرتی ہوئی آنکھیں۔

انہوں نے آگے بڑھ کر بیٹی کے پاس جانا چاہا مگر درمیان میں چھپکلیوں کا ایک قافلہ تھا وہ نہیں جا سکتے تھے ان کے ہاتھ میں لوح قرآنی آویزاں کرنے کی نیت سے ایک ہتھوڑا تھا انہوں نے ہتھوڑا زمین پر مارا جہاں چھپکلیاں تھیں لیکن وہ ویسے ہی جاتی رہیں ان میں سے کسی ایک کو بھی نقصان نہ پہنچا وہ رینگ رہی تھیں ان کے سرسرانے کی خوفناک آواز کمرے میں خوف کو ہوا دے رہی تھی روزی اب باقاعدہ چیخنے لگی وہ اس کے اوپر تھیں اس کے پاؤں پر -----اس کے ہاتھ پر------اس کی ٹانگوں پر ----اس کی رانوں پر------اس کے پیٹ پر ------اس کی پسلیوں پر------روزی کے جسم میں خون کی گردش رک گئی صرف چھپکلیاں دوڑتی رہیں باہر، اندر، اوپر------ان کا شکنجہ مضبوط ہوا اب وہ جسم کو دھنسا رہی تھیں تکلیف سے روزی کی چیخیں مزید تیز ہوئیں اس نے ان کو جھٹکنا چاہا مگر زرد آنکھیں اور سبز مائل کھردری سطح والی مخلوق چپک چکی تھی وہ اپنا وزن بڑھا رہی تھی اپنا بوجھ ڈال رہی تھی بوجھ سے روزی کی آنکھیں ابل آئیں اس کا چہرہ تمتمایا وہ چیخ رہی تھی۔

ابا---ابا----------ابا جی ظفر صاحب دیوانہ وار زمین پر ہتھورے برسا رہے تھے مگر اثر ندارد ------ چھپکلیوں جیسی مخلوق پر کوئی اثر ہی نہیں تھا وہ ایسے نکلے چلی جا رہی تھیں جیسے جنگ ہو وہ چیٹے چلی جا رہی تھی اس کا جسم آہستہ آہستہ چھپکلیون کے جم غفیر میں گم ہوا وہ نگل رہی تھیں اس کی آنکھیں زرد ہوئی بہت ورد اس کا گلا بھی چھپکلیوں میں چھپ گیا وہ اب اس کے چہرے کی جانب بڑھنے لگی ظفر صاحب نے ہتھوڑا اٹھا کر زمین پر دے مارا اور اونچی آواز میں چلائے۔

''نہیں لگاتا لوح قرآنی -----نہیں لگاتا ----
میری بیٹی کو بخش دو میری بیٹی کو چھوڑ دو۔''

آناً فاناً ساری چھپکلیاں کمرے سے غائب ہو گئیں جیسے تھی ہی نہیں روزی نچڑے ہوئے چہرے کے ساتھ فرش پر بے ہوش ہو گئی ظفر صاحب کو اب انا کا بت توڑنا تھا

یہ جو ریگ دشت فراق ہے
یہ رکے اگر تو پتہ چلے
کہ جو فاصلوں کی صلیب ہے
گڑی ہوئی ہے کہاں کہاں
میری چھت سے کدھر گئی
تیرے التفات کی کہکشاں
میں رہی کس نگر
تو رہا کہاں

کہ زمین و آسماں کی وسعتیں
تجھے دیکھنے کو ترس گئیں
وہ مرے نصیب کی بارشیں
کسی اور چھت پر برس گئیں

ماہ روز نے دس سال بعد اسلام آباد میں قدم رکھے اس کی آنکھوں میں بیتے برسوں نے اتنے خنجر چھبوئے کے ہردم خون رستا رہتا وہ سوچنا چاہتی کہ آج سے دس سال پہلے کہاں تھی اور کیا تھی سوچ نہ پاتی اس کے شل ہوئے اعصاب اسے ماضی کے دریچوں کو کھولنے کی اجازت نہ دیتے اتنی گھٹن تھی کہ سانس لینا محال لیکن سانس چل رہی تھی وہ جی رہی تھی کچھ لوگ ڈھیٹ ہوتے ہیں بہت ڈھیٹ زندگی ان کو ہر طرح سے آزماتی ہے مالی، ذہنی، قلبی، سماجی اور جذباتی پریشانیاں انہیں توڑنے کی پوری کوشش کرتی ہیں لیکن ان کے سن ہوئے اعصاب کسی بھی غیر کو زیادہ عرصہ تک برداشت نہیں کر پاتے سوچ نہیں پاتے محسوس نہیں کر پاتے وہ اس فیز سے نکل کر اگلے فیز میں داخل ہو جاتے ہیں۔

پرانی تکلیفیں بھول جاتے ہیں اور نئی تکلیفوں کو بھولنے کے لیے ان سے سمجھوتہ کر لیتے ہیں دیکھنے والے ان کو خوش قسمت سمجھتے ہیں یہ کوئی خود ان کی ذات سے پوچھے کہ اتنا بھاگنا روح کو کیسے چھلنی کر دیتا ہے اتنی مسافت پیروں کو کتنا آبلہ پا کر دیتی ہے اتنی وحشت احساس کو کیوں مردہ کر دیتی ہے وہ بھی بھاگ بھاگ کر تھک چکی تھی مگر ڈھیٹ تھی جیے چلی جا رہی تھی وہ اگر ماجی کو یاد کرتی تو ہر روز نیا امتحان تھا ہر رات نئی آزمائش تھی لیکن وہ جو دو سال خواب نگری میں گزارے تھے وہ زندگی میں نہیں رک سکے اور اگر وہ نہیں رکے تو برا وقت کیسے رکتا وہ بھی گزرتا چلا گیا وہ ہر دن سوچتی کے آج جو برا ہوا اس سے بھی برا ہو سکتا تھا اور قسمت اسے مایوس نہ کرتی اس کے اوپر اگلا دن اور بھی برا آ جاتا اب کچھ عرصے سے خاموشی تھی گہری خاموشی اسے یقین تھا کہ اب پھر کوئی طوفان آئے گا رب مزید اسے آزمائے گا وہ لاشعوری طور پر ابھی ابھی انڈے سے نکلے چوزے کی طرح زندگی کے پروں میں چھپتی جا رہی تھی اور دنیا کو خوف سے دیکھ رہی تھی کہ کس طرح قسمت وار کرے گی اس سے اپنے پیروں پر کھڑا نہ ہوا جاتا اور کہیں کچھ ٹوٹ رہا تھا۔

میرے اللہ! یا ارحم الراحمین! یا ارحم الراحمین! یا ارحم الراحمین! بے شک میں نے اپنی جان پر ظلم کیا اب اور آزمائش نہیں اب سکون چاہیئے تھوڑا سا سکون اتنا کہ رات کو ڈر کے مارے نیند کی گولیاں لینے کے باوجود آنکھ نہ کھل جائے اللہ جی اب اور آزمائش نہیں۔

وہ سجدے میں پڑی فریاد کرتی رہی اور فرشتے لمحہ قبولیت کے پروں میں اس کی دعا سمیٹتے رہے

......☆❁☆......

سب سے چھوٹی بہن ہی زیادہ لاڈلی ہوتی ہے آج منی کے گھر پہلے بیٹے کی پیدائش کی خبر ملی آفس سے ہاف لیو لے کر حیدر سیدھا سینٹورس پہنچا یہ مال صرف مہنگی اشیاء کے لیے ہی نہیں گھومنے پھرنے کے لیے بھی مشہور ہے صد شکر کے دن کا وقت ہونے کی وجہ سے زیادہ رش نہیں تھا وہ بچے کے لیے کچھ کپڑے لینا چاہتا تھا ایک وقت تھا کہ اسے بچے بہت پسند تھے ماہ روز اسے کہا کرتی تھی

"آپ کے تو شادی کے پہلے ہی سال بچے ہو جانے ہیں' وہ مسکرا کر استفسار کرتا اس میں غلط کیا ہے؟ ماہ روز کو بچھڑے دس سال گزر گئے اور اب بھی میں اس کی یادوں کی تاروں سے اپنے حصے کی روشنی مانگتا ہوں میں بھی کتنا پاگل ہوں جانتا بھی ہوں اب معجزے نہیں ہوتے۔

سیکنڈ فلور پر elevator سے پہنچتے ہی وہ ٹھٹکا ہمیشہ کی طرح بے نیاز اور تمکنت سے چلتی ہوئی یہ وہی تھی جو ان دس سالوں میں پل پل اس کے ساتھ رہی سونے سے پہلے جس کا خیال چھن کر کے دماغ میں جھٹکنے لگ جاتے صبح ہوتے ہی جس کی یاد افسردگی کا فسوں طاری کر دیتی وہ

ہنسنا چاہتا تو ہنس نہیں پاتا اس کی جدائی اسے ہنسنے نہ دیتی وہ رونا چاہتا تو رو نہ پاتا اس کی آخری دعا ہمیشہ خوش رہنا اسے رونے نہ دیتی وہ مردوں کی طرح زندہ تھا ابھی وہ دل ہی دل میں یہ کہہ رہا تھا کہ وہ میری نہیں نہ سہی تو مجھے یوں ہی وہ دکھا دے میرے اللہ میری رگوں میں دوڑتا خون منجمد ہو گیا اس کا تخیل اس کا تصور گرفت سے نکلتا جا رہا ہے ایک دفعہ پھر اسے چلتا پھرتا ہنستا مسکراتا دکھا دے میں تجھ سے نہیں کہوں گا کہ مجھے ماہ روز عطا کر لیکن میری ترسی ہوئی آنکھوں کو ایک جھلک ہی سہی سیراب کر دے اور یہ رہی تھی اس کے سامنے تمکنت اور بے نیازی سے چلتی ہوئی اس کا دل بے اختیار بولا معجزے ہوتے ہیں۔

بات صرف اتنی سی ہے کہ انسان جب اللہ کی عطا پر راضی ہو جاتا ہے تھوڑے کو بہت جاننے لگتا ہے تو اللہ جی اس کو اور عطا کر دیتے ہیں اس کو وہ چیز بھی دے دیتے ہیں جس کے نہ ملنے پر اس کو پانے کی ضد صبر میں بدل جاتی ہے اور پھر صبر شکر میں بدل جاتا ہے ماہ روز کے لمبے کمر تک آتے بال اسٹیپ کٹنگ سے آدھے شانوں پر پڑے تھے اس کے متعلق کلاس میں کہا جاتا تھا کہ وہ دس سال بعد بھی ایسی ہی لگے گی اور وہ ویسی ہی تھی متوازن قدم اٹھاتی ہوئی ----اس کی آنکھوں کی چمک ماند پڑ چکی تھی اور چہرے کی معصومیت و ملاحت سنجیدگی کی چادر اوڑھ چکی تھی وہ اس کے پیچھے چلنے لگا اسے ڈر تھا کہ اگر اسے بلایا تو نیند نہ ٹوٹ جائے گا خواب ہاتھوں سے نہ چھوٹ جائے آہستہ آہستہ اس کے پیچھے چلتا وہ خود کو یقین دلاتا رہا کہ وہ ماہ روز ہی ہے کافی دیر بعد اسے یقین آ گیا جب ماہ روز نے چلتے ہوئے ہمیشہ کی طرح اپنی مٹھیوں کو بھینچ کر کھولا تھرڈ فلور پر جانے والے elevator پر جب وہ چڑھی اسے کسی نے پکارا

"ماہ روز' یہ حیدر کی آواز تھی اسے لگا کہ امرت رس کانوں میں گھل رہا ہے کوئی مدھر مانوس نغمہ عرصے بعد سماعتوں کو غم شناس کی طرح پر سکون کر رہا ہے ساری مسافت کی ساری تھکان کو اپنی پوروں سے چن رہا ہے۔

اف میں بھی کیا خواب دیکھنے لگ جاتی ہوں اس نے سر جھٹکا

'ماہی' آواز پھر آئی اب کے وہ مڑی گڑبڑا کر elevator پہ توازن قائم نہ رکھ سکی اور گری-----لیکن وہ اسے گرنے دے سکتا تھا اکیلا؟ وہ دونوں گرے ہوئے تھے

آس پاس کے لوگ اس حادثے کو حیرت سے دیکھ رہے تھے اور حیدر ہنس رہا تھا وہ کھل کے ہنسا جیسی ماہ روز کی خواہش تھی کے اسے ہنستا ہوا دیکھے ہنستے ہنستے اس کی آنکھوں سے پانی نکلنے لگ گیا وہ رو رہا تھا وہ خواس باختہ تھی اس شخص کے ساتھ رہتے ہوئے ہمیشہ فلمی سین ہی کیوں ہوتے ہیں؟ جناح پارک میں پتوں کا اچانک سے گرنا اور سلامی دینا اور آج اتنے عرصے بعد ان دونوں کا یہاں گر جانا۔

حیدر کے شاپر سے کسی کھلونے کے بولنے کی آواز آئی وہ دونوں ہوش میں آئے 37 سال کے مرد نے اپنے آنسوؤں پر قابو پایا اور 35 سال کی عورت نے خود کو گھسیٹ کر کھڑا کیا انہیں یاد آیا کہ یونیورسٹی کا زمانہ گزر چکا ہے اور زندگی آگے بڑھ چکی ہے ان کے درمیان دس سال ہیں وہ اب آگے پیچھے نہیں تھے بلکہ ساتھ چلتے چلتے ٹپ فلور پر کرسیوں پر بیٹھ گئے دونوں میں سے کوئی ایک لفظ نہ بولا دس سال کی گہری کھائی کیسے عبور کی جائے دونوں اس مہارت سے انجان تھے۔

"کیسی ہو؟" حیدر اسے دیکھتے ہوئے بولا

"شکر الحمدللہ! مجھے کچھ ہو سکتا ہے؟" ماہ روز ازلی ڈھٹائی لہجے میں سمو کر بولی۔

"اللہ آپ کے ساتھ کبھی کچھ برا نہ کرے۔" حیدر نے دعائیہ انداز میں کہا وہ مسکرا دی اب اور کتنا برا ہونا تھا۔ اب

یہ دعا پچھلے برسوں کی آزمائشوں کو کیسے آسان کرسکتی ہے؟
''بچے کیسے ہیں؟'' ماہ روز کا سوال عجیب تھا اس کی فطرت میں تھا شک کرنا اس کی سماعتوں سے امرت نکل چکا تھا اب صرف اور صرف سماعت میں اس کھلونے کی آواز تھی

''اللہ کا شکر ہے ٹھیک ہیں۔'' حیدر نے اپنی بہن کے بچوں کے بارے میں جواب دیا۔

''وہ کیسی ہے گڑیا جسے میں کہتی تھی؟'' اگلے سوال نے حیدر کو جھٹکا دیا اب سمجھ میں آئی کے وہ حیدر سے اس کے بچوں کے بارے میں پوچھ رہی تھی اور اب بیوی کے بارے میں وہ ہنسنے لگا۔

''ہاں جی! گڑیا ہی ہے بہت اچھی بہت پیاری ہے۔'' ماہ روز کی آنکھ میں کچھ گیا تھا پلکیں بھیگنے لگیں اور اس نے مٹھی بھینچ کر اپنے ضبط کو سہارا دیا اس کے پاس پوچھنے کے لیے کوئی سوال نہ رہا برسوں میں وہ یہی سوچتی تھی کے اگر وہ سکون میں نہیں ہے تو کہیں نا کہیں اس کی یاد چاہے لمحاتی قید میں ہی سہی حیدر کو بھی کسک کا احساس دلاتی ہو گی لیکن حیدر کی ہنسی اور اس کا یقین ۔۔۔۔تھکاوٹ سے ہڈیاں چٹخی وہ اس کا چہرہ پڑھ رہا تھا۔

''شادی نہیں کی میں نے۔'' حیدر نے ٹھنڈے لہجے میں جواب دیا لہجہ ٹھنڈا اس لیے تھا کہ اگر اس کی شادی نہیں ہوئی تو کیا فائدہ؟

ماہ روز کی شادی ہوگئی تھی ناں۔

دنیا کا خوش قسمت ترین انسان کون ہے؟ حیدر نے قدرے ہچکچا کر پوچھا۔

''وہ دنیا میں نہیں رہے۔'' ماہ روز نے کہا اور کھڑی ہو گئی وہ جانے لگی تھی حیدر مضطرب ہوا۔

''آخری فون پر بھی آپ کو جلدی تھی آج بھی جلدی ہے میرے سوال آج بھی وہیں کھڑے ہیں کیسے ہوا یہ سب؟'' حیدر نے اس سے نرمی سے پوچھا۔

''کچھ سوالوں کے کوئی جواب نہیں ہوتے۔'' ماہ روز نے تھکی سی آواز میں کہا اور قدم بڑھایا حیدر نے ہاتھ تھام لیا۔

''بیٹھ جائیں مجھے بس یہ بتائیں کہ میری کیا غلطی تھی ایسے کوئی اچانک سے کیسے چھوڑ کر جا سکتا ہے جیسے آپ نے مجھے چھوڑا اباجی سے میری اتنی تو بنتی تھی کہ ان کو کندھا دیتا پھر مجھے ایک دوست اور ایک بیٹے کے حق سے کیوں محروم رکھا؟ آپ نے کبھی میرے آگے ضد نہیں کی تھی۔ میں کہتا تھا یہ لڑکی دنیا کے سامنے کچھ اور ہے اور میرے سامنے کچھ اور لیکن آپ نے مجھے سب کی صف میں لا کھڑا کیا اتنا اچانک نکاح؟ اگر آپ مجھے بتاتی تو کبھی تنہا گھر سے رخصت نہ ہوتی مجھے اتنا خود غرض سمجھ ہی کیسے لیا کہ اگر میرے نصیب میں آپ نہیں ہیں تو میں آپ سے دوستی بھی نہیں نبھا سکوں گا آپ کو مجھ میں میرے اخلاص میں کہاں کمی لگی؟'' وہ شکایتیں کر رہا تھا وہ سارے گلے شکوے جو لاشعور میں پناہ گزین تھے آج لبوں کی قید سے آزاد ہو کر فضا میں چکر کاٹ رہے تھے۔

''کمی آپ میں نہیں تھی کمی مجھ میں تھی۔'' ماہ روز کی مری ہوئی آواز نکلی۔

''کون سی کمی ماضی کی کمی کی بات کر رہی ہیں ناں؟'' ہر شخص کا ماضی ہوتا ہے کچھ کا اچھا ہوتا ہے کچھ کا برا ہوتا ہے رشتے احساس کی بنیاد پر قائم کیے جاتے ہیں مطلقہ عورتوں کی بھی شادیاں ہو جاتی ہیں بیوہ عورتیں بھی شادی کر لیتی ہیں منگنیاں ٹوٹ جاتی ہیں نکاح ختم ہو جاتے ہیں زندگی نہیں ٹھہرتی اور اگر ہم اس کو ٹھہرانے کی کوشش کرتے ہیں تو اس سے بساند آنے لگتی ہے میں نے آپ کی پلکوں کی لرزش دیکھی میں نے آپکی آنکھوں کا چمکنا بھی دیکھا وہ لڑکی جو سب کی آنکھوں میں جھانک کر بات کرتی تھی میرے سامنے اس کی آنکھیں کیوں جھک جاتی تھیں؟ کوئی تو وجہ تھی ماہ روز اور وہ وجہ محبت تھی چاہے آپ لاکھ انکار

کریں سچ یہی ہے کہ آپ کو مجھ سے محبت تھی اگر محبت نہ ہوتی تو کیا میں سنور جاتا؟ محبت کے علاوہ کس جذبے میں سنوارنے کی طاقت ہے؟ یک طرفہ محبت تو عذاب دیتی ہے آپ کی محبت میں مجھے سکون ملا پھر آپ کیسے اپنے جذبات پر پردہ ڈال سکتی ہیں ؟ آپ کب تک قاسم کی روزی بن کر زندگی گزاریں گی؟ آپ نے ایک دفعہ بھی حیدر کی ماہی بن کر کیوں نہیں سوچا؟'' حیدر کے ضبط کا بندھن ٹوٹا اس کی آواز اونچی نہ تھی لیکن ٹھنڈی تھی بہت ٹھنڈی ماہ روز کو جیسے بس اسی کا انتظار تھا۔

کچھ لوگ ہوتے ہیں نا بڑے ظرف والے بنے پھرتے ہیں اپنے حصار میں قید نظر آتے ہیں لیکن ان کی دم پر پاؤں رکھ دو تو سارے سچ ان کے لبوں سے بلبلا اٹھتے ہیں ماہ روز کی بھی دم پر پاؤں آیا تھا

'بند کریں قاسم نامہ۔۔۔۔میں روزی نہیں ہوں میں ماہ روز ہوں اباجی کے پاس بیٹھ کر دھیان سے صرف انہی کی باتیں سنتے تو آپ کو پتا چلتا کے وہ آپ کو ماہ روز کا نہیں روزینہ کا قصہ سناتے رہے ہیں ہاں جی آنکھیں کھول کر مت دیکھیں سچ کہہ رہی ہوں روزی روزینہ ظفر تھی اباجی کی بیٹی اور میں ماہ روز صفدر ہوں اباجی کی پوتی آپ بیٹھتے اباجی کے پاس تھے لیکن دھیان مجھ پر رہتا کہ میں کچن میں ہوں یا کمرے میں صحن میں ہوں یا چھت پہ اباجی مجھے روزی کہہ کر ضرور پکارتے تھے کیوں کہ میرا سارا بچپن ان سے الگ ہی گزرا جب اباجی نے بابا سے رابطہ کیا تو میں سترہ سال کی تھی۔۔۔۔اپنی پھوپھو سے چار سال چھوٹی بابا نے پسند کی شادی کی تھی چھوٹی عمر میں یہی کوئی سترہ اٹھارہ سال سال عمر ہو گی شادی کے بعد دادی کی فوتگی نے انہیں حرمان نصیب بنا دیا پھر میری پیدائش پر میری امی کی وفات نے انہیں اکیلا کر دیا انہوں نے اباجی سے رابطے کی اتنی کوششیں کی جتنی وہ کر سکتے تھے لیکن اباجی نہیں مانے پھر ایک دن فون آیا اباجی رو رہے تھے۔

''صفدر میری روزی کو بچالو' بابا پریشان ہو گئے انہیں صدمے در صدمے نے ذیابیطس اور گردوں کے مرض میں مبتلا کر دیا تھا وہ پریشان ہو گئے کہ جانے کیسی آزمائش ہے اتنے عرصے بعد باپ نے یاد کیا ہے اگر ان کی امید پر پورا نہ اتر سکا تو جس طرح ساری عمر گزری ہے اسی بدنصیبی میں باقی ماندہ عمر بھی کٹ جائے گی۔

خیر ہم اباجی کے پاس آئے دروازہ کھولا تو برآمدے میں ہی سر ہاتھوں میں دیئے اباجی بیٹھے تھے بابا کے گلے لگ کر ان کے ضبط کے سارے بندھن ٹوٹ گئے بمشکل انہیں سنبھالا تو روزی پھوپھو سے سامنا ہوا۔

کہتے ہیں ناں یک طرفہ محبت عذاب ہوتی ہے میں نے اس عذاب کی آگ میں جھلستے ہوئے اپنے بہت قریبی رشتے کو دیکھا ہے روزی پھوپھو کی آنکھوں میں اتنی وحشت تھی کے جیسے ان کی آنکھوں سے ساری زندگی چوس لی گئی ہو معاملہ اب یک طرفہ محبت سے بہت آگے بڑھ چکا تھا بابا نے ایک روحانی علاج کرنے والے بزرگ کو ڈھونڈا وہ گھر آئے ایک رات گھر میں رہنے کے بعد انہوں نے بتایا کے جن حقیقتاً پائے جاتے ہیں اللہ کی اس مخلوق کا بلاشبہ ذکر قرآن میں آیا ہے اللہ تعالیٰ نے قرآن میں ارشاد فرمایا ہے کے ہم نے جن و انس کو اپنی عبادت کے لیے پیدا کیا ہے جس طرح سارے انسان اللہ کی عبادت نہیں کرتے بالکل اسی طرح سارے جنات بھی صراط مستقیم پر نہیں چلتے جس طرح انسانوں کی دنیا زمین پر آباد ہے اس طرح زمین سے بارہ فٹ اوپر جنات بھی رہتے ہیں کبھی کبھی وہ زمین پر بھی آجاتے ہیں جیسے شہد کی مکھیاں میٹھا دیکھ کر پاس آجاتی ہیں بالکل اسی طرح جنات کو بھی کچھ چیزیں اپنی طرف کھینچتی ہیں مثلاً تیز خوشبو، نجس، ویرانہ، جامن، پیپل، برگد، انار وغیرہ کے درخت زمینی مخلوقات کے بل، پایا خانے وغیرہ

ہمارے بڑے بزرگ کہتے ہیں کے لڑکیوں کو مغرب

کے بعد کھلے بال لے کر پیڑوں کے نیچے نہیں جانا چاہئیے لیکن ہم ماڈرن ہو گئے ہیں ہم کہتے ہیں یہ خبطی بڈھے کیا جانیں؟ کس جن کے پاس اتنا وقت ہے کہ عاشق ہو جائے؟ دوسری بات یہ کہ بیوی کی وفات کے بعد شادی کرنا بھی معیوب سمجھا جاتا ہے کے کہیں بے وفائی کا ارتکاب نہ کر بیٹھیں ہمیں اس چیز کی فکر ہونی چاہیے کے جو اولاد ہماری محبوب بیوی چھوڑ کر گئی ہے اس کی تربیت کے لیے اگر دوسرا نکاح ضروری ہے تو ضرور کریں خاص طور پر بچیوں کی والدہ کو سخت ضرورت ہوتی ہے ایک رات اس گھر میں گزارنے کے بعد مجھے احساس ہوا کے کچھ تو سایہ اس گھر پر ہے اور دوسری غلطی ظفر صاحب آپ کی ہے آپ کے گھر میں بیٹی تھی خودرو بیل نہیں آپ نے اس کو بڑھنے دیا اس کی تربیت اس کی ذمہ داری کو سمجھا ہی نہیں ایسے آنکھیں بند کر کے رکھنے کا کام تو ہم اپنے جانوروں کے ساتھ بھی نہیں کرنا چاہئیے یہ روزینہ تو آپ کی اولاد تھی اگر آپ نے روزِ اول سے ہی روزینہ میں آنے والی تبدیلیوں پر نظر رکھی ہوتی تو آج وہ اس مقام پر نہ ہوتی جنات بھی ایک دم سے حاوی نہیں ہوتے وہ وقت لگاتے ہیں تاک میں بیٹھے رہتے ہیں گھات لگاتے ہیں ہم اللہ کو یاد کرتے ہیں تو دم دبا کر بھاگنے کی کوشش کرتے ہیں اور اگر ہم کوئی کمزوری نہیں پکڑاتے ہیں تو وہ گردن سے لپٹ جاتے ہیں آپ سب گھر والے صبح شام منزل پڑھیں تین دن بعد اس گھر سے بوریا بستر باندھیں اور چلے جائیں ابھی ان بزرگ نے اتنی ہی بات کہی تو پھوپھو کے کمرے سے چیخ کی آواز آئی ہم وہاں بھاگتے دوڑتے گئے تو روزی پھوپھو عجیب حالت میں بستر پر پڑی تھی ان کے ہڈیوں کے چٹخنے کی آواز۔ ہم تک آ رہی تھی پھر ان کی آواز نکلی لیکن یہ آواز ان کی نہیں تھی۔

''مجھے چھوڑ دو مجھے اس کے پاس چھوڑ دو میرے حصار میں نہ آؤ میرا حصار نہ توڑو وہ ہیجانی انداز میں بھاری آواز میں چلا رہی تھی چہرے پر زخم کے نشانات واضح تھے ہاتھوں کی کھینچی ہوئی رگیں اور ایک دوسرے میں پیوست ہوتی پسلیوں سے ان کی تکلیف کا اندازہ لگایا جا سکتا تھا ہم سب کے رونگٹے کھڑے ہو گئے وہ بزرگ ہم میں سے تیزی سے نکلے اور کمرے کے اندر جا کر دروازہ بند کر دیا اندر سے آنے والی بھاری آواز اور بھی بھاری ہو گئی وہ بزرگ بھی اونچی آواز میں دہاڑنے لگے ان کے منہ سے نکلنے والی آوازیں یقیناً قرآنی کلمات نہیں تھے وہ کچھ اور ہی تھا ابا جی پورے قد سے نیچے آن گرے بابا نے بمشکل ان کو اٹھایا اور بیٹھک میں لے گئے میں ساتھ ساتھ ہی رہی پھر بابا دوڑ کر نکڑ والے کلینک سے نیند کا انجیکشن بھر کر لے آئے میں نے اپنے ہاتھوں سے ابا جی کو لگایا اور پائنتی کے پاس دوزانو بیٹھ گئے میرے اندر کا تجسس کا کیڑا مجھے چین نہیں لینے دے رہا تھا میں اٹھی اور صحن میں آ گئی کمرے سے آنے والی آوازیں تھم سی گئی تھیں بھاری عجیب چیخیں اور مردانی دھاڑیں خاموش ہو چکی تھی میں کھڑکی کے پاس بیٹھ گئی اور درختوں کو دیکھنے لگی اچانک اندر سے زنانہ چیخ بلند ہوئی میرے کان کھڑے ہو گئے میں نے اٹھ کر ہلکا سا کھڑکی کا پٹ وا کیا اندر جو بھی ہو رہا تھا وہ کسی بھی طرح جن بھوت اتارنے کا طریقہ نہ تھا وہ بزرگ نام کا بزرگ تھا وہ ویسا انسان تھا جو اپنے مقصد پیدائش کو فراموش کر چکا تھا اگر اسے حیوان کہا جائے تو بہتر رہے گا میں دوڑتی ہوئی بیٹھک میں آئی ماں کی عدم موجودگی نے مجھے میرے بابا سے قریب کرنے کے بجائے دور کر دیا تھا وہ اپنی ماں کی موت، باپ کی جدائی اور بیوی کی وفات سب کا سبب اپنے آپ کو سمجھتے اپنی بیٹی کو محرومیوں سے بھرے دن رات دیتے رہے بابا سامنے تھے اور میرے پاس الفاظ نہیں تھے کہ ان سے کچھ کہہ سکوں میں ان کے پاس گئی اور ان کا ہاتھ تھام کر ان کو کھڑا کیا کاش میں نے انہیں نہ پکارا ہوتا'' کاش میں نے انہیں نہ کھڑا کیا ہوتا مجھے پتہ ہوتا کہ یہ چھونا آخری دفعہ کا چھونا ہو گا تو میں نہ چھوتی وہ میرے ساتھ میکانکی انداز میں چلتے کھڑکی کے پاس آئے اور پھر وہ ہوا جس نے موجوں کی نذر ہوئی زندگی کو بھنور میں ڈبو دیا اگر ابا جی کو دکھاتی تو وہ باپ ہونے کے باعث ذہنی توازن کھو دیتے بابا تو بالکل ہی ہاتھوں سے نکل گئے ان کے اندر بجلی کی سی تیزی آئی بھائی کی غیرت کیسے جاگتی ہے مجھے اس دن معلوم ہوا دروازہ کھولنے پر حیوان گڑبڑا گیا گھگیانے لگا پھوپھو نیم مردہ پڑی تھی میں نے ان پر چادر ڈالی اور بابا نے شیشے کا گلدان اس شخص کے سر پر دے مارا وہ بیٹھتا چلا گیا اور خون کا تیز فوارہ فرش کو بھگونے لگا اور عین اسی لمحے بابا نے گلدان کا ٹوٹا ہوا اپنے ہاتھ میں موجود حصہ اپنی گردن پر دے مارا خون کے فوارے یہاں بھی چھوٹ گئے۔

میں اکیلی لڑکی نہ اس محلے میں جان پہچان نہ کچھ اور نکڑ کے کلینک کا ڈاکٹر ابا جی کو بابا کے گھر آنے کی مبارک باد دینے انہی لمحوں میں پہنچا ابا جی نیند کے انجیکشن کے زیر اثر تھے اس نے صد شکر کچھ ہوتے نہ دیکھا پولیس آئی ابا جی بھی ہوش میں آئے بیٹے کی لاش دیکھ کر ان کو ہارٹ اٹیک ہو گیا مجھے اس وقت لگتا تھا میں کسی لٹو سے چپکا ہوا چھوٹا سا ذرہ ہوں زندگی مجھے گھمائے جا رہی تھی ہر پل نیا تھا نرالا تھا ہر دن دہلا دینے والا تھا ایک دن میں اپنے دادا اور پھوپھو سے ملنا پھوپھو کی ذہنی حالت کو دیکھنا نورانی بزرگ کے روپ میں کالے علم والے کالے کرتوت والے بھانڈ کو دیکھنا اپنے باپ کو مرتے ہوئے دیکھنا اپنے دادا کا ہارٹ اٹیک دیکھنا پولیس سے نبٹنا۔

آپ سوچیں حیدر! اتنی ساری باتیں اتنے حادثے ایک ہی دن میں ہوئے شکر ہے اس دن میں صرف چوبیس ہی گھنٹے تھے ورنہ مجھے پتہ نہیں اور کیا کیا دیکھنا نصیب ہوتا پولیس نے قتل کیس بنایا قاتل اور مقتول دونوں مر چکے تھے ابا جی کی پرانی محلہ داری کی وجہ سے معاملہ دب گیا اور میں جو ساری زندگی یہ سوچتی تھی اپنے باپ کی زندگی کا جمود توڑ دوں گی انہیں ہنسنا سکھا دوں گی ان کی موت پر بین کرنے کے لیے وہیں رہ گئی زندہ رہ گئی۔

دو دن خاموشی سے گزر گئے ہم تینوں میں نہ ہی کوئی زندہ تھا نہ ہی کوئی مردہ ابا جی صبح شام منزل پڑھتے تھے انہیں اس حقیقت سے بے خبر ہی رکھا کہ بابا اور وہ بزرگ کیسے فوت ہوئے ان کی نیک نامی نے گرد و پیش سب کا منہ بند رکھا کیوں کہ میں ایک اور رشتہ کھونے کی ہمت نہیں رکھتی تھی پھوپھو کی وحشت میں کوئی خاص کمی نہ آئی تھی وہ بال کھولے جامن کے پیڑ کی نیچے بیٹھی رہتی ہنستی تو ہنسے چلی جاتی اور روتی تو کوئی ان کو چپ کروانے والا نہ تھا تیسرے دن ابا جی صبح سویرے سے مگن نظر آئے اور پھوپھو اپنے کمرے میں بند میں اجنبیوں کی طرح کھلے آسمان کو تکا کرتی کے اے اللہ تو نے مجھے اس گھر میں بھیجا تھا؟ میں بچپن سے تجھ سے رشتوں کی کمی کا شکوہ کرتی رہی تو نے یہ کیسے رشتے دیئے؟ یہ وہ لوگ ہیں جن میں سے کسی کو پتا ہی نہیں کے میں کس کرب سے گزر رہی ہوں تھوڑی خود غرض ہوں ناں ان لوگوں کی تکلیف نہ سمجھ سکی شام ہوتے ہی ابا جی نے اذن روانگی دیا اور کہا کہ پھوپھو کو بھی گھر سے ساتھ لے جانا ہے اسے بلاؤ وہ شاید ابھی تک اسی ڈھونگی کے معتقد تھے میرا دل چاہا کہ انہیں سب بتا دوں لیکن خاموش رہی روزی پھوپھو کے کمرے کا دروازہ بجایا جواب ندارد دوبارہ بجایا جواب خاموشی سہ بار بجایا کچھ نہ ہوا ابا جی نے آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا ایک اور قیامت منتظر تھی وہ بستر پر تھیں اور ان کی آنکھیں ٹھہر چکی تھیں ان کے ماتھے پر چھپکلی مردہ پڑی ہوئی تھی ابا جی ہونقوں کی طرح دیکھ رہے تھے انہیں اظہار غم کا طریقہ بھی نہیں سوجھ رہا تھا انہیں یقین ہی نہیں آ رہا تھا میں نے آگے بڑھ کر ماتھے سے مردہ چھپکلی ہٹائی اور ان کی آنکھیں بند کر دی تدفین تک اس گھر میں رہے اور پھر رات کے اندھیرے

میں گھر چھوڑ دیا۔
"نئے گھر میں جہاں آپ بھی آتے جاتے رہے ہیں شکر ہے کوئی مسئلہ نہیں ہوا ابا جی کو بس خاموشی کھا گئی اور میرے پاس جینے کے لیے بس ایک ہی سہارا تھا میں نے اپنی تمام تر توانائیاں خرچ کر دیں دو سال بعد ابا جی اللہ کے کرم سے اس قابل ہوئے کے انہوں نے خود میرا داخلہ یونیورسٹی میں کروایا۔"

ماہ روز بتاتے بتاتے کئی دفعہ روئی کئی بار ہچکیاں لیں آنکھوں میں وحشت ناچی اور ہیبت ٹپکی یہ سب وہ ٹیبل پر نظر ٹکا کر بولتی رہی سامنے دیکھا تو حیدر کا پریشان سا چہرہ سامنے تھا وہ حواس باختہ تھا اسے بڑا مان تھا کہ مجھے چہرے پڑھنے آتے ہیں اور آج اس کا مان بری طرح سے خاک بوس ہوا تھا وہ بھی ایسی جگہ جہاں نہیں ہونا چاہیے تھا حیدر کو دیکھ کر اسے پھر سے غصہ آیا۔

"میں اس ماضی کی بات کرتی تھی جو آپ کو سنایا لیکن آپ کا ماضی قاسم سے باہر نکلتا ہی نہیں تھا اس دن یونیورسٹی جاتے ہوئے مجھ سے سو کالڈ اظہار محبت کیا تو اس میں بھی یہی کہا کے آپ کو میرے ماضی سے کوئی سروکار نہیں اس وقت تو میں بہت خوش ہوئی کہ یہ شخص مجھ سے اتنی محبت کرتا ہے کہ وہ چیزیں جو میرے ماضی کا حصہ نہیں ہیں اور بدترین ہیں ان کا ہونا بھی اس شخص کی محبت پر اثر انداز نہیں ہوتا کیسی غیر مشروط محبت ہے اس شخص کی مجھے تو اپنی خوش قسمتی پر ہی یقین نہیں آ رہا تھا ہاں ہوئی تھی مجھے آپ سے محبت کوئی شخص اتنا دیکھے گا اتنے غور سے دیکھے گا اتنے پیار سے دیکھے گا اتنا مان دے گا اتنی عزت دے گا تو اس سے محبت کیسے نہیں ہوگی میں نے نہیں کی تھی آپ سے محبت میں نے کرنی ہی نہیں تھی لیکن خود ہی ہوگئی۔

اس کی آواز مدہم ہوئی کیوں کہ سامنے بیٹھے شخص کی آنکھیں چمک اٹھی تھیں اس کے اندر پھر ابال اٹھا وہ ایسی ہی تھی جذباتی سی پاگل سی جب جذبے لٹائے نہ جائیں تو وہ اندر سینت سینت کر لاوا بن جاتے ہیں اور لاوا بے سمت بے لگام ہوتا ہے۔

'اگر آپ یہ سمجھتے ہیں ابھی بھی مجھے آپ سے محبت ہے تو نہیں ہے ہو ہی نہیں سکتی آپ نے جھوٹ بولا کہ آپ کو چہرے پڑھنے آتے ہیں آپ کو تو باتیں بھی سمجھنی نہیں آتی چہرے پڑھنے کیسے آئیں گے اگر آپ میرے پیچھے آئے تو میں آپ کا حشر کر دوں گی سمجھ آئی؟ اللہ حافظ پتا نہیں اللہ جی اجنبیوں سے کیوں ملواتے ہیں مجھے۔

وہ تپی اور اٹھ کر چل دی حیدر خاموشی سے بیٹھا رہا اور اس کی پشت کو دیکھ کر مسکراتا رہا پھر ٹیبل پر دیکھا اپنی کہانی سناتے ہوئے ماہ روز کے ہاتھوں پر پسینہ آیا تھا اس نے اپنی انگلیاں مروڑی تھیں اور اس نے انگوٹھی اتار کر ٹیبل پر رکھی تھی حیدر نے انگوٹھی اٹھائی اور مٹھی میں دبا لی۔

ماہ روز جب ملی تو اس نے مخصوص کمپنی کے یونیفارم کی شرٹ پہن رکھی تھی جو ٹخنوں تک آ رہی تھی ساتھ کھلا ٹراؤزر بھی تھا جب وہ اٹھ کر گئی تو حیدر نے اس لیے جانے دیا کہ یہ لڑکی جب شعلہ جوالہ بنی ہو تو اسے اس کے حال پر چھوڑ دینا ہی اچھا ہے اور جب غصہ اتر جائے اور اس سے بات کرو تو اچھی خاصی بھیگی بلی بن جاتی اور یہ غصہ عموماً سو کر اٹھنے کے بعد ختم ہو جاتا اس کے علاوہ غصہ کرنے کے بعد اس کے پاس دو آپشنز ہوتے یا رونا یا سونا۔

کیا ہوا جو میں چہرے نہیں پڑھ سکتا لیکن جتنا میں اسے سمجھتا ہوں اتنا کوئی نہیں سمجھ سکتا حیدر نے پہلے سوچا پھر خود کو خود ہی جھڑکا ان خوش فہمیوں نے اسے پہلے ہی کہیں کا نہ چھوڑا تھا ابھی مجھے میرے سوالوں کے جواب نہیں ملے وہ چاہیں اف کریں یا ہائے انہیں مجھ سے ملنا ہی ہوگا مصمم ارادہ کر کے اگلی صبح وہ پھر سینٹورس میں تھا آج اس نے ہلکے سے سکن کلر کی شرٹ اور لائٹ بلیو کلر کی جینز پہنی تھی بصارت از سر نو تازہ ہو گئی تھی اور سماعتیں بھی خوشی کے شادیانے سن رہی تھیں دل اک موسم اچھا ہو تو کچھ بھی برا نہیں لگتا۔

لنچ بریک ہوئی تو ایک ایک کر کے مختلف یونیفارم پہنے ورکرز کھانا کھانے ٹاپ فلور پر آ رہے تھی حیدر نے خود کو calm down رکھنے کی بہت کوشش کی تھی لیکن دل اس شوخی پر ہی آمادہ ہوا جو دس سال پہلے ماہ روز کو دیکھتے ہی امڈ کر آنے لگتی تھی اس نے مچلتے دل کو سنبھالا اور سیدھا کھڑا ہو گیا ماہ روز اکیلی اوپر آ رہی تھی وہ آئی اور حیدر اس کے کان کے قریب جا کر بولا۔

May if you don't mind can i have your precious time

ماہ روز نے چونک کر دیکھا اور ذرا سڑے ہوئے لہجے میں بولی۔

I don't understand that why people can not mind their own business

حیدر مسکرایا اور بولا

If you are allow speak single word for me then what will be that ?

وہ ویسے ہی شوخ ہوا جیسے ہوا کرتا تھا کہ ماہ روز تو پیدا ہی اس کے سوالوں کا جواب دینے کے لیے ہوئی تھی

shut up

ماہ روز نے ہمیشہ کی طرح سپاٹ لہجے میں کہا اور حیدر کھلکھلا کر ہنس پڑا

[illegible] اگا نہیں [illegible]

مت اس [illegible] خود کو ڈپٹا۔
تکلی کیا ہے آپ کو۔ اب وہ چیخ کر بولی
"وہی جو آپ کو نہیں ہے۔" حیدر نے چڑایا۔
"چاہتے کیا ہیں۔" وہ مزید تپی۔
"کتنی دفعہ اظہار محبت کروانا چاہتی ہیں؟" حیدر نے سلگایا۔
"بھاڑ میں جائیں۔" ماہ روز نے تکیہ کلام کا استعمال کیا۔

"آپ ساتھ چلیں گی تو چلا جاؤں گا۔" حیدر نے یوں کہا جیسے وہ ناران کاغان کی بات کر رہی ہے اب کے ماہ روز اس کی طرف مڑی اور انگلی اٹھائی۔

"حیدر۔" حیدر نے اپنی انگلی سے ماہ روز کی انگلی پکڑی یہ بہت بے ساختہ سی حرکت تھی وہ اسے عزیز تر تھی اور پھر اس سے دور چلی گئی۔ اب ملی تو دل چاہتا تھا کہ اسے پوروں میں سمیٹ لے سارے لحاظ کہیں دور کہیں پیچھے رہ گئے تھے۔

"میرے سوالوں کے جواب جب تک مجھے نہیں دیں گی میں یوں ہی ستاتا رہوں گا۔ حیدر نے دھیرے سے انگلی چھوڑتے ہوئے کہا ماہ روز کو چپ لگ گئی بے شک وہ بیوہ تھی برتی ہوئی تھی لیکن اس پیار سے جب کبھی کوئی چھوتا ہے تو دھڑکن تھم جاتی ہے وہ دونوں غیر ارادی طور پر کل والی ٹیبل پر ہی آ گئے۔

"چلیں سنائیں۔" حیدر نے یوں کہا جیسے وہ چھوٹا سا بچہ ہے اور ماہ روز نے اسے کہانی سنانی ہے۔

"پاگل ہی رہنا ہمیشہ ایسے کہیں گے تو کیسے سناؤں گی؟" ماہ روز نے اس کی نگاہوں سے جھجکتے ہوئے کہا۔

"نیچے دیکھ کر سنا دیں' حیدر نے پھر یوں تسلی دی جیسے کلاس روم میں ٹیچر کسی بچے میں حوصلہ بڑھانے کے لیے سب کی نظروں سے بچنے کا گر سکھاتا ہے ماہ روز نے اسے [illegible]" اور پھر نیچے دیکھ کر بولی۔

"کہاں تک غصہ کیا تھا میں نے۔" آپ کو پھر بات بھول گئی ہے ناں مجھے دیکھ کر حیدر نے چٹکلہ چھوڑا۔

"بندہ بنیں بتا رہی ہوں جب میں آپ کے گھر گئی تو میں بہت خوش تھی پھر جیسے گڑیا نے میرے ساتھ برتاؤ کیا میرے اندر کی محرومیاں اس گھر کے پودوں سے ہی بھرنے

لگ گئی انسان تو پھر بہت آگے کی بات ہیں گڑیا نے مجھے گھر کے سب حالات بتائے مجھے خوشی ہوئی کے میرے ساتھ ایک ایسا شخص ہے جو اپنی بہنوں سے محبت کرنے والا ہے اسے رشتوں کا احساس ہے اور حرمتوں کا پاس ہے گڑیا کی آنکھوں میں آپ کے لیے بہت محبت تھی اور آنکھوں میں بہت عزت تھی جب سدرہ باجی کی زندگی کے بارے میں پتا لگا تو میں حقیتا بہت متاثر ہوئی ایک لڑکی جو جوان ہے خوبصورت ہے جس کا رشتہ طے ہوا ہے لیکن وہ اپنے متعلق نہیں سوچتی وہ چوڑیوں پراندوں کے لیے پیسے نہیں جوڑتی بلکہ اپنے بہن بھائیوں کی فیس پوری کرتی ہے اپنے ارمان اپنے خواب چھوڑ دیتی ہے پھر شادی کے بعد بھی خود کو وہ اپنے بھائی کی مجبوری نہیں بننے دیتی وہ اپنے بھائی کی کامیابی کو اپنے شوہر پر لٹانا نہیں چاہتی وہ چاہتی ہے کے وہ وفا شعار بیوی بنے لیکن وہ بے چاری بہن کا لقب نہیں اپنانا چاہتی پھر گڑیا نے مجھے آپ کے جذبات کی صداقت کا یقین دلایا میں حقیقتاً شکر گزار ہوئی کے اس گھر میں مجھے خوشیوں کی نوید سمجھا گیا ہے لیکن جب گڑیا نے مجھے بتایا کے انصر بھائی نے اپنی بہن کی شادی کی شرط رکھی ہے میں سن ہو گئی میں نے ظاہر نہیں کیا میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا کوئی لفظ نہیں تھا کہ میں اپنے جذبات کا اظہار کرسکتی سدرہ باجی نے بھی گھر آ کر جیسے پیار لٹایا میں شرمندہ ہو گئی میں نے اپنے فیصلے کو مستحکم کرلیا کہ اب کچھ بھی ہو جائے میں آپ بہن بھائیوں کی زندگی میں اپنی وجہ سے کوئی تلاطم کوئی طوفان نہیں آنے دوں گی۔'' ماہ روز نے بڑے اٹل لہجے میں اس دن کے حوالے سے بتایا۔

''کیا مطلب آپ کیا کہنا چاہ رہی ہیں۔'' حیدر کو یہ لڑکی حیران کر رہی تھی وہ اس کو predictable کہا کرتا تھا اور آج اسے پتا چل رہا تھا کہ اس لڑکی نے اپنے آپ کو ایک لفظ میں بیان کرتے ہوئے unpredictable جو کہا تھا بالکل ٹھیک کہا تھا اس نے حیرانگی سے پوچھا۔

''بتانے دیں نا مجھے بتا رہی ہونے میں آپ کے گھر سے نکلتے ہوئے پکا ارادہ کرلیا کہ آپ سے آہستہ آہستہ تعلق ختم کرلوں گی آپ پھر آنسہ سے شادی کرلیں گے میرے جذبات میں ہمیشہ کی طرح بھونچال آیا ہوا تھا اور مجھے لگ رہا تھا جو میں نے سوچا ہے وہ صحیح ہے اور وہی کرنا ہے میں گھر جا کر سونا چاہتی تھی لیکن گھر میں میرے داخل ہونے سے پہلے دو اجنبی مرد اور ایک خاتون ابا جی کو سنبھالتے ہوئے نکلے انہیں ہارٹ اٹیک ہوا تھا میں آپ سے رابطہ کرنا چاہ رہی تھی نہیں کیا آپ کے اپنے گھر پریشانی تھی میں آپ کو کیسے تنگ کرتی؟ بہرحال پریشانی میں آخری سانسوں میں ابا جی نے آپ کو پکارا لیکن میں نے منع کر دیا ہم سمجھتے ہیں ہمارے بڑوں نے ہماری طرف سے آنکھیں بند کر رکھی ہیں لیکن ایسا سچ میں ہوتا نہیں ہے وہ آنکھیں جو ہمیں بند نظر آ رہی ہوتی ہیں ان بند آنکھوں سے ہمارے بڑے نہ صرف ہماری نقل و حرکت پر نظر رکھے ہوئے ہوتے ہیں بلکہ ہماری بدلتی سوچ کو بھی جانچ پرکھ رہے ہوتے ہیں میں جو سمجھتی تھی ابا جی کو ہمارے تعلق کے بارے میں کچھ نہیں پتا اس رات پتا لگا انہیں تو شاید مجھ سے بھی زیادہ پتہ ہے بہرحال جب میں نے انہیں یقین دلایا کے آپ نہیں آسکتے تو انہوں نے اسریٰ باجی کے ہاتھوں میں میرا ہاتھ دے دیا کے وہ اپنے دیور کے لیے مجھے لے جا سکتی ہیں یہ وہی اسریٰ باجی تھی جو قاسم کی بہن ہیں قاسم کو میں اب ان کے مرنے کے بعد بھی بھائی نہیں کہہ سکتی اس شخص سے اتنی نفرت ہے مجھے اسریٰ باجی نے کچھ گھول کر پلایا تھا یا ابا جی کو منہ موڑتی سانسوں میں رہبرن سے بڑا کوئی رہبر نہ ملا میرا نکاح آنا فانا واصف سے ہو گیا ابا جی کی روح جسم کے پنجرے سے آزاد ہو گئی آپ کو انفارم کرنے کے بعد میں کینیڈا چلی گئی۔

کینیڈا میں کہنے کو واصف کی اسپئر پارٹس کی شاپ تھی عجیب مکینیکل قسم کا بندہ تھا محدود وقف کے لیے بولتا محدود وقت کے لیے مسکراتا محدود وقت کے لیے خوش ہوتا اور اس محدود کے لفظ سے مجھے اس وقت لگاؤ ہوا جب وہ مجھ پر تشدد بھی محدود وقت کے لیے کرتا اس کی کوئی نفسیاتی الجھن تھی وہ اپنے دماغ کی گتھیاں سلجھانے میں مصروف رہتا میں مدد کرنے کی کوشش کرتی تو الجھ جاتا سچ پوچھیں تو جب وہ میرے سامنے آیا اس نے مجھ سے پہلا سوال پوچھا۔

''حیدر کون تھا اور میرے پاس کوئی جواب نہ تھا میں جو صاف دل لے کر گئی تھی میرے زخموں کے بخیے ادھیڑنے لگے میں نے پھر بھی خود پر قابو پایا بناہ کی پوری کوشش کی تھی۔

لیکن یہ نہ تھی ہماری قسمت کے وصال یار ہوتا۔

ایک دن وہ اچانک دکان سے آیا اور اپنے کاروبار کے تمام کاغذات میرے نام کر دیئے میں حیران پریشان کھڑی سوچتی رہی کے سورج کس طرف سے نکلا ہے اس نے مجھے یوں لاؤنج میں ششدر کھڑا رہنے دیا اور اپنا پاسپورٹ لے کر نکل گیا شام تک سب بھید کھل گئے وہ سپیئر پارٹس کی دکان کی آڑ میں جعلی ویزوں کاروبار کرتا تھا تین دن بعد اس کی لاش گھر آئی کسی نے اسے قتل کر دیا تھا اور کاروبار بھی سارے کا سارا قرضے میں ڈوبا ہوا تھا جیتے وقت اپنی ذہنی الجھنوں سے گھاؤ دیتا رہا مرتے وقت سارا ادھار میرے نام کر گیا۔

میں ان شب و روز کی اذیت لفظوں میں بیان ہی نہیں کرسکتی انسان جو درد خود جھیلتا ہے اسے ہی صحیح سے سمجھتا ہے میں نے اللہ سے اپنے بابا کی موت کے دن کی سختی کی شکایت کی تھی لیکن یہ شب و روز ختم ہونے میں ہی نہیں آتے تھے بس ایک آگ ہی آگ تھی جو چاروں طرف سے مجھے لپیٹ رہی تھی واصف خود پڑھا لکھا نہیں تھا اس نے میری ڈگریاں بھی جلا دیں ایم ایس فزکس کہیں دور رہ گئی اور میں لوگوں کے گھروں میں کام کرنے والی بن گئی سات سال میرے بھاگتے دوڑتے گزر گئے مجھے لگتا تھا کہ میں اپنی ہڈیوں کا گودا نکال کر لوگوں کو دے رہی ہوں اتنا کام اتنی مصروفیت اتنی تھکاوٹ کہ کبھی آئینہ دیکھتی تو حیران ہوتی کہ میں کیسے زندہ ہوں تین سال پہلے بمشکل قرضہ ختم ہوا تھوڑی بہتر نوکری ملی وہاں بھی جوتیاں چٹخا چٹخا کر اب اس جگہ آن پہنچی ہوں کے میرے لیے پاکستان آنا ممکن ہوا عنقریب ارادہ ہے کہ اپنی یونیورسٹی سے ڈگری نکلواؤں یا پھر یہاں تو انگریزی کا رعب ہی بہت ہے کسی اسکول میں جا کر انگلش بولوں گی تو ٹیچر ہی رکھ لیں گے لیکن پھر سوچتی ہوں سارا دن پڑھا کر پچیس ہزار سے پینتیس ہزار والی نوکری بہتر ہے یونیورسٹی جانے کا بھی دل نہیں کرتا پرانے راستوں پر الٹے قدم کیسے رکھوں۔'' ماہ روز بولتے بولتے تھکی اور اس نے سر کرسی کی پشت گاہ سے لکا دیا اسے یقین تھا کہ اب حیدر تسلی آمیز الفاظ بولے گا حوصلہ بڑھائے گا اس کے سفر کی تکان سمیٹے گا حیدر نے ایک لفظ منہ سے نہ نکالا اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا ماہ روز حیران ہوئی یہ مجھے چھوڑ کر جانے والا ہے؟ پھر پریشان ہوئی کیا یہ واقعی مجھے چھوڑ جائے گا؟ اس نے سیدھے ہاتھ سے گاڑی کی چابی تھامی اور الٹے ہاتھ سے ماہ روز کو بازو سے تھام کر کھڑا کیا وہ لاشعوری طور پر اس کے پیچھے پیچھے چل رہی تھی دو قدم کا یہ فاصلہ حیدر کی خاموشی کی وجہ سے تھا وہ منہ سے کسی قسم کی کوئی ہدایات نہیں دے رہا تھا لیکن اس نے ماہ روز کا بازو ایک لمحے کے لیے بھی نہیں چھوڑا وہ اسی طرح چلتے باہر آ گئے گاڑی کا دروازہ کھول کر اس نے ماہ روز کو اندر بٹھایا سارے راستے خاموشی ہی رہی ویسی ہی خاموشی جیسی یونیورسٹی سے پہلی دفعہ ماہ روز کے گھر جاتے ہوئے تھی گاڑی کے شیشے کے ساتھ ایک چین لگی ہوئی تھی ماہ روز نے اسے پکڑ کر دیکھا چھوٹا سا دل بنا ہوا تھا دل اس نے پکڑ رکھا تھا جب حیدر نے گاڑی چلاتے ہوئے ہلکا سا اس دل کو اوپر سے پش کیا وہ لاکٹ کھل گیا اس پر لکھا تھا

ماہ روز حیران ہونا چھوڑ کر خالی الذہن سی بیٹھی سوچنے لگی اپنی کہانی سنا کر میں اس شخص کی ہمدردی تو نہیں بٹور رہی گاری جانے پہچانے راستے سے ہوتے ہوئے اسی گھر کے سامنے کھڑی ہوگئی وہ گھر بدل چکا تھا مکمل بدل چکا تھا حیدر نے دروازہ کھول کر اسے ہاتھ سے تھام کر باہر نکالا ماہ روز اسے روک نہ سکی گھر کے باہر بڑے پیارے لکڑی کے فریم میں 'نیل محل' لکھا ہوا تھا گھر کے باہر ہلکے نیلے رنگ کی خوبصورت ٹائلیں لگی ہوئی تھیں اور سفید رنگ کی سپر نگ شیڈ گرل کھڑکیوں کے پاس لگی تھی باہر کی کیاری ختم کر کے دروازہ بڑا کر لیا گیا تھا اور کھڑکیوں کے آگے تھوڑی سی جگہ پر گملوں سے نکلی بیلیں ان سپر نگ شیڈ گرل پر بہت خوبصورتی سے لپٹی ہوئی تھی مین گیٹ سلائیڈ کر کے سائیڈ پر کیا اور وہ ماہ روز کا ہاتھ ویسے ہی تھامے اسے اندر لے گیا راہداری میں بھی ہلکے نیلے رنگ کی ٹائلیں لگی تھیں اور اس کے بعد صحن میں نیلے رنگ کے ہر شیڈ کو بڑی خوبصورتی سے استعمال کیا گیا تھا نیلے رنگ کے فانوس جن سے نکلتی سفید روشنی ٹھنڈی لگ رہی تھی سفید رنگ کی بیلوں کو بڑھانے کے لیے اسٹیل کے فریم کے اوپر دیدہ زیب بیلیں۔۔۔۔ دیواروں پر ہلکے نیلے رنگ کی ٹائلوں سے زمین بنی تھی جس پر گہرے نیلے اور کھلتے نیلے رنگ کی چھوٹی چھوٹی مختلف اشکال کی ٹائلوں سے پھول بنے تھے یہ کواب تھا وہ نیلے بھاری پردے کو ہٹا کر کمرے میں داخل ہوا یہ کمرہ کافی بڑا تھا کسی کے ہنسنے کی آوازیں آرہی تھیں آدھا کمرہ عبور کر کے ماہ روز کو احساس ہوا کے ضرور اس گھر کے عین پیچھے موجود گھر خرید کر اس گھر کو بڑا کیا گیا ہے ورنہ پچھلی دفعہ کمرے کافی چھوٹے تھے کمرے کے وسط میں نیلے جالی کے پردے لگے ہوئے تھے جن پر سفید رنگ کے پھول بنے ہوئے تھے اور پھولوں پر چاندی سی چمک تھی پردوں کے اس پار کچھ نظر نہ آرہا تھا نیلے پردے ہٹے تو سلور پردے تھے اور پھر پہلے جیسے نیلے پردے ان پردوں سے نکل کر جب وہ کمرے کے دوسری جانب پہنچے تو حیدر کی بہنیں خوش گپیوں میں مصروف نظر آئیں سامنے دیوار پر حیدر کی اور ماہ روز کی تصویریں الگ الگ تھیں اور حیدر بہنوں کی تصویریں اپنے شوہروں کے ساتھ تھیں۔

''ماہ روز۔'' سب کے منہ سے اچانک نکلا ہاتھ ساکت ہوگئے وہ سب اٹھ کر آنا چاہ رہی تھیں کہ حیدر نے ہاتھ کے اشارے سے منع کر دیا۔

''رک جائیں سب وہیں رہیں ان سے ملنے یا انہیں ہاتھ لگانے کی قطعاً ضرورت نہیں یہ تو قربانی کی دیوی ہیں ان کو دیکھنا ہی تبرک ملنے کے برابر ہے ان کو صرف پوجا جانا چاہیے آپ سب اور میں بس یہی سوچتے رہے کے آخر ایسا کیا ہوا کونسا طوفان آگیا کہ اچانک سے یہ غائب ہوگئیں ان کا راتوں رات نکاح کیسے ہوگیا؟ اس سوال کا جواب ڈھونڈتے ڈھونڈتے میرے پاس لفظ ختم ہوگئے گڑیا نے صرف ان کو یہاں تک بتایا کہ سدرہ باجی کو جلانے کی کوشش کی ہے اور انہوں نے فیصلہ کر لیا۔ کہ یہ ہماری زندگیوں میں مشکلات کھڑی نہیں کریں گی اس لیے یہ چلی گئیں اس لیے ان کا نکاح ہوگیا اس کے بعد کی زندگی میں مشکلیں آئی تب بھی انہیں میں یاد نہیں آیا یہ ایک دوست کی حیثیت سے ہی مجھ سے مدد مانگ لیتی مجھے سے اپنا غم بانٹ لیتی لیکن نہیں ان کی انا ان کے قد سے زیادہ بڑی ہے۔'' حیدر نے سینے تک آتی ماہ روز کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''تم مذاق کر رہے ہو حیدر' سدرہ باجی بھی سامعین میں شامل تھی۔

'نہیں انہوں نے میری زندگی کے ساتھ مذاق کیا ہے' حیدر دل برداشتہ تھا وہ پھر ماہ روز کی طرف مڑا اسے کندھوں سے پکڑ کر اپنے سامنے بٹھایا۔

''آپ آدھی بات کیوں سنتی ہیں؟ آپ آدھی بات کیوں سمجھتی ہیں؟ ٹھیک ہے میں کوتاہ نظر ہوں چہرے نہیں پڑھ پاتا لیکن آپ تو بقراط کا فلسفہ جھاڑتی ہیں ناں پھر اتنا فوری فیصلہ کیوں اور کیسے کر لیا بہت شوق تھا مجھے تنہا کرنے کا؟ ایک دفعہ مجھ سے تو پوچھتی ایک دفعہ میری تو سنتی میں کوئی حل نکالتا آپ کی الجھن سلجھاتا مجھے اپنے بیتے برسوں کا کوئی ملال نہیں مجھے دکھ ہے تو آپ کا ہے کیسے آپ نے اپنی ذات پر تنہائی کا عذاب جھیلا ہوگا وہ تنہائی دکھ نہیں دیتی جس میں کوئی ساتھ نہ ہو تنہائی تب دکھ دیتی ہے جب کوئی ساتھ ہو کر بھی ساتھ نہ ہو تنہائی آپ نے دیکھی ہے آپ نے جھیلی ہے میں نے آپ کو اللہ کا انعام سمجھا تھا جسے سینت سینت کر رکھنا تھا آپ نے پتہ نہیں کیسے مجھ سے وہ حق چھین لیا جو صرف میرا تھا۔ ماہ روز کو کچھ سمجھ میں نہ آیا اسے بس شرم آرہی تھی کہ سب کے سامنے حیدر یہ کیسے دیکھ رہا ہے اور کیا کہہ رہا ہے سدرہ باجی مدد کو آگے بڑھی۔

''ماہ روز اس دن انصر نے مجھے جلانے کی کوشش کی اور مجھے بچانے کے لیے میرا بیٹا ہادی آگے آگیا وہ جتنا اس کو سنبھالنے کی کوشش کرتے وہ اتنا ان کی ٹانگوں سے نکل کر میری ٹانگ پر لگی آگ اپنے ہاتھ سے بجھاتا رہا میں جلی سو جلی ہادی کے ہاتھ بھی جل گئے حیدر کو پتا چلا تو وہ اسپتال لے گیا انصر بھی ہادی اور ہادیہ کو لے کر وہیں آگئے میں نے اس وقت دل کڑا کر لیا ہم جب باہر نکلے تو انصر نے گھر چلنے کو کہا ہادی میری گود میں آنے کو بے تاب تھا لیکن میں نے اسے نہ اٹھایا میں نے حیدر کا ہاتھ دبا کر انصر کو کہا۔

''میں آپ کو چھوڑ کر جا رہی ہوں مجھے نہ آپ کا ساتھ چاہیے اور نہ آپ کے بچے' انصر ششدر رہ گئے انہیں لگتا تھا وہ کوئی بھی ظلم کر لیں گے تو بچوں کو ہتھیار بنا کر میرے زخموں پر نمک بھی چھڑک لیں گے اور میرے وجود کو مٹی مٹی کرتے رہیں گے انہیں لگتا تھا کہ میں ایک بہن کتنی ہی مضبوط کیوں نہ ہوں ایک ماں کی حیثیت سے ضرور کمزور ثابت ہوں گی انہیں ٹھیک لگتا تھا لیکن میں یہ بھی جانتی تھی کہ ایک شوہر کی حیثیت سے وہ کتنے ہی جلاد اور سفاک کیوں نہ ہو ان کے اندر کا باپ ضرور نرم دل ہوگا انہوں نے اولاد کو میری کمزوری بنا کر استعمال کرنا چاہا اور میں نے اسے طاقت بنا لیا وہ کچھ بھی کر سکتے تھے لیکن اپنے بچوں کو ماں سے دور کرنے کے ظلم کے متعلق سوچ بھی نہیں سکتے تھے انہوں نے جو مجھے جلانے کی کوشش کی وہ ناکام کوشش نہیں تھی اس کوشش کو انہوں نے اپنی مرضی سے ناکام کیا وہ میرا چہرہ بھی جلا سکتے تھے میرے اوپر تیل پھینک سکتے تھے لیکن نہیں انہوں نے صرف مجھے پریشرائز کرنا تھا مجھے دھکا دے کر میری ٹانگ اور پاؤں پر تیل پھینکا خود ہی حیدر کو فون کیا انہیں پتا تھا حیدر میری تکلیف نہیں برداشت کر سکے گا فوری ہاں کر دے گا لیکن اسپتال میں ہی میں نے حیدر کو سمجھایا مجھے مضبوط دیکھ کر وہ کمزور پڑ گئے جب میں ان کے ساتھ نہیں گئی تو وہ ڈر گئے ایک مہینہ میں یہیں رہی پھر وہ آئے اور ماضی کی تمام غلطیوں کی معافی مانگی میرے اندر کی بیوی اور ماں ویسے ہی خول چڑھا کر بیٹھی تھی اندر سے سسک رہی تھی ان کے ساتھ چلی گئی تب سے اب تک انصر بدل چکے ہیں انہیں پیسے کا لالچ بھی نہیں رہا بہن ابھی تک گھر بیٹھی ہے لیکن مجھ پر کبھی دباؤ نہیں ڈالا میں ان کے ساتھ بہت خوش ہوں ان کو چور راستے جو حیدر کی نرمی سے [illegible] اور میری سخت [illegible] وجہ سے پرانی باتوں کو دہرا رہی ہوں ورنہ میں تو بھول بھی گئی کہ انہوں نے کبھی مجھ سے برا رویہ رکھا میری ساری دعائیں قبول ہوگئی ہیں میرا شوہر نیک اور میری اولاد صالح ہے۔''

سدرہ باجی کی آنکھوں سے خوشی کے آنسو ٹپکنے لگے وہ ماہ روز کا ہاتھ تھامے اس کے پاس بیٹھی رہیں۔

''ساری غلطی ہی میری ہے مجھے ماہ روز آپی کو کچھ بتانا ہی نہیں چاہیے تھا' گڑیا کی ہلکی سی آواز آئی جس پر شرمندگی

کا غبار تھا ماہ روز سر اٹھانے کے قابل نہ رہی۔

اپنے تئیں اس نے معرکہ مارا تھا ایک گھر کو مشکلات کا شکار ہونے سے بچایا تھا لیکن اس نے تو ایک شخص کے دل کو برباد کر دیا تھا

مسجد ڈھا دے مندر ڈھا دے

حیدر کمرے میں نہیں تھا وہ کچھ دیر وہیں رہی اور پھر خاموشی سے واپس اپنے فلیٹ پر آ گئی۔

صبح صبح وہ فلیٹ سے نکلی گیلے بالوں سے پانی ٹپک رہا تھا چہرہ ہمیشہ کی طرح میک اپ سے عاری تھا دروازے کو تالا لگانے لگی تو کنڈی میں ایک سفید کاغذ تھا جس پر نیلے رنگ سے لکھا تھا۔

مجھے آپ سے محبت ہے۔ اس نے کاغذ کو بیگ میں ڈالا اور سیڑھیوں کی طرف بڑھی ہر سیڑھی پر سفید کاغذ تھا وہ اٹھاتی گئی ہر کاغذ پر وہی تحریر اور حیدر کا انداز تحریر وہ جھینپ گئی اس کی گاڑی باہر کھڑی تھی ابھی ہی قسطوں پر نکلوائی تھی لیکن گاڑی کے ساتھ ڈھیروں کاغذ چپکے تھے اور ہر کاغذ پر وہی ایک جملہ

”مجھے آپ سے محبت ہے“

ابھی صبح صبح کا وقت تھا لوگ گھروں سے باہر نہیں نکلے تھے وہ شرمندہ ہوئی گھر کے دروازے سے گاڑی تک آتے وہ کاغذ ہی سمیٹتی جا رہی تھی یہ عمران چونچلوں کی نہیں ہے اس نے خود سے کہا اس کے چھوٹے سے پرس میں گاڑی سے لگے کاغذ نہیں آ سکتے تھے اس نے ارد گرد نظر دوڑائی کے شاید کوئی شاپر نظر آئے وہ گاڑی کی دوسری طرف گئی وہاں حیدر دبک کر بیٹھا تھا ماہ روز کی ہنسی نکل گئی کوئی اس کی عمر دیکھے اور چونچلے دیکھے حیدر اسے دیکھ کر کھڑا ہو گیا۔

”میں نے سوچا آپ کو ایسے تو سمجھ نہیں آتا لہذا لکھ کر دے دوں کے مجھے آپ سے محبت ہے وہ محبت جو بالکل بے بس کر دیتی ہے وہ محبت جو میری آنکھوں کو حیران کرتی ہے مجھے آپ کے اٹھنے بیٹھنے چلنے اور بولنے سے محبت ہے

جب آپ کی پلکیں لرزتی ہیں مجھے ان پلکوں سے محبت ہے جب آپ آنکھیں اٹھا کر ایک لمحے کے لیے دیکھتی ہیں مجھے اس لمحے سے محبت ہے مجھے ان آنکھوں سے محبت ہے جب آپ ہچکچا کر اپنی انگلیاں مروڑنے لگتی ہیں مجھے اس ہچکچاہٹ سے محبت ہے مجھے ان انگلیوں سے محبت ہے میں نے جن دو سالوں کو آپ کے ساتھ گزارا مجھے ان دو سالوں سے محبت ہے مجھے آپ کے ہنسنے سے محبت ہے جب ابھی مجھے دیکھ کر آپ نے سوچا کہ اس عمر میں یہ چونچلے مجھے اس سوچ سے محبت ہے مجھے آپ کے ٹھنکنے مجھے آپ کے ہاتھ ہلا ہلا کر بولنے سے محبت ہے مجھے خود بھی نہیں پتا کہ ایسا کیسے ہے لیکن میں آپکو دیکھوں تو ایک لفظ جو میرے ذہن میں آتا ہے وہ محبت ہے جب آپ میرے پاس ہوتی ہیں تو خوشیوں کا حصار مجھے اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے مجھے اس حصار سے محبت ہے حیدر اس کے بالکل قریب کھڑا تھا ماہ روز میں ہمت نہیں تھی کہ اس اظہار پر اس کی آنکھوں میں جھانک سکے دونوں پر اسی لمحے ڈھیروں پھولوں کی پتیاں برسیں کچھ اور لوگ بھی تھے شاید۔

سدرہ باجی، انصر بھائی اور گڑیا دوسری گاڑی کی اوٹ سے نکلے۔

”اب آفس نہیں چلنا سیدھا اپنے گھر جانا ہے۔“ سدرہ باجی نے مسکرا کر ماہ روز کو گلے لگاتے ہوئے کہا فیصل مسجد میں جا کر نکاح ہوا اور نیل محل کے نیلگوں کمرے میں ان کی ہنسی کی آواز گونجتی رہی محبت بلائیں لیتی رہی چاندنی جان لٹاتی رہی اور آسمان رشک کرتا رہا کمرے کے باہر کی دیوار پر زرد آنکھوں والی کھردری سطح والی چھپکلی آہستہ آہستہ رینگتی رہی۔

(ختم شد)



فن پارے

دیس بدیس نئے اور پرانے لکھاریوں کی رنگا رنگ تحریریں جو آپ کے دل کو چھو لیں گی

خزاں کے بعد	وقار الرحمان
دہلیز	عنبرین اختر
نیم پلیٹ	عمارہ خان
عاشق نمبر 309	میمونہ صدف
آپاں	فرحین ناز طارق
انسانیت	نائمہ غزل
پرایا دھن	محمد فاروق
ٹوٹنا ضروری تھا	عرشیہ ہاشمی

خزاں کے بعد

وقار الرحمان

آج فضا اداس تھی، بہت اداس۔
خزاں رسیدہ درختوں کے خشک پتے، بل کھا کر زمیں پر گر رہے تھے، خاموش فضا میں بکھرتے پتے، فضا کو اداس رنگ کر رہے تھے۔
وہ پارک کے ایک ویران گوشے میں بیٹھا، اس منظر میں کھویا ہوا تھا، جونہی کوئی پتا ایک خفیف کھڑکی سے اس کے قریب گرتا، وہ چونک جاتا۔
اسے ایسا لگتا جیسے کوئی دبے پاؤں اس کی جانب بڑھ رہا ہے۔
ایک انجانی پراسرار آہٹ پر وہ تجسس سے دائیں بائیں پھر پلٹ کر دیکھتا، لیکن کسی کو سامنے نہ پا کر پھر سے یاس کی وادی میں اتر جاتا۔
وہ سوچنے لگا۔
کیا میں بھی ان خشک پتوں کی طرح بکھر گیا ہوں، ٹوٹ گیا ہوں۔ اسے یاد آنے لگا، پچھلے برس خزاں کے ان ہی دنوں ایسا ہی ایک اداس دن تھا فرق صرف اتنا تھا کہ اس روز تیز خنک ہوا چل رہی تھی...... اور...... خزاں رسیدہ درختوں کے خشک پتے ہوا کے دوش پر اڑتے پھرتے، سو سو بل کھا کے چہار سو بکھر رہے تھے۔
ایک تسلسل سے گرتے پتوں اور تیز ہوا سے پیدا ہونے والی سرسراہٹ سے سراسیمگی چھائی تھی۔ ایسے میں اس نے ایک نظر اٹھا کر دیکھا۔
کچھ خوش رنگ خوبصورت پرندے، فضا میں اڑان بھرتے چہچہا رہے تھے۔ وہ ان چہکتے پرندوں کو حیرت سے دیکھنے لگا لیکن کچھ ان دیکھے سنہری پرندے، شاخوں پر دبکے بیٹھے تھے۔
چپ چاپ، اداس سے، جیسے وہ اپنے ہمجولیوں سے بچھڑ گئے ہوں۔
کبھی کبھی ان کی لمبی کوک، فضا کو افسردہ کر دیتی۔
اس طرح وہ آس و نراش، کے عمیق رنگوں میں کھو گیا۔ نراش کے اداس رنگوں میں اترتے اسے یاد آیا۔
پت جھڑ کے ایک ایسے ہی دن، اس کی چہیتی بیوی، اسے تنہا چھوڑ گئی...... جاتے، اس نے یہ بھی نہ سوچا کہ وہ اس کے بغیر کیسے جئے گا۔
مانا کہ اس سے انجانے میں کچھ غلطیاں سرزد ہوئیں...... بھول ہوئی لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ اس کی چاہت میں کوئی کمی آ گئی تھی۔ وہ اپنی بیوی کو دل و جان سے چاہتا تھا۔
نہ جانے اس کی بیوی نے کس بات کو دل سے لگا لیا۔
جو اس کا حساس دل برداشت نہ کر سکا اور وہ روٹھ کر چلی گئی۔
وہ بہت دل برداشتہ تھا۔
منفی سوچیں اسے بیکل کیے دے رہی تھیں۔
سوچنے لگا......!
کیا یہ بندھن، اتنے ناپائیدار اور نازک ہوتے ہیں، جو معمولی ارتعاش ہی سے ٹوٹ جاتے ہیں!
پھر وہ خود کلامی کے انداز میں بولا' کیا معاف کر دینا' کسی کو نئی زندگی دینے کے مترادف نہیں؟''
اس نے ایک سرد آہ کھینچی اور پھر سوچوں میں مستغرق ہو گیا۔

بدلتے موسم خزاں لاتے رہیں گے، پت جھڑ میں گرتے پتے اداسیوں کو جنم دیتے رہیں گے، لیکن کیا اب خزاں کے بعد بہار نہیں آئے گی، اس کے دل کی کلی کبھی نہ کھلے گی؟
اس کی آنکھوں کے کنارے بھیگنے لگے۔
بھیگی پلکوں میں ایک شبیہ دھندلائی۔
برسات ہونے لگی!
تن من بھگونے لگی!

......☆☆......

دھلیز

عنبرین اختر

یہ معاشرہ مردوں کا ہے. اور یہ دنیا بھی مردوں کے نام سے جیتی ہے. عورت خود کو جتنا بھی مضبوط کر لے. مرد کی لال آنکھوں کے پیچھے غصے کی ایک جھلک اس کے حوصلے کو ملیامیٹ کر ڈالتی ہے. پھر اسے اپنی ہمت اور توانائی کو سمیٹنے میں ایک عرصہ بیت جاتا ہے. عورت کا اپنا گھر کہاں ہوتا ہے. والدین کے گھر میں وہ ہمہ وقت یہی فقرہ سنتی ہے اپنے گھر جاے گی تو راج کرے گی. سسرال کی دہلیز پر قدم رکھتی ہے تو اسے ہر کسی کی گھورنے والی نظروں کا سامنا کرنا پڑتا ہے. جب بھی اس کے آنسو گرنے لگتے ہیں تو اس کے چاروں طرف ایک ہی جملہ گردش کرتا ہے. پرائے گھر سے آئی ہے آخر دوسرے کی پسند نا پسند سمجھنے میں وقت تو لگائے گی. پھر جب طلاق کے تین بول سن کر دھتکاری جاتی ہے تو ویران سڑکوں پر ننگے پاؤں اور ننگے سر کے ساتھ یہ سوچتی ہے کہ آخر عورت کا گھر کون سا ہے؟
جہاں وہ خود کو محفوظ تصور کر سکے. اسے تحفظ کا احساس دلائے. اس کی چھوٹی چھوٹی خوشیوں پر سب آنکھیں بچھا دیں اور اس کے غموں پر سب اسے تسلی دیں. یہی حسرت لیے وہ جوانی کی دہلیز پار کر کے اس مقام پر پہنچ جاتی ہے جہاں ماضی اور جوانی ایک خواب دکھائی دینے لگتے ہیں.
میری آنکھ ایسے ہی معاشرے میں کھلی. جب میں نے ہوش سنبھالا تو میرے کانوں نے ایک ہی جملہ سنا. یہ معاشرہ مردوں کا ہے. عورت تو محض ایک کھلونا ہے. جو ٹوٹ جائے تو چاہے کسی کچرے پر پھینک دو. کسی کو کوئی فرق نہیں پڑے گا.
میری ماں سارا دن اینٹوں کے بھٹے پر محنت مزدوری کرتی اور میں اس بھٹے کے قریب ایک جھگی میں اپنی چھوٹی بہن کا خیال رکھتی. بہن بھوک کی وجہ سے ماں کو یاد کر کے روتی رہتی. اور روتے روتے ہی سو جاتی. میری ماں کس لیے اتنی محنت کر رہی تھی. وہ ہمارے لئے نہیں بلکہ اس ظالم مرد کے لئے اپنا پھول جیسا بدن سورج کی بے رحم کرنوں کے سپرد کر رہی تھی. جس کی آوارہ عادتوں نے اسے جیل کی سلاخوں کے پیچھے ہمیشہ کے لیے چھوڑ دیا تھا.
وقت مجھے پیچھے لے جا رہا تھا. میرا باپ رحیم سارا دن تپتی دھوپ میں انگور کی ریڑھی لگا کر کھڑا رہتا. سارے دن میں وہ کوئی چار سو روپیہ کما کر شام کو گھر آتا تو بدن تھکاوٹ سے چور اور آنکھوں سے غصہ ٹپک رہا ہوتا. میری ماں شکیلہ شوہر کو دیکھ کر ڈر کے مارے کوئی بات نہ کرتی. میں بھی باپ کو دیکھ کر سہم کر ایک کونے میں بیٹھ جاتی. ہمارا چھوٹا سا گھر پیچھے ایک کمرہ ساتھ باورچی خانہ اور آگے چھوٹا سا کچا صحن تھا. مکان کرائے پر تھا. بارش اور خاص کر ساون کے دنوں میں چھت سے پانی ٹپکتا رہتا. ہم نے کئی بار سوچا کہ کہیں اور مکان دیکھ لیتے ہیں. لیکن ان کے کرائے بہت زیادہ تھے. میرا باپ اتنا کہاں کماتا تھا. جو ہمارے لئے پکا مکان ڈھونڈتا. میری ماں مٹی اور گارے سے دیواروں اور چھت کو پکا کرتی رہتی. تب ہی اتنا عرصہ گزر گیا تھا. اس گھر میں.

ایک دن میری ماں شکیلہ صحن میں مٹی کے چولہے پر رات کا کھانا بنا رہی تھی۔ رحیم نے ریڑھی باہر کچی دیوار کے ساتھ لگا دی۔ اور غصے میں ایک ٹانگ سے دروازہ کھولتا ہوا اندر آیا۔ دروازے کے پاس سے لکڑی اٹھائی اور بیوی کی کمر پر زور زور سے وار کرنے لگا۔ شکیلہ بیچاری چیخنے چلانے لگی۔ ماں کی پکار پر میں باہر آئی تو ماں کو باپ کے ہاتھوں روئی کی مانند دھونتے ہوئے دیکھ کر مدد کے لیے پکارنے لگی۔ رحیم کا غصہ جب ٹھنڈا ہوا تو خود ہی لکڑی پھینک کر گالیاں دینے لگا۔ میں بے سدھ دیوار کے ساتھ چپکی رہی۔ شکیلہ کا بدن زخموں سے چور ہو گیا۔

تجھے کتنی دفعہ کہا ہے کہ عمارہ کو شیدے کے ہاتھ بیچنے دے۔ دوسری بھی تو بڑی ہو رہی ہے۔ لیکن تو نے تو جیسے ان دونوں کو ساتھ لے کر قبر میں اترنا ہے۔ بیٹیاں جوان ہو رہی ہیں کہاں سے ان کی شادی کے خرچے پورے کرے گی۔ باہر وہ شیدا مجھے لاکھ سناتا ہے اور ادھر تیری پاک دامنی کے فلسفے پورے نہیں ہوتے۔ میری بات کان کھول کر سن لے۔ کل میں خود عمارہ کو شیدے کے ہاتھ بیچ آؤں گا۔ پھر شیدا جانے اور اس کا کام۔ مجھے تو صرف کورے اور سرخ نوٹ چاہیں۔ رحیم نوٹوں کی مہک دل میں اتارتے ہوئے بولا۔

ادھر جب میں نے اپنے بکنے کی خبر سنی۔ تو مجھے باپ پر سخت غصہ آیا۔ یہ کیسا باپ ہے؟؟ جو اپنے کلیجے کے ٹکڑے کو غیروں کے ہاتھ محض چند روپوں کی خاطر بیچنا چاہتا ہے۔ باپ تو اولاد کے لئے گھنی چھاؤں ہوتا ہے۔ اسے سورج کی تمازت اور آوارہ نظروں سے بچا کر رکھتا ہے۔ دوسری طرف ماں کو زخموں سے چور دیکھا تو آنکھوں سے موٹے موٹے آنسو گر کر کچی زمین میں دفن ہونے لگے۔ میری ماں کتنی اچھی تھی۔ میری وجہ سے آج اس نے پھر مار کھا لی تھی۔ لیکن شوہر کے آگے ایک لفظ بھی نہ بول سکی۔ میں شوپیس میں پڑا کوئی کھلونا نہیں تھی کہ جب جس کا دل چاہتا مجھے منہ مانگے دام وصول کر کے لے جاتا۔ میں چودہ پندرہ برس کی دوشیزہ جس پر جوانی آمد کر آ رہی تھی۔ میری ماں کتنے عرصے سے مار کھا رہی تھی۔ رات کو سونے سے پہلے میں نے ماں کے زخموں پر دوائی لگاتے ہوئے کہا۔

ماں تجھ میں اتنا حوصلہ کہاں سے آ جاتا ہے۔ جو تو باپ کی مار کھا کر بھی چپ کے تالے اپنے ہونٹوں پر لگائے رکھتی ہے۔ آگے سے جواب کیوں نہیں دیتی۔ ماں نے خالی نظروں سے میری طرف دیکھا پھر کہنے لگی۔

''پتر اگر تیرے باپ کو میں ایک لفظ بھی سناتی تو وہ تجھے کب کا بیچ چکا ہوتا۔ مجھے مار کر اس کا غصہ ختم نہیں کم تو ہو جاتا ہے۔ پھر اگلے دن وہ سکون سے ریڑھی لگانے چلا جاتا ہے۔ میری خاموشی اسے ایک دن بہت مہنگی پڑے گی۔ دیکھ لینا تو۔ اس رات شکیلہ نے لیٹے لیٹے اپنے رب سے ڈھیر سارے شکوے کیے۔ پھر اپنی بیٹیوں کی جوانی اور ان کی سلامتی کی کتنی دیر تک دعائیں مانگتی رہی۔

"اے اللہ صبح ہونے میں کچھ گھنٹے باقی ہیں۔ میں نہیں جانتی اس رات کے اندھیرے کے پیچھے جو کل کی روشنی چھپی ہے۔ اس میں کس کی عزت داغدار ہونے والی ہے۔ یا اللہ میری بچیوں کو سلامت رکھنا۔ اور میرے شوہر کے ناپاک ارادوں سے ہم کو اپنی پناہ میں رکھنا۔""

اس نے ایک نظر عمارہ پر ڈالی۔ پھر پہلو میں سوئی ہوئی دوسری بیٹی پر ڈالی۔ اپنے بچوں کو دیکھ کر وہ سوچ رہی تھی کاش میں تم دونوں کو اس مردوں کے معاشرے سے دور کہیں ویرانوں میں لے جاؤں۔ جہاں لالچی نگاہوں کا وجود نہ ہو۔ تم دونوں کو اپنے دامن میں سمیٹ لوں جہاں شکاری کتے صرف بھونکتے رہ جائیں۔ پر ہاتھ کچھ نہ آئے۔ آنسو گر کر میلے سرہانے میں جذب ہو رہے تھے۔ پھر ایک پرعزم خواہش کے ساتھ اس نے آنکھیں بند کر لیں۔

''کیوں یار سودا طے ہو گیا ہے کیا۔ میں نے تجھے آدھے پیسے دے رکھے ہیں۔ آدھے پیسے مال ہاتھ میں آنے کے بعد دوں گا'' شیدا رحیم کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔

''سرکار تمہارا حکم سر آنکھوں لیکن مجھے پیسوں کی ضرورت آن پڑی ہے کیا تم سارے پیسے ابھی دے سکتے ہو؟''

''رحیم یہ تم کیا کہہ رہے ہو۔ تمہیں پتہ بھی ہے ہمارے درمیان سودا طے ہو چکا ہے۔ مال کے بدلے مال۔''

''وہ میں نے کہیں جوا کھیلا تھا لیکن ہار گیا۔ وہ جواری فوراً پیسے۔ مانگ رہا ہے۔''

''اگر وہ پیسوں کا اصرار کر ہی رہا ہے تو اپنی دوسری بیٹی اسے دے دو۔ اور پھر ایک جوا آج میرے ساتھ بھی کھیلو۔'' شیدا کہنے لگا۔۔

''کیسا جوا۔'' رحیم ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہنے لگا۔

''اپنی بڑی بیٹی ابھی گھر سے بھگا کر لا۔ پھر دیکھنا جوا کیسے کھیلتے ہیں۔''

''شیدے اپنی زبان بند رکھ یہ تو کیا کہہ رہا ہے۔ وہ میری بیٹی ہے کوئی تاش کے پتے نہیں۔ جو تم میز پر پھینک کر جیتنے کی امید لگا رہے ہو۔''

''آج تو تیرے اندر اپنی بیٹیوں کے لیے بڑی غیرت جاگ رہی ہے میں سارے پیسے اس طرح نہیں دے سکتا اور ویسے بھی ہمارے درمیان سودا طے ہو چکا ہے۔ شیدا اپنی مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے بولا۔

''کیسا سودا؛؛ رحیم نے قمیص کے اندر سے چھرا نکالا اور اسی لمحے شیدے پر دو تین وار کر دیے۔ شیدا زمین پر گرتے ہی ہلاک ہو گیا۔ بیچ بازار میں خون کی ہولی کھیلی جا رہی تھی اور بچانے والا کوئی نہ تھا۔

دروازہ زور سے بج رہا تھا۔ میں ڈر کے مارے اندر کمرے میں چلی گئی۔ ماں خوف سے کانپتی دروازے پر گئی۔

ٹاٹ کا پردہ اٹھا کر پوچھا۔ ''کون ہے؟''

سامنے بھدی شکل والا بندہ کہہ رہا تھا۔ تمہارے شوہر نے شیدے کا قتل کر دیا ہے۔ پولیس اسے پکڑ کر لے گئی ہے۔ سنا ہے وہ جوا بھی کھیلتا تھا ہمیں تو اس بات کا آج پتہ چلا ہے۔''

قتل کا سن کر شکیلہ کے ہاتھ پاؤں پھولنے لگے زمین گھومتی ہوئی محسوس ہونے لگی۔ میرا شوہر قاتل بن گیا۔ اسی لمحے دل کے ویران گوشے سے صدا آئی۔ تیرا شوہر قاتل تو بن گیا لیکن تیری بیٹیاں آج کسی کے ہاتھوں بکنے سے رہ گئی۔ اس نے پہلے کون سے اچھے کام کیے تھے جو آج قتل کر کے میرا سر نیچا کر دیا۔

شکیلہ ایک دو بار شوہر کو ملنے جیل گئی۔ اس نے کبھی بچوں کا نہ پوچھا۔ بس اسکے منہ پر ایک ہی جملہ ہوتا۔ میں جوئے میں ہارا تھا دو لاکھ کی رقم کا بندوبست کر کے اس بندے تک پہنچا دینا۔ ورنہ وہ کچھ بھی کر سکتا ہے۔ بڑا اثر رسوخ والا بندہ ہے۔ رحیم آنکھ کے اشارے سے کچھ سمجھاتے ہوئے بولا۔

''میں کہاں سے لاؤں اتنے پیسے۔ تو نے کون سی اپنے پیچھے جائیداد چھوڑی ہے۔ جو میں اس کو رقم دے سکوں۔ شکیلہ آنسو صاف کرتے ہوئے بولی۔

تو ایسا کر سائرہ کو اس کے ہاتھ فروخت کر دے۔ اس طرح تو چھوٹی بیٹی کی ذمہ داری سے پہلے ہی فارغ ہو جائے گی۔ میری تو یہاں سے نکلنے کی امید بہت کم ہے۔''

''بس کر رحیم ابھی بھی تیری وہ ہی عادتیں ہیں۔ رسی جل گئی مگر بل نہ گیا۔ اب تو کچھ خدا کا خوف کھا لے۔ کہیں تجھے اپنے ہی بچوں کی بددعا نہ لگ جائے۔'' شکیلہ نے سر سے چادر ٹھیک کی اور جیل سے باہر نکل آئی۔

دن ابتر ہوتے جا رہے تھے۔ شوہر کی باتیں شکیلہ کے دماغ پر ہتھوڑے برسا رہی تھیں۔ دو لاکھ کی رقم میں کہاں سے انتظام کروں گی۔ یہاں کھانے کو پیسے نہیں ہیں۔ نوبت فاقوں تک آ گئی۔ چھ ماہ سے کرایا ادا نہ کرنے پر مالک مکان نے ہمیں گھر سے نکال دیا۔ راستے میں شکیلہ کو جوئے باز پپول گیا۔ میں نے اپنی بچیوں کو ایک جھٹکے سے پیچھے چھپا لیا۔ وہ اپنی مونچھوں کو موڑتا ہوا کہنے لگا۔

''میں ایک شرط پر تیرے شوہر کو ضمانت پر رہا کروا سکتا ہوں۔ کہ تو اپنی بیٹی ان پیسوں کے عوض میرے حوالے کر دے۔ جو رحیم نے ادا نہیں کیے۔''

یہ میری بیٹیاں ہیں کوئی سبزی کی دوکان نہیں جو ساری تیرے حوالے کر دوں مجھے تیری مکاریاں اچھی طرح سمجھ آ رہی ہیں تم

لوگوں کی زبان کا کیا بھروسہ۔ جو کرتوت تم لوگ کرتے ہو اس سے سارا زمانہ واقف ہے میں اپنی طرف سے پوری کوشش کروں گی کہ تیری رقم تجھے لوٹا سکوں محنت مزدوری کرلوں گی لوگوں کے گھروں میں جا کر کام کروں گی یا پھر تپتی دھوپ میں کسی بھٹے پر بھی بیٹھنا پڑا تو ضرور بیٹھوں گی پر اپنی پھول جیسی بچیاں تیرے حوالے نہیں کروں گی۔"

پپو شکیلہ کی بات سن کر زور سے ہنسنے لگا۔ اور اپنی مونچھوں کو بل دیتے ہوئے آگے چلا گیا۔

سر چھپانے کو کوئی آسرا نہ رہا۔ میں ماں کے ساتھ چلتی خانہ بدوشوں کے علاقے میں آگئی۔ جہاں بہت سے لوگ جھگیاں ڈال کر زندگی گزار رہے تھے۔ ہم نے بھی سر چھپانے کے لئے معمولی سی جھگی بنالی۔ کم از کم سر چھپانے کا عارضی سہارا تو مل گیا۔ جھگی سے تھوڑے فاصلے پر اینٹوں کے بھٹے پر عورتیں اور مرد کام کر رہے تھے۔ میری ماں نے مجھے تاکید کی اور سمجھا کر بھٹے کے ٹھیکیدار کے پاس گئی۔ اپنا نام لکھوایا۔ اور پہلی دہاڑی لے کر اس نے خدا کا شکر ادا کیا۔ کام کے دوران بھی اس کے ذہن میں لاشعوری طور پر ہر وقت پپو اور رحیم کے الفاظ گونجتے رہتے۔ ہمیں یہاں رہتے ایک سال گزر گیا۔

ماں جیل میں میرے باپ سے ملاقات کرنے نہیں گئی۔ وہ زندہ ہے یا...... اس نے ہمیں کون سی خوشی دی ہے ساری زندگی۔ جو میری ماں عدالتوں کے چکر کاٹتی۔ وہ تو میرے باپ کی بوئی ہوئی فصل کاٹ رہی تھی اور نہ جانے کب تک کاٹتی رہے گی۔

آج بھی میری ماں اینٹوں کے بھٹے پر بیٹھی کچی مٹی سے پکی اینٹیں بنانے میں مگن تھی جیسے نہ دھوپ کا خیال تھا۔ نہ بھوک کا اور نہ اپنا۔ اسے تو بس اس بات کا ڈر تھا کہ پپو کہیں جھگی کی دہلیز پار نہ کرلے۔ اور ایسی دہلیز پار کرنا ان جیسے آوارہ مردوں کے لیے معمولی بات ہے وہ خود کو مطمئن کرنے کے لیے پیسے جمع کر رہی تھی۔ تا کہ اس جواری کا منہ بند کر سکے۔

......☆☆......

نیم پلیٹ

عمارہ خان

فریدہ۔۔۔اری او فریدہ

سلیم نے خوشی سے جگمگاتے چہرے کے ساتھ گھر میں داخل ہوتے ہوئے اپنی نصف بہتر کو آوازیں لگانا شروع کر دیں

او فریدہ، کہاں مرگ ء آ نہ ادھر

آوازیں لگانے کے ساتھ اب سلیم نے چھوٹے سے صحن میں، دیوار کے ساتھ رکھی چارپائی کو بچھا کے اس پہ سکون سے بیٹھ کے ادھر ادھر دیکھا، اچانک کسی سوچ کے پیش نظر اس کے چہرے پہ چمک سی آئی، اس نے فوراً اپنے ہاتھوں میں پکڑا تھیلا اپنے پیچھے چھپایا اور ایک بار پھر آواز لگائی

تو کھر مے بھی فریدیے

کیا آفت آن پڑی اخر

فریدہ نے چھت سے جھانکتے ہوئے تنکے ہوئے لہجے میں دریافت کیا

اوپر کیا کر رہی ہے اس بھری دوپہر میں۔۔۔نیچے آ چل

کپڑے ڈال رہی ہوں، ایک ہفتے بعد جو پانی آیا تھا

"اری چھوڑ کپڑے وپڑے کو، جلدی نیچے آ"

چار کپڑے رہ گئے، صبر کرنا۔

"صبر کی بچی۔ آ رہی ہے نیچے یا نہیں؟"

"اف ہو......!" فریدہ نے باقی ماندہ کپڑوں کے تسلے کو ایک نظر دیکھا اور دوسری نظر سلیم کے چہرے کی خوشی کی طرف۔ فیصلہ خود بخود اپنے محبوب شوہر کی طرف ہو گیا

اور۔۔۔۔ اور باوجود اس کے کہ آٹھویں ماہ ہونے کے باعث وہ جانتی تھی اتنی سیڑھیاں ایک بار پھر چڑھنا اس کے لیے آسان ثابت نہیں ہوگا لیکن محبت کرنے والے شوہر کی خاطر اتنی تکلیف تو اٹھا ہی سکتی تھی ایک بیوی۔

سہج سہج کے سیڑھیاں اترنے کے باوجود فریدہ کی سانس پھول چکی تھی۔

"ہاں بول اب بے صبرے۔"

فریدہ نے پھولی ہوئی سانس کو بحال کرتے ہوئے، سلیم کے برابر بیٹھتے ہوئے مصنوعی ناراضگی سے کہا۔

"دو منٹ رک جاتا تو پورے کپڑے ایک ہی واری میں نمٹ جاتے نا۔"

فریدہ نے گیلے دامن کو جھٹکتے ہوئے ایک بار پھر سلیم کو گھورا۔

"پتہ نہیں کیا آفت آن پڑی تجھ پہ، ایک تو اس حال میں اتنی پہاڑ سیڑھیاں چڑھنا اترنا مصیبت ہے۔ اوپر سے تیرے نخرے نہیں مکتے۔ میں نے...... فریدہ نے جو اک ٹک سلیم کو خود پہ نظریں جماتے دیکھا تو فطری شرم سے بیساختہ رک گئی۔

"اری پگلو، میں پھیلا آؤں گا نا۔"

سلیم نے ہاتھ پھیلا کے فریدہ کے شانوں پہ رکھ کے اسے اپنے سے نزدیک کرتے ہوئے کہا۔

"کپڑے تو کیا، تو بولے کپڑے دھو بھی دیا کروں؟"

سلیم نے کسی سڑک چھاپ عاشق کی نقل کرتے ہوئے فریدہ کو ہنسانا چاہا۔

"پرے ہو۔" ابھی فاطمہ جھانکی مار لیگی دیوار سے۔

فریدہ نے ہلکے دھکے سے فیصل کو دور کرتے ہوئے اپنی پڑوسن کا نام لیا، جو دن میں چھ سات بار اپنے آنگن سے فریدہ کے چھوٹے سے صحن میں جھانکتے ہوئے گپ شپ کرتی تھی۔

"ارے تو آج جلدی کیسے آگیا، لو میں نے تو ابھی آلو پکانے تھے، دیکھ اب تو کھانا نا مانگیو۔" اب کے فریدہ کو کھانے کی فکر ستائی تو اس نے صحن میں بنے چھوٹے سے کچن کی طرف دیکھتے ہوئے پریشانی سے کہا۔

"اور بول نا، کیوں آوازیں لگا رہا تھا، اتی دیر سے خاموش بیٹھا ہے۔"

فریدہ جیسے سانس لینے رکی لیکن پھر اسے بچوں کی فکر لگ گئی۔

بات سن، اب تو جو جلدی آگیا ہے تو کیا جمعے پڑھنے پھر جائے گا، اور اس سے پہلے تو یہ، فیصل کو لائے گا؟ گرمی دیکھی ہے باہر؟ یا اللہ۔۔۔ کیوں دو تین پھیرے ڈالتا ہے تو سلیم، ایک تو یہ اتنی پتلی گلی میں گھر ہے کہ تیرا رکشہ (رکشہ) بھی اندر نہیں آن پاتا، ورنہ قدرے آسانی ہو جاتی نا؟"

اچانک فریدہ کو احساس ہوا وہ ہی مسلسل بولے جا رہی ہے۔

وہ اپنا ایک ہاتھ منہ پہ رکھتے ہوئے بولی۔

"ایک تو میں بھی رکے بغیر شروع ہی ہو جاتی ہوں، بول نا سلیم۔"

فریدہ نے سلیم کو باقاعدہ ہلاتے ہوئے کہا

"تیری کہانیاں ختم ہو تو بندہ اپنی بات کہے نہ میری مینا۔"

سلیم بھرپور مسکراہٹ سے فریدہ کو تکتے ہوئے بولا۔

فریدہ نے شرماتے ہوئے منہ نیچے کر لیا۔

باوجود اس کہ ان دونوں کی شادی کو بارہ تیرہ برس ہو چکے تھے، لیکن آج بھی فریدہ سلیم کی آنکھوں سے جھانکتی محبت اور وارفتگی سے تکنے سے شرما جاتی تھی تو دوسری طرف سلیم بھی اس کی ساری پریشانیوں سے واقف تھا کہ کیسے غربت اور پریشانی

میں فریدہ نے ماتھے پہ شکن لائے بغیر اس کا ہر جگہ مان رکھا ہے، کبھی کوئی بے جا فرمائش یا نخرہ نہیں کیا۔ ہر مشکل میں اس کا حوصلہ بڑھایا۔ اس کی یہ بات سلیم کے دل میں عزت کے ساتھ محبت بھی بڑھاتی رہتی تھی۔

''کیا دیکھے جا رہا ہے؟'' فریدہ نے سلیم کی ٹکٹکی باندھ کے دیکھنے سے جز بز ہوتے ہوئے بولا۔

''کتنی ظالم ہے تو فریدہ، دو گھڑی سکون سے خود کو دیکھنے بھی نہیں دیتی۔

''اچھا چل دیکھ یہ کیا ہے؟''

بالآخر سلیم نے اپنے پیچھے چھپے تھیلے کو نکالتے ہوئے فریدہ کی سمت بڑھایا۔

''کیا ہے یہ؟''

فریدہ نے سلیم کی پہلی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے، تھیلے کے اندر جھانکتے ہوئے سوالیہ نظروں سے سلیم کو دیکھا۔

''اری نیک بخت کھول کے دیکھ نا۔''

سلیم جواب فراغت سے فریدہ کے پیچھے پاؤں پھیلا کے لیٹ رہا تھا، دونوں ہاتھ کا تکیہ سا بنا کے سر کے نیچے رکھا اور دلفریب مسکراہٹ کے ساتھ فریدہ کو آنکھوں سے تھیلا کھولنے کا اشارہ کیا۔

فریدہ نے ناسمجھی سے سر ہلاتے ہوئے کپڑے سے بنا تھیلا کھولا، تو سامنے اخبار میں لپٹی ہوئی ماربل کی تختی/ بلاک نکلا۔

فریدہ نے وہ تختی ہاتھ میں لیتے ہی بے ساختہ سلیم کی سمت دیکھا جو چمکتی آنکھوں سے اسی کو دیکھ رہا تھا۔

''یہ یہ، یہ بنوالی تو نے، کب کیسے کس سے، اللہ جی بتایا کیوں نہیں مجھے۔۔۔۔ ہائے کتنی پیاری ہے نا سلیم۔''

فریدہ کے چہرے پہ اب وہی روشن مسکراہٹ سجی ہوئی تھی جو کچھ دیر پہلے سلیم کے چہرے پہ تھی۔

ایک سفید کلر کی صاف شفاف ماربل کی ''نیم پلیٹ'' فریدہ کے ہاتھوں میں تھی اور دونوں میاں بیوی اسے تک رہے تھے، نرمی سے ہاتھوں سے سہلا رہے تھے

محمد سلیم فاروق۔ L49۔ اورنگی ٹاؤن۔ کراچی

ہائے اللہ جی۔ سلیم دیکھ تیرا نام کتنا پیارا لگ رہا۔''

تین جماعت پڑھی فریدہ نے باآسانی سلیم کا نام نم آنکھوں سے پڑھا اور اسے محبت سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

یہ بنوائی کب تو نے؟

کب سے پیسے جمع کر رہا تھا، بولا ہوا بھی کافی وقت سے تھا رشیدے کو اور آج اٹھوا ہی لی آخر کار۔ سلیم نے سکون سے آنکھیں موند کے جواب دیا

''تو جانا لگا اسے گھر کے باہر اب تو ہمارا اپنا گھر ہے۔ مجال ہے کسی کی کوئی کچھ کہے یا منع کرے۔'' فریدہ نے بھیگی مسکراہٹ سے بولا۔

''ہاں بلایا ہے پرسوں یعنی اتوار کو چاند میاں کو۔ رشید تو بول رہا تھا اسی دن اٹھا لے اسے بھی لیکن میرے سے صبر نہیں ہوا تو اسے اٹھا لایا دیکھتے ہی۔

سلیم نے آنکھیں کھول کے خفت سے سر کھجاتے ہوئے بات پوری کی۔

جھلا نہ ہو تو۔ فریدہ نے پیار سے اس کے بال بکھراتے ہوئے کہا۔

ویسے فریدے اچھا لگیگا نہ میرا نام۔ اس مکان کے باہر

سلیم نے گویا جاگتی آنکھوں سے اس نیم پلیٹ کو گھر کے باہر لگا دیکھ کے فریدہ سے تصدیق چاہی

فریدہ صرف خاموشی سے پیار سے اسے تکتی رہی، جانتی تھی سلیم کا یہ برسوں پرانا خواب ہے کہ اس کے مکان کی شناخت علامت باقاعدہ نیم پلیٹ کے ساتھ ہو

تیرہ سال پہلے جب فرید اور سلیم کی شادی ہوئی تھی آباء مکان اس کے سسر یعنی تایا کے نام تھا سو ان کے ہی نام کی نیم

پلیٹ لگتی تھی، اس وقت بھی سلیم اس تختی پہ ہاتھ پھیر کے اس بات کا اعادہ کرتا تھا جب وہ بڑا ہو کے اپنا مکان بنوالیگا وہ بھی ایسی ہی تختی بنوائے گا۔

بات کریں بچپن کی تو، اس وقت بھی جب کبھی گھر گھر کا کھیل کھیلا گیا، سلیم نے ہمیشہ اپنے اس گھر پہ جو چارپائی پہ کسی بھی کپڑے کو ڈال کے مصنوعی گھر بنایا جاتا تھا ادھر بھی کاغذ قلم سے اپنا نام لکھ کے شوق پورا کیا، وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کا یہ بے ضرر سا ارمان اپنی جگہ ہی رہا۔

لیکن۔۔۔۔۔۔۔

لیکن شادی کے چار، سال بعد جب ساس سسر آگے پیچھے انتقال کر گئے تو مکان وراثت میں بٹ گیا۔ تین بہنوں کے حصے ایمانداری سے ادا کرنے کے بعد سلیم اور فریدہ کے پاس اتنا پیسہ نہی تھا کہ وہ دو کمروں کا ہی سہی مکان بنوالیں۔ نو سال تک کرائے کے مکانوں میں رہے۔

ایک بیٹا ایک بیٹی بھی اسی دوران ہوئے تو زندگی مشکل سے مشکل تر، ہوتی چلی گئی۔ لیکن ایک ان دیکھی ہمت تھی دونوں میں جو ختم ہونے کا نام نہی لیتی تھی

سلیم نے قسطوں پہ رکشہ لیکے چلانا شروع کیا، صبح اسکول کے بچوں سے لیکے فیکٹریوں کے لوگوں کو بھی مناسب اجرت پہ پک اینڈ ڈراپ دی ساتھ بازاروں سے لوڈنگ کا کام بھی پکڑا، غرض رکشے کا جہاں جہاں استعمال ہو سکتا تھا چار پیسوں کی خاطر وہ ہر کام کیا

دوسری طرف فریدہ نے برسوں دل مارا، جوڑ توڑ کی، کمیٹیاں ڈالی، گھر میں ٹافیاں پیک کرنے سے پاپڑ تلے، اچار ڈالے اور بالآخر نو سال لگاتار محنت کرنے کے بعد دونوں میاں بیوی اس قابل ہو گئے کہ ایک کمرے اور چھوٹے سے صحن والا گھر لے سکیں

مکان لینے کے بعد اس ماربل کی نیم پلیٹ کی دبی ہوئی خواش جو حسرت بنتی جا رہی تھی وہ خود بخود عود آء کہ کرائے کے مکانوں میں کون کسی کرائے دار کو اپنی من مانی کرنے دیتا ہے کچہ نیم پلیٹ لگانے دے

گو کہ پہلے ماحول الگ تھا جو لوگ سالوں ایک ہی مکان میں رہ لیتے تھے، اب تو مکان ہی گیارہ ماہ کے معاہدے پی اسٹیٹ ایجنٹ کے تحت دیا جاتا تھا، سو سلیم کی بھی برسوں پرانی خواہش سینے میں ہی دفن رہی، لیکن اب خدا نے اپنا گھر دے دیا تھا تو کوئی حرج نہی تھی اپنی دل کی بات ماننے میں

......☆☆......

اچھا بھئی فریدے لے میں چلا ذرا جمعہ پڑھ آؤں

سلیم نے حقیقت کی دنیا میں آتے ہوئے بولا

اسے سنبھال کے رکھیو، پرسوں چاند میاں آ کے صفاء سے لگا دینگے، ایسا نا ہو تو کام میں لگ جائے اور تیرے بچے اسے توڑ دیں

سلیم نے اٹھتے اٹھتے شرارت سے فریدہ کو چھیڑا

ہاں ہاں میں تو اپنے میکے سے لاء ہوں نا بچے

فریدہ نے حسب عادت فوراً تنک کے جواب دیا

ہیں اچھا، چاچا چاچی نے تجھے جہیز میں بچے بھی دیے تھے

سلیم نے قہقہہ لگا کے فریدہ کی سمت دیکھا

فریدہ نے سلیم کا جاندار قہقہہ سنتے ہی بے ساختہ ماشاء اللہ کہا ساتھ ہی اسے تسلی بھی کرا دی

بس نا چھوڑ دے اب اس بات کو، ہر ویلے کا مذاق۔۔ اور ہاں فکر نا کر ابھی اندر پیٹی بھی رکھ دونگی اسے

چل پھر اٹھ جا میں چارپائی لگا جاؤں ورنہ بعد میں شکایت کریگی تیرا "اس حال" میں خیال نہی رکھا، اور ہاں بات سن رات میں کچھ نا پکایو، نہاری روٹی لیتا آؤنگا۔" سلیم نے چارپائی واپس دیوار کے سہارے لگا کے جیب میں رکشے کی چابی ٹٹولتے ہوئے کہا۔

"ہاں بھئی آج تو تو نے حاتم طائی کی قبر پہ لات مارنی ہی ہے نا۔"

فریدہ نے بھی واپس چھت کی سمت جاتے ہوئے شرارت سے جواب دیا۔

"ہاہاہاہاہاہاہا۔" ایک جاندار قہقہہ آخری بار اس چھوٹے سے صحن میں گونج کے رہ گیا۔

......☆☆......

"معاف کرنا باجی، میں اتوار کو نہیں۔" آسکا۔ چاند میاں نے جیسے ہی فریدہ کی دروازے کی اوٹ سے جھلک دیکھی فوراً صفائی دینا شروع ہو گئے۔

وہ میرا بہنوئی بھی اس بم بلاسٹ کا شکار ہو گیا تھا دراصل، جو جمعہ کو جامع مسجد کی پارکنگ میں ہوا۔ میں سلیم بھائی کو فون ملاتا رہا لیکن ان کا فون مسلسل بند تھا۔ سوچا تھا سوئم کے فوراً بعد آن کے سلیم بھاء کا کام کر جاؤنگا لیکن بس آپ کو تو معلوم ہی ہے ایسے مرن والے گھر سے نکلنا کہاں آسان ہے۔

چاند میاں اپنی دھن میں رکے بغیر شروع تھے لیکن جیسے ہی دروازے کی اوٹ سے دبی دبی سسکیوں کی آواز تیز ہوئی، چاند میاں کی وضاحتوں کو ایک دم بریک لگ گیا۔

"کیا ہوا باجی سب خیر ہے نا؟"

زرا سا دروازہ مزید کھلا تو فریدہ کی نظروں کا پیچھا کرتے ہوئے چاند میاں کی آنکھیں پتھرا گئی۔

محمد سلیم فاروق تاریخ پیدائش ۸-۱۹۷۸-۱۲-۲۲ تاریخ وفات ۲۰۱۷-۸-۱۴

ماربل کا بنا کتبہ عین اسی نیم پلیٹ کے نیچے تھا جو چاند میاں لگانے آئے تھے، سلیم کی بچپن کی خواہش اس طرح پوری ہونی تھی یہ کسی نے خواب وخیال میں بھی نہیں تھا۔

جی ہاں، سلیم کے دونوں گھروں کی شناخت اسی کے نام کے ساتھ ماربل کی تختی سے ہو رہی تھی۔

......☆☆......

عاشق نمبر ۳۰۹

میمونہ صدف

مجھے آپ سے شدید محبت ہے اور میں آپ کے لفظوں سے شدید متاثر ہوں۔ میسنجر انسٹال کرتے ہی پہلا میسج موصول ہوا۔

قصہ یہ تھا کہ ہماری پہلی کتاب کی رونمائی کے بعد ایک عزیز نے مشورہ دیا کہ ایک ایسا فیس بک اکاونٹ بنا لیجیے جس میں آپ زیادہ تر لوگوں کو ایڈ کر سکیں یہ کتاب کی تشہیر کے لیے ازحد ضروری ہے۔ ہم نے سوچا خیال برا نہیں فیس بک اکاونٹ بنانا چاہیے۔ اس سوچ کو عملی جامہ پہنانے کی دیر تھی کہ پے درپے درخواست برائے دوستی کا انبار لگ گیا جن میں سے اکثر کو ہم نے ایڈ کر لیا۔ پھر باری آئی میسنجر کی۔ میسنجر انسٹال کرتے ہی پہلے فیس بکی عاشق کی آمد ہوئی۔

ایک میسج دیکھنے کے بعد ابھی ہم شش وپنج سے نہ نکلے تھے کہ ایک کے بعد ایک میسج آتا چلا گیا اور ہر میسج میں محبت کا اظہار بدرجہ اتم موجود تھا۔

اگر آپ نے میسج کا جواب نہ دیا تو وہ خودکشی کر لیں گے۔ کم وبیش پچیس میسج کے بعد موصوف نے فرمایا۔ ہم نے دل میں سوچا جواب کا موقع کب دیا؟ خیر

کر لیجیے جواباً ہم نے انھیں اپنے مفید مشورہ سے نوازا کہ اگر خودکشی کا ارادہ رکھتے ہیں تو کر لیں ہمیں کیا فرق پڑتا ہے؟

خیر آدھے گھنٹے تک ان کا کوئی جواب نہ آیا تو ہمیں یقین ہو گیا کہ یا تو انٹرنیٹ پیکج ختم ہو گیا یا پھر محبت کا بخار اتر گیا۔ لیکن ہمارے دونوں خیال درست نہ تھے۔

آپ جس روپ میں بھی آجائیں بہترین ہیں۔ ہم نے میسج دیکھا۔ روپ جو پہلا ذہن میں آیا وہ کاکروچ کا تھا۔ کیا ہی سماں ہو جب ہم کاکروچ کی مانند اڑتے پھریں اور موصوف ہمیں قتل کرنے کے درپے ہو جائیں۔ اس کے ساتھ ہی یہ خیال آیا کہ اگر کسی خاتون خانہ کی نظر کاکروچ پر پڑھ گئی، یا تو وہ اپنی چیخوں سے ہمیں بے ہوش کر دیں گی یا جھاڑو سے۔ بس یہ سوچنا تھا کہ جھاڑو کی پٹاخ پٹاخ کی آواز نے ہمارے رگ وپے میں جھرجھری پیدا کر دی۔

نہیں نہیں ہمیں جھاڑو سے قتل نہیں ہونا۔ یہ سوچ کر ہم نے لاحول پڑھ کر اس خیال کو جھٹک دیا۔

دوسرا روپ جو ذہن میں آیا وہ کسی چڑیل کا تھا۔ چڑیل بنئے، سامنے والے کا خون پیجیے اور جوان رہیے۔ لیکن خون کے ذائقے کا تصور اٹھتے ہیں چڑیل والا خیال بھی سرے سے جھٹک دیا۔ اور خون بھی کوئی ہضم کر سکتا ہے بھلا!

عاشق در عاشق، وائے رے پھوٹی قسمت! اس بار تو بات بہت آگے تک پہنچ چکی تھی موصوف بس یونہی ٹپکے اور ساتھ ہی شادی کا اظہار کر دیا۔ ہم نے اخلاقیات کا دامن ہاتھ میں تھامے ہوئے ان کی نجی زندگی کے بارے کچھ معلومات لے لیں۔ موصوف ابھی ۲۱ برس کی عمر کو پہنچے تھے اور یونیورسٹی میں زیر تعلیم ہیں۔ ہمیں کون پوچھے! ہم نے بھی تو نوجوان نسل کو سدھارنے کا بیڑہ اٹھا رکھا ہے، لڑکے کو سمجھایا کہ ابھی انہوں نے بمشکل جوانی کی سرحد میں قدم ہی رکھا ہے، کسی ہم عمر لڑکی کا انتخاب فرمائے۔ اس پر کیا موقوف ایک صاحب کی پوسٹ غلطی سے لائک کر دی۔

لیجیئے جناب! اب جب بھی انٹرنیٹ آن کریں کبھی وائس کال تو کبھی وڈیو کال۔ شکر ہے فیس بک نے بلاک کا آپشن رکھا ہے حالانکہ ایک آپشن یہ بھی ہونا چاہیے کہ آپ کسی کے گال کو گل وگلزار بھی کر سکیں۔

خیر! ابھی ہم نے چند ایک پوسٹ کی تھیں۔ پھر روزانہ کی بنیاد پر فرینڈ ریکوسٹ آنے لگی۔

اب میسنجر پر بھی روزانہ کئی لوگوں کے سلام آنے لگے۔ اگر کارِ قضا سلام کا جواب دے دیجیے تو اگلا سوال آپ شادی شدہ ہیں؟ آپ کی عمر کیا ہے؟ بس نہیں پوچھا گیا تو یہ نہیں پوچھا گیا کہ آپ سانس لیتی ہیں یا نہیں؟

ایک سوال جو سب سے زیادہ پوچھا گیا وہ تھا آپ لڑکی ہیں؟ ہم نے اس سوال کے جواب میں پہلے خود کو قدِ آدم آئینہ میں دیکھا اس نے تصدیق کی کہ ہم لڑکی ہی ہیں۔ کوئی پوچھے اگر کسی لڑکے نے لڑکی بن کر اکاؤنٹ بنایا ہوگا تو کیا وہ آپ کو خود تھوڑا ہی بتائے گا کہ وہ لڑکا ہے؟۔

ایک محترمہ نے تو انتہا ہی کر دی فرماتی ہیں ثبوت دیجیے کہ آپ لڑکی ہیں؟ میں نے جواباً کہا محترمہ یہی ثبوت میں آپ سے چاہتی ہوں۔ میری بات کے بعد ایک طویل خاموشی چھا گئی۔ کم وبیش کوئی ایک گھنٹے بعد محترمہ یا محترم کا میسج آیا۔ مجھے یقین ہے کہ آپ لڑکا ہیں۔ ہم نے لاحول پڑھ کر انھیں بھی بلاک کیا۔

معاملہ یہاں تک محدود نہیں۔ ایک صاحب دن رات ہمیں اداس اور عشقیہ شاعری بھیجتے تھے جو جائے کا کہ انھیں کبھی صبح بخیر کا جواب تک نہ دیا۔ ایک صاحب نے یکے بعد دیگرے نہ جانے کتنے ہی اشعار بھیجے، ہم نے دیکھا اور بنا پڑھے چھوڑ دیا۔ جب عاشقی میں ان کی دال نہ گلی تو فرمانے لگے آپ مجھے اپنی بہن لگتی ہیں۔ آپ جیسی خاتون تو کسی کی بہن ہی ہو سکتی ہیں۔ یعنی کوئی تعلق تو جوڑ، کچھ تو بول۔

حضرت فرمانے لگے۔ آپ انتہائی مغرور انسان ہیں۔ پہلے تو ہم نے مغرور کو مغرور پڑھا، پھر اپنی تصیح کی کہ ابھی تک واحد یہ کام ہم نے نہیں کیا اور نہ ہی اس کا ارادہ رکھتے ہیں۔ خیر انواع واقسام کی وڈیوز اور نہ جانے کیا کیا ہمیں بھیجا جانے لگا۔

یہاں تک کہ میسنجر ان انسٹال کیا اور سکون کا سانس لیا۔

چند دنوں کے اس تجربہ سے ہمیں اندازہ ہوا کہ فیس بک پر آپ کو محبت وافر مقدار میں ملے گی۔ یہاں تک کہ بوڑھے حضرات کو بھی بوقت ضرورت عشق ہو سکتا ہے۔ اس لیے مناسب ہے کہ کسی کو اگر آپ نہیں جانتے تو اسے فیس بک پر ایڈ نہ کریں یا کم از کم ایڈ کرنے سے پہلے اس کی پروفائل کو دیکھ لیں۔

......☆☆......

آپاں

فرحین ناز طارق

دلہن نے جیسے ہی پالکی سے قدم باہر نکالا قدرے میلے ہاتھوں اور کپڑوں والی نو دس سالہ لڑکی ٹھک سے آن اس کے سینے سے لگی- یہ اس کی بھابی سے پہلی مڈبھیڑ تھی۔ اس نے ناگواری سے کملی کو خود سے دور کیا۔

'اے کملی بھابی کو تنگ نہ کر-'

اماں نے فوراً پکڑ کر پیچھے دھکیلا- بھابی بیگم کی ناگواری وہ جہاندیدہ عورت دیکھ چکی تھی- وہ منہ بسورتے پیچھے ہٹ گئی، مگر دیدے پھاڑے بھابی کو دیکھتی رہی- گھر کی اکلوتی لڑکی چھ بھائیوں کی اکلوتی بہن تھی- اسے ہمیشہ اپنے اکیلے پن کا شکوہ رہتا- بھابی کی صورت میں اپنی کوئی ہم جولی ملی تھی- وہ پہروں بیٹھی سجی سنوری بھابی کو دور دور سے تکا کرتی- اس کا جی چاہتا اس کے پاس جائے اس کا گھونگھٹ جو وہ اجنبی عورتوں کو دیکھ کر ذرا سا گرا لیتی تھی کو اٹھا کر اس کے گہنوں کو چھو کر دیکھے- وہ بھاگ بھاگ کر وہ کام کرتی جن میں زیادہ سے زیادہ بھابی کے آس پاس جانے اور اسے دیکھنے کا موقع ملتا- مگر بھابی نے کبھی اجنبیت کی دیوار گرا کر اسے اپنے پاس نہ بلایا- ساس سے فطری حیا اور عمروں کے تفاوت کی وجہ سے فاصلہ قائم رہا- یوں وہ ایک ہی گھر میں رہنے والے ایک ہی خاندان کے لوگ ایک دوسرے کے لیے اجنبی رہ گئے-

وقت کے ساتھ ساتھ کملی بڑی ہوتی گئی- کملی سے راشدہ بن گئی- قد کاٹھ بڑھا تو اماں کو اس کی شادی کی فکر لاحق ہونے لگی- اس کا رشتہ بچپن سے بھابی کے چھوٹے بھائی اپنے پھوپھی زاد قیوم سے طے تھا- اب اس کی رخصتی کا وقت قریب آ چکا تھا- اماں نے اس کے جہیز کے ٹرنک کو کھول کر برسوں کی محنت سے جمع کیے رکھے جوڑے لتے و مخمل شنیل کے لحاف نکال کر سینے شروع کر دیے- راشدہ پہروں بیٹھی ان کپڑوں کی ملائمت چھو چھو کر محسوس کرنے کی کوشش کرتی- سلیمہ بھابی کبھی اس کے جہیز تو کبھی بری کے معاملات میں مشاورت کرتی پائی جاتی- اس نے اماں کے ساتھ شادی کے انتظامات میں خوب ہاتھ بٹایا تھا- یہ شادی ساس اور بہو کے درمیان لاتعلقی کی دیوار گرانے میں تو کافی کارآمد ثابت ہوئی تھی مگر راشدہ کے ساتھ سلیمہ کی سرد مہری جوں کی توں رہی- بچپن سے رشتہ طے ہونے اور دوسرے شہر رہنے کی بدولت اس کا پھوپھی کے گھر آنا جانا نہ ہونے کے برابر تھا- جبھی وہ ان کے گھرانے کے طور طریقے سے خاصی ناواقف تھی-

بارات آئی نکاح ہوا- وہ گھبراہٹ کے مارے کچھ کھا پی نہ سکی- ساتھ ہی رخصتی کا شور بلند ہوا- اس نے مارے وحشت کے بھابی کا ہاتھ پکڑ لیا- زندگی میں پہلی بار اس نے ہاتھ چھڑوانے کی بجائے راشدہ کو گلے لگا لیا- راشدہ بری طرح رونے لگی تو اس کا ماتھا چوم کر اسے چپ کروانے کی سعی کرنے لگی- میکے والوں کی طرف سے بھابی سلیمہ ہی اس کے ساتھ گئی تھی- جوں جوں سفر گزر رہا تھا- راشدہ کے خوف میں اضافہ ہو رہا تھا- شہر کی حدود میں داخل ہوتے ہی جب اسے گاڑی سے نکال کر پالکی میں بٹھایا گیا تو اپنے ساتھ بھابی کو بیٹھتے دیکھ کر اسے ڈھارس ملی- سسرال میں اس کی خوب آؤ بھگت ہوئی- اسے ہر ممکن آرام پہنچانے کی کوشش کی جا رہی تھی- اتنی اہمیت پا کر اسے لگتا وہ کسی خواب میں جی رہی ہے--

وہ مکلاوہ آئی اماں اسے کمزور سی لگی- اس نے اکیلے میں پوچھا مگر وہ سردی کو مورد الزام ٹھہرا گئیں- شام کو ابا سے ملاقات ہوئی تو ان کی بہت زیادہ توجہ و شفقت بھرا لہجہ اسے یقین دلا گیا کہ وہ پرائی ہو گئی ہے-

کچھ عرصہ اس خواب نگر میں کھوئے گزرا ہی تھا کہ گھر میں تلخیاں سر اٹھانے لگیں۔ ساس کو اس کی گود ہری ہوتی نظر نہ آتی تھی- وہ کم سن کھلنڈری عورت پٹر پٹر ان کو دیکھتی رہتی- ان کے خدشات سنتی جاتی جن میں سے اکثر باتیں اس کی سمجھ سے بالاتر تھیں- چند ہی برسوں میں ان کے خدشات و واہمے حقیقت کا روپ دھارتے دکھائی دیتے- وہ ان کی سب کڑوی کسیلی برداشت کرتی کاموں میں جتی رہتی مگر دن بدن اس کی ساس کی تیوری کے بل بڑھتے چلے گئے اور وہ دن آ گیا۔ جب انہوں نے اسے مار پیٹ کر گھر سے نکال باہر کیا- اس کا شوہر ہمیشہ کی طرح کٹھ پتلی کا کردار نبھاتا رہا۔ اس کی ساس بانجھ اور نجانے کتنی ہی ایسی گالیاں دیتی چلی گئیں اور یوں وہ محض انیس بیس سال کی عمر میں طلاق کا ٹیکہ ماتھے پہ سجائے میکے آ بیٹھی۔

وہ پہلے ہی زیادہ نہ بولتی تھی اب تو اور بھی گم صم ہو گئی- بھابی روز چیخ چلا کر خوب اسے ذلیل کرتی اپنے گھر سے نکلنے کو کہتی کہ اس کی زبان پکڑنے والا کوئی نہ تھا۔ اماں تو خود اس کی طلاق کے بعد چارپائی سے جا لگی تھی- وہ روز کی طرح اس مٹی کی ڈھیری کو ذلیل کر رہی تھی، اسی وقت بھائی نے گھر میں قدم رکھا- گھر سے آتی آوازوں سے پریشان ہوتے اندر داخل ہوا اور پھر وہیں ڈیوڑھی میں رک کر بھابی کی باتیں سننے لگا- جو ماں بیٹی دونوں کو صلواتیں سنائے جا رہی تھی- وہ کچھ دیر سنتا رہا پھر آگے بڑھا- بھابی کا ان کو دیکھتے ہی رنگ فق ہوا تھا- اس سے پہلے کہ وہ کچھ بولتا اس نے کمرے میں بھاگ جانا چاہا مگر بھیا نے بھابی کی کلائی پکڑ کر اسے روک لیا- بہت ضبط کے باوجود آنسو بھیا کی آنکھوں سے لڑھکتے چلے گئے-

'تم سے میری ماں بہنیں برداشت نہیں ہوتیں- اس کا کوئی حل تو نکالنا پڑے گا سلیمہ- تمہاری ماں نے میری چھوٹی سی بہن کو بنا قصور طلاق دلوادی- اب اس لیے اس کا تو اس گھر کے سوا کوئی ٹھکانہ نہیں رہا- وہ تو کہیں نہیں جا سکتی مگر تم جا سکتی ہو-"

وہ کچھ دیر رک کر اسے دیکھتا رہا-

"میں نے تمہیں طلاق دی-"

"اشرف یہ کیا کہہ رہے ہیں-"

بھابی چیخی اماں اس کی طرف دوڑیں کہ اسے روک سکیں- اس نے بنا کسی کی طرف دیکھے تین بار یہ الفاظ دہرائے اور اس کا بازو چھوڑ کر گھر سے باہر نکل گیا- وہ لچکیلی شاخ کی طرح زمین پہ گری اماں صحن کے بیچوں بیچ گرنے کے انداز میں بیٹھ گئیں- اسے بہت دکھ پہنچا- بھابی کے برے رویے کے باوجود اس نے کبھی ان کا برا نہ چاہا تھا- اک قیامت اس وقت اس پر ٹوٹی تھی جب اسے طلاق ہوئی تھی- اک قیامت ابھی اس کے سر سے گزری تھی- وہ پانی کا گلاس پکڑے بھابی کی طرف بھاگی مگر وہ اس کا ہاتھ جھٹک کر اسے دھکا دیتی اٹھ کر اپنے کمرے میں گئی اور چادر اور پرس اٹھا کر گھر سے نکل گئی- وہ دونوں صرف اسے جاتا دیکھتی رہ گئیں-

چند دن بعد پھوپھو ان کے گھر آئیں بھابی امید سے تھی- پھوپھو بھائی کو اپنے فیصلے میں گنجائش نکالنے کے لیے منانے کی کوشش کرتی رہیں- بالآخر ان کے فیصلے میں لچک نہ پاتے ہوئے اپنے اندر کا سارا زہر اماں پہ انڈیل دیا- جس کی بدولت ان کی بیٹی کو اپنی منصوبہ بندی سے طلاق یافتہ بنا کر ان کی دہلیز پہ پٹخ گئی تھیں-

یہ ان دنوں کی بات تھی۔ جب دادا دادی ابا کے لیے لڑکی ڈھونڈ رہے تھے- ان کی شرط تھی کہ وٹہ سٹہ کی شادی کی جائے- اماں کے پسند آتے ہی اماں ابا کی چٹ پٹ شادی کروا کر ان کے بھائی سے پھوپھو زبیدہ کا رشتہ بھی طے کر دیا گیا- مگر کچھ ہی عرصے بعد ماموں غیر قانونی طور پر کینیڈا چلے گئے اور وہاں قانونی مجبوریوں میں ایسے پھنسے کہ پھوپھو سے شادی کرنے واپس نہ آ سکے- ان کی عمر ڈھلنے لگی تو ان کی کہیں دوسری جگہ شادی کر دی گئی- پھوپھو نے اسے اپنی توہین محض گردانا اور شادی ہو جانے کے بعد بھی اپنا بیر نبھاتی رہی- وہ چاہتی تھی کہ ماں کو طلاق دلوا دے مگر وہ کبھی کامیاب نہ ہوئی کہ اماں کسی کے آگے سر نہ اٹھاتی تھی- چپ چاپ سب کچھ برداشت کرتی رہتی اور یوں زبیدہ کی جلن کڑھن گھٹنے کی بجائے بڑھتی گئی وہ ہر ممکن طریقے سے بھاوج کو اذیت پہنچانے کی کامیاب کوشش کرتی مگر وہ نظر انداز کر جاتیں تو اسے مزید چڑ ہونے لگتی- راشدہ کی پیدائش پہ اسے اپنے ماں باپ کی گود میں کھیلتے دیکھ کر اس کی جلن اپنے آپ راشدہ کی طرف منتقل

ہوگئی اور اس نے سالہا سال اس کے بڑا ہونے اور اپنا بدلہ لینے کا انتظار کیا۔ اور جب اسے یقین تھا کہ اس کی بیٹی ماں بننے کے بعد اپنے گھر میں مضبوطی سے پیر جما چکی ہے اور وہ ان کی بیٹی کو طلاق دلوا کر، ان کا بیٹا ان سے چھین کر اپنے مقصد میں کامیاب ہوجائے گی، عین اسی وقت اس کا وار خود اس پہ ہی الٹ گیا۔

سلیمہ کا بیٹا پیدا ہوا طلاق موثر ہوئی عدت و بچے کا خرچ دیتے کئی بار یونین کونسل میں بھیا کا ان سے سامنا ہوا مگر انہوں نے اپنی ہی اولاد تک کے لیے اپنے دل کے دروازے بند کرلیے۔ پھوپھو نے جو زہر کا بیج بھاوج کے لیے بویا تھا، اس کی فصل خود اسے بھی کاٹنی پڑی۔

راشدہ نے بانجھ کی گالی ایسی دل سے لگائی کہ اسی دہلیز کی ہو کر رہ گئی۔ بھیا کی دوبارہ شادی ہوئی بچے ہوئے۔ وہ نئی بھاوج کے ساتھ مل کر انہیں پالنے لگی۔ ایسا نہیں تھا کہ نئی بھاوج اس کے ساتھ بہنوں جیسی تھی مگر وہ ایک بار پھر بھیا کا گھر خراب کرنا نہ چاہتی تھی۔ سومنہ کان لپیٹے بچوں کی قلقاریوں میں خود کو بہلائے رکھتی۔ وہ بچوں کے لیے آپاں بن چکی تھی۔ رفتہ رفتہ وہ سب بڑے ہوتے گئے۔

اماں ابا کے بعد بھائی بھاوج بھی سب بچوں کا بوجھ اس کے کندھوں پہ ڈالے راہی ملک عدم ہوگئے۔ مگر اس نے اپنی جو چھوٹی سی دنیا ان بچوں کے وجود میں بنا رکھی تھی، اسے سمیٹے رہی۔ حتیٰ کہ تینوں بیٹیاں اپنے گھروں کو رخصت ہو چکیں اور گھر گرہستی بہوؤں نے آ کر سنبھال لی۔ وہ ہمہ وقت ان بچوں پہ جان نچھاور کرنے کو تیار رہتیں۔ مگر دن گھر سے باہر زبردستی کے ڈھونڈے گئے کاموں میں گزار دیتیں کہ اپنے وجود سے، بہوؤں کی بیزاری یا تکلیف کا سبب بننا نہیں چاہتیں۔

......☆☆......

انسانیت

نائمہ غزل

موسم کی رعنائی اپنے عروج پر تھی، بارش کے بعد نکھرا ستھرا آسمان جیسے دعوت نظارا دے رہا تھا، یہ موسم میرے اندر جیسے عجیب ہی ترنگ بھر دیا کرتا تھا، پتہ نہیں موسم اپنے اندر اتنے راز کہاں سے سمولاتا ہے، ہر موسم کی اپنی ایک الگ ہی کہانی ہے، میں ان قدرتی نظاروں میں مکمل طور پر گم تھی، اچانک سامنے ٹیرس پر نظر پڑی، وہ ہمیشہ کی طرح کسی کتاب کے مطالعے میں گم نظر آیا، میں نے کبھی اسے کچھ اور کرتے ہوئے نہیں دیکھا تھا، ہمیشہ اس کے ہاتھوں میں کوئی کتاب ہوتی اور وہ اردگرد کے ماحول سے بے پروا اسی میں مگن رہتا، ابھی بھی وہ پوری طرح کتاب میں گم تھا بس آج اس کے ہاتھ میں کسی ناول کے بجائے شاعری کی کتاب تھی، میرے ہونٹوں پہ مسکان بکھر گئی، میں اسے کوئی آدم بیزار قسم کی شخصیت سمجھ رہی تھی

"ہمم... تو محترم لطیف جذبات بھی رکھتے ہیں" میں خود سے مخاطب ہوئی

ہم لوگ نئے نئے اس علاقے میں شفٹ ہوئے تھے، ابھی تک کسی سے خاص جان پہچان نہیں ہوئی تھی، میں اپنی پڑھائی سے فارغ تھی سو یہ تمام دن میرے لیے انتہائی بوریت لیے ہوئے تھے، گھر کے سارے کام نمٹا کر میں اوپر اپنے کمرے سے ملحقہ ٹیرس کی طرف بھاگتی اور لوگوں کی بھاگتی دوڑتی زندگی کا معائنہ کرتی رہتی، سامنے کے گھر کے ٹیرس پہ موجود ہستی کو دو دن کے بعد ہی دریافت کرلیا تھا، مجھے اس کے طرز زندگی پہ بہت حیرت ہوئی، اس پر جیسے کسی بوڑھی روح کا سایہ تھا، وہ بمشکل چوبیس پچیس کا نظر آتا تھا، جب پہلی بار نظر پڑی تو وہ کرسی سے ٹیک لگائے خاصے ریلیکس سے انداز میں بیٹھا ہوا تھا کتاب کو اوندھا کر کے منہ پہ رکھا ہوا تھا شاید مطالعہ کرتے کرتے تھک گیا تھا، یا پھر کتاب میں لکھی کسی بات نے کچھ لمحے کے لیے اسے کچھ سوچنے پر مجبور کردیا تھا، تھوڑی دیر بعد اس نے کتاب چہرے سے ہٹائی تو میں اسے دیکھ کر دنگ رہ گئی، مردوں میں اتنا حسن و جمال شاذ و نادر ہی نظر آتا تھا، بھوری آنکھوں میں جیسے حزن و ملال کا سا عنصر غالب آرہا تھا یا اتنی دور سے دیکھنے پہ مجھے

کچھ غلط فہمی ہو رہی ہو کیوں کہ ضروری نہیں کہ جو دکھتا ہو وہی سچ ہو، سرخ و سفید رنگت میں جیسے گلابیاں گھلی ہوں، ماتھے پہ پڑے اکا دکا بال روشن پیشانی کو مزید حسن عطا کر رہے تھے، مجھے کبھی بھی اتنی گوری رنگت کے مرد پسند نہیں رہے، میری تو اپنی ایک کزن جیسے مردوں کی گوری رنگت ہی اٹریکٹ کرتی تھی، اس سے اکثر بحث ہوجایا کرتی تھی، کیونکہ میرا ماننا تھا جو کشش مردوں کی سانولی رنگت میں ہے وہ گوری رنگت میں کہاں... مگر اس لمحے اسے دیکھ کر میں اپنی سوچ بدلنے پر مجبور ہوگئی تھی... وہ بیٹھا ہوا تھا مگر اسکی نشست سے پتہ چل رہا تھا کہ وہ ایک دراز قد شخص ہے... ساری حسن و خوبصورتی ایک جگہ یکجا ہوگئی تھی..

اچانک وہ کچھ چونک کر سیدھا ہوا اور ادھر ادھر کچھ کھوجنے کے انداز میں نظریں گھمائیں اسے شاید میری نظروں کی تپش کا اندازہ ہوگیا تھا، مجھ پر نظر پڑی تو اس کی آنکھوں میں ناگواری کا سرد سا تاثر پھیل گیا، میں حیران رہ گئی، ایک انجان شخص کا ایسا رویہ میری سمجھ سے بالاتر تھا

ابھی بھی میں مسلسل ٹکٹکی باندھے اسی کی طرف دیکھ رہی تھی مجھے پتہ تھا ابھی کچھ ہی دیر میں وہ اپنی سرد سی نگاہیں مجھ پر ڈالے گا اور ہوا بھی یہی اس نے نگاہیں اوپر اٹھائیں، پہلے پہل وہ اردگرد نگاہ دوڑانے کے بعد میری طرف دیکھتا تھا مگر اب اسے پتہ تھا اسے دیکھنے والی شخصیت کہاں موجود ہے، اس نے مجھے دیکھا اور تقریباً کھا جانے والے انداز میں گھورا، مگر میرے دیکھنے کے انداز میں ذرہ برابر بھی فرق نہیں آیا بلکہ میں نے ایک صلح جویانہ مسکراہٹ اس کی طرف اچھال دی اس نے ہاتھ میں پکڑی ہوئی کتاب پٹخنے کے انداز میں پاس پڑی ہوئی میز پر رکھی اور جگ سے گلاس میں پانی نکال کر لبوں سے لگالیا، وہ شاید اپنے غصے کو کمپوز کرنے کی کوشش کر رہا تھا، اس کا رویہ میرے لیے بہت عجیب تھا، کچھ لوگ عجیب ہوتے ہیں بلاوجہ ہی عناد پال لیتے ہیں، پتہ نہیں کیوں وہ میرے لیے ایک راز کی صورت اختیار کر رہا تھا، میں نے اس کے گھر میں کبھی کسی کو آتے جاتے نہیں دیکھا تھا، نہ کسی محلے دار کو اور نہ ہی کسی اور جاننے والے کو، وہ اتنا آدم بیزار کیوں تھا... میں اسے دیکھتے ہوئے بھی مسلسل اسی کے بارے میں سوچ رہی تھی... مغرب کی اذان کا وقت ہو رہا تھا میں چونک کر خیالات کی دنیا سے باہر آئی، رات کے کھانے کی تیاری بھی کرنی تھی۔

......☆☆......

"ثانیہ! عمیر کب تک آئے گا۔" ابو نے کھانے کا نوالہ منہ کی طرف لے کر جاتے ہوئے پوچھا۔

"ہم..." میں اپنے خیالات میں گم بس ہنکارا بھر کر رہ گئی۔

"ثانیہ......!!" ابو نے اس بار تھوڑا اونچی آواز میں پکارا میں کچھ چونک سی گئی نوالہ میرے ہاتھ سے گرتے گرتے بچا۔

"ج... جی ابو..." میں نے جلدی سے کہا۔

"کیا ہوا طبیعت تو ٹھیک ہے نا تمہاری..." انہوں نے پریشان کن لہجے میں کہا۔

"جی ٹھیک ہے۔" میں نے پھیکی سی مسکان لبوں پہ سجاتے ہوئے کہا۔

"لگتا ہے بور ہوگئی ہو، کہیں آتی جاتی بھی تو نہیں ہو، غنی صاحب کے گھر ہی چلی جایا کرو، ان کی بیٹیاں تمہاری عمر کی ہی ہیں، جاؤ گی تو اچھا محسوس کروگی، اب میں اور تمہارے بھائی تو پورا دن گھر میں ہوتے بھی نہیں۔" ابو نے مسکراتے ہوئے کہا، غنی صاحب ابو کے پرانے جاننے والوں میں سے تھے، یہ مکان جس میں ہم رہ رہے تھے ابو نے انہی کے توسط سے خریدا تھا، ان کی دو بیٹیاں تھیں ماریہ اور ضحیٰ میری ان سے بس نام کی حد تک ہی جان پہچان تھی، میں نے ابو کی بات پہ ہاں کے انداز میں سر ہلایا اور دھیمے سے مسکرا دی، اگلا نوالہ لیتے ہوئے میں اس بات پہ غور کر رہی تھی کہ وہ لڑکا جو چھت سے نظر آتا ہے ماریہ اور ضحیٰ سے اس کے بارے میں معلومات حاصل ہوسکتی ہیں، میں اپنے خیالات میں اس قدر مگن تھی کہ مجھے پتہ ہی نہیں چلا ابو کب اٹھ کر عشاء کی نماز کے لیے گئے، اور یقیناً وہ دروازہ بند کرنے کی تاکید کر گئے ہونگے جو کہ اپنے خیالات میں گم میں بالکل بھی نہیں سن سکی تھی، چونکی تو اس وقت جب عمیر بھائی کی آواز اپنے نزدیک سنی۔

"کیا ہوا کیا بھوت دیکھ لیا۔" انہوں نے میرے چونکنے پر ہنستے ہوئے کہا۔

"آپ کب آئے مجھے پتہ ہی نہیں چلا" میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"تب ہی جب تم نیا پاکستان بنانے کی تیاری میں تھیں۔" انہوں نے میرے سوچنے کے انداز پر چوٹ کرتے ہوئے کہا۔ میں سر جھٹک کر مسکرا دی۔

"ابو کہاں ہیں...؟؟؟" ان کے پوچھنے پہ میں نے گھڑی کی طرف دیکھا اور حیران رہ گئی میں نجانے کب سے اس پوزیشن میں بیٹھی ہوئی تھی۔

"نماز پڑھنے گئے ہیں بس آتے ہی ہونگے، آپ کے لیے کھانا گرم کروں...؟؟؟" میں نے جلدی جلدی برتن سمیٹتے ہوئے بتانے کے ساتھ ساتھ پوچھا۔

"نہیں بس ایک کپ چائے پلا دو، وہ صوفے کے پیچھے سر ٹکا کر بیٹھ گئے۔

"او کے بس پانچ منٹ میں لائی.." میں کہنے کے ساتھ تمام برتن سمیٹ کر کچن میں چلی گئی۔

......☆☆......

"السلام علیکم۔" آواز پر میں نے سر اٹھا کر دیکھا تو دو لڑکیاں کھڑی تھیں، میں اچنبھے سے انہیں دیکھ کر رہ گئی۔

"بیٹا یہ غنی صاحب کی بیٹیاں ہیں" ابو نے دونوں کا تعارف کرواتے ہوئے کہا۔ دروازہ شاید ابو نے ہی کھولا تھا۔

"اوہ آؤ بیٹھو.. پتہ ہے آج میں تمہاری طرف ہی آنے کا سوچ رہی تھی..." میں نے مسکراتے ہوئے دونوں کو بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

"چلو کوئی بات نہیں تم آؤ یا ہم ایک ہی بات ہے" ماریہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"اور سناؤ تم کیا کرتی ہو بور ہونے کے علاوہ" ضحیٰ کے پوچھنے پہ میں مسکرا کر اپنے روزمرہ کے معمولات کے بارے میں انہیں بتانے لگی، دونوں بہنیں کافی ہنس مکھ سی تھیں گو کہ ہم پہلی بار ملے تھے مگر ان کے رویے سے ذرا سا بھی اس بات کا اظہار نہیں ہو رہا تھا، جب ہی مجھے ذرا ہمت ہوئی اور میں نے ان سے وہ سوال پوچھ ہی لیا جو بہت دیر سے میرے دماغ میں گردش کر رہا تھا۔

"کیا تم لوگ اسے جانتی ہو جو ہمارے سامنے والے گھر میں رہتا ہے، مجھے حیرت ہوتی ہے وہ کبھی گھر سے باہر تک بھی نہیں جاتا، اتنا آدم بیزار شخص وہ بھی اس عمر میں، میں نے اپنی پوری زندگی میں نہیں دیکھا" میرے سوال پہ وہ دونوں کچھ دیر تک حیرت سے مجھے دیکھتی رہیں، پھر اچانک سے جیسے ہنسی کا فوارہ پھوٹ پڑا، یہ ضحیٰ تھی، اسے جیسے ہنسنے کے علاوہ اور کوئی کام نہیں تھا، جب کہ ماریہ بھی اپنی ہنسی روکنے کے چکر میں سرخ ہو رہی تھی۔

"کیا ہوا میں نے کچھ غلط کہہ دیا کیا" ان کے غیر متوقع رویے پہ میں اپنی جگہ چور سی بن گئی۔

"نہیں یہ بات نہیں ہے...بس وہ...، ہی ہی ہی..." ضحیٰ نے اپنی ہنسی روکتے ہوئے کچھ کہنا چاہا مگر اس پہ پھر سے ہنسی کا دورہ پڑ گیا

"میں نے ماریہ کی طرف پر امید نظروں سے دیکھا تو اس نے ہاتھوں کو ہلا کر نفی کا اشارہ کیا... "اس طرح کہ جیسے وہ بھی کچھ بتا نہیں سکے گی، میں بہت حیران ہوئی آخر ایسی کیا بات تھی جو ان لوگوں کا ایسا عجیب سا رویہ سامنے آ رہا تھا، مجھے جیسے ہتک کا سا احساس ہوا یہ کیسی انسانیت تھی، اگر کوئی بات تھی بھی تو اس طرح کسی پہ ہنسنا...، میں نے کچھ کہا تو نہیں لیکن پتہ نہیں کیوں ان کے لیے دل میں عجیب سی گرہ پڑ گئی، وہ شخص الگ ایک عجیب معمہ بنتا جا رہا تھا۔

......☆☆......

اتوار کا دن تھا، نماز پڑھ کے دوبارہ سونے کے لیے لیٹی تو نیند مہربان نہیں ہوئی، میں بستر پہ کروٹیں بدلنے کا ارادہ چھوڑ کر ٹیرس پہ آ کر کھڑی ہو گئی، ابو اور بھائی بھی آج ناشتہ دیر سے کرنے والے تھے، سامنے ٹیرس پہ وہ موجود نہیں تھا، شاید سو رہا تھا، میں خاصی بدمزا ہوئی، اور ٹیرس پر لگی گرل سے لگ کر آتے جاتے ہوئے لوگوں کو دیکھنے کے لیے نیچے جھانکنے لگی، مگر لگتا تھا

سارا عالم ہی سویا پڑا تھا، سارا علاقہ سنسان پڑا ہوا تھا، ابھی مکمل طور پر اجالا نہیں ہوا تھا، سورج کی کرنیں دور افق پہ نظر آ کر اپنی آمد کی خبر دے رہی تھیں، ابھی تھوڑی دیر میں ہی سورج کی کرنیں زمین پر بکھر کر ہر سو اپنا سونا بکھیرنے والی تھیں، دور سے آتے جاگنگ ٹریک میں ملبوس شخص کو دیکھ کر میں چونک گئی، وہ وہی تھا...، مجھے کافی حیرت ہوئی...

"اچھا تو جناب جاگنگ بھی کرتے ہیں" میں اپنے آپ میں بڑبڑائی اور کافی پر جوش سی ہوئی.... جلدی سے سیڑھیاں اتر کر بھاگتے ہوئے میں دروازے پہ آ کر کھڑی ہو گئی جیسے ہی وہ گھر کے نزدیک پہنچا میں نے اسے ہاتھ ہلا کر اپنی طرف متوجہ کیا، میری اس حرکت پہ وہ کچھ ٹھٹک سا گیا اور ارد گرد چور نظروں سے دیکھنے لگا، چہرے پر ناگواری کے تاثر صاف پڑھے جا رہے تھے، ارد گرد نگاہیں دوڑانے کے بعد وہ جلدی سے اپنے گھر کے اندر گم ہو گیا....، میں جہاں کی تہاں کھڑی رہ گئی۔

......☆☆......

"ہائے...!!!" دوسرے دن میں اس سے پہلے ہی جاگنگ ٹریک پر موجود تھی، مجھے نہیں پتہ تھا وہ آج بھی آئے گا یا نہیں مگر ایک امکان تو تھا، تھوڑی ہی دیر میں میں نے اسے بھی اسی ٹریک پہ آتے دیکھا تو اسے پکارا، میری آواز پر اس نے چونک کر سر اوپر اٹھایا اور اس کی آنکھوں میں پھر ایک ناگواری بھرا سرد سا تاثر پھیل گیا مگر زبان سے کچھ نہ کہا، میں پہلی بار اسے اتنی قریب سے دیکھ رہی تھی، مجھے حیرت ہو رہی تھی، وہ دور سے جتنا شاندار نظر آتا تھا قریب سے دیکھنے پہ اس سے بھی زیادہ ہینڈسم لگ رہا تھا، گو کہ اس کا رسپانس کچھ اچھا نہیں تھا پھر بھی میں نے ہمت نہیں ہاری تھی

"تو تم یہاں روز جاگنگ کرنے آتے ہو، مجھے حیرت ہے اس کے علاوہ میں نے کبھی تمہیں باہر آتے جاتے نہیں دیکھا" میں نے اس کے برابر میں دوڑتے ہوئے دوستانہ انداز اپناتے ہوئے کہا، میری اس حرکت پہ اس نے مجھے کھا جانے والی نظروں سے گھورا

"کیا ہوا...!" میں نے مصنوعی حیرت چہرے پہ سجاتے ہوئے کہا، جیسے مجھے اس کے رویے کا کوئی اندازہ نا ہوا ہو۔

"تم....!" وہ دانت پیسنے کے انداز میں مجھے دیکھنے لگا، میں یک ٹک اسے ہی دیکھ رہی تھی۔

"وور رہو مجھ سے...!!!" اس نے چیختے ہوئے کہا اور اپنے گھر کی طرف دوڑ لگا دی... میں مڑ کر اسے جاتا ہوا دیکھنے لگی.. اکا دکا لوگ آ جا رہے تھے مجھے ایسا لگا جیسے وہ معنی خیزی سے مجھے دیکھ رہے تھے، میں اسے اپنا وہم سمجھ کر سر جھٹک کر گھر کی جانب بڑھ گئی۔

......☆☆......

رات لمحہ لمحہ اپنے دامن میں سیاہیاں لیے ہوئے بیت رہی تھی، رات کتنی سفاک ہوتی ہے، تنہائیوں کا عذاب کاٹنے والوں کے لیے جیسے صدیوں کے برابر ہو جاتی ہے، گناہگاروں کے لیے راتیں کس آسانی سے اپنا دامن وا کر لیتی ہے مگر معصوم زندگیوں میں جو لوگوں کے لفظوں کی بازگشت لاتی ہے، ان کے لیے اس سے فرار بھی ممکن نہیں ہوتا، کمرے کی کھڑکی پہ پڑنے والی ہواؤں کی سورش پہ جیسے کسی دستک کا گمان ہوتا ہے. مگر جہاں لوگوں کو یقین ہو کہ مسافر بھی رستہ بھٹک کر اس دروازے کا رخ نہیں کریں گے، اس پر یہ دستک کیا عذاب لاتی ہے بھلا رات کو کیا خبر...!! پتہ نہیں کون تھی وہ لڑکی جو بلاوجہ اس کی ذات میں دلچسپی لینے کی کوشش کر رہی تھی... بے خبر تھی شاید.. جب ہی شعلوں میں ہاتھ دینے کی کوشش کر رہی تھی، اس کا وجود جیسے صدیوں سے کسی آگ میں جل رہا تھا، وہ سوچ رہا تھا اسے تو اس کے اپنوں نے قبول نہیں کیا تھا، اصلیت جاننے کے بعد اس نے بھی منہ پھیر ہی لیا تھا، کون تھا جو اسے قبول کرتا، کوئی نہیں، کوئی ایک بھی تو نہیں، وہ جو تھا لوگ اس سے تعلق داری پہ شرم محسوس کرتے تھے، وہ خود بھی نہیں چاہتا تھا کہ لوگ اس سے ملیں جلیں وہ بس اتنا چاہتا تھا، لوگوں کی نظروں میں اس کے لیے جو استہزاء ہوتا ہے وہ نہ رہے، پہلے پہل وہ لوگوں کی آنکھوں میں اپنے لیے ترحم تلاش کرتا تھا مگر آہستہ آہستہ اسے پتہ چلا وہ لوگوں کے لیے اس قابل بھی نہیں کہ لوگ اس پر ترس کھائیں، دنیا عجیب ہے اس کے اپنے قانون ہیں، انسانوں کو ناپنے تولنے کے اس کے اپنے پیمانے ہیں، کون کیا ہے، اسے اس کی اوقات میں کیسے رکھنا ہے، اسے خوب آتا ہے، وہ لڑکی بھی ایسی

ہی ہوگی، کوئی کسی سے الگ نہیں ہوتا، بس اپنے نظریے کو اچھے سے مصلحت کے ریپر میں لپیٹنا انسان کو خوب آتا ہے...آنسو قطار در قطار آنکھوں سے بہے چلے آرہے تھے جسے وہ بیدردی سے اپنے ہاتھوں کی پشت سے صاف کررہا تھا...

رات اپنے آنگن میں
آسماں سجاتی ہے
تارے جگمگاتے ہیں
ان حسیں نظاروں میں
کوئی کتنا تنہا ہے
کون جان سکتا ہے
چاند جتنا روشن ہے
اتنا ہی اکیلا ہے....!!!!

......☆☆......

"ثانیہ....!!" دوسرے دن صبح ابو کی آواز پر میں چونک کر بستر سے اٹھی، گھڑی پہ نظر پڑی تو دیکھا وہ سات کا ہندسہ عبور کر گئی تھی

"اوفوہ....!!!! اتنی دیر ہوگئی" میں کچھ افسردہ سی ہوگئی، گو کہ میں نے رات کو ہی تہیہ کرلیا تھا کہ اب اس سے رابطے کی کوئی کوشش نہیں کرنی مگر پھر بھی نجانے کیوں آج باہر نا جاسکنے کی وجہ سے مجھے عجیب سا محسوس ہورہا تھا، سارا دن میرا بوجھل بوجھل سا گزرا، شام میں وہ مجھے ٹیرس پر بھی نظر نہیں آیا، مجھے اچھنبے کا احساس ہوا، ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا تھا، وہ تو ہمیشہ میرے آنے سے بھی پہلے موجود رہا کرتا تھا، نجانے آج کیوں نہیں آیا تھا، کہیں اس کی طبیعت تو خراب نہیں ہوگئی...!، میں اپنی سوچوں کے تانے بانے بن رہی تھی، اگلے دن میں پھر سے جاگنگ ٹریک پر موجود تھی، مگر کافی دیر ہوگئی وہ نہیں آیا

"شاید کہیں گیا ہوا ہو...!" میں نے خود کو مطمئن کیا، اور تھوڑی ہی دیر میں ماحول سے بیزار ہوکر گھر آگئی، شام کو میں ٹیرس پہ گئی تو وہ وہیں موجود تھا، میں خوش ہوتے ہوئے جلدی سے آگے بڑھی، لیکن مجھے دیکھتے ہی وہ ایک جھٹکے سے مڑکر اندر چلا گیا اور میں جو دل ہی دل میں اس کی طبیعت پوچھنے کے لیے الفاظ ترتیب دے رہی تھی اپنا سا منہ لیکر رہ گئی، اگلے دو تین دن تک وہ جاگنگ ٹریک پر نظر نہیں آیا، شاید وہ وہاں جانا بھی چھوڑ چکا تھا..، وہ میرے لیے ایسا معمہ بنتا جارہا تھا جسے حل کیے بغیر مجھے بالکل سکون نہیں مل رہا تھا..، انسان ایسا ہی تو ہوتا ہے اسے وہی چیزیں اٹریکٹ کرتی ہیں جو بظاہر ایک راز ہوں، پتہ نہیں انسان میں یہ خصلت کیسے اور کیونکر آئی..، مگر یہی سچ ہے، وہ رازوں کو کھولے بنا چین نہیں پاتا یہ جانے بنا کہ کچھ چیزوں کا راز رہنا ہی بہتر ہے.....

دوسرے دن جاگنگ ٹریک پر جانے سے پہلے میں اس کے دروازے پر موجود تھی، میرا پکا ارادہ تھا کہ آج میں اسے جاگنگ کرنے کے لئے منا لونگی اور وہ سوال جو آج کل میرے ذہن پہ بوجھ کی مانند طاری ہے اس کا جواب جان کر ہی رہوں گی چاہے مجھے اس کے لیے اس کے ساتھ زبردستی ہی کیوں نہ کرنا پڑے، کیا ہے تھوڑا سا ناراض ہی ہوگا نا، تو کیا فرق پڑتا ہے...، یہ معمہ تو حل ہوگا....، میں نے بیل پر انگلی رکھ دی، اندر تھوڑی ہلچل کا احساس ہوا پھر دروازہ کھل گیا، اس کی آنکھوں میں حیرت صاف پڑھی جارہی تھی، شاید اسے کسی کا اپنے گھر آنے کا اندازہ ہی نہیں تھا۔

"چلو میں تمہیں جاگنگ کے لئے بلانے آئی تھی، تم اتنے دنوں سے آ بھی نہیں رہے، طبیعت تو ٹھیک ہے نا تمہاری" میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا، میری بات سن کر اس کے چہرے پر غصے کے تاثرات نمایاں ہوگئے، اس نے اضطرابی کیفیت میں اپنے ہونٹوں کو بھینچ لیا۔

"چلو چلتے ہیں" میں نے اس کی کیفیت کو نظرانداز کرتے ہوئے ایسے کہا جیسے ہمارا کتنا پرانا دوستانہ ہو اور اس بات اور

میرے لہجے نے جیسے جلتی پر تیل کا کام کیا، اس نے ایک جھٹکے سے میرا ہاتھ تھاما اور کھینچتے ہوئے مجھے گھر کے اندر لے آیا، میں اس اچانک حملے کے لیے بالکل تیار نہیں تھی، اس کے ساتھ کھنچی چلی آئی اور اب اس وقت اس کے سامنے کھڑی میں خود کو کسی مصیبت میں گرفتار محسوس کررہی تھی، وہ اس گھر میں اکیلا رہتا تھا، اگر اس نے میرے ساتھ کچھ....، میں جھرجھری لے کر رہ گئی اس سے آگے سوچنے کی میری ہمت ہی نہیں ہوئی

"کیا..، کیا چاہتی ہو تم..." اس نے میرا ہاتھ جھٹکنے کے انداز میں چھوڑتے ہوئے کہا۔

"مم میں..، کک کچھ نہیں۔" میں نے سہمی ہوئی نگاہوں سے اردگرد کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

"پتہ نہیں کیا ملتا ہے لوگوں کے زخموں کو ادھیڑ کر..، میں نہیں کرنا چاہتا تم سے بات، کیا تمہیں سمجھ میں نہیں آتا.." وہ جیسے اپنے ہوش میں نہیں تھا۔

"چاہتی کیا ہو تم..!!، اور جانتی ہی کیا ہو میرے بارے میں، آنکھیں ہیں نا تمہارے پاس، تو کیا لوگوں کا استہزا اڑاتا ہوا انداز نظر نہیں آتا۔" اس نے مٹھیاں بھینچتے ہوئے کہا۔

"کان ہیں نا تمہارے پاس، کبھی لوگوں کو مجھ پہ فقرے کستے ہوئے نہیں سنا...، کیسے کیسے عجیب حوالے سے پکارتے ہیں، کوئی شرافت کی زندگی جینا بھی چاہے تو اس پہ عذاب لا دیتے ہیں.." وہ سسکنے لگا مگر اس کی بات ختم نہیں ہوئی تھی، مجھے اس کا ایسا رویہ سمجھ میں نہیں آرہا تھا اور ویسے بھی میں ابھی تک یہ سوچ کر پریشان ہورہی تھی کہ اگر کسی کو یہ پتہ چلا کہ میں یہاں اس کے گھر میں تھی تو لوگ میرے بارے میں کیا رائے قائم کرتے..

"مجھے نہیں ضرورت کسی کی دو چار روزہ ہمدردی کی اور ہمدردی بھی کب تک جب تک اصلیت کا پتا نہ ہو تب تک... ہاہ..!، لوگ کسی مجرم پہ بھی ترس کھا لیا کرتے ہیں، مگر میں..، میں تو شاید انسان کہلانے کے بھی لائق نہیں ہو۔" وہ اپنی بات کے اختتام پہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

"دد...، دیکھو یہ جگہ کک..کچھ مناسب نہیں ہے ہم لع..، بعد میں ملتے ہیں، کسی نے دیکھ لیا تو وہ کیا سوچے گا" میرا دماغ ماؤف ہورہا تھا

"ہاہاہاہاہاہا..." وہ دیوانوں کی طرح ہنسنے لگا، میں نا سمجھی کے انداز میں اسے دیکھنے لگی

"ہاہاہاہاہا..." اس کی ہنسی رکنے میں ہی نہیں آرہی تھی

"کوئی دیکھے گا تو....، ہاہاہاہاہاہا..." وہ مستقل دیوانوں کی طرح ہنس رہا تھا، میں عجیب کیفیت میں گھری اسے ہنستا ہوا دیکھ رہی تھی، کچھ دیر دیوانوں کی طرح ہنسنے کے بعد وہ اپنے سر کو دونوں ہاتھوں میں تھام کر صوفے پہ بیٹھ گیا، میں ایک شاک کی کیفیت میں اسے دیکھ رہی تھی

"سنو میرا تعلق اس صنف سے ہے، جو نہ مردوں میں شمار ہوتی ہے نہ عورتوں میں" اس نے سر اوپر اٹھایا تو اسکی آنکھیں وحشت سے سرخی مائل ہورہی تھیں، اس کی اگلی بات سن کر ہفت اقلیم میرے سامنے گھوم گئے..اور وہ..اپنی بات کہنے کے بعد بالکل خاموش ہوگیا تھا اور ضبط کی کیفیت میں دانتوں کو اس شدت سے ہونٹوں پہ گڑایا کہ خون کا ایک قطرہ ٹپک کر اس کی ہتھیلی پر پھیل گیا....

......☆☆......

پرایا دھن

محمد فاروق

آج سے نصف صدی قبل میری رہائش ساہیوال کے ایک گاؤں جیون آباد میں تھی ہمارے گھر کے بالکل سامنے اماں تا

جاں کا گھر ہوا کرتا تھا دو گھروں کے درمیان صرف دس فٹ کی کچی غیر ہموار گلی تھی گرمیوں کی راتوں میں جب ہم لوگ چھت پر سوتے تو اپنی چھت پر بیٹھے بیٹھے دوسرے کی خیر خبر لے لیتے۔ اُس زمانے میں عام رجحان تھا کہ گاؤں کے لوگ گرمیوں کی راتیں چھت پر گزارتے تھے چارپائیوں پر لیٹے لیٹے آپس میں باتیں کرتے کرتے اور حقے کی گڑ گڑ کے ساتھ ساتھ گہری نیند کی وادیوں میں دور نکل جاتے۔ رات کی تاریکی میں گہری خاموشی رچ بس جاتی۔ ہر طرف سناٹا پہرا دینے لگتا۔ گھڑیوں کی سویوں کی ٹک ٹک بھی سنائی دیتی۔ رات کو کبھی کبھی کتے بھونکنے لگتے۔ پھر خاموشی چھا جاتی۔ رات کے آخری پہر کا ہمیں اس وقت پتا چلتا جب اماں تاجاں کی مدھانی چڑیوں کے چہچہانے سے بھی پہلے چاٹی میں چہچہانے لگتی تھی۔ گھر میں شورڑ شورڑ، شورڑ شورڑ کی آوازیں گونجنے لگتیں ادھر اماں تاجاں کی مدھانی بولتی ادھر مائی جنتے کا چٹا سفید مرغا پو پھٹنے سے پہلے ککڑوں کوں ککڑوں کوں کا شور مچا دیتا۔ اماں تاجاں اور یہ نامراد مرغا صبح کے سہانے سے نہ خود سوتے نہ کسی کو سونے دیتے۔ شورڑ شورڑ اور ککڑوں کوں ککڑوں کوں جب باقاعدہ ایک چیخ و پکار کی صورت اختیار کر لیتا اور قوت سماعت میں خراشیں ڈالنے لگتا۔ اس وقت مائی تاجاں مدھانی چھوڑ اپنی بیٹی حنیفاں کو اُٹھانے لگتی گاؤں کی پر سکون خاموشی میں اس طرح بتدریج حرکت شروع ہوتی جیسے کسی جھیل کے پانی میں کنکر پھینکنے سے لہروں میں میں آہستہ آہستہ نشیب و فراز پیدا ہوتے ہوئے کناروں تک پہنچ جاتے ہیں۔

اماں تاجاں اپنی بیٹی حنیفاں کے سر پر ہاتھ پھیرتی اور کہتی۔

”اُٹھ میرا پُتر دیکھ تیری ماسی جنتے کا مرغا کب سے اذانیں دے رہا ہے۔“

ہائے! یہ مرغے کی ککڑوں کوں بھی حنیفاں کے لیے صور اسرافیل سے کم نہ تھی اس کا بس چلتا تو اس لوفر مرغے کو چھری پھیر دیتیں۔ لیکن اگر وہ ایسا کرتی تو ماسی جنتے نے اُس کی گردن پر چھری پھیر دینی تھی۔ لہذا امن اسی میں تھا کہ مرغے کی ہونگ کو برداشت کرتی۔ بس وہ ماں سے صرف اتنا کہتی ماں میں اُٹھ گئی۔ لیکن نیند کا نشہ اتنی جلدی کیسے کافور ہوتا۔ وہ پھر سو جاتی، اماں تاجاں بھی ہار ماننے والی کب تھی تھوڑی دیر کے بعد حنیفاں کو آوازیں دیتی رہتی۔ ایک طرف اماں تاجاں کے ہنکارے اُٹھ میرا پتر دوسری سفید مرغے کے نعرے۔ ساری نیند کا مزہ کرچی کرچی ہو جاتا۔ حنیفاں چپ چاپ آنکھیں بھینچ کر لیٹی رہتی اور دل میں کہتی ابھی تو مولوی نے الصلواۃ خیر من نوم بھی نہیں کہا ماں کو نہ جانے کیا مسئلہ ہے کبھی دل ہی دل میں مرغے کو کوسنے دیتی کہ اللہ کرے اس کو رانی کھیت کی بیماری لگ جائے۔ خدا کرے اس کو کوئی جنگلی بلا کھا جائے۔ ربا اس کو۔۔۔۔ کوسنے دیتے دیتے صبح کی خنک ہوا میں اُس کو میٹھی نیند کا جھونکا پھر اس کے رخسار پر آہستہ آہستہ تھپکیاں دیتا۔ اور وہ ایک بار پھر نیند کی وادیوں میں آنکھیں موند کر چلی جاتی۔ پھر جب اماں تاجاں کی ایک گرج دار آواز اس کے کانوں کے پردوں سے بم کی آواز کی طرح ٹکراتی اور رست اور کاہل ہونے کے طعنے نیزے کی انی کی طرح اس کی سماعت کے پردوں پر چبھتے۔ تو وہ جل بھن کر کہتی اچھا بے اُٹھ گئی مگر اماں تاجاں کی زبان گھڑی کی سویوں کی طرح نان اسٹاپ چلتی ہی رہتی حتیٰ کہ حنیفاں منہ بسورتے ہوئے اُٹھ کر بیٹھ جاتی۔ دوسری طرف مسجد کے اسپیکر میں موذن اللہ اکبر کی آواز بلند کرتا تو ہر طرف رحمت برسنے لگتی۔ اُس وقت آج کل کی طرح مسجد میں موذن ملازم نہیں ہوا کرتے تھے۔ یہ تو چچا شہاب دین مسجد کا پڑوسی تھا۔ جو اذان دیا کرتا اور مسجد کی صفائی ستھرائی کرتا رہتا۔ اذان کے ساتھ ہی اکا دکا بزرگ بابے آہستہ آہستہ مسجد کی راہ لینے لگتے تھے۔ اس لیے گلی میں کبھی کبھی کسی کے چلنے کی کھسر کھسر آواز آجاتی۔ لیکن آج جب اماں تاجاں نے حنیفاں کو آواز دی تو حنیفاں خلاف توقع سر کھجاتی ایسے تیزی سے بیدار ہوئی کہ اگر اُٹھنے میں تاخیر ہو گئی تو اس کی ریل چھوٹ جائے گی۔ وہ دوپٹہ سنبھالتے ہوئے اور چھنگلی سے دونوں آنکھوں صاف کرتے ہوئے پانی کے ہینڈ پمپ کی طرف چل پڑی اور وہاں پہنچ کر جلد جلد وضو کیا۔ اور دو سجدے دینے کے لیے مصلے پر کھڑی ہو گئی مصلا کیا تھا ایک پرانی دری تھی جس پر نماز پڑھا کرتے تھے اماں تاجاں کے متصل گھر میں چچا طفیل رہا کرتا تھا ادھر اذان ختم ہوئی اُدھر چچا طفیل دودھ کا ڈول لے کر اپنے گھر پہنچ جاتا وہ سادہ بے میل آدمی تھا جس کو زمانے کی ہوا نہ لگی تھی۔ بس سارا دن کھیتوں میں کولہو کے

بیل کی طرح کام میں جتا رہتا۔ اِن دو گھروں کے صحن کے درمیان بس پانچ فٹ اُونچی دیوار تھی جو نہ ہونے کے برابر تھی جب بھی کوئی کسی گھر میں داخل ہوتا تو دوسرے گھر کو پتا چل جاتا کہ کون آیا اور کون گیا۔ ایک گھر کی باتیں دوسرے گھر سے چھپانا مشکل تھی اس لیے وہ خود ہی اپنے مسئلے ایک دوسرے کے ساتھ سانجھ کر لیتے۔ اس سے ایک فائدہ ضرور ہوتا تھا کہ دیکھنے میں یہ دو گھر تھے لیکن ان کے دکھ اور سکھ سانجھے اور مشترک تھے۔ نصف صدی قبل گاؤں میں آج کل کی پرائیوسی کا رواج نہ تھا بلکہ لوگ اپنے مسائل اور پریشانیاں ایک دوسرے سے سانجھ کر لیتے۔ ایسا لگتا تھا جیسے ایک بڑا خاندان اس گاؤں میں آبسا ہے۔ اور ہر ایک دوسرے دکھ سکھ جانتا ہے۔

ابھی حنیفاں نے نماز مکمل نہیں کی تھی کہ خیر دین حنیفاں کا والد بھی دودھ سے لبالب ڈول لے کر آگیا۔ رسوئی میں دودھ کا ڈول رکھ کر وہ ہینڈ پمپ پر وضو کرنے لگا تھا۔ اماں تاجاں کی مدھانی نے بھی زبان منہ میں ڈال لی تھی۔ اس لیے گھر میں کچھ خاموشی سی ہو گئی تھی اور اب اماں تاجاں چاٹی سے مکھن کا پیڑا نکال کر پتیلی میں رکھ کر خیر دین کے پاس آگئی جہاں وہ وضو بنا رہا تھا اور بڑے رازدارنہ انداز میں خیر دین سے کہنے لگی۔

نیفاں کے ابا وہ رسولاں نہیں ہے ہماری نیفاں کی وچولن، اپنے شفیع کی گھروالی، رات وہ آئی تھی۔

ہاں ہاں کیا ہو گیا اس کو؟، خیر دین نے منہ پر پانی کے چھینٹے مارتے ہوئے اتنی اونچی آواز میں کہا کہ اڑوس پڑوس والوں نے بھی سن لیا ہو گیا، ’خیر دین کی بلند آواز نے اماں تاجاں کی رازدارنہ سرگوشی بے مول کر دی۔ اماں تاجان نے ماتھے پر تیوری ڈالتے اور تنک کر جواب دیا لیکن آواز قدرے پست ہی رکھی۔

کچھ نہیں ہوا اس کو۔ بس اُس نے پیغام بھیجا ہے۔ کہ آج کچھ مہمان لائلپور سے اپنی دھی رانی نیفاں کو دیکھنے آرہے ہیں۔ اس لیے تو اپنا کام جلدی جلدی مکا کر کے آجانا۔“ وہ حنیفاں کو شروع سے ہی نیفاں کہتی تھی۔ اماں تاجاں کی بات سن کر خیر دین کے جسم میں ایک سنسناہٹ سی دوڑ گئی۔ وہ سب کچھ جانتے ہوئے بھی ان جان بن گیا۔ اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

کیوں دیکھنے آرہے ہیں مائی تاجاں بولی۔

ہائے ہائے جوان بیٹی ہے لوگ اُسے دیکھنے۔

نہیں آئیں گے تو کیا تجھے دیکھنے آئیں گے۔ مائی تاجاں نے موقع پا کر خیر دین پر طنز کا تیر چلا دیا۔ پر خیر دین وہاں کب موجود تھا وہ تو گم صم ہو گیا تھا روح اس کے جسم سے نکل کر ہوا ہو گئی تھی۔ وہ مٹی کا بت بنا بے حس کھڑا تھا حنیفاں سے اس کو پیار ہی بڑا تھا وہ تو اس کی صورت دیکھ کر جیتا تھا۔ بیٹیوں کے جب رشتے آنے لگیں تو سمجھ لو بیٹیاں اب پرائی ہو گئیں ہینڈ پمپ پر ہاتھ رکھے۔

وہ سوچ رہا تھا کہ بیٹیاں کتنی جلدی جوان ہو جاتی ہیں وقت مٹھی میں پکڑے ریت کی طرح کسک جاتا ہے اور مٹھی بند کی بند رہ جاتی ہے۔ ابھی کل کی بات ہو وہ میری گود میں کھیلا کرتی۔ جب میں حویلی سے آتا تھا تو وہ ننگے پاؤں دوڑ کر میرے پاس آتی اور میں اس کو گود میں اُٹھا کر سینے سے لگا لیتا۔ سینے میں ٹھنڈک سی محسوس ہوتی۔ وقت پلک جھپکتے گزر جاتا ہے۔ اگرچہ اس کا وضو مکمل ہو گیا تھا اُس نے پاؤں تک دھو لیے تھے پھر بھی اس نے اپنی آنکھوں کی نمی کو چھپانے کے لیے ایک دفعہ پھر منہ پر پانی کے چھینٹے مار کر اس کو دھونے لگا۔

لڑکا کیا کام کاج کرتا ہے۔ خیر دین نے اپنی اندرونی کیفیات کو چھپانے کے لیے اماں تاجاں کو سوال کر دیا۔ رشتہ کرتے وقت ماں باپ لڑکے کی معاشی حالت کے بارے میں ضرور فکر مند ہوتے ہیں۔ لڑکا کام پر لگا ہو تو جہاں بیٹی کا معاشی تحفظ مل جاتا ہے وہاں لڑکے کے محنتی ہونے اور بری اٹھک بیٹھک سے بچے رہنے کا اشارہ بھی مل جاتا ہے۔ اماں تاجاں نے کہا۔

رسولاں بتا رہی تھی کہ جو مہمان آرہے ہیں وہ لائلپور میں رہتے ہیں لڑکا کپڑے کی مل میں کام کرتا ہے۔ اچھے لوگ ہیں لائل پور میں یہ اونچا مکان ہے۔ چار بھینسیں ہیں ان کی حویلی میں۔ نیفاں عیش کرے گئی خیر دین کے دل میں حنیفاں کی رخصتی

کا سن کر گھبراہٹ سی ہونے لگی تھی کھلی فضا میں بھی اس کو گھٹن محسوس ہو رہی تھی وہ جلدی سے نماز کے لیے مسجد کی طرف چلا گیا اس کو یقین نہ آتا تھا کہ وہ اپنی بیٹی کے بغیر زندہ رہ سکتا۔ آتا بھی کیسے حنیفاں اس کی اکلوتی اولاد تھی بس یوں سمجھ لو کہ اس کی بیٹی تو اس کے گھر کی شہزادی تھی پھر ذہن کہ کسی دریچہ سے آواز آئی کہ تُو خوامخواہ دل چھوٹا کر رہا ہے۔ بیٹیاں تو بادشاہوں کے گھر نہ رہیں۔ بیٹیوں کا گھر چاہے سرکنڈوں کی جھگی کیوں نہ ہو وہی ان کو محل ہوتا ہے۔ بیٹیاں جب جوان ہو جائیں تو باپ کے گھر کی گھی شکر سے اپنے گھر کی سوکھی روٹی اچھی ہوتی ہے۔ باپ اور بیٹی دونوں کی عزت اِسی میں ہے بیٹی جوان ہو کر اپنے گھر جائے۔ مہمانوں کو زبردستی گھر میں روکے رکھنے سے عزت نہیں بنتی بلکہ اُن کی خوب سیوا اور خدمت کر کے رخصت کرنے سے میزبان کی عزت ہوتی ہے اور بیٹیاں بھی تو مہمان ہی ہوتی ہیں۔ وہ مسجد کی طرف جاتے ہوئے اپنے دل سے آپ ہی باتیں کر رہا تھا۔

ویسے تو حنیفاں پہلے بھی کام کرنے میں ہرنی کی طرح پھرتیلی تھی لیکن آج وہ زیادہ ہی متحرک لگ رہی تھی اُسے آج متحرک ہونا بھی چاہیے تھا آج اس کے سفر حیات کا ایک اہم موڑ تھا اور ہر لڑکی کو چاؤ ہوتا کہ اس کا اپنا گھر ہو۔ اس لیے وہ بھی حال میں رہتے ہوئے مستقبل میں گم تھی آج صبح کا دھندلکا بھی اُس کو نکھرا نکھرا لگ رہا تھا۔ اور تو اور آج اس نے مائی جنتے کے مرغے کی اُونچی اُونچی ککڑوں کوں ککڑوں کوں کا بھی بُرا نہ منایا تھا۔ نیفاں اب مصلے سے اُٹھ کر چولہے میں پھونکنے سے آگ سلگانے لگی اور دھواں مٹی کے چولہے سے آہستہ آہستہ اوپر کی طرف سرکتا ہوا صبح کے جھٹپٹے میں گھل مل رہا تھا۔ نماز پڑھ کر خیر دین گھر آ گیا تھا اور اباؒ کے آنے سے پہلے حنیفاں نے چائے بنالی تھی۔ رات کی بچی روٹی سے آدھا ٹکڑا توڑ کر اور اس کے اوپر مکھن رکھ کر اس نے اپنے والد کو صبح کا ناشتہ دیا۔ خیر دین نے مکھن روٹی کے سارے ٹکڑے پر لگا لیا اور ایک نوالہ منہ میں رکھ کر چبانے لگا۔ اور ساتھ ساتھ سڑ کر کے چائے کی چسکی لگاتا۔ اچھا ہے بیٹی اپنے گھر کی ہو جائے گی۔ ایک بوجھ اترے گا اُس نے خیالوں خیالوں میں اپنے دل کو دلاسا دیا اور پھر سڑ سے ایک گرم چسکی اپنے اندر اُنڈھیل لی۔ چائے کافی گرم تھی۔ لیکن وہ کسی اور دھیان میں مگن چائے پی رہا تھا

مہمانوں کے کھانے پکانے کی ذمہ داری حنیفاں کی ہی تھی۔ ویسے تو اس نے شام ہی کو اپنی سہیلی بشیراں کو کہہ دیا تھا۔ کہ کل مہمان آ رہے ہیں تو ذرہ گھر آ جانا۔ بشیراں تھوڑی چنچل اور ہنس مکھ تھی اُس نے مہمانوں کا سن کر حنیفاں کے رخسار پر چٹکی لیتے ہوا کہا۔

اچھا اب میری بنو اپنے دیس سدھار جائے گی۔ دیکھ تو چہرے پر کیسے لالیاں آئی ہوئی ہیں۔ حنیفاں کے چہرے پر شرم کے مارے سرخی آ گئی تھی اس نے اپنے احساسات پر قابو پاتے ہوئے کہا اب زیادہ باتیں نہ بنا۔ کل آ جانا۔ بشیراں نے حنیفاں کی بات سنی ان سنی کر دی اور مسکراتے ہوئے کہا۔

کیا کرتا ہے ہماری بنو کے سر کا سائیں۔ حنیفاں نے منہ پھلاتے ہوئے کہا۔

مجھ کیا پتا۔ ابا اور بے بے جانے مجھے کیا لگے۔ میری جان چھوڑ۔ مگر بشیراں کہاں جان چھوڑنے والی تھی اس نے ایک اور سوال کر دیا۔

اچھا تصویر تو دیکھی ہو گئی۔

ہائے تو کتنی بے شرم ہے بیاہ سے پہلے اس کی شکل دیکھ لوں۔

لے اس میں کیا ہے۔ بشیراں نے چہرے پر سنجیدگی لاتے ہوئے کہا وہ میری شہر والی ماسی رقیہ ہے نہ اس نے اپنی بیٹی کو اپنے داماد کی تصویر دکھائی تھی۔ حنیفاں کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی اس نے بشیراں کو جھٹک کر کہا چل ہٹ مجھ سے ایسی باتیں نہ کر۔ بشیراں اور حنیفاں دونوں بچپن کی سہیلیاں تھیں۔ ان کے درمیان کوئی بات راز نہ تھی۔۔ سونے سے پہلے جب تک دونوں ایک دوسرے سے دل کی بات نہ کرتیں اُن کو نیند نہ آتی۔

دوپہر سے پہلے سارے گھر کو حنیفاں نے شیشے کی طرح چمکا دیا تھا۔ صحن صاف ستھرا کرسیوں پر بھی اچھی طرح کپڑا مارا

ہوا تھا کھڑکیوں پر بڑے بڑے پھولوں والے پردے بھی لگا دیئے۔ چارپائیوں پر نئی چادریں بھی بچھا دی تھیں اور کچھ دیر کے بعد رسولاں ایک پختہ عمر کی عورت اور مرد کو ساتھ لیے جھکتے جھکتے گھر میں داخل ہو گئی عورت کا نام عنایت بی بی اور اس کے ساتھ آنے والے آدمی جو کہ اس کا خاوند تھا اس کا نام محمد نیاز تھا۔ نیاز نے گہرے کالے رنگ کا خضاب لگا کر بالوں کو کالا سیاہ کیا ہوا تھا جبکہ عنایت بی بی نے دنداسہ مل کر دانت خوب چمکائے ہوئے تھے دنداسے کے زیادہ استعمال نے اس کے ہونٹ بھی سرخ کر دیے تھے۔ بہرحال مہمانوں کی آمد سے گھر میں ایک خوشگوار سی کھلبلی مچ گئی۔ ایک طرف مائی تاجاں خوشی خوشی چل پھر رہی تھی۔ بابا خیر دین کے چہرے پر بھی ایک اطمینان تھا لیکن دونوں اپنے من میں ایک کسک بھی محسوس کر رہے تھے جیسے دھوپ اور چھاؤں ساتھ ساتھ چلتے ہیں اس طرح ان کے دل میں خوشی اور ملال ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ کبھی اس خیال سے بیٹی اپنے گھر کی ہو گی خوشی اور اطمینان کا سایہ لمبا ہو جاتا کبھی حنیفاں کی جدائی کا خیال چلچلاتی دھوپ کو لمبا کر دیتا۔ جب بشراں حنیفاں کو ساتھ لیے کمرے میں داخل ہوئی تو حنیفاں گہرے پیلے رنگ کا سوٹ پہنے ہوئے تھی اوپر سے گورا رنگ حنیفاں تو آج گیندے کے پھول کی طرح خوبصورت لگ رہی تھی۔ عنایت بی بی تو پہلی نظر ڈال کر لٹو ہو گئی۔ فوراً آگے بڑھ کر حنیفاں کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرا۔ کچھ دیر بعد اور پورے گیارہ روپیہ حنیفان کی ہتھیلی پر رکھ دیے حنیفاں پیسے لیتے ہوئے کچھ ہچکچائی۔ بشراں نے کہا۔

لے لو یہ شگن کے روپیہ ہیں۔ بس پھر اس نے وہ نوٹ پکڑ لیے۔ سارا کام تسلی بخش ہو گیا۔

شام کو چھت پر بیٹھی حنیفاں اور بشیراں ایک دوسرے کے ساتھ مذاق اور چھیڑ چھاڑ میں مصروف تھیں کسی کی بات پر وہ اتنی زور سے ہنستیں کہ اُن کی ہنسی کی کھلکھلاہٹ گھر کے صحن میں بیٹھے خیر دین اور طفیل کو بھی سنائی دیتی۔ وہ ایسے ہنستی جیسے کسی برتن میں سکے کھنکھتے ہیں اور نیچے صحن میں طفیل اور خیر دین بیٹھے اپنی باتوں میں مصروف تھے جوان نسل چھت پر بیٹھی مستقبل کے تانے بانے بن رہی تھی۔ جبکہ پرانی نسل ماضی کی بھول بھلیوں میں گم تھی۔ ایک گھر میں ایک ہی وقت میں خیالوں کے دو دریا مختلف سمت میں رواں تھے۔ خیر دین نے طفیل سے کہا۔

تجھے یاد ہے کہ حنیفاں تین سال کی تھی تو وہ کیسے توتلا کر بولتی تھی۔ کھانے کو تھانا کہتی پانی کو مانی اور اس کی یہ توتلی زبان مجھے سب زبانوں سے زیادہ بھلی لگتی تھی کبھی وہ میری پیٹھ پر آ کر لٹک جاتی تھی کبھی اُنگلی پکڑ کر میرے ساتھ باہر جانے کی ضد کرتی۔

ہاں ہاں مجھے یاد ہے طفیل نے حقے کا گہرا کش لیتے ہوئے کہا۔ خیر دین نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔

دیکھ لے دن کس طرح ہوا کی مانند گذر جاتے ہیں۔ طفیل نے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

اچھا ہے دمی رانی اپنے گھر کی ہو گئی اس میں اتنے اداس ہونے والی بات نہیں ہے۔ خیر دین نے ایک گہری سانس لی اور کہا۔

اداسی تو میرے بس میں ہے یہ تو خود بخود ہو جاتی ہے جب میں حنیفاں کی رخصتی کا سوچتا ہوں تو میرا دل بیٹھ جاتا ہے طفیل نے حقے کی نال ایک طرف کرتے ہوئے کہا۔

خیر دین! بیٹیاں تو پرایا دھن ہوتی ہیں۔ یہ تو چڑیاں ہیں چڑیاں انہوں نے ایک دن آڑ جانا ہوتا ہے۔ بیٹیاں اپنے گھر کی ہوں اسی میں عزت ہے اور اب لائکپور اتنی دور تو نہیں ہے کہ تو وہاں جا نہ سکے۔ روز لاری جاتی ہے۔ جب چاہے مل کر آ جانا۔

خیر دین کی آنکھوں میں نمی اُتر آئی اور اُس نے کہا۔

”طفیل تو ٹھیک کہتا ہے۔“

اوپر چھت پر بشیراں حنیفاں سے کہہ رہی تھی کہ وہ اس کو لائلپور جا کر بھول تو نہیں جائے گی۔ حنیفاں نے کہا۔

لے یہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ میں اپنی بشیراں کو بھول جاؤں۔ بشیراں نے منہ پر مصنوعی سنجیدگی لاتے ہوئے کہا۔

جب چھوٹے چھوٹے بچے ہو جائیں تو بندہ بھول ہی جاتا ہے۔

پھٹے منہ بشیراں تو بڑی بے شرم ہو گئی ہے حنیفاں نے بناوٹی سی خفگی سے کہا اور دونوں کھلکھلا کر ہنس پڑیں جیسے اندر کی کوئی بات باہر آگئی ہو۔ اس کے ٹھیک چھ ماہ کے بعد بارات آئی۔ اور حنیفاں کو لے کر چلی گئی۔ وقتِ رخصت حنیفاں خیر دین سے لپٹ کر بہت روئی خیر دین نے ڈبڈباتی آنکھوں سے اپنی شہزادی کو ڈولی میں ڈالا۔ اور طفیل کے کاندھے پر سر رکھ ہچکیاں لینے لگا۔ بارات رخصت ہوگئی مائی تاجاں اور خیر دین طفیل بشیراں اور گاؤں کے کئی اور لوگوں دھندلی آنکھوں سے وہاں تک بارات کو دیکھتے رہے جہاں تک وہ نظر آتی رہی۔

......☆☆......

ٹوٹنا ضروری تھا

عرشیہ ہاشمی

بو ہے باریاں ہائے

بو ہے باریاں

’’واہ واہ...... کیا کمال کی سریلی آواز ہے یار' تم اگر باقاعدہ گلوکاری شروع کردو تو قسم سے سب کو پیچھے چھوڑ جاؤ۔‘‘ گانے کا سحر ٹوٹا تو اس کی بہترین دوست انیلا نے داد دی۔

کالج کے باغ کے ایک تنہا گوشے میں وہ چاروں ایک دائرے کی صورت میں بیٹھیں تھیں۔ تفریح کے اوقات میں ان کا نہایت ضروری اور دلچسپ مشغلہ آئینور کی آواز میں گانا سننا تھا۔

’’شکریہ یار، یہ تو تم سب دوستوں کی محبت ہے۔‘‘ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

’’یہ صرف محبت نہیں ہے پیاری، یہ تمہارا ہنر بھی ہے...... اور میرا بھی خیال ہے کہ تمہیں اپنا یہ ہنر ضرور آزمانا چاہیے۔‘‘ اس کی کسرِ نفسی دیکھتے ہوئے اسماء بھی میدان میں کودی۔

’’اہاں...... لیکن یار ہماری فیملی اتنی آزاد خیال نہیں ہے، مجھے کبھی اجازت نہیں ملے گی' اور کچھ پیٹ پوجا بھی کرنی ہے یا صرف میرے گانے پر ہی گزارا کرنا ہے آج؟‘‘ اس نے قدرے اداسی سے جواب دیتے ہوئے موضوع بدل دیا۔

......☆☆......

اوسط طبقے سے تعلق رکھنے والے حبیب احمد کے دو بیٹے اور ایک بیٹی تھی۔ سعداللہ حبیب بڑے جبکہ عبداللہ حبیب سب سے چھوٹے تھے۔ جبکہ رفعت آرا دونوں بھائیوں کے درمیان میں تھیں رفعت آرا کی شادی اپنے خالہ زاد سہیل احمد سے ہوئی تو وہ ان کے ساتھ رخصت ہو کر کراچی آن بسیں۔

عبداللہ اور سعداللہ کی شادیاں ایک ہی دن میں ہوئی تھیں۔ صبح سویرے عارفہ بیگم حبیب منزل میں بہو بن کر آئیں اور دن ڈھلے تسنیم احمد کی ڈولی بھی گھر کے آنگن میں اتر آئی تھی۔ حبیب احمد اور صابرہ بیگم خوشی سے پھولے نہ سمائے تھے۔ دونوں بہوئیں آپس میں خوب اتفاق اور محبت کے ساتھ رہتیں تھیں۔ ایسی خدمت شعار بہوئیں پا کر صابرہ بیگم کا دل سکون سے بھر گیا تھا۔ اب انہیں اپنے گھر کی کوئی فکر نہ تھی۔

عارفہ کے ہاں دانیال پیدا ہوا تو تسنیم بھی پیچھے نہ رہیں۔ اگلے ہی سال ان کی گود میں سفید گل گوتھنا سی عروش آگئی۔ دونوں بھائی بہت خوش ہوئے اور سعداللہ تو اس کی پہلی سالگرہ پر ہی پہنچ گئے۔

’’عبداللہ رسم کردیتے ہیں، زندگی کا کیا بھروسا۔ میرے دانیال کی دلہن میری عروشی ہی بنے گی۔‘‘ سعداللہ نے اپنے بھائی سے عروش کا ہاتھ مانگا تو عبداللہ نے اسی وقت خوشی خوشی ہاں کردی لیکن ابھی وہ کسی رسم کے حق میں نہیں تھے۔

’’سعد بھائی، عروشی آپ ہی کی بہو بنے گی لیکن ابھی رسم کی کیا ضرورت ہے' ابھی یہ صرف ایک ہی برس کی تو ہے، کیوں اباجان؟‘‘ عبداللہ نے نہایت متانت سے ان کو ٹالتے ہوئے اباجان کی مدد چاہی۔

’’ہاں سعد بیٹا، گھر کی ہی بات ہے تو رسموں کی کیا ضرورت۔‘‘ حبیب احمد کی تسلی سے سعداللہ مان گئے۔

اور پھر ڈیڑھ سال کے وقفے سے تسنیم کے یہاں آئینور اور فہد قلقاریاں مارتے ہوئے اس دنیا میں آئے تو گھر میں رونق دوبالا ہوگئی، لیکن عارفہ کے ہاں اور کوئی اولاد نہ ہوسکی۔

فہد جب دو ماہ کا ہوا تو صابرہ احمد خالق حقیقی سے جاملیں۔ ایسے مشکل وقت میں عارفہ اور تسنیم نے گھر کو بخوبی سنبھالا۔

سعداللہ اور عبداللہ دونوں بھائیوں نے مل کر کاروبار سیٹ کررکھا تھا۔ نہایت سوچ بچار اور ابو جان کے مشورے سے انہوں نے اپنے ہی شہر میں کپڑوں کی فیکٹری لگالی تھی۔ جب مارکیٹ میں ان کے کپڑوں کی مانگ بڑھی تو سعداللہ حبیب نے ایک اور فیکٹری لگالی۔ دونوں بھائیوں نے مل کر کاروبار کو خوب چمکایا، لیکن ایک مرتبہ عبداللہ حبیب کاروبار کے سلسلے میں انگلینڈ گئے تو واپسی پر ان کا طیارہ گر کر تباہ ہوگیا اور شہید ہونے والے اٹھائیس لوگوں میں سے ایک عبداللہ حبیب بھی تھے۔

تسنیم احمد کی تو زندگی ہی اندھیر ہوگئی تھی۔ کچھ سمجھ نہ آیا کہ کریں تو کیا کریں۔ تین بچوں کا ساتھ اور خود بھی سیدھی سادی گھریلو سی خاتون تھیں۔ پہاڑ سی ذمہ داریاں منہ کھولے کھڑی تھیں۔

سعداللہ حبیب کو اپنے بھائی کی بیوہ اور یتیم بچوں کا احساس تھا اور پھر اپنے والد کی پُرزور تاکید کے بعد انہوں نے تسنیم اور ان کے بچوں کی ذمہ داری بھی اپنے ذمہ لے لی تھی۔ مشکل حالات اچھے ہوتے ہیں کیونکہ یہ آپ کو اپنے اور پرائے کا فرق سمجھا دیتے ہیں۔

عارفہ کی حاسد طبیعت ایک دم ہی سامنے آئی تھی دیورانی سے بچوں کا حسد تو تھا ہی اب شوہر کو یتیم بچوں کی کفالت کرتا دیکھتی تو واویلا کرتی بچوں کو بھی طعنہ دیتی تھی۔

......☆☆......

گندمی چہرے پر چراغ جیسی لو دیتی آنکھیں ایسی ہی تھیں گویا کاغان کی جھیل کے سبز پانیوں میں چاند نہار رہا ہو، ستواں ناک کے نیچے گلاب کی پنکھڑیوں جیسے ہونٹ کندھوں تک آتے ہوئے سیاہ تراشیدہ بال اس کے حسن کو دوآتشہ بلکہ سہ آتشہ کردیتے۔ متناسب قد کی حامل آئینور خواب دیکھنے اور چھوٹی چھوٹی خواہشیں رکھنے والی ایک عام سی لڑکی تھی۔ پڑھائی کے علاوہ اس کا بس ایک ہی مشغلہ تھا، سُر تال سے کھیلنا' جب اسے فرصت میسر آتی، وہ اپنے سُر پکے کرنے کے لیے گاتی۔ خاندان میں کوئی فنکشن ہو یا اسکول کالج کی کوئی تقریب، اس کے سروں کے بغیر نہ سجتی تھی۔ اسے تعریف اچھی لگتی تھی۔ خاندان کی تقریبات اور اسکول کالج میں ہونے والے فنکشنز میں جب اس کے گانے، اس کے سروں اور آواز کی تعریف کی جاتی تو اس کا خون سیروں بڑھ جاتا۔ آئینور ایک حساس دل کی مالک تھی، لیکن اسے اپنی بہن عروش سے بہت گلے تھے۔

’’آپی بس کردو یار...... اب رونے کا کیا فائدہ......؟ منہ پر ہی سناتی نا ان کو، ہوش ٹھکانے آجاتے۔‘‘ آدھے گھنٹے سے مسلسل آنسو بہانے والی عروش پر اسے بے حد غصہ آرہا تھا۔ تائی امی نے تو بارہا اس پر بھی طنز کے تیر چلائے تھے۔

’’کیسے جواب دے سکتی تھی میں...... بڑی ہیں وہ اور پھر وہ کہتیں کہ عروش زبان دراز بھی ہے۔‘‘ عروش نے سسکیاں لیتے ہوئے اس کی بات کا جواب دیا تو آئینور نے سر پیٹ لیا۔

’’ارے...... وہ جو مرضی کہیں، کچھ بھی سوچیں، تم پروا کیوں کرتی ہو؟ آج میں خود دانیال بھائی سے بات کروں گی، حد ہوتی ہے خود غرضی کی بھی۔‘‘ اس نے حتمی لہجے میں بات ختم کی تو عروش نے جھٹ سے اپنی آنکھیں اور چہرہ صاف کیا۔

’’تم دانیال سے کچھ نہیں کہو گی۔‘‘ وہ اس کے قریب آکر بولی تو آئینور اس کا چہرہ دیکھتی رہ گئی۔

عروش کے اسکول میں نتائج کی تقریب تھی اور اس نے آئینور کو وقت پر پہنچنے کی سختی سے تاکید کی تھی۔ لیکن جب آئینور اسکول میں پہنچی فنکشن شروع ہوچکا تھا۔ اسے دیکھتے ہی عروش اور اس کی قریبی سہیلیوں کے چہروں پر مسکراہٹ در آئی تھی۔ ہر سال کی طرح اس بار بھی اسکول کی سالانہ تقریب میں آئینور کے دعائیہ نغمے کو بے حد سراہا گیا تھا۔

......☆☆......

''اتنی دیر سے کیوں آئی آج؟'' پیریڈ ختم ہوا تو انیلا لان کے مخصوص گوشے کی طرف چلی آئی جہاں اس کی توقع کے عین مطابق آئینور موجود تھی۔

''بس یار کیا بتاؤں آج دانیال بھائی بیمار تھے تو پبلک وین میں آنا پڑا، اسی لیے دیر ہوگئی۔''

''تمہارے لیے اچھی خبر ہے میرے پاس...... اگر تم وقت سے آتی تو اپنے کانوں سے سن لیتی۔'' گول مٹول چہرے پر سجی ہوئی چھوٹی آنکھوں والی انیلا کی بات نے اسے متجسس کر دیا۔

''پتا ہے ٹی وی چینل کی طرف سے مقابلہ موسیقی کا اہتمام کیا جا رہا ہے اور ہمارے شہر کے پانچ کالجز میں سے ہمارا کالج منتخب ہوا ہے، جہاں آڈیشنز لیے جائیں گے۔''

''تو......؟'' آئینور نے بھنویں اچکاتے ہوئے اس کا اصل مدعا دریافت کیا۔

''تو کیا...... ہمارے کالج کو پچاس انٹری پاسز ملے ہیں اور سر عدیل نے دلچسپی رکھنے والے طلبا کے نام اپنے پاس لکھے اور......اور......''

''اور کیا......؟''

''اور...... میں نے تمہارا نام لکھوا دیا......'' انیلا نے گویا اس کی سماعتوں پر بم پھوڑا۔

''ہائے...... یہ کیا کیا پاگل لڑکی...... مجھے کبھی اجازت نہیں ملنے کی گھر والوں سے۔'' آئینور اس پر غصہ ہوئی۔

''خود ہی یہ فرض کر بیٹھو گی تو ملے گی بھی نہیں...... یار قسمت بار بار موقع نہیں دیتی، تمھیں اجازت لینا پڑے گی، ہر حال میں......'' اس نے سمجھایا۔

اور یہی کام تو مشکل تھا...... ورنہ اس کے دل کی تو شدید خواہش تھی کہ وہ اسی فیلڈ میں نام کمائے۔

''کوشش کرنے میں کیا حرج ہے۔'' اس نے دل میں سوچا اور فیصلہ کر لیا۔ عارفہ احمد نے سنا تو حیران رہ گئیں۔

''خاندان کی تقریبات میں رونق میلا لگانا اور بات ہے، اب کیا ٹی وی پر میلا لگایا کریں گی اس گھر کی لڑکیاں......'' انہوں نے طعنہ دیا۔ تسنیم احمد نے اپنی بیٹی کے لیے یہ ساری باتیں سنیں تو اسے سختی سے منع کر دیا۔

''امی جب آپ کو یہ پروفیشن پسند نہیں تھا تو کیوں مجھے شروع سے ہی منع نہیں کیا؟ پلیز امی...... آپ ان لوگوں کی خاطر میرا کیریئر داؤ پر لگا رہی ہیں جنہوں نے کسی مشکل میں آپ کا ساتھ نہیں دیا۔'' وہ روہانسی ہوئی۔

''آئینور...... ضد مت کرو۔ کوئی مشکل میں ساتھ دے یا نہیں، لیکن ایک بات یاد رکھنا کہ اس چیز کو ترک کرنا ہی بہتر ہے جسے ہر کوئی معیوب سمجھے اور ہمارے دین نے بھی گائیکی کو ایک مشغلے، پیشے یا تفریح کے طور پر ناپسند ہی کیا ہے اور جو بات دین میں منع ہے ہمیں اسے ترک کرنے میں دیر نہیں کرنی چاہیے۔ سمجھی تم......'' تسنیم احمد جو کہ بریانی کے لیے چاول چن رہی تھیں، ذرا سخت لہجے میں بولیں۔

''پلیز امی...... میرا بہت بڑا خواب پورا ہونے والا ہے، ایک ہی تو خواہش کی ہے اور آپ اسے محض دوسروں کی مرضی کے تابع کرنا چاہتی ہیں۔ مجھے آپ سے اس سخت دلی کی ذرا بھی امید نہیں تھی۔'' آئینور کو اپنی ساری ہمت دم توڑتی محسوس ہو رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں موٹے موٹے آنسو تیرنے لگے تو وہ ٹی وی لاؤنج میں آ گئی، جہاں دادا جان اپنی وہیل چیئر پر بیٹھے تسبیح کے دانے پھیر رہے تھے۔

''کیا ہوا آئینہ بیٹا...... تسنیم نے کچھ کہہ دیا کیا؟'' دادا جان کو اپنی یہ پوتی بہت عزیز تھی اور بچپن سے ہی ان کے ساتھ بہت اٹیچ بھی تھی، ان سے آئینور کے آنسو دیکھے نہ گئے تو پوچھ بیٹھے۔

''دادا جان! آپ امی کو سمجھائیں...... مجھے میرے خوابوں کی تعبیر سے دور نہ کریں، کتنا اچھا موقع مل رہا ہے مجھے، اور یہ چانس ہر کسی کو نہیں ملا کرتے...... اگر پاپا زندہ ہوتے تو میں کبھی اس طرح لاچار نہ ہوتی۔'' اسے پتا تھا دادا جان کی ہمدردی

کیسے حاصل کرنی ہے۔

اور پھر حبیب احمد نے بہو سے بات کر لی۔ ابتدا میں تو وہ بالکل بھی مان نہیں رہی تھیں۔ دین کے فیصلوں پر تو حبیب احمد بھی چوں چراں نہ کر سکتے تھے۔ لیکن پھر بھی وہ مصر تھے کہ آئینہ کو گائیکی کی اجازت دے دی جائے۔

''ابا جان...... آپ بضد کیوں ہیں؟ آپ تو مجھ سے بہتر جانتے ہیں، تو پھر اسے کیوں نہیں سمجھاتے؟'' تسنیم احمد نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے ناراضی سے پوچھا۔

''دیکھو بیٹا، جوان اولاد کو ہینڈل کرنے کا طریقہ ہوتا ہے۔ اور ماشاء اللہ ہماری آئینور خود بہت سمجھدار ہے اور اس طرح سختی انسان کو بغاوت پر اکساتی ہے۔ تم اسے اجازت دو، ایک دن آئے گا جب اسے خود محسوس ہوگا کہ وہ غلطی پر ہے۔ اس طرح کم از کم وہ ساری زندگی کفِ افسوس تو نہیں ملے گی ناں اور خود سے سیکھا ہوا سبق زیادہ دیرپا اور ذہن نشین رہتا ہے۔'' حبیب احمد نے نہایت باریکی سے انہیں موقع کی نزاکت کا احساس دلایا۔ یوں تسنیم احمد نے اسے اپنے خوابوں کو پا لینے کی اجازت دے دی۔ پہلی کامیابی پر آئینور خوشی سے پھولے نہ سما رہی تھی۔

ٹھیک سات دن بعد کالج میں ججز پینل کے تینوں ممبرز موجود تھے۔ حسب وعدہ آڈیشنز طے شدہ تاریخ پر ہو رہے تھے۔ آئینور کے ساتھ اسماء اور انیلا اس کی حوصلہ افزائی کے لیے موجود تھیں۔ اپنا آڈیشن دینے کے بعد انتظار کے لمحات بہت مشکل تھے۔ آڈیشن کے نتیجے کا انتظار کرنے والی پانچوں لڑکیوں کی نظریں ہال کی اسکرین پر تھیں۔

''یاہو...... آئینور......'' انیلا کی نظر سب سے پہلے آئینور کے نام پر پڑی جو سب سے نیچے تھا۔ دونوں نے آئینور کو خوشی سے نہایت پُرجوش انداز میں گلے لگایا۔ آئینور کو تو یقین ہی نہیں آ رہا تھا۔

''پہلی فتح بہت مبارک ہو۔'' آئینور کے ساتھ ساتھ اسماء کا چہرہ بھی خوشی سے تمتما رہا تھا۔

آئینور مسکرا دی۔ یہ اس کی پہلی جیت ہی نہیں بلکہ...... اگلی جیت کے لیے ایک موقع تھا۔ اسے خود کو ثابت کرنا تھا۔ خود پر اعتماد بڑھنے لگا تھا۔ پہلا قدم سفر کی بنیاد ہوتا ہے، اسی پر ہمارے مستقبل کی عمارت تعمیر ہوتی ہے۔ آئینور نے اپنی کامیابی کی عمارت کی پہلی اینٹ رکھ دی تھی۔

......☆☆......

''بیٹا ایک لڑکی کی سب سے بڑی دولت اس کی عزت ہوتی ہے۔ اگر کبھی عزت، مال، دولت، شہرت یا تعلقات کی بات سامنے آ جائیں اور تمھیں اُن میں سے کسی ایک کو چننا پڑے تو تمھارا کیا انتخاب ہوگا؟'' تسنیم احمد نے اس کے کپڑے اور دیگر ضروری سامان پیک کرتے ہوئے پوچھا۔

''امی بے شک میرا انتخاب عزت کے علاوہ کچھ نہیں ہوگا۔ آپ فکر مت کریں، میں اپنی اور آپ کی عزت پر کوئی آنچ نہیں آنے دوں گی۔ مجھ پر یقین رکھنا ہوگا آپ کو......'' آئینور اپنی امی کی آنکھوں سے چھلکتی ہوئی فکرمندی کو دیکھ چکی تھی۔ اس نے ان کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے انہیں تسلی دی۔

''آئینور...... میں تو اکیلی ہو جاؤں گی ناں...... تمھیں میری کوئی فکر نہیں۔'' عروش بے حد اداس ہوئی۔ اسے آئینور کی فکر بھی ہو رہی تھی، جانے پھپھو کے گھر کا ماحول کیسا ہو۔

''آپی...... آپ کہو تو میں نہیں جاتی۔'' آئینور منہ پھلا کر بیٹھ گئی۔

''ارے نہیں، خوشی خوشی جاؤ...... اللہ تمھارے خواب پورے کرے اور کامیابی تمہارے قدم چومے۔'' عروش دل سے اپنی بہن کے لیے دعا گو تھی۔

اور پھر عروش کی رات بھیگی آنکھوں میں، تسنیم احمد کی فکرمندی اور آئینور کی آنے والے دنوں کے خواب دیکھتے گزر گئی۔ اگلے دن اسے کراچی کے لیے روانہ ہونا تھا۔ اپنی تیاری کے بعد وہ تایا ابو، تائی امی سے مل کر عروش اور امی سے ملی...... تو تسنیم احمد کی نم آنکھیں دیکھ کر اس کا دل بھی بھر آیا۔

''امی پلیز...... خوشی خوشی رخصت کریں مجھے۔'' اس کا لہجہ گلوگیر ہوا۔

''اُفف کتنا ڈرامہ ہو رہا ہے یہاں...... تمھیں جانا ہے کہ نہیں؟ اتنا لمبا سفر ہے، تمھیں تو صبح چار بجے نکلنا چاہیے تھا۔'' دانیال ٹی وی لاؤنج میں آیا تو وہاں کا اداس ماحول دیکھ کر ٹوکے بنا رہ نہ سکا۔

''دانی بھائی، بس آ رہی ہوں۔ فہد تم یہ بڑے والے دونوں بیگ گاڑی میں رکھ دو۔'' آئینور نے دانیال کو جواب دیتے ہوئے پاس ہی خاموشی سے کھڑے فہد کو بھی ہدایت دی۔ اور پھر وہ آنسوؤں، امیدوں، فکرمندی، پیار اور انتظار کا بوجھ دل پر لیے کراچی آ گئی۔

رفعت پھپو نے نہایت جوش سے اس کا استقبال کیا۔ جائشہ اور جبران بھی اپنی کزن کو کافی عرصے بعد اپنے گھر میں دیکھ کر خوش ہوئے تھے۔ جائشہ تو آئینور کے حوصلے اور بلند ہمتی سے کافی متاثر تھی۔ کراچی جیسے فیشن زدہ شہر میں رہتے ہوئے بھی اس نے کبھی اس طرح کا پروفیشن اپنانے کا سوچا تک نہ تھا اور میرپور جیسے دور علاقے میں رہنے والی آئینور اپنے خوابوں کو پورا کرنے کے لیے کراچی تک آن پہنچی تھی۔ اس کی سہیلیاں جب ٹی وی پر آئینور کو میوزک شو میں دیکھتیں تو اکثر جائشہ سے اس کے متعلق دریافت کرتیں۔ اپنی اہمیت کم ہوتے دیکھ کر آہستہ آہستہ جائشہ کو آئینور سے جیلسی محسوس ہونے لگی تھی۔

روشنیوں کا شہر اگرچہ کافی حد تک اندھیروں میں ڈوب چکا تھا لیکن آئینور کو اپنا مستقبل روشن نظر آ رہا تھا۔ اس کی کلاسز اسٹارٹ ہو چکی تھیں۔ مشہور اور منجھے ہوئے استاد سے موسیقی کے سُر تال اور ان کی پیچیدگیوں پر قابو پانا سیکھ رہی تھی۔ وہ نہایت سنجیدگی سے اپنی کمزوریوں پر قابو پانے کی کوشش کر رہی تھی۔ آڈیٹوریم کے علاوہ گھر میں بھی وہ صبح کے وقت ریاض کرتی نظر آتی اور یہ وقت جائشہ پر ہمیشہ ناگوار گزرتا تھا۔

''مما...... منع کریں اس کو...... صبح صبح گھر میں نحوست پھیلائے بیٹھی ہے۔'' وہ آئینور کی پروا کیے بغیر رفعت آرا کو انتہائی ناگواری سے کہتی، تو وہ اسے صرف گھور کر رہ جاتیں۔ ایسے میں جبران اس کی مدد کو پہنچ جاتا۔

''جیشو...... یہ صبح صبح نحوست نہیں پھیلا رہی بلکہ تم پھیلاتی ہو...... سو کر وقت دیکھا ہے؟ دن کے ساڑھے گیارہ بج رہے ہیں......'' جبران کی یہ کمک اس کا حوصلہ بڑھا دیتی تو وہ مسکراتی نگاہوں سے اس خوبرو کزن کو دیکھتی رہ جاتی۔ اسے جبران کی آنکھوں میں اپنے لیے ہمیشہ ہی کچھ خاص جذبہ محسوس ہوتا۔ جسے سوچ کر وہ مسکرا دیا کرتی تھی۔ لیکن جائشہ کو جبران کا آئینور کی طرف جھکاؤ سخت طیش دلاتا تھا۔

''تم میرے بھائی ہو...... اس کے نہیں، تمھیں میری طرف داری کرنی چاہیے۔'' اور کچھ نہ کہہ پاتی تو غصے میں اتنا ہی کہہ دیتی۔

''ڈیئر جیشو...... بے شک بہن تو میری تم ہی ہو اور آئینور کو تو بہن بنانا بھی نہیں چاہتا۔'' شرارت سے آنکھ مارتے ہوئے اس نے آئینور کی طرف دیکھا تو وہ ایک دم یوں بوکھلائی جیسے کوئی چوری پکڑی گئی ہو اور سارا قصور اسی کا ہو۔ کچن سے ہی ان تینوں کی طرف گاہے بگاہے نگاہ اٹھانے والی رفعت آرا نے نظروں کی چوری اس بار بھی پکڑ لی تھی۔ وہ اپنے سمجھدار بیٹے کے انتخاب پر بے حد خوش تھیں، کیونکہ انہوں نے بھی آئینور کو ہی اپنے جبران کے لیے پسند کر رکھا تھا اور اب وہ اس خوشی کی نیوز کو بریک کرنے کے لیے مناسب موقع کی تلاش میں تھیں۔

ٹاپ ستر میں سے بہترین بیس چن لیے گئے تھے آئینور بھی انہیں میں سے ایک تھی۔ مقابلے کی براہِ راست کوریج ٹی وی پر بھی دکھائی جا رہی تھی۔ آئینور کے بڑھتے قدم اس کے چہرے کی چمک بھی بڑھا رہے تھے، تسنیم احمد کو یقین تھا کہ ان کی آئینہ ضرور فتح قرار پائے گی۔

عروش، فہد، تسنیم احمد اور عارفہ بیگم ٹی وی لاؤنج میں دیوار پر نصب ایل ای ڈی پر دی راک اسٹار میوزک شو دیکھ رہے تھے۔

''امی ہماری آئینور کتنی ٹیلنٹڈ ہے ناں...... پوری تیس لڑکیوں کو پیچھے چھوڑا دیا ہے اس نے۔'' عروش کے لہجے میں اپنی بہن کے لیے بے پناہ رشک تھا۔

''ہاں...... اللہ نے خوب نوازا ہے اسے۔ اللہ کرے دنیا اور آخرت کے ہر میدان میں وہ کامیابی و کامرانی کے مزے لوٹے۔'' تسنیم احمد اس کے لیے دعاگو تھیں۔

''اللہ ہدایت دے اسے۔ کامیابی اگر غلط منزل تک پہنچنے کی ہو تو ایسی کامیابی سے ناکامی بہتر ہے۔'' تائی امی نے بھی دھیمے لہجے میں اپنی رائے کا اظہار کیا۔

اور یہی دعا تھی جو تسنیم احمد نے بھی چپکے چپکے تہجد کے سجدوں میں مانگی تھی۔ لیکن شاید ابھی اس کی قبولیت کا وقت نہیں آیا تھا۔

......☆☆......

کامیابی کی سیڑھی پر قدم رکھنے والی آئینور منزل سے بس کچھ ہی دور تھی، اس بار جو مقابلے کا میدان سجا تو سلیکشن کی تلوار ایک بار پھر اس کے سر پر لٹکنے لگی۔ منزل کے قریب پہنچ کر وہ ناکامی کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی اور اسی عزم اور حوصلے نے اسے بہترین پانچ تک پہنچا دیا تھا۔ اس روز وہ بے حد خوش تھی، بچپن سے دیکھے جانے والے خواب کی تعبیر اس کے سامنے بس دو ہی قدم کے فاصلے پر تھی۔

وہ اپنے مستقبل اور فائنل کے لیے پُرامید تھی۔ پورے پاکستان میں اس کے لیے ہونے والی ریٹنگ کا گراف سب سے زیادہ تھا۔ وہ خوشی خوشی گھر واپس آئی تو یہاں جو صورت حال تھی اس کا وہ کبھی سوچ بھی نہ سکتی تھی۔

''مما...... لوگ پاگل نہیں ہیں کہ اسے ہی جتوائیں۔ ججز ہر بار اسے ہی کیوں پروموٹ کرتے ہیں؟ اور وہ جو ہاشم شاہ ہے، وہ تو اور کسی کو گھاس ہی نہیں ڈالتا، پھر اسی کا نام کیوں جپتا رہتا ہے؟ مما کچھ تو ملتا ہے ناں اسے جو اس دیہاتی لڑکی کو ہی سراہتا رہتا ہے۔'' وہ رفعت آرا کے دل و دماغ میں آئینور کے لیے زہر بھر رہی تھی۔ دروازے کی جانب ہاتھ بڑھائے پورچ میں کھڑی آئینور کا خوبصورت چہرہ یکلخت زرد ہو گیا تھا۔ آنکھوں سے آنسوؤں کی آبشار بہنے لگی تھی۔ وہ تو سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ اس کی کزن اس سے اس حد تک بدگمان ہے کہ اس پر کسی بھی قسم کا الزام لگا سکتی ہے...... جائشہ کے زہر میں بجھے الفاظ اس کے کانوں کو سیسے کی طرح جلا رہے تھے۔ ٹانگیں گویا بے جان ہو گئیں تھیں، پاؤں نے گویا قدم آگے بڑھانے سے انکار کر دیا تھا۔ وہ بمشکل اپنا نیم جان وجود گھسیٹتی ہوئی اندر آئی، تو جائشہ اسے دیکھ کر یکلخت خاموش ہو گئی اور اس پر نفرت بھری ایک نگاہ ڈالتے ہوئے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ آئینور نے پھپو کی طرف دیکھا تو وہ بے حد سنجیدگی سے کچھ سوچ رہی تھیں۔ آئینور چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی ان کے پاس چلی آئی۔

''پھپو...... یہ سب الزام ہے، جھوٹ ہے...... پتا نہیں جائشہ یہ سب کیوں کہہ رہی ہے؟ میرا یقین کریں پھپو میں نے کچھ غلط نہیں کیا...... بھروسا رکھیں مجھ پر۔'' وہ روتے ہوئے اپنی صفائی پیش کر رہی تھی جبکہ رفعت آرا دل ہی دل میں جائشہ کے لگائے گئے اس الزام پر آئینور سے بے حد شرمندہ ہو رہی تھیں۔

......☆☆......

وقت کچھ اور آگے بڑھا اور اس بار وقت کی زنبیل میں اس کے لیے کیا تھا، وہ نہیں جانتی تھی، کوئی بھی تو نہیں جانتا تھا کہ تقدیر نے اس کے مقدر کی تختی پر کیا نقشہ کھینچا ہے...... آنے والا مقابلہ اس کے لیے بے حد خاص تھا۔ اگر اس میں وہ کامیاب ہو جاتی تو سیدھی فائنل میں جا پہنچتی۔ اتنی اہم پرفارمنس تھی اس کی کچھ دنوں میں، لیکن وہ اپنے گانے پر فوکس نہیں کر پا رہی تھی۔ اسے جب بھی جائشہ کی زہر میں بجھی باتیں یاد آتیں، وہ بے حد پریشان ہو جاتی۔

''میں اپنی کزن کی یہ بات برداشت نہیں کر پا رہی تو امی کیسے تائی امی اور باقی محلے والوں کی باتوں کو برداشت کرتی ہوں گی!'' اسے اب اپنی امی کی مشکلات کا صحیح معنوں میں احساس اب ہو رہا تھا۔

پریشانی کے انہی لمحات میں ایک مقابلے کے لیے جاتے ہوئے، آڈیٹوریم کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے بے دھیانی میں اس کا پاؤں پھسلا اور وہ لڑھکتی ہوئے نیچے آن گری اور پھر اسے کوئی ہوش نہ رہا۔

جب ہوش آیا تو وقت اس کے ہاتھوں سے پھسل چکا تھا۔ غیر حاضری کی وجہ سے وہ مقابلے سے باہر ہو چکی تھی۔ اس کی

ساری محنت اکارت چلی گئی تھی۔ اس دن آئینور بہت روئی۔ اس کی ٹانگ میں فریکچر ہوگیا تھا۔ وہ کئی دن سے ہاسپٹل میں ہی زیر علاج تھی۔ منزل کے پاس پہنچ کر اس طرح ہار جانا انسان کو توڑ کر رکھ دیتا ہے۔ وہ بھی اندر سے ٹوٹنے لگی تھی۔

اس کا فریکچر کچھ حد تک بہتر تھا لیکن پنڈلی کی ہڈی کی حالت ٹھیک نہ تھی۔ ڈاکٹرز نے کچھ عرصے تک ٹانگ پر وزن ڈالنے سے منع کیا تھا۔ ہاسپٹل سے ڈسچارج ہوتے ہی فہد دانیال اور تسنیم اسے اپنے ساتھ واپس میرپور لے آئے۔ عروش اپنی باہمت بہن کو ویل چیئر پر دیکھ کر اس کے گلے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی تھی۔

''یہ کیا ہوگیا آئینور......؟'' اس کے دل سے اٹھنے والا غبار آنکھوں سے بہنے لگا تھا۔

''انسان قسمت کے آگے بے بس ہے عروش آپی...... دیکھیں ناں قسمت نے کیسا دغا دیا...... میں تو کہیں کی بھی نہ رہی۔''

وہ اداسی سے بول رہی تھی۔ اس کی مردہ سی آواز کسی بھی امید سے خالی تھی۔

تسنیم احمد دل ہی دل میں کڑھنے لگیں...... آج انہیں آئینور کے نصیب سے ڈر لگنے لگا تھا۔ پتا نہیں اس کی قسمت میں کیا لکھا ہے؟

تائی امی کا رویہ جو کچھ بہتر ہوا تھا پھر سے تلخ ہونے لگا تھا اور ہوتا بھی کیوں نہیں بیٹھے بٹھائے نیا خرچ جو آن پڑا تھا ان کے شوہر پر...... تسنیم احمد چپ چاپ ان کی باتیں ایک کان سے سنتیں اور دوسرے سے نکال دیتیں، وہ جانتی تھیں عارفہ دل کی بری نہیں، بس زبان کی سخت تھیں، اور سعد بھائی پر دونوں فیکٹریوں کی ذمہ داری تھی۔ زیادہ وقت وہ فیکٹری کو دیتے تھے۔ عارفہ بیگم کے پاس جب سعداللہ حبیب تھکے ہارے پہنچتے تو اتنا غصہ تو انہیں آنا ہی تھا۔

تین مہینے کے بعد ڈاکٹر نے چیک اپ کے لیے بلایا تھا۔ دانیال اور تسنیم کے ساتھ آئینور ایک بار پھر پھپھو کے گھر آ پہنچی تھی۔ ایک ٹانگ اور دوسری پنڈلی کا ایکسرے کروایا تو آنے والی رپورٹ نے تو گویا آسمان ہی سر پر گرا دیا تھا۔

''دیکھیں بی بی...... رپورٹ اچھی نہیں ہے۔ پنڈلی والی ہڈی کھوکھلی ہوچکی ہے۔ اس کی صفائی کر کے اس کو بھرنا پڑے گا، ایم آر آئی ہوگا...... فریکچر تو فی الحال صحیح ہوگیا ہے۔ لیکن مجھے ڈر ہے آئینور کو بون کینسر نہ ہو......'' ڈاکٹر نے ایکسرے دیکھتے ہوئے کہا۔

''کک...... کیا...... بب...... بون کینسر......!'' تسنیم احمد کا تو حوصلہ ہی جواب دے گیا تھا۔ ان کے قدم لڑکھڑا سے گئے تو جبران نے انہیں کندھوں سے تھام کر اپنا احساس دلایا۔

''یااللہ...... میری بچی پر رحم فرما......'' ان کا دل اللہ کے حضور سجدہ ریز ہوگیا تھا۔

رفعت آرا، عروش، جبران، جائشہ، فہد، سعداللہ اور عارفہ، جس نے بھی سنا پریشان ہوگیا۔ اس کے لیے صدقہ خیرات کیے جانے لگے۔ رفعت آرا نے محلے کی عورتوں کو بلوا کر 'یا سلام' کا ختم شریف پڑھوایا۔ دانیال اور فہد بھی آئینور کے پاس ہاسپٹل میں ہی تھے۔

''جلد اچھی ہو جاؤ لڑکی تاکہ میرا بینڈ باجا بجنے کی تیاریاں شروع ہوسکیں۔'' دانیال نے کنکھیوں سے اس کے بالوں میں کنگھی کرتی عروش کو دیکھتے ہوئے ازراہِ مذاق کہا تو آئینور کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ در آئی۔

''تم اس طرح خاموش لیٹی ہوئی بالکل اچھی نہیں لگتی...... کوئی سُر تو بکھیرو۔'' جبران کو اس کی خاموش اور گہرے حلقوں والی آنکھیں دیکھ کر بہت ڈر لگتا تو وہ اس کو زندگی کی طرف لانے کے لیے کوئی نہ کوئی پھلجھڑی چھوڑتا دیتا۔

جبران کی اس بات پر آئینور کے چہرے پر ایک سایہ سا لہرا گیا تھا۔ جبران کو کیا خبر تھی کہ اس کی یہ بات آئینور کے زخم پھر سے ہرے کر دے گی۔ اسے اپنے گلے میں گھٹ کر رہ جانے والی آواز کا شدت کے ساتھ احساس ہوا۔ جس دن اس کا ایم آر آئی ہوا...... جائشہ بھی اس کی ہمت بندھانے ہاسپٹل آئی تھی۔

''مجھے معاف کر دو آئینور...... مجھے اپنی خطا کا شدت سے احساس ہے۔ آئم سوری۔''

''نہیں جائشہ...... مجھے وہی ملا جو میری قسمت میں لکھا تھا...... میں تم سے ناراض نہیں ہوں۔'' اس نے اپنی ساکت آنکھیں جائشہ کے چہرے پر ٹکائیں اور سپاٹ لہجے میں بولی۔

ہاسپٹل کے بیڈ پر لیٹی آئینور اس قابل بھی نہیں تھی کہ اپنی ضروری حاجات کے لیے اپنے پیروں پر چل سکے۔ بے بسی کی انتہا پر تھی چہ اور اس وقت سب ہی اس کے پاس تھے۔ عروش اور امی تو مسلسل اس کی پٹی سے لگی بیٹھی تھیں۔ فہد، دانیال اور جبران اس کی ہر ضرورت پوری کرنے کے لیے ہمہ وقت اس کے آس پاس رہتے، جائشہ اور پھپھو بھی گاہے بگاہے اس کی خیریت پوچھنے آتیں۔ تین وقت کا کھانا گھر سے ہی آتا تھا۔ سعداللہ حبیب بھی فون پر خیریت دریافت کرتے رہتے۔ تائی امی نے بھی فون کر کے اس کی خیریت دریافت کی تھی۔ حبیب احمد اس کے لیے خصوصی دعا کرتے تھے۔ ان کے جگر کا ٹکڑا جس تکلیف میں مبتلا تھا...... ان سے برداشت نہیں ہو پا رہا تھا۔ ان کا بس چلتا تو وہ اڑ کر کراچی پہنچ جاتے اور اپنی آئینہ کو سینے سے لگا کر ڈھیر ساری دعائیں لیکن وہ بے بس تھے۔ جو انسان خود وہیل چیئر کے سہارے پر ہو وہ کیسے اتنا لمبا سفر کرسکتا ہے۔

ٹھیک تین ہفتے بعد اس کی پنڈلی کا میجر آپریشن ہوا۔ اس کی پنڈلی میں کچرا ہو جانے والی ہڈی اور خراب ہونے والا بون میرو نکال کر راڈ ڈالا گیا اور فلنگ کرنے کے بعد اسے پورے چودہ دن کا ریسٹ بتایا گیا۔ آپریشن کے ٹھیک پانچویں دن اسے ہاسپٹل سے ڈسچارج کر دیا گیا تھا۔

''تسنیم...... اب کیا کہتے ہیں ڈاکٹر...... رپورٹ میں کیا آیا؟'' رات کو آئینور کے سونے کے بعد رفعت آرا ٹی وی لاونج میں اکیلی بیٹھی تسنیم احمد کے پاس چلی آئیں۔

''ایم آر آئی کی رپورٹ تو ٹھیک ہے...... لیکن ڈاکٹر بھٹی نے ایک اور ٹیسٹ لکھ کر دیا ہے، اللہ کرے وہ بھی ٹھیک آئے۔''

آئینور کو محتاجی کے ان کچھ دنوں میں اپنوں کے ساتھ نے جتنا حوصلہ دیا تھا اس کا دل ان سب کے لیے احسان مند تھا۔ عروش اس کے پاؤں کی ورزش صبح شام کرتی۔ چار انچ لمبائی کے زخم پر ڈریسنگ کرنا بھی عروش نے اپنے ذمے لے رکھا تھا۔ ان چودہ دنوں میں اس کی صفائی، غسل اور رفع حاجت کے سب کام امی کرتی تھیں اور بغیر کسی اکتاہٹ کے وہ دونوں اس کا مسلسل خیال رکھ رہی تھیں۔

ان سب کی بس ایک ہی خواہش تھی کہ آئینور ایک بار پھر اپنے قدموں پر کھڑی ہو سکے...... وہ اس کا بھلا چاہتے تھے، اس لیے پریشان تھے۔

''تو مس آئینور...... ثابت ہوا کہ اپنوں کا ساتھ زندگی میں سب سے زیادہ ضروری ہے، اور سب سے زیادہ اہم اور خوبصورت چیز جو ہم اپنوں کو دے سکتے ہیں...... وہ وقت ہے۔''

''پاؤں ڈھیلا چھوڑو آئینور......'' عروش جو اسے بٹھا کر پاؤں کی ورزش کروا رہی تھی یکدم اسے حقیقت کی دنیا میں لے آئی۔

''میں خود سے کروں آپی؟'' اس نے اپنی ہمت و طاقت سے پاؤں کی انگلیوں کو اوپر اٹھانے کی کوشش کرتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں کرو ناں...... بلکہ آج سے تم خود یہ ایکسرسائز کرنا تاکہ پتا چلے کتنی ریکوری ہوئی۔'' عروش اسے خود پاؤں اٹھاتے ہوئے دیکھ کر بڑی خوش ہوئی۔

آپریشن کے دوران اس کے پاؤں سے مربوط ایک نس دب گئی تھی، جس کی وجہ سے پاؤں اوپر صحیح طور پر اٹھ نہیں پا رہا تھا اور اسی نس کی بحالی کے لیے ڈاکٹرز نے اس کو ورزش بتائی تھی۔ پہلے تین مہینے پورے ہوئے تو اس کا سی ٹی اسکین کیا گیا تاکہ پتا چل سکے کہ بون ٹیومر کسی اور جگہ تو نہیں نمودار ہوا۔

اب ڈاکٹر نے اسے بیساکھی کے سہارے چلنے کی اجازت دے دی تھی۔ تسنیم احمد اور آئینور کے لیے یہ خوشی کی بات تھی کہ اس کی محتاجی ختم ہوئی...... اب وہ جو کام چاہے خود کر سکے گی۔

......☆☆......

''ہوم سویٹ ہوم...... آئی مسڈ یو سو مچ۔'' وہ اپنے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے خوشی سے بولی۔ پورے سات مہینوں کے بعد اس نے گھر میں قدم رکھا تھا۔

''پھپھو نے ہمارا ہر طرح سے خیال رکھا پھر بھی...... جو بات اپنے گھر میں ہے وہ کہیں نہیں۔'' عروش بھی خوش تھی۔ اپنے

گھر میں پہنچتے ہی اس کے دل میں ایک طمانیت کا احساس ابھرا تھا۔

''بون کینسر...... اس کا مطلب ہے میں کبھی اپنے پاؤں پر نہیں چل سکوں گی...... لوگ مجھے اپاہج اور معذور کہہ کر بلائیں گے نہیں...... یہ نام تو نہیں کمانا تھا مجھے...... مجھے تو......'' اور اس سے آگے سوچنے کی شاید اس کی اوقات نہیں تھی۔ اپنے ادھورے سپنوں پر ماتم کناں، وہ خود ترسی کا شکار ہو رہی تھی۔

''شاید اللہ تعالیٰ یہی چاہتے تھے کہ میں اپنے قدم واپس موڑ لوں...... شاید موسیقی کا پیشہ اختیار کرنا میری غلطی تھی۔ بس اللہ پاک مجھے اپنے پیروں پر کھڑا کر دے...... پھر میں اپنوں کو چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گی۔'' وہ ویل چیئر پر بیٹھی اپنے رب سے دکھ بانٹ رہی تھی۔

''آئینور...... آئینور...... پھپھو کا فون آیا تھا اور پتا ہے انہوں نے کیا کہا؟'' عروش نے کمرے کا دروازہ کھولا اور بولتی ہوئی اس کے پاس آئی۔

''کیا......؟'' اس نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے پوچھا۔

''یہ...... کہ تمہاری اسکین کی رپورٹ بالکل ٹھیک ہے اور تم جلد ہی اپنے پیروں پر چل سکو گی۔'' عروش نے خوشی سے چہکتے ہوئے اسے سب بتایا اور آگے بڑھ کر اسے گلے لگا لیا۔

شاید زندگی اب مسکرانے لگے اور اسی امید کے سہارے وہ مسکرا دی۔

مزید کچھ وقت سرکا اور وہ دن بھی آ پہنچا جب وہ اپنے قدموں پر کھڑی ہو گئی تھی۔ آہستہ آہستہ قدم آگے بڑھاتے ہوئے اس احساس ہوا کہ زندگی اب بھی بانہیں کھولے اسے بلا رہی ہے۔ اس کے احساسات ابابیل کے اس بچے کی طرح تھے جو اپنی زندگی کی پہلی پرواز کرتا ہے۔ وہ خوش تھی بے حد خوش اور اس سے زیادہ خوش عروش، فہد اور امی تھے۔

''ماشاءاللہ...... اللہ پاک نے میرے بچے کو اپنے قدموں پر پھر سے کھڑا کر دیا۔'' دادا جان جو خود ویل چیئر پر بیٹھے تھے...... مسکراتے ہوئے نہایت محبت سے بولے تھے۔

''دادا جان یہ سب آپ کی اور میرے اپنوں کی دعاؤں کا ثمر ہے۔'' وہ ایک جذب سے مسکراتے ہوئے بولی۔

اس روز تسنیم احمد نے محلے کی مسجد میں آئینور کے نام کا صدقہ بھیجا تھا۔

بلآخر اس داستان نے عارفہ احمد کا دل بھی دھو دیا تھا۔

......☆☆......

''امی...... میں نے سوچا ہے کہ تایا ابو کے ساتھ فیکٹری کے کام میں ان کا ہاتھ بٹاؤں...... مطلب پاپا والی فیکٹری کا چارج سنبھال لوں......'' آئینور نے کباب پلیٹ سے اٹھاتے ہوئے کہا تو تسنیم احمد حیرت سے اس کا منہ دیکھنے لگیں۔

''کک کیا ہوا امی؟'' امی کو اس قدر حیران دیکھ کر اپنی کسی ناکردہ غلطی کا احساس ہوا۔

''کیا تم سنبھال سکو گی؟'' اب کے امی نے کچھ سوچتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں...... ان شاءاللہ، مجھے اب احساس ہوا ہے امی کہ میں نے کتنے فضول سے شوق میں اپنا وقت برباد کیا۔ جبکہ میرا کام یہ تھا کہ میں تایا جان کے ساتھ ہاتھ بٹاتی، کم از کم ابو جان کی فیکٹری کے کام میں ہی مدد کرواتی تاکہ ان کا کچھ بوجھ ہی ہلکا ہو جاتا اور اب جو ارادہ کیا ہے تو ان شاءاللہ کامیابی مقدر ٹھہرے گی...... کیونکہ دعاؤں کے تناور درخت کا سایہ میرے سر پر سلامت ہے۔'' اس کے لہجے میں یقین، آنکھوں میں ایک عزم اور مان تھا۔

اور پھر عید سے دو روز پہلے پھپھو اپنی پوری فیملی کے ساتھ حبیب منزل آ گئیں تو گھر بھر میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ عارفہ احمد کا بھی پرانا روپ نظر آیا۔ نہایت پُرتکلف کھانے کے بعد چائے کا دور چلا تو عروش چائے سرو کرنے کے بعد کچن سے کمرے کی جانب آ گئی جہاں آئینور اور جائشہ خوش گپیوں میں مصروف تھیں۔ اسی رات دانیال اور عروش کی شادی کی تاریخ عید کے ٹھیک دس روز بعد طے پائی گئی تھی۔

''واؤ، کتنا مزہ آئے گا جائشہ...... اور آج سے آپ کا پکا والا پردہ عروش آپی۔'' اس نے انتہائی خوشی کے عالم میں انگلی اٹھاتے ہوئے عروش کو تاکید کی۔ آئینور بے حد خوش تھی، اس کی زندگی میں، اس گھر میں پہلی بار کوئی شادی ہو رہی تھی۔

''اور اپنے بارے میں کیا خیال ہے مس آئینور عبداللہ......؟'' جائشہ نے آنکھیں نچاتے ہوئے اس سے پوچھا تو وہ حیرت سے اس کا منہ تکنے لگی۔

''کیا مطلب......؟'' اسے جائشہ کا یہ سوال ذرا بھی سمجھ نہ آیا۔

''منگنی سے لے کر شادی تک...... تمہیں بھی جبران بھائی سے پکا والا پردہ کرنا ہوگا......'' جائشہ نے شہادت کی انگلی دکھاتے ہوئے تاکید کی تو آئینور ایک دم اچھل ہی پڑی تھی۔

''عروش کے نکاح والے دن، ہم بھی آپ کو اپنے بھائی کے نام کرالیں گے۔'' جائشہ گردن اکڑائے اسے ایک کے بعد ایک شاک دیتی جا رہی تھی۔ وہ شرمگیں سی مسکراہٹ کو دونوں بہنوں سے چھپا نہ پائی تو وہاں سے اٹھ کر چھت پر آ گئی۔

اجلا اجلا چاند تاروں بھرے سیاہ آسمان پر پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا۔ جنگلی شہتوت کے اونچے درخت چاندنی اوڑھے بہت خوبصورت لگ رہے تھے۔

''آہم...... آہم...... کیا ہو رہا ہے۔'' وہ چاند کے اس حسین نظارے میں ایسی کھوئی کہ اسے جبران کی آمد کی خبر ہی نہ ہوئی تھی۔ جب اس نے کانوں میں سرگوشی کی تو وہ ایک دم اچھل پڑی۔

''آپ مجھے ڈرا رہے ہیں۔'' اس نے تیز لہجے میں بھنویں اچکاتے ہوئے اس سے پوچھا۔

''ارے...... میں ڈرا کہاں رہا ہوں میں تو اپنی سچی محبت کا اظہار کر رہا ہوں......'' جبران اسے خوشمگین نظروں سے دیکھتے ہوئے تھوڑا اور قریب آیا تو وہ ایک دم بوکھلا گئی۔

''کک کب...... کب اظہار کیا آپ نے......!'' وہ اپنے ذہن پر زور ڈالتے ہوئے سوچتے ہوئے بولی، لیکن جبران کے چہرے پر شرارتی سی مسکراہٹ دیکھ کر اسے اپنی بے وقوفی کا احساس ہوا، تو وہ شرماتے ہوئے رخ موڑ گئی۔

''آئینور عبداللہ...... اس چاند کو بھی گواہ بناتے ہوئے میں پورے ہوش و حواس میں اقرار کرنا چاہتا ہوں..........'' اس کا ہاتھ تھام کر اپنی طرف متوجہ کرنے کے بعد وہ اتنا بول کر رکا تو آئینور نے اس کے خاموش ہونے پر نگاہیں اٹھا کر اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

چاہا ہے تم کو
خود سے بھی زیادہ
سوچا ہے تم کو......!
خواہش یہی ہے
مجھ کو ملے تو
چاہت یہی ہے......!

''کیا تم زندگی کے اس حسین سفر میں میری ہم سفر بننا پسند کرو گی؟'' اپنی آنکھوں میں محبت کا ایک جہان بسائے وہ اس کی آنکھوں میں جھانک رہا تھا۔

آئینور کو اس لمحے جبران کی محبت پر ٹوٹ کر پیار آیا تھا۔ اس نے دھیرے سے سر اثبات میں ہلایا اور چاند پر نگاہ جمالی۔ محبت زندگی کے آسمان پر چمکتے ہوئے چاند کی مانند ہی تو ہے...... اسے امید تھی اب زندگی کی راہیں ضرور روشن ہوں گی۔

☐

ذوقِ آگہی

سباس گل

وحدانیت

خداوند کریم نے اپنے پیارے کے صدقے پوری کائنات کی تخلیق کی اور طول وعرض کے ذرے ذرے میں اپنی حکمت کے بے شمار جوہر نمایاں کیے زمین سے آسمان تک مشرق سے مغرب تک اور اول سے آخر تک اس کی حکمت و دانائی ظاہر ہوتی ہے۔

کلیوں کی مہک میں گلوں کی خوشبو میں چڑیوں کی چہکار میں کوئل کی کوک میں، شیر کی دھاڑ میں ہاتھی کی چنگھاڑ میں عقاب کی پرواز میں مور کی خوب صورتی میں لومڑی کی چستی میں ان کی تیز رفتاری میں اس کی قدرت کے بے پایاں اور انمول رنگ جھلکتے ہیں۔

بادل کی گھن گرج ہو یا بجلی کا چمکنا، برکھا کی ٹپ ٹپ برستی بوندیں ہوں یا موسلا دھار بارش، ہواؤں میں نمی ہو یا گرمی فضاؤں میں تسلسل ہو یا ارتعاش فصلوں کی انگوری ہو یا جوانی، پرانے چھپر کے تنکے ہوں یا بلند و بالا بلڈنگ (عمارت) نیز ہر ہر زاویے ہر ہر رنگ، ہر ہر سمت یہاں تک کہ زمین کی نچلی تہوں سے آکاش کی بلندیوں تک اس کی قدرت اور اس کا موجود ہونا ظاہر ہوتا ہے۔

انسان کے انتہائی قریب آگے پیچھے اوپر نیچے اس کی شاہ رگ کے قریب یہاں تک کہ اس کے اندر سینے کے راز تک جاننا اور اس کے پورے وجود میں بستا اس کی قدرت کا فیض اور کمال فن ہے۔

دوسری طرف کائنات کی ہر اک شے ہر اک بناوٹ فانی اور مٹنے کے لیے غرور و تکبر جاہ و حشمت اور بڑائی بھی چند روزہ مہمان ہیں ہر شے زوال پزیر ہے بس عاجزی، انکساری اور سعادت مندی ہی سدا رہنے کے لیے ہے کیونکہ سدا رہنے والی ذات خدا ہے اور وہی سبھی کا پالن ہار ہے اسی کو ہی یہ فوقیت حاصل ہے اسی کی حکومت ازل سے ابد تک جاری و ساری رہے گی اس کی واحدانیت سدا قائم و دائم رہے گی۔

ایم حسن نظامی...... قبولہ شریف

جاہلوں سے نہ الجھ

جو عقل مند جاہلوں سے الجھ جائے اسے عزت کی توقع نہیں کرنی چاہیے اور اگر کوئی جاہل زبان کے زور پر غالب آبھی جائے تو کوئی تعجب نہیں کیونکہ وہ پتھر کی مانند ہے، جو موتی کو توڑ دیتا ہے وہ بلبل جو کوے کے ساتھ پنجرے میں بند ہو اگر اس کا سانس گھٹ جائے تو کچھ تعجب نہیں اگر کوئی ہنر مند کسی آوازرہ سے تکلیف اٹھائے تو ہر گز وہ اپنا دل نہ دکھائے اور نہ غصہ دکھائے کیونکہ پتھر اگر سونے کے قیمتی برتن کو ریزہ ریزہ کردے تو بھی پتھر کی قیمت نہ بڑھے گی اور نہ سونے کی قیمت میں کمی واقع ہوگی۔

ریاض بٹ...... حسن ابدال

اجارہ داری

بھکاری نے ایک گھر کے سامنے صدا لگائی تو گھر کی نئی نویلی دلہن نے کہا جاؤ بابا معاف کرو۔

بھکاری کچھ دور گیا تو دلہن کی ساس نے بھکاری کو آواز دی بھکاری خوشی خوشی واپس آیا تو خاتون نے بھی کہا بابا معاف کرو۔

بھکاری کو بہت غصہ آیا اور کہا یہ بات تو آپ کی بہو نے بھی کہہ دی تھی پھر مجھے واپس کیوں بلایا؟

خاتون نے جواب دیا مالکن میں ہوں وہ کون ہوتی ہے تم پہ رعب جمانے والی۔

عبدالجبار رومی...... انصاری قصور

عورت

ہر وقت اس کو سوچ سوچ کر میرا دماغ اب مفلوج رہنا شروع ہوگیا تھا نہ تو میں اس کو چھوڑ سکتی ہوں نا ہی بھول سکتی ہوں نا اس کے بغیر مر سکتی اور نا ہی جی سکتی ہوں آخر اب میں کروں تو کیا کروں اس کی لاغرضی نے مجھے بہت سے مرض لگا دیے ہیں کبھی کبھی عورت ہونا بھی مار دیتا ہے عورت کے قدموں تلے جنت یوں ہی نہیں آگئی ساری زندگی فرض نبھانے پڑتے ہیں اپنی عصمت کی جنگ لڑنی پڑتی ہے بے فیض رشتے نبھانے پڑتے ہیں اک بت کی پوجا کرنی ہوتی ہے ابھی زلفوں کی طرح زندگی بھی اب الجھ سی گئی ہے مجازی خدا خود کو خدا کیوں سمجھتا ہے کیا بیوی صرف گوشت کی دکان ہوتی ہے کیا بیوی کے کوئی حقوق

نہیں ہوتے، عورت کے وجود پر صرف اس کے شوہر کا ہی حق ہوتا ہے اور شوہر صرف اپنا حق لینا جانتا ہے اپنا فرض نبھانا نہیں جانتا۔

حسین خواجہ...... مچن آباد

بات رنگ دھنک کی

اگر کوئی اجنبی شخص کسی سے کوئی ایڈریس پوچھے تو جان بوجھ کر غلط بتا دیا جاتا ہے اور یہ سب کسی غلط نظریے کے باعث نہیں کیا جاتا بلکہ محض مذاق یا تفریح کے طور پر ہی کیا جاتا ہے۔

ہمیں اس بات کی تعلیم نہیں دی گئی ہمیں حکم ہے کہ لوگوں کو درست راستے پر چلائیں، یہ چھوٹی چھوٹی محبت کی جھرنیں محبت اور پیار کا ایک بڑا پرنالہ بن جائیں گی کہ اس کی چھینٹیں اور کرنیں ہماری سب کی زندگیوں کو تابناک بنا دیں گی۔

محمد فرقان رومان...... چکوال

یاد رکھیں

☆ دل، دودھ اور موتی ایک بار پھٹ جائیں تو پھر نہیں جڑتے۔

☆ بیماری اور جھگڑے کو آکاس بیل کی طرح مت بڑھائیں۔

☆ اگر سائیکل کار میں بدل جائے تو رشتے ٹریفک میں ہلاک نہیں ہوجاتے۔

☆ جو لوٹ جائیں وہ باقی سفر نڈر ہو کر کرتے ہیں۔

☆ پیسے کے لیے جانے والے کبھی لوٹ کر نہیں آتے۔

☆ کمزور ہمیشہ اپنے دشمنوں میں اضافہ کرتا ہے۔

☆ انتہائی خوب صورت اور انتہائی بدصورت چہرہ ہمیشہ یاد رہتا ہے۔

مہر پرویز احمد دولو...... میاں چنوں

تھوڑا اور

شہد کا ایک بڑا سا قطرہ فرش پر پڑا تھا ایک چیونٹی آئی اور شہد کی چسکی لی اور جانے لگی مگر شہد کے میٹھے ذائقے نے اسے مجبور کردیا کہ بس ذرا سی چسکی اور چیونٹی نے ایک چسکی اور لے کر جانا چاہا لیکن چیونٹی کو پھر لگا قطرے کے کنارے سے لی گئی چسکی کافی نہیں شہد کے قطرے کے بیچ میں ڈوب کر زیادہ لطف اندوز ہوا جائے چیونٹی نے ایسا ہی کیا لیکن جیسے ہی وہ قطرے میں داخل ہوئی وہاں سے واپس نکل نہ پائی اور شہد میں مقید ہوگئی اور اس کی جان نکل گئی۔

دنیا کی زندگی بھی ایک بڑے سے شہد کے قطرے کی مانند ہے جو لوگ اس کی چھوٹی مقدار یعنی کم چسکی پر راضی رہتے ہیں وہ محفوظ رہتے ہیں اور جو اس میں ڈوب کر اس کی مٹھاس کے لالچ میں تھوڑا اور حاصل کرنے میں غرق ہوجاتے ہیں وہ برباد ہوجاتے ہیں۔

ایس حبیب خان...... کراچی

محبت

❁ محبت ایک ایسا پھول ہے جو دل میں کھلتا ہے تو انسان کی زندگی اس کی خوش بو سے مہک اٹھتی ہے۔

❁ محبت ایک ایسا پاکیزہ رشتہ جو ہر رشتے پر برتری حاصل کرلیتا ہے۔

❁ محبت ایک احساس ہے سکھ کی چاہت اور الفت کا۔

❁ محبت دل میں نئی امنگیں نیا احساس اور جستجو جگاتی ہے۔

❁ محبت اس کا رشتہ پھول سے زیادہ نازک اور چٹان سے زیادہ مضبوط ہوتا ہے۔

❁ محبت انسان کو خدا کے قریب لے آتی ہے۔

❁ محبت خوش نصیبوں کے حصے میں آتی ہے۔

احسان سحر...... میانوالی

تین چیزوں کا غلبہ

حضرت معاذ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا امت مسلمہ شریعت پر اس وقت تک ثابت قدم رہے گی جب تک تین چیزیں غالب نہ آجائیں۔

علم اٹھالیا جائے گا، ناجائز بچوں کی کثرت ہونے لگی۔

صقارون کا غلبہ ہوجائے لوگوں نے پوچھا۔

یارسول اللہ ﷺ صقارون سے کیا مراد ہے۔

آپ نے فرمایا وہ لوگ جو آخری زمانے میں ہوں گے ان کی باہمی ملاقات (سلام کے بجائے) ایک دوسرے کو لعنت ملامت کر کے ہوا کرے گی۔ (مسند احمد بن حنبل)

گل مہر...... کراچی

مرد کی خوب صورتی

مرد کی خوب صورتی کیا ہوتی ہے بھلا؟

❖ خوب صورت مرد وہ ہوتا ہے جو عورت کی بڑی سے بڑی خطا معاف کر دیتا ہے۔

❖ خوب صورت مرد وہ ہوتا ہے جو روٹی، کپڑا اور پناہ دے کر احسان نہیں کرتا بلکہ مشکور نظر آتا ہے۔

❖ خوب صورت مرد وہ ہوتا ہے جو وحشت کے گھوڑے پر سوار ہو کر عورت کی انا کی دھجیاں نہیں اڑاتا۔

❖ خوب صورت مرد وہ ہوتا ہے جو مانگے بنا عورت کو محبت دیتا ہے۔

❖ خوب صورت مرد وہ ہوتا ہے جو عورت کو محض نفسانی خواہشات کا آلہ نہیں سمجھتا۔

❖ خوب صورت مرد وہ ہوتا ہے جو عورت کو موتیا کا پھول سمجھتا ہے موتیا کا پھول گرم سانس کی گرمی نہیں سہہ سکتا، وہ عورت کو اپنے مزاج کی تپش سے جلا کر راکھ کر دیتا ہے۔

(بشریٰ رحمان کے ناول "خوبصورت" سے اقتباس)

کمال شاہ......حبیب آباد

استوڈنٹ

صاحب اب تو اسٹوڈنٹ کو پہچاننا مشکل ہو گیا ہے ہم نے ایک صاحب سے پوچھا "کیا آپ اسٹوڈنٹ ہیں؟" تو انہوں نے جواب دیا "نہیں جناب یہ تو جلدی میں مجھے اوپر والا بٹن بند کرنا یاد نہیں رہا۔"

البتہ اب کوئی اسٹوڈنٹ یہ کہے کہ اس پر کوئی کیس درج نہیں تو ہم یہ سمجھتے ہیں کہ یہ پابندی سے کالج نہیں جاتا ہوگا آج کل دنیا میں دو طرح کے طالب علم مشہور ہیں ایک وہ جو قابلیت کی وجہ سے جانے جاتے ہیں اور دوسرے وہ جو اپنی قابلیت کی وجہ سے ہیں، جب ہمیں پتا چلا کہ طلبہ نے طالبان کے نام سے کابل پر قبضہ کرلیا ہے تو ہم یہ سمجھے کہ امتحان ملتوی کروانا چاہتے ہیں لیکن انہوں نے طالب علموں والا ایک ہی کام کیا وہ یہ کہ لڑکیوں کے کالج بند کرا دیے۔

(نوک جھونک، ڈاکٹر یونس بٹ)

نورین ظفر......لودھراں

اقوال زریں

☐ حکومت اور عورت کی محبت کا چھوڑنا صبر سے زیادہ کڑوا ہے۔

حضرت سفیان ثوریؒ

☐ اگر خود برا ہے لیکن دوسروں کی برائی نہیں کرتا تو یہ بھی نیکی ہے۔

خواجہ نظام الدین اولیاؒ

☐ جب تک کسی شخص سے بات چیت نہ ہوا سے حقیر نہ سمجھو۔

حضرت علیؓ

☐ مسکراہٹ روح کا دروازہ کھول دیتی ہے۔

البیرونی

☐ جاہلوں کی صحبت سے پرہیز رکھو، ایسا نہ ہو کہ وہ تمہیں اپنے جیسا بنا دیں۔

حضرت لقمان

نبیل خان......کوٹ ادو

انبیاء علیہ السلام کے القابات

۞ ابوالبشر حضرت آدمؑ کو کہا جاتا ہے۔

۞ شیخ الانبیاء حضرت نوح علیہ السلام کو کہا جاتا ہے۔

۞ ابو الانبیاء حضرت ابراہیم علیہ السلام کو کہا جاتا ہے۔

۞ خطیب الانبیا حضرت شعیب علیہ السلام کو کہا جاتا ہے۔

۞ خلیفہ الارض حضرت داؤدؑ کا لقب ہے۔

۞ ابو العرب حضرت اسماعیل علیہ السلام کو کہا جاتا ہے۔

۞ ذوالنون حضرت یونس علیہ السلام کو کہا جاتا ہے۔

۞ کلیم اللہ حضرت موسیٰؑ کا لقب ہے۔

۞ ذبیح اللہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کا لقب ہے۔

۞ خلیل اللہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا لقب ہے۔

آصف بٹ......کشمیر

لفظ لفظ خوشبو

● اگر زندگی میں سکون چاہتے ہو تو کبھی کسی سے توقع مت رکھو کیونکہ توقع کا پیالہ ہمیشہ ٹھوکروں کی زد میں رہتا ہے۔

● جتنا کسی کا ساتھ پرانا ہوتا ہے اسی کی بے وفائی کے

لیے تیار رہنا چاہیے کیونکہ تبدیلی کائنات کا خمیر ہے۔

● رشتے اپنائیت کے ہوں یا خلوص کے اتنے ہی نازک ہوتے ہیں جیسے آبگینے کہ ذرا سی ٹھیس لگے تو ٹوٹ گئے، بدگمانی نے سر اٹھایا تو چکنا چور ہو گئے پھر ان پر فخر کیسا۔

● عورتیں مردوں پر بالکل اعتبار نہیں کرتیں لیکن کسی خاص مرد کے لیے اپنے اس اصول کو بھول جاتی ہیں۔

● قبرستان ایسے لوگوں سے بھرے پڑے ہیں جو یہ سمجھتے تھے کہ ان کے بغیر دنیا اجڑ جائے گی۔

● دکھ کی دراڑیں چہروں سے تو رخصت ہو جاتی ہیں لیکن وہ انسان کے اندر اتر کر اس گوشے کو ویران کر دیتی ہیں جو کسی ایک شخص کے لیے مخصوص ہوتا ہے۔

عباس......موسیٰ خیل

امت محمدیہ کے بد ترین افراد

شوقین مزاج اور فیشن کے دلدادہ لوگ اللہ کی نظر میں پسندیدہ نہیں ہیں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے لوگوں کو امت کے بدترین افراد میں شمار کیا ہے ارشاد نبوی ﷺ ہے۔

"میری امت کے بدترین لوگ وہ ہیں جو ناز و نعم میں پیدا ہوئے اور اسی میں پلے اور بڑھے، جن کو ہر وقت بس انواع واقسام کے کھانوں اور طرح طرح کے لباس زیب تن کرنے کی فکر دامن گیر رہتی ہے اور جو (تکبر کی وجہ سے) مشار مشار (چباچبا کر) بات چیت کرتے ہیں۔

سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے کہ تم (زیب و نیت کے لیے) بار بار غسل خانوں کے چکر لگانے اور بالوں کی بار بار صفائی سے بچتے رہو اور عمدہ عمدہ قالینوں کے استعمال سے بھی بچو، اس لیے کہ اللہ کے خاص بندے عیش و عشرت کے دلدادہ نہیں ہوتے۔

(کتاب الزہد ص:۲۶۳)

نور شاہ......مانسہرہ

باتوں سے خوشبو آئے

● پرندہ زندہ ہو تو چیونٹیاں کھاتا ہے مگر جب پرندہ مر جاتا ہے تو وہی چیونٹیاں اسے کھاتی ہیں۔

● ایک درخت ایک لاکھ ماچس کی تیلی بنا سکتا ہے مگر ماچس کی ایک تیلی ایک لاکھ درخت جلا سکتی ہے۔

● زندگی میں کبھی کسی کو مت ستانا اس وقت شاید آپ طاقت ور ہوں مگر وقت آپ سے زیادہ طاقتور ہے۔

● زمین انسان کو رزق دیتی ہے لیکن جب انسان مرتا ہے تو پھر وہی زمین اسے اپنا رزق بنا لیتی ہے۔

زویا خان......راولپنڈی

سنہری باتیں

۞ ہمارے زندہ رہنے کا فائدہ ہی کیا ہے کہ اگر ہم ایک دوسرے کے حالات کی تلخی کم نہ کر سکیں۔

۞ جب انسان کے دل میں روشنی نہ ہو تو وہ چراغوں کے میلے میں کیا حاصل کرے گا۔

۞ لوگ چاند پر پہنچنے کے لیے ہزاروں جتن کر لیں گے مگر دل تک پہنچنے کے لیے کچھ بھی نہیں کیا۔

۞ جو محبتیں وقت پر ادا نہ ہو سکیں وہ قرض کی طرح سود در سود چڑھتی چلی جاتی ہیں۔

۞ انتظار مرتا نہیں آنکھوں میں جم جاتا ہے ہاں بس آنکھیں مرجاتی ہیں۔

صنم ناز......گوجرانوالہ

بغض و کینہ

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ ہر ہفتے میں دو دن دوشنبہ اور پنجشنبہ کو لوگوں کے اعمال پیش ہوتے ہیں تو بندہ مومن کی معافی کا فیصلہ کر دیا جاتا ہے۔ سوائے ان دو آدمیوں کے جو ایک دوسرے سے کینہ رکھتے ہوں پس ان کے بارے میں حکم دیا جاتا ہے کہ ان دونوں کو چھوڑے رکھو یعنی ان کی معافی نہ لکھو جب تک کہ یہ آپس کے اس کینہ اور باہمی دشمنی سے باز نہ آئیں اور دلوں کو صاف نہ کر لیں۔

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا۔ "تم دوسروں کے متعلق بدگمانی سے بچو کیونکہ بدگمانی سب سے جھوٹی بات ہے تم کسی کی کمزوریوں کی ٹوہ میں نہ رہا کرو اور جاسوسوں کی طرح راز دارانہ طریقے سے کسی کے عیب معلوم کرنے کی کوشش بھی نہ کیا کرو اور نہ آپس میں حسد کرو نہ بغض و کینہ رکھو اور نہ ایک دوسرے سے منہ پھیرو۔ بلکہ اے اللہ کے بندو، اللہ کے حکم کے مطابق بھائی بھائی بن کے رہو۔

بلی شاہد......گلشن اقبال



خوشبوئے سخن

نوشین اقبال نوشی

آرزوئے گل

ہر کہانی سفر میں چھوڑ آئے
زندگانی سفر میں چھوڑ آئے
کچھ سنبھالا گیا نہ الفت میں
ہر نشانی سفر میں چھوڑ آئے
دیکھتے کیا ہو میرے چہرے کو
ہم جوانی سفر میں چھوڑ آئے
بھوک سے جب مَرے تو یاد آیا
دانہ پانی سفر میں چھوڑ آئے
یاد رکھنے کو یہ بھی کافی تھا
رت سہانی سفر میں چھوڑ آئے
غم کا دریا تو دل میں ٹھہرا تھا
اور روانی سفر میں چھوڑ آئے
عشق میں ہم نے بار ہا گوہر
خاک چھانی سفر میں چھوڑ آئے

غلام فرید گوہر

غزل

مسئلہ یہ نہیں کہ میں نے تعلق قطع کرلیا ہے
مسئلہ یہ ہے کہ اس کا الزام اپنے سرلیا ہے
مسئلہ یہ نہیں کہ شعلوں سے حرارت لی ہے
مسئلہ یہ ہے کہ ہاتھوں میں انہیں بھرلیا ہے
مسئلہ یہ نہیں کہ مجھ کو وہ میسر نہیں ہے
مسئلہ یہ ہے کہ اس نے اجنبی خود کو کرلیا ہے
مسئلہ یہ نہیں کہ دنیا میری مخالف ہے
مسئلہ یہ ہے کہ اس نے لوگوں کا یقین کرلیا ہے
مسئلہ یہ نہیں جو بات وہ کہے سچ ہے فرح
مسئلہ یہ ہے کہ دل نے اس پہ اعتبار کرلیا ہے

شاعرہ: فرح بھٹو......شہر: حیدرآباد

غزل

دیوار و در سے ہوتی رہی گفتگو تمام
اپنی تو رائیگاں ہی گئی جستجو تمام
بکنے پہ آ گئی ہے جنس وفا گری
بازار میں ہیں بیٹھے لئے آبرو تمام
کیسے حضور قلب کی دولت نصیب ہو
پڑھتے نماز عشق رہے بے وضو تمام
زخم اتنے دوستوں کی طرف سے عطا ہوئے
حسرت سے دیکھتے ہیں ہم کو عدو تمام
اس کی جدائیوں نے وہ گھاؤ ہمیں دیئے
ہو پائے زندگی میں نہ ہم سے رفو تمام
پھوٹے نہال ذات پہ جو غنچہ ہائے ہجر
خون جگر سے پاتے رہے ہیں نمو تمام
تو نے نگاہ ناز سے ایسی پلائی مے
رندوں نے اپنے ہاتھوں توڑے سبو تمام
ہم پہ اداسیاں ہی مریم ہیں مہرباں
لوٹے یہاں غموں نے مرے رنگ و بو تمام

مریم ناز......ہارون آباد

غزل

فغانِ اہلِ برما سے ہے ہلچل آسمانوں میں
مگر اہلِ زمیں نے انگلیاں ڈالی ہیں کانوں میں
عبث ہے سست رفتاری کا یہ الزام ناقوں پر
حدی خوانی نہیں آتی کسی کو ساربانوں میں
یہاں پر آستینوں میں ہزاروں سانپ پلتے ہیں
کئی صیاد ہیں شامل تمھارے باغبانوں میں
تھے بحر و بر تمھارے تابع فرمان صدیوں تک
وہ تم تھے بجلیاں پلتی تھیں جن کے آشیانوں میں
ہوا عرصہ بلالی روح سے عاری ہوئی دنیا
کہ وہ جذبِ دروں باقی نہیں ہے اب اذانوں میں
تمہارے عزم کے آگے حوادث سر جھکاتے تھے
مگر مفقود ہے اب وہ شجاعت نوجوانوں میں
حرم رسوا ہوا سیماب ان کی بے ضمیری سے
حمیت ہوگئی عنقا حرم کے پاسبانوں میں

بسمل سیماب......نئی دہلی، انڈیا

غزل

میری موت پہ کوئی اک بھی بولتا نہیں
سرحدوں کے در کوئی اک بھی کھولتا نہیں
انتظار میں ہوں کہ کوئی آئے گا یہاں
پر مرے غموں کو کوئی بھی تولتا نہیں
میرے پیچھے کوئی آواز اٹھاتا ہی نہیں
یہ ہی بات میرا دشمن بھی بھولتا نہیں
آزادی کی نیند میں سونا چاہتا ہوں اب
جھولے کو مرے مگر کوئی جھولتا نہیں
سرحدوں کے در کوئی اک بھی کھولتا نہیں

مبشر ریاض بھٹی......تلہ گنگ

غزل

وہی تھی کل بھی پسند اور وہی ہے آج پسند
الگ مزاج ہے میرا، الگ مزاج پسند
میں کیا کروں کہ مری سوچ مختلف ہے بہت
میں کیا کروں مجھے آیا نہیں سماج پسند
میں اپنی راہ نکالوں گا اپنی مرضی سے
مجھے نہیں ہیں زمانے، ترے رواج پسند
یہ میرا دل، مری آنکھیں، یہ میرے خواب، عذاب
اٹھا اے عشق تجھے جو بھی ہے خراج پسند
محاذ عشق پہ خود ہی شکست مانی ہے
زبیر دل کو ہوا ہے کسی کا راج پسند

زبیر قیصر......اٹک

عشق

ہر گھڑی عشق ہے
زندگی عشق ہے
سچا سائیں مرا
آپ ہی عشق ہے
شاہ جیلانی کی
نوکری عشق ہے
رُوح نَلھا کہے
رقص بھی عشق ہے
جو کرے تاج ور
وہ سخی عشق ہے
سچ ہے دارین کی
روشنی عشق ہے
ہم سے عشاق کا
مُرشدی عشق ہے
کربلا کا سبق
عشق ہی عشق ہے
مال و دولت نہیں
قیمتی عشق ہے
اہلِ ملتان کا
کام ہی عشق ہے
تو مری زیست کا
آخری عشق ہے

مبشر سعید......ملتان

غزل

بال بکھرے ہوئے ہیں شانوں پر
شام اترے نہ کیوں منڈیروں پر
وقت روکا ہوا ہے صدیوں سے
ہونٹ رکھے ہوئے ہیں پھولوں پر
کیا قیامت ہے موسم گل میں
دھوپ اگنے لگی شاخوں پر
ہو رہی ہے اذاں تہجد کی
اشک اترے ہوئے ہیں پلکوں پر
کوئی اترا نہ آسمانوں سے
خواب جلتے رہے زمینوں پر
رات لپٹی رہی دریچے سے
زخم اگتے رہے ہیں بیلوں پر
مجھ کو رونا ہے عمر بھر میثم
سر لگا کے خود اپنے کاندھوں پر

شاعر: میثم علی آغا

انتخاب: پرنس افضل شاہین......بہاولنگر

ساون رت

ساون رت میں اور تم
چھم چھم برستی بارش میں
بھیگ رہے تھے میں اور تم
گرما گرم پکوڑے ہوں
بھاپ اڑاتی چائے ہو
ساری دنیا دیکھ رہی ہو
کھاتے جائیں ہم اور تم
جگنو تتلی بادل بارش

چاند ستارے میں اور تم
گھور اندھیری راتوں میں
روشن چاند میں اور تم
بن میں پنچھی چہک رہے تھے
مہک رہے تھے میں اور تم
مردہ ہوشی کا عالم تھا
گم صم گم صم میں اور تم
سارا عالم رقص میں تھا
جھوم رہے تھے میں اور تم

فریدہ فری یوسفزئی...... لاہور

زلفیں

زلفیں با کمال تیری
یہ چہرہ بے مثال تیرا
زمانہ چاہے لاکھ کہتا رہے
مگر نہیں ہے غلط یہ خیال میرا
کہہ بیٹھا ہوں ضد میں الوداع اس کو
تجھے سونے نہیں دیتا اب ملال میرا
میرے لفظوں میں دکھتے ہیں سبھی رنگ اس کے
تیرے لکھنے میں نہیں ہے کوئی کمال میرا
اک میں ہوں کرتا ہوں ہر وقت ذکر اس کا
اک وہ ہے کہ سنتا ہی نہیں کوئی سوال میرا
چلو آؤ آج دیکھتے ہیں صائم
تو جلال میرا، میں جمال تیرا

ظہور احمد صائم...... مانگا منڈی لاہور

غزل

درد کے ساغر پلائے جائیں گے
اس طرح سے ہم ستائے جائیں گے
زندگی بھر ہم نے یہ سوچا نہ تھا
تیری محفل سے اٹھائے جائیں گے
بالیقیں ہوں گے ذلیل و خوار ہی
ہم جہاں بھی بن بلائے جائیں گے
یہ نہ سوچا تھا کہ راہ عشق میں
اس طرح ہم آزمائے جائیں گے
کچھ سمجھ آتا نہیں ہے کس طرح
داغہائے غم مٹائے جائیں گے
ایک دن بھی یقیناً آئے گا
شعر اپنے گنگنائے جائیں گے
بات سچ ہے بے وفاؤں کو قمر
درد کے قصے سنائے جائیں گے

ریاض حسین قمر...... منگلا ڈیم

نئے افق ستمبر کے سرورق پر غزل

پیاری لڑکی

بالوں میں مانگ نکالے
ماتھے پہ ٹیکہ ساجے
بھنویں کمانی اس کی
آنکھوں میں کاجل لاگے
پلکیں شرمیلی سی تو
ہونٹوں پہ تبسم ساجے
چمکتے ستاروں ایسے
کانوں میں جھمکے پہنے
صراحی سی گردن میں وہ
ڈھولن تو تیڑی پہنے
بقعہ نور ہالہ
گالوں کی لالی دمکے
چنری میں شرم وحیات کی
دکھتی وہ حور لاگے
عید میں سج سنور کے روپی
پیاری مستور لاگے

(بقلم خود)

عبدالجبار رومی انصاری...... ستی قصور

غزل

سانس چلنے لگتی ہے تمہارے آنے سے
سانس رکنے لگتی ہے تمہارے جانے سے
نہ تم سے کوئی غرض نہ مطلب ہے
بس تم سے وابستہ ہیں کچھ خواب سہانے سے
محبت نے یہ کیسی آزمائش میں ڈالا ہے
کشتی امید ڈوب رہی ہے بچانے سے
تمہاری بانہوں میں مرجانا چاہتے ہیں
کوئی پابندی تو نہیں اس طرح مرجانے سے
زندگی کے کھیل بھی بڑے عجیب ہے مدثر

کچھ بھی نہیں بن رہا سب کچھ بنانے سے

مدثر اقبال وٹو...... مچن آباد

غزل

اپنوں کی نفرت سے سہارے ٹوٹ جاتے ہیں
وفا کی طغیانی سے کنارے ٹوٹ جاتے ہیں
سچے دوستوں کی بے وفائی سہہ تو سکتے ہیں
مگر پتا ہے کتنے دل ہمارے ٹوٹ جاتے ہیں
زرد پتے نہ رہیں گے سر شاخ ہرگز
نفرت کی ہواؤں سے پیارے ٹوٹ جاتے ہیں
جل گئیں تن کی کھیتیاں تو پریشانی کیا
اندر کی تقدیر کے ستارے ٹوٹ جاتے ہیں
دو پرندوں میں محبت دیکھی تھی بہت ہم نے
غریب کی صداؤں سے دلارے ٹوٹ جاتے ہیں
نوک خنجر سے میں نے تبسم کا خلاصہ لکھ دیا میں نے
وفا کا بھید کھلنے سے دوارے ٹوٹ جاتے ہیں
حسن اور عشق میں تفریق ہے بہت حسن
ظاہر دونوں کرنے سے نظارے ٹوٹ جاتے ہیں

ایم حسن نظامی...... قبولہ شریف

وہ دن

کیا وہ دن لوٹ سکتے ہیں
جب صرف میں اور تم تھے
اکیلے وادیوں میں
حسین جھیلوں میں
پھولوں کے چمن میں
تتلیوں کے بھنور میں
سمندر کی لہروں میں
چڑیوں کی بحروں میں
دسمبر کی سرد رات کو
جون کے گرم دن میں
کیا وہ دن لوٹ سکتے ہیں
جب ہم یک جاں تھے
عہد و پیماں تھے
دلوں میں رہتے تھے
سانسوں میں بہتے تھے
کیا وہ دن لوٹ سکتے ہیں
جب تجھ میں صرف میں
اور مجھ میں صرف تو تھا
چاندنی راتوں میں
برستی بارش میں
جب ہم ساتھ تھے
کیا وہ دن لوٹ سکتے ہیں
اب آ جاؤ نا پلٹ کر
دل یاد کرتا ہے بہت
جی لیتے ہیں پل بھر
اکٹھے مسکرا کر
اے میرے ہم سفر
کیا تم لوٹ سکتے ہو
کیا وہ دن لوٹ سکتے ہیں؟

عامر خان چاند...... کوٹ ادو

سانپ سیڑھی

یہ جو سانپ سیڑھی کا کھیل ہے
ابھی ساتھ ہی تھے دونوں ہمنوا!
وہ بھی ایک پہ میں بھی ایک پہ!
اسے سیڑھی ملی وہ بڑھ گیا!
مجھے رستے میں ڈس لیا میرے بخت کے سانپ نے!
بڑی دور سے لوٹنا پڑا چوٹ نصیب کی کھا کے!
وہ ننانوے پہ پہنچ گیا میں دس کے پھیر میں گھر گیا!
اسے ایک چاہیے تھا سو نہیں ملا میں بڑھتے بڑھتے بڑھ گیا!
بس اک چوکے کی بات تھی!
مگر اس سے جیت میری مات تھی!
میں نے جان کے گوٹ غلط چلی اور سانپ کے منہ میں ڈال دی!
یہ پیار بھی کبھی سوچنا سانپ سیڑھی کا کھیل ہے

انتخاب: ناصر محمود...... ہانگ کانگ



مرشد

ساحر جمیل سید

قسط نمبر5

قدم قدم ہنگاموں اور حادثوں کے ساتھ ساتھ پروان چڑھنے والے عشق کی روداد دل گداز

اس نے نزہت جہاں بیگم کے کوٹھے پر آنکھ کھولی

مسلے، مرجھائے گجرے، باسی پھول اور گھنگرو اس کے کھلونے بنے

بدمعاشوں کی دنیا نے اسے مرشد مانا اور پھر......وہ کسی کا مرید ہو گیا......!!

شاہی محلے کا نمازی بدمعاش جس نے سرکار سے عشق کیا اور عشق کی مریدی کی



مرشد کو غالباً دہلیز سے ٹھوکر لگی تھی۔ مگر اس نے سنبھلنے اور اٹھنے میں لحہ بھر کی بھی دیر نہیں کی۔ موالی ملنگ اور کتکان' دونوں بائیں طرف منہ اٹھائے کھڑے تھے۔ کتکان کچھ بھونک بھی رہا تھا۔

پوری گلی میں فاصلے فاصلے پر بس دو تین بلب ہی روشن تھے۔ مرشد نے دیکھا کہ موٹر سائیکل سوار اگلی گلی کی نکڑ مڑ رہے تھے۔ البتہ چاچے گوگے کے کھوکھے کے سامنے ملگجے سے اندھیرے میں تین ہیولے سے موجود تھے' ایک شخص غالباً نیچے گرا پڑا تھا اور دو اس پر جھکے ہوئے تھے۔

''زریون؟''

مرشد نے ایک اندازے کے تحت پکارا اور پسٹل پر گرفت مضبوط کرتے ہوئے آگے بڑھا

''یس...... پلیز ہیلپ می۔''

توقع کے مطابق وہ زریون اور اس کے ساتھی ہی تھے۔ مرشد کو آواز سے محسوس ہوا کہ وہ زخمی ہے۔ چند ہی لمحوں میں مرشد ان کے قریب تھا اور اس کے عقب میں مراد' ساون اور جعفر بھی تھا۔

''اسے ہماری گاڑی تک پہنچانے میں ہیلپ کیجیے پلیز۔''

قریب پہنچتے ہی زریون مرشد سے مخاطب ہوا تھا۔ مرشد نے دیکھا کہ زریون کے بائیں ہاتھ میں پسٹل تھا اور دائیں بازو میں غالباً گولی لگی تھی کیونکہ اس کی سفید آستین سے خون نچڑ رہا تھا۔ نیچے گرا ہوا اس کا ساتھی زیادہ زخمی تھا۔ اسے دو گولیاں لگی تھیں۔ ایک پسلیوں میں اور دوسری پشت پر کندھے میں اور یقیناً یہ قاتلانہ حملہ انہی موٹر سائیکل سواروں نے کیا تھا اور بعد والی تین چار فائر زان پر زریون نے کیے ہوں گے۔

''کون لوگ تھے؟ کوئی دشمن داری ہے یا......''

''ہاں' دشمنی ہی کا معاملہ ہے۔ آپ پلیز اسے گاڑی تک پہنچانے میں ڈیوڈ کی مدد کیجیے' میرے شاید بازو کی ہڈی متاثر ہوگئی ہے۔''

مرشد کے سوال پہ زریون نے کہا' اس کے چہرے پر تکلیف کے آثار تھے اور کچھ دیر پہلے تک والا سارا نشہ جیسے ہرن ہو چکا تھا۔

''خون بہت بہہ رہا ہے' آپ ادھر سے پکڑیے اسے۔''

ڈیوڈ نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا اور زخمی کی بغلوں میں ہاتھ ڈال کر اسے اٹھانے کی کوشش کی تو اس بے چارے کے حلق سے بے اختیار کراہیں ابل پڑیں۔

''اوئے میرے خدا...... ہائے' آہ' بس' بس اب میں نہیں بچنے والا نہیں۔''

''بھونکو مت' چپ رہو تم۔''

زریون نے اسے دبکا تھا۔ مراد اور جعفر دونوں آگے بڑھ کر زخمی پر جھک گئے۔

''نہیں......زر...... زریون! پاپا کو سوری بولنا اور...... اور براؤن والا بریف کیس سائرہ تک پہنچا...... پہنچانا۔''

''کچھ نہیں ہوگا تمہیں۔''

''مرد بنو یار! دو تو گولیاں لگی ہیں کیوں دل چھوڑ رہے ہو' جعفر پکڑو ذرا۔'' مراد نے پہلے زخمی کو مخاطب کیا پھر جعفر کو دونوں نے مل کر اسے اٹھایا تو زریون فوراً بولا۔

''گاڑی اس طرف ہے...... وہ دائیں ہاتھ والی بڑی گلی میں۔''

''اگر کہو تو ہم اسپتال تک پہنچا آئیں تم لوگوں کو۔''

''اس کی ضرورت نہیں' ڈیوڈ بالکل ٹھیک ہے' ڈرائیو کرلے گا وہ۔''

مرشد کے پوچھنے پر زریون نے جواب دیا۔ جعفر اور مراد زخمی کو اٹھا کر آگے بڑھے تو زریون اور ڈیوڈ بھی فوراً ہی ان کے پیچھے چل دیئے۔

''ساون......کوئی پریشانی ہے کیا؟''

شبیرے کی آواز پر ان دونوں نے مڑ کر دیکھا۔ شبیرا اور دلشاد بیٹھک کے دروازے پر دکھائی دے رہے تھے۔

''کوئی پریشانی نہیں سب ٹھیک ہے۔''

ساون نے پلٹ کر جواب دیا۔ مرشد چاچے گوگے کے تھڑے پر بیٹھ گیا۔

''کون لوگ تھے یہ؟''

''معلوم نہیں۔''

ساون نے مرشد کی طرف دیکھا' اس کے چہرے پر

غیر معمولی سنجیدگی تھی اور وہ کچھ ہی فاصلے پر موجود نزہت بیگم کے کوٹھے کی طرف دیکھ رہا تھا' ساون خاموش ہو رہا۔

مرشد کی نظریں لکڑی کے ان کہنہ زینوں پر ٹکی تھیں جو وحید درزی اور استاد عارف ساؤنڈ والے کی دکانوں کے درمیان سے اوپر کوٹھے تک جاتے تھے۔ کوٹھے کی بغلی طرف والی گلی خاصی کشادہ تھی' جعفر اور مراد زریون کے زخمی ساتھی کو اٹھا کر اسی گلی میں گئے تھے۔ کوٹھے کا ایک داخلی راستہ اس طرف بھی تھا۔

لکڑی کے ان زینوں کا اختتام ایک گیلری نما حصے پر ہوتا تھا' جس کے سامنے لکڑی ہی کی ریلنگ موجود تھی۔ ایک طرف داخلی دروازہ اور ریلنگ کے اختتام کے قریب ایک کھڑکی' گیلری میں ایک کمزور سا بلب روشن تھا جس کی زرد روشنی میں وہ حصہ خاصا شکستہ اور نحوست زدہ سا دکھائی دے رہا تھا۔ جیسے...... جیسے کسی آسیب نگری کا راستہ یا پھر کسی عقوبت گاہ کا ایک بیرونی منظر...... اسی آسیب نگری' اسی عقوبت گاہ میں اس نے جنم لیا تھا۔ پرورش پائی تھی اور اسی عقوبت گاہ' اسی نحوست خانے میں اس کی ماں زندگی کے نام پر جیسے ایک سزا کاٹتی آئی تھی اور ہنوز کاٹ رہی تھی اور شاید آخری سانس تک اسے یہ سزا کاٹتے رہنا تھا' کیونکہ یہ اس کا اپنا انتخاب تھا۔ اپنی مرضی کا سودا تھا' سال ہا سال سے ہر لمحہ' ہر گھڑی اس کی زندگی بس ایک انتظار بن کر رہ گئی تھی۔ ایک ایسا انتظار جس کی شاید کوئی منزل نہ تھی۔ کوئی حاصل نہ تھا' مگر پھر بھی وہ اس انتظار کی قیدی تھی اور راضی خوشی اس قید میں اپنا آخری سانس تک گزار دینے کی خواہش مند تھی۔

مرشد نے جب سے ہوش سنبھالا تھا تب سے اس محلے...... اس ماحول کو ناپسند کرتا آیا تھا۔ یہی ناپسندیدگی وقت کے ساتھ ساتھ نفرت میں ڈھلتی گئی تھی۔ اسے گھن آتی تھی' اپنے اس ماحول سے بھی اور اکثر اوقات اپنے آپ سے بھی کہ وہ یہیں کی پیداوار تھا۔ اسی غلیظ دنیا کا حصہ تھا۔ وہ یہاں نہیں رہنا چاہتا تھا اور شاید کب کا وہ یہاں سے کہیں دور چلا گیا ہوتا...... مگر وہ مجبور تھا...... اپنی ماں کی وجہ سے' اس کی اب تک کی زندگی میں اس کی واحد مجبوری اور کمزوری اس کی ماں ہی تھی' جس سے وہ بے تحاشا محبت کرتا تھا' جس سے دور وہ کسی صورت' کسی قیمت پر نہیں جا سکتا تھا...... گزشتہ چند سالوں میں وہ ہر ممکنہ کوشش کر چکا تھا کہ ماں کو یہاں سے کہیں دور چلے چلنے پر آمادہ کرلے مگر...... لاحاصل......! اس کی یہ بات ماننے کو وہ تیار نہیں تھی...... مرشد کو غصہ آجاتا تھا۔ وہ جھنجلاہٹ کا شکار ہو جاتا تھا کہ ماں نے بے وجہ اس جہنم کی اسیری قبول کر رکھی تھی۔ وہ ایک پرچھائیں کی منتظر تھی' ایک سراب کا شکار تھی' مرشد کے نزدیک وہ ایک ایسے بدنسل انسان کے لایعنی انتظار میں زندگی گھلا رہی تھی جسے کبھی نہیں لوٹنا تھا مگر وہ تھی کہ اس شخص کے متعلق کوئی ایک بھی برا جملہ سننے کو تیار نہیں تھی۔ مرشد اچانک اپنی جگہ سے اٹھا اور تیز قدموں سے بیٹھک کی طرف بڑھ گیا۔ یکایک سینے میں جیسے انگارے سے دہک اٹھے تھے۔ بیٹھک میں آکر وہ سیدھا غسل خانے میں گھسا اور کپڑوں سمیت ہی پانی کے نل کے نیچے بیٹھ گیا۔ کافی دیر بھیگتے رہنے کے بعد وہ باہر نکلا کپڑے تبدیل کیے' نماز ادا کی اور پھر صحن میں چبوترے پر آبیٹھا...... دل و دماغ میں قدرے سکون اتر آیا تھا۔

دن کے تقریباً آٹھ بجے لالا دلاور آپہنچا...... رسمی علیک سلیک کے بعد اس نے بتایا کہ رات ڈیرے پر پنچایت بیٹھی تھی۔ کالے خان کے ساتھ گھوڑا بھی آیا تھا اور سارا معاملہ رفع دفع ہوگیا ہے۔ اب ان لوگوں کی طرف سے کوئی شرارت نہیں ہوگی...... مرشد بس ہوں ہاں کرتا رہا تھا۔ اس نے ان سب باتوں میں دلچسپی لی تھی نہ کوئی توجہ دی تھی۔ دلاور تقریباً آدھا گھنٹہ وہاں بیٹھا رہا اور جب وہ واپس جانے لگا تو مرشد نے رستم کے پانچ بندوں کو بھی اس کے ساتھ ہی روانہ کردیا۔ وہ لوگ روانہ ہوئے ہی تھے کہ ٹڈا اچھو آ گیا' مرشد' ساون اور مراد اس وقت چبوترے پر بیٹھے ناشتہ کر رہے تھے۔

''آ بھئی گھوڑے کی شکل والے گدھے! کیسے آیا ہے؟''

''مرشد بھائی! وہ...... خالہ کہہ گئی ہیں کہ مہمان کا خیال رکھنا۔''

''پوری بکواس کیا کر۔''

''وہ خالہ کہیں منت ماننگنے گئی ہیں' تو وہ کہہ رہی تھیں کہ آپ کو ان کا پیغام دے دوں کہ وہ حجاب بی بی خالہ کی

مہمان ہیں' ان کا خیال رکھنا ہے کہ انہیں ادھر کوئی پریشانی وغیرہ نہ ہو...... خالہ رات تک یا پھر کل دن میں کسی وقت واپس آئیں گی۔

مرشد کا نوالہ بناتا ہوا ہاتھ ٹھٹک گیا۔

''کہاں منت مانگنے گئی ہیں اماں؟''

''یہ تو انہوں نے نہیں بتایا۔''

''اور یہ حجاب بی بی کون ہے؟''

''وہی لڑکی وہ...... جس کا آپ پوچھ رہے تھے۔''

''وہ پٹولا۔'' مرشد کے پردہ تصور پر سرخ انگور جیسے ہونٹ ابھر آئے۔ ایک چہرہ روشن ہوا اور خوفزدہ آنکھیں چمک اٹھیں۔

''جی۔''

ساون اور مراد دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا تھا۔

''ٹھیک ہے' تو نکل۔''

مرشد نے نوالہ چھوڑ دیا...... پھر تیز لہجے میں بولا۔

''اماں کو گئے کتنی دیر ہوئی ہے؟''

''گھنٹے سے زیادہ ہوگیا' انہوں نے خود ہی کہا تھا کہ ان کے جانے کے ایک گھنٹے بعد آپ کو پیغام دوں۔''

اچھو نے ٹھٹکتے ہوئے جواب دیا اور پھر مرشد کے ہاتھ کے اشارے پر پلٹ کر بیرونی دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ مرشد کے چہرے پر قدرے فکرمندی کے آثار ابھر آئے تھے۔ یہ اطلاع اس کے لیے حیرت کے ساتھ ساتھ پریشانی کا باعث بھی تھی۔

اماں کا گھر سے نکلنا حیران کن تھا' گزشتہ تین سالوں سے وہ باہر نہیں نکلی تھی۔ اس سے پہلے اس نے لاہور شہر اور اردگرد کے شہروں میں کوئی دربار' مزار نہیں چھوڑا تھا جہاں حاضریاں نہ دی ہوں' منتیں نہ مانگی ہوں' کوئی پیر فقیر ایسا نہیں تھا جس کے حضور وہ حاضر نہ ہوئی ہو...... مگر تین سال پہلے وہ یہ سب چھوڑ چکی تھی' شاید اس سب سے تھک گئی تھی یا پھر ان راستوں سے مایوس ہوگئی تھی' اور تین سال بعد آج اچانک پھر وہ منت مانگنے نکل کھڑی ہوئی تھی۔ اب تو اس کی صحت اور ہمت بھی اتنی نہیں تھی کہ وہ کہیں آجاسکتی۔

مرشد کو فکرمندی نے آلیا...... پتا نہیں اماں نے دوا کا کیا کیا تھا اور اپنے ساتھ کسے لیا تھا' تین سال پہلے تو زیادہ تر شازیہ ہی اس کے ساتھ ہوا کرتی تھی۔

مرشد نے پانی کی گڑوی اٹھا کر کلی کی اور پھر ہاتھ پر پانی گراتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔

''تم لوگ ناشتہ کرو میں آتا ہوں۔''

اس نے سفید دھوتی اور سفید کرتا پہن رکھا تھا' پسٹل اٹھا کر اس نے ڈب میں پھنسا لیا تھا۔

''ناشتہ تو پورا کرلے یار۔''

ساون نے اس کی فکرمند صورت پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

''بس ہوگیا پورا۔''

مرشد پلٹ کر بیرونی جانب بڑھ گیا۔

''آفرین ہے یاران ماں بیٹے کی محبت پر تو...... کبھی کبھی تو رشک آتا ہے۔'' مرشد کے باہر نکلتے ہی ساون مراد سے مخاطب ہوا تھا۔

''خالہ کا تو پتا نہیں اپنا مرشد واقعی اس سے شدید محبت کرتا ہے۔''

''وہ ماں ہے' اس کی محبت کو کیا تولے گا تو۔''

''مائیں تو ہماری بھی ہیں' کتنی ہوتی ہے ماں کی محبت؟''

''ہماری ماں میں اور مرشد کی ماں میں فرق ہے۔ وہ مشین نہیں بنی' اندر سے بھی آج تک عورت ہی ہے۔ اسی لیے اس کے سینے میں اصلی والی ممتا بھی ہے اور ہم سبھی جانتے ہیں کہ وہ عورت مرشد ہی کو دیکھ دیکھ کر جیتی آئی ہے آج تک...... ورنہ میر صاحب والا روگ تو کب کا اس بے چاری کو کھا چکا ہوتا۔''

''ہاں...... اور یہی روگ اس کے ساتھ ساتھ مرشد کا کلیجہ بھی کھائے جارہا ہے۔ یہ بات اس ماں کو شاید سمجھ نہیں آرہی۔''

''آتی ہوگی سمجھ مگر وہ بے چاری مجبور ہے...... میر صاحب کا انتظار اس کے پیروں کی بیڑیاں بنا ہوا ہے نا۔''

مراد نے ایک بڑا سا نوالہ منہ میں ڈالا اور ساون کی صورت دیکھتا رہا۔

سارا بازار' پورا محلہ حسن آرا اور میر صاحب کی داستان سے اچھی طرح واقف تھا...... سال ہا سال بیت چکے تھے مگر حسن آرا آج بھی میر صاحب کی واپسی کی منتظر تھی۔ وہ آج بھی پریقین تھی کہ میر صاحب ضرور واپس آئیں گے اور لوگ اس کے اس یقین پر حیران ہوتے تھے...... طوائفوں کی اکثریت اس کے لیے اچھے اور ہمدردانہ جذبات رکھتی تھی کہ حسن آرا کی زندگی میں ایک ہی آدمی آیا تھا اور اس کے بعد آج تک کی زندگی اس نے گویا عدت میں گزاری تھی۔

بقول شاعر......

اے عشق ہم نے تیری اطاعت میں کاٹ دی
اس سے بچھڑ کے عمر ہی عدت میں کاٹ دی

مرشد بازار والوں کے سلام کے جواب میں سر ہلاتا ہوا تیز قدموں سے چلتا گھر تک پہنچا تھا۔ اندر داخل ہوتے ہی اس کی نظر شازیہ اور خالہ سندس پر پڑی۔ وہ دونوں صدر دالان میں موجود تھیں...... خالہ نیچے بیٹھی تھی اور شازیہ تخت پوش پر بیٹھی اس کا سر دیکھ رہی تھی۔ دونوں نے کھلے گلے کی تنگ قمیص پہنی اور دونوں کے دوپٹے ندارد تھے۔

مرشد پر نظر پڑتے ہی شازیہ کا چہرہ کھل اٹھا البتہ خالہ سپاٹ صورت بیٹھی رہی۔

''اماں کہاں ہے؟'' مرشد نے پہنچتے ہی سوال داغا تھا۔

''کہیں منت مانگنے گئی ہیں۔''

''ساتھ کون گیا ہے؟''

''میں نے بہت کہا انہیں کہ مجھے ساتھ لے چلیں...... میں چلتی ہوں مگر وہ مانی ہی نہیں...... اکیلی ہی نکل گئیں۔''

''تو نے جانے کیوں دیا...... مجھے بلالیا ہوتا۔''

مرشد نے بے چینی سے کہا اور ایک طرف موڑھے پر بیٹھ گیا۔

''کچھ بتایا نہیں کہ کس جگہ جارہی ہیں؟''

''نہیں۔''

''چار قدم چل کر تو تھک جاتی ہیں اماں...... پتا نہیں کدھر نکل گئی ہیں۔'' اس نے جیسی خود کلامی کی تھی۔ فکرمندی میں اضافہ ہوگیا تھا۔

''تیری طرح وہ بھی تو اپنی مرضی کی مالک ہے۔ کوئی کیا کہہ سکتا ہے۔'' خالہ بلند آواز میں بڑبڑائی تھی۔

''ہر کوئی اپنی مرضی کا مالک ہوتا ہے۔''

''ہر کسی کی مرضی کہاں چلتی ہے۔''

شازیہ نے فوراً حصہ ڈالا تھا۔ اس کی مسکراتی نظریں مرشد پر جمی تھیں۔ مرشد خاموش رہا۔ اسے خیال آیا کہ تین سال بعد اچانک غیر متوقع طور پر اماں منت مانگنے چلی گئی اور جسم میں سکت نہ ہونے کے باوجود اکیلی ہی چلی گئی۔ شازیہ کے اصرار کے باوجود اسے ساتھ لے کر نہیں گئی کیوں؟ اچھو کو بھی گھنٹے بعد پیغام پہنچانے کی تاکید کی' یقینی بات تھی کہ اسے پتا تھا کہ اگر روانگی کے وقت ہی مرشد کو معلوم ہوگیا تو وہ مجھے نہیں جانے دے گا اور اکیلے تو کسی صورت بھی نہیں...... جانا لازمی تھا اور کہاں جانا تھا یہ بھی راز میں رکھنا ضروری تھا اسی وجہ سے شازیہ کو بھی ساتھ نہیں لیا...... مرشد کو اچانک محسوس ہوا کہ اماں منت مانگنے نہیں گئی بلکہ اصل بات کچھ اور ہے...... اس کا دھیان فوراً اس لڑکی کی طرف چلا گیا......

حجاب بی بی...... مہمان!

''یہ مونچھیں چھوٹی کیوں نہیں کرالیتا تو۔''

شازیہ کی آواز نے اس کا دھیان بانٹ لیا مگر وہ بولا کچھ نہیں۔

''کیسے چھتے کا چھتا پال رکھا ہے...... ہونٹوں کا تو ٹھیک سے پتا ہی نہیں چلتا۔''

''اچھا ہی ہے چڑیلوں کی نظر لگنے سے محفوظ ہیں۔'' اس نے سنجیدگی سے کہا اور اٹھ کر حسن آرا کے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

''دو منٹ توجہ سے دیکھ لے تو میں پھر جان چھوڑوں تیری۔''

سندس جہاں نے بیزار سے انداز میں شازیہ سے کہا تو وہ پھر سے اس کے سر کی طرف متوجہ ہوگئی۔

مرشد دالان سے نکل کر کمرے میں چلا آیا۔

حجاب بی بی' پلنگ پر نیم دراز سی پڑی چھت کی

کڑیوں کو تک رہی تھی...... دروازے پر آہٹ محسوس کرتے ہوئے اس نے گردن موڑ کر دیکھا اور مرشد کو اندر داخل ہوتے دیکھ کر ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ وہی روشن چہرہ مرشد کے سامنے تھا۔ ہونٹ کا ورم کم ہو چکا تھا البتہ آنکھوں کے قریب وہ نیلگوں ہلالی نشان ویسا ہی تھا۔ اس نے فوراً دوپٹہ سنبھالا اور گھبرائی ہوئی نظروں سے مرشد کی طرف دیکھا جو دو قدم اندر آ کر کھڑا ہو گیا تھا۔

''حجاب تیرا ہی نام ہے نا؟''

''جی۔''

''تو یہاں کیا کر رہی ہے؟''

''مم...... مجھے خالہ حسن آرا نے کہا تھا کہ میں یہیں رہوں۔''

مرشد خاموش کھڑا چند لمحے اسے تکتا رہا پھر ایک طرف دیوار کے ساتھ رکھے سنگار میز کے اسٹول پر بیٹھ گیا۔ حجاب کے وجود پر وہی لباس اور وہی دوپٹہ تھا جو اس نے بڑے اچھے سے اوڑھ لیا تھا۔

وہ گھبرائی سمٹی سی بیٹھی گود میں دھرے اپنے ہاتھوں کو تک رہی تھی اور مرشد سے اس کے سامنے جیسے حجاب نہیں بلکہ ایک خیالی تصویر رکھی تھی۔ مشرق کی افسانوی تہذیب کی عکاس ایک معصوم صورت باحیا لڑکی کی تصویر۔

مرشد نے اپنے سینے میں ایک عجیب سرسراہٹ محسوس کی اور اچانک ہی اس کے دل میں ایک گھبراہٹ سی آ دھڑکی۔

''اچھا تو کیا فلم ہے تیری؟'' اس نے کھردرے لہجے میں پوچھا۔

''جی...... کیسی فلم؟''

''کیا کہانی کیا ہے تیری...... یہاں کیسے پہنچی؟''

''جھگڑا ہوا تھا' میرے بھائیوں کا اور گاؤں کے چوہدریوں کا' تو وہ لوگ مجھے زبردستی گھر سے اٹھا کر یہاں چھوڑ گئے۔''

''کیا نام ہے تیرے گاؤں کا؟''

''نندی پور۔''

''اور ان چوہدریوں کا؟''

''اکبر علی اور فرزند علی' باپ بیٹا ہیں۔''

مرشد چونک پڑا' ابھی چند روز پہلے ہی تو جاگیردار اکبر علی سے اس کی بات ہوئی تھی' تو یعنی وہ جس لڑکی کے حوالے سے بات کرنا چاہتا تھا وہ یہی تھی...... حجاب!

''تجھے یہاں مارا پیٹا کس نے ہے؟''

''جی' وہ...... ہاشو نز...... نزہت بیگم اور...... اور وہ مجھے جن کاموں پر مجبور کرتے رہے ہیں وہ میں نہیں کر سکتی' کسی صورت بھی نہیں۔''

''اچھا......''

مرشد نے پرسوچ انداز میں ہنکارا سا بھرا...... تقریباً ساری کہانی ہی اس کی سمجھ میں آ گئی تھی۔ وہ اکبر علی جیسے نیچ ذہنیت لوگوں کے مزاج اچھی طرح سمجھتا تھا۔ ایسے لوگ دشمنی میں نہ تو کوئی معیار رکھتے ہیں اور نہ کوئی تمیز' بس اپنے خود ساختہ معیاروں اور اصولوں کی غلامی میں زندگیاں گزار دیتے ہیں۔

مرشد نے دیکھا وہ اسی طرح سر جھکائے بیٹھی تھی' اس کے چہرے کا کچھ حصہ کھلا دکھائی دے رہا تھا اور کچھ دوپٹے کی اوٹ میں چمک رہا تھا۔ مرشد کے اندر کہیں جھنجھلاہٹ سی ہوئی۔

''ابھی اماں کدھر گئی ہے؟''

''جی کون؟'' اسے ٹھیک سے سمجھ نہیں آئی تھی۔

''تیری خالہ حسن آرا نے تجھے میرے متعلق نہیں بتایا؟''

''آپ کو پیغام بھیجا تھا انہوں نے اور...... بتایا تھا کہ آپ آئیں گے اور...... اور یہ کہ میں آپ سے گھبراؤں نہیں۔''

''تو پھر کیوں گھبرا رہی ہے؟''

''جی' نہیں تو...... وہ بس یونہی۔''

''اچھا' اماں کا بتا کدھر گئی ہے وہ؟''

مرشد اس سے سوالات کر رہا تھا اور اس کی نگاہیں لاشعوری طور پر حجاب کے ہونٹوں پر ٹک کر رہ گئی تھیں۔ ان ہونٹوں کی حرکت اسے انتہائی بھلی اور اچھی لگ رہی تھی۔

''اماں۔''

حجاب نے ناسمجھی سے کہا۔ حسن آرا نے اسے اپنے اور مرشد کے رشتے کے بارے میں نہیں بتایا تھا۔

''ہاں' اماں! تیری خالہ حسن آرا میری ماں لگتی ہے۔''

اس بار حجاب نے بے اختیار چونک کر اس کی طرف دیکھا تھا۔ مرشد اندرونی طور پر ایک ذرا گڑبڑایا مگر اس کے چہرے پر کوئی تاثر نہیں آیا۔ حجاب نے یوں مرشد کی صورت دیکھی جیسے پہلی بار اسے دیکھ رہی ہو...... اسے جھٹکا سا لگا تھا' اتنی مشفق اور مہربان عورت اور بیٹا بدمعاش......!

''یہ انہوں نے نہیں بتایا تھا۔'' حجاب نے دوبارہ سر جھکا لیا۔

''اور وہ کسی دربار مزار پر گئی ہیں مگر یہ نہیں بتایا کہ کس مزار پر۔''

مرشد کچھ دیر تک پرسوچ نظروں سے اس کی سمت دیکھتا رہا پھر سر ہلاتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔

''چلو...... ٹھیک ہے' اب اماں نے تجھے مہمان کہا ہے تو بے فکر ہو کر وقت گزار اب تجھے کوئی کچھ نہیں کہے گا۔''

''جی اچھا۔''

مرشد کمرے سے باہر نکل آیا...... دالان خالی پڑا تھا گھر میں مکمل خاموشی تھی' یقیناً باقیوں کی طرح سندس جہاں اور شازیہ بھی آرام کرنے چلی گئی تھیں۔ مرشد عقبی طرف صحن میں نکل آیا...... وہاں پہنچ کر اس نے بلند آواز سے اچھو کو پکارا۔

''اچھو......''

''ابے او اچھو......''

''کیا ہے...... کیا ہوا؟'' دوسری منزل کی ایک کھڑکی سے فوراً ہی شازیہ نے سر نکالا تھا۔

''وہ ٹڈا کدھر ہے؟''

''شور نہ مچا بھیجتی ہوں اسے۔'' وہ کھڑکی سے غائب ہو گئی اور کچھ ہی دیر میں سیڑھیوں سے اچھو نمودار ہوا۔

''جی مرشد بھائی!''

''تو نے یہاں والوں کو بتایا تھا کہ یہ لڑکی اماں کی مہمان ہے؟''

''جی سب کو بتا دیا تھا۔''

''ایک بار پھر بتا دے...... اب یہ مرشد کی بھی مہمان ہے۔ خصوصاً مائی کے اور اس ڈنگر ہاشو کے کان میں بھی ڈال دے یہ بات' چل...... شاباش۔''

''جی بہتر۔''

مرشد اچھو کا گال تھپتھپاتے ہوئے بیرونی جانب چلا گیا۔ اسے یہ تو یقین تھا کہ اب یہاں حجاب کو کوئی پریشان کرنے کی جرات نہیں کرے گا البتہ اماں کی طرف سے اسے پریشانی لاحق تھی۔ وہ واپس بیٹھک پر پہنچا تو مراد کے علاوہ باقی ساتھی وہاں موجود تھے۔ اس نے مختصر الفاظ میں سب کو سمجھایا اور اگلے ایک گھنٹے میں محلے کے سبھی لفنگے تلنگے اور نوجوان سائیکلوں اور موٹر سائیکلوں پر اماں کی تلاش میں مختلف سمتوں میں روانہ ہو چکے تھے۔

بیٹھک پر مرشد کے علاوہ صرف ساون اور جعفر ملتانی رکے تھے۔

کچھ تھوڑا وقت مزید گزرا ہوگا کہ مرشد ایک نئی الجھن محسوس کرنے لگا' اس کا دل وہاں بیٹھنے کو نہیں چاہ رہا تھا...... اس کے پردہ تصور پر بار بار حجاب کا سراپا ابھرنے لگا تھا۔ کانوں میں اس کی آواز کسی جھنکار کی طرح گونجنے لگی تھی اور اس کا دل چاہ رہا تھا کہ دوبارہ جا کر وہیں سنگھار میز کے اسٹول پر جا بیٹھے اور یک ٹک اس خیالی تصویر کو تکتا رہے...... خاموش بیٹھا اسے سنتا رہے۔

اس نے سر جھٹک کر یہ سب ذہن سے نکال دیا مگر کچھ ہی دیر بعد یہ الجھن سی پھر بیدار ہوئی اور وہ بے چین ہو اٹھا۔ اس بے چینی میں تھوڑا مزید اضافہ ہوا تو وہ اٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگ گیا۔ ساون اور جعفر بیٹھے اس کے چہرے کے بدلتے تاثرات دیکھ رہے تھے۔ اونچی چھت کے وسط میں لمبے راڈ والا پنکھا چل رہا تھا۔ پچھلے چند دنوں سے گرمی کی شدت میں اضافہ محسوس ہونے لگا تھا۔

''مرشد اتنا پریشان ہونے کی ضرورت نہیں...... خالہ کی طبیعت بہتر ہو گی تبھی تو وہ گئی ہیں' آ جائیں گی خیریت سے۔''

مرشد نے یوں چونک کر اس کی طرف دیکھا جیسے کمرے میں اس کی موجودگی سے ابھی واقف ہوا ہو۔

’’میں اوپر اپنے کمرے میں جارہا ہوں‘ کچھ دیر اکیلا رہوں گا۔‘‘

اس نے الجھن زدہ انداز میں کہا اور اوپر اپنے کمرے میں چلا آیا۔ اسے اوپر آئے تھوڑی ہی دیر گزری ہوگی کہ کمرے کے دروازے پر مراد کی صورت دکھائی دی۔

’’میں کچھ بات کرنا چاہتا ہوں تجھ سے۔‘‘

’’بول۔‘‘

’’صبح جب میں اور جعفر زریون لوگوں کو روانہ کرکے واپس آرہے تھے تو میں نے تیرے گھر کی طرف سے کسی کو نکلتے دیکھا تھا۔‘‘

مراد مرشد کے قریب چلا آیا۔

’’کسے؟‘‘

’’یقین سے تو نہیں کہہ سکتا مگر...... مجھے یوں لگا تھا جیسے وہ تیری اماں ہو...... بڑی سی کالی چادر میں خود کو لپیٹے ہوئے تھی۔ میں جعفر کو ادھر بھیج کر اس کے پیچھے بھی گیا تھا۔‘‘ مراد یقیناً نیچے سے ساری صورت حال سن آیا تھا۔

مرشد پوری طرح اس کی طرف متوجہ ہوگیا۔

’’بہرحال وہ جو کوئی بھی تھی ادھر...... خالہ اقبال کوثر کے گھر گئی تھی۔‘‘

’’وہ اماں ہوسکتی ہیں۔‘‘

مرشد نے پرامید لہجے میں کہا اور تیزی سے باہر نکل گیا۔ مراد فوراً اس کے پیچھے لپکا تھا۔

خالہ اقبال کوثر ہیجڑوں کے ایک گروپ کا گرو تھا اور حسن آرا کے خیرخواہوں میں سے تھا‘ وہ دل سے حسن آرا کی عزت کرتا تھا۔ کبھی کبھار اس سے ملنے کی غرض سے کوٹھے کا چکر بھی لگالیا کرتا تھا۔

اگلے دس منٹ بعد مرشد اور مراد خالہ اقبال کے دروازے پر تھے۔ دروازہ کھلا تھا‘ مرشد نے ہاتھ بڑھا کر زنجیر بجائی اور انتظار کیے بغیر اندر داخل ہوگیا۔ مراد اس کے پیچھے تھا۔

وہ ایک تنگ اور گھٹن زدہ سا مکان تھا۔ صحن میں بمشکل دو یا تین چارپائیاں آتی ہوں گی۔ دائیں ہاتھ نلکا تھا اور چمکیلی وہاں بیٹھا کپڑے دھو رہا تھا۔ سامنے برآمدے میں بچھی چارپائی پر شبو اور رانی بیٹھے لڈو کھیل رہے تھے۔ گھر کی فضا سے ایک عجیب سی بو چھلک رہی تھی۔ دودھ میں بھیگے ہوئے پسینے جیسی بو...... مرشد کو اندر داخل ہوتا دیکھ کر وہ تینوں ہی چونک پڑے۔

’’آئے ہائے آج صبح سورج کدھر سے ابھرا تھا۔ اے شبو‘ رانی دیکھو تو ذرا کون آیا ہے۔‘‘

چمکیلی فوراً اٹھ کھڑی ہوئی تھی یا اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

’’ارے مرشد باؤ! آیئے آیئے...... ادھر آجایئے۔‘‘ شبو اور رانی نے فوراً لڈو سمیٹی اور چارپائی سے اتر کھڑے ہوئے۔

’’ادھر...... اس چارپائی پر آجایئے...... اے چمکیلی جلدی سے دو بوتلیں پکڑ کے لا مہمانوں کے لیے۔‘‘

’’ضرورت نہیں ہے۔‘‘ مرشد نے فوراً چمکیلی کو منع کیا...... پھر شبو سے مخاطب ہوا۔

’’خالہ اقبال کدھر ہے؟‘‘

’’وہ تو گھر پر نہیں ہے مگر...... ہم تین یہیں ہیں مرشد باؤ‘ ہمیں خدمت بتایئے۔‘‘

’’کہاں گئی ہے وہ؟‘‘

’’کوئی خبر نہیں سویرے سویرے نکل گئی تھی۔ خیریت تو ہے نا؟‘‘

’’کس کے ساتھ گئی ہے؟‘‘

’’ادھر پرے مر۔‘‘ چمکیلی کے ہاتھ تھامنے پر مراد نے اسے جھڑکا تھا۔

’’مرشد باؤ کے ساتھ رہ رہ کر تیرے بھی کانٹے نکل آئے ہیں۔‘‘

چمکیلی نے دھیمے لہجے میں کہا اور پھر مرشد کو دیکھتے ہوئے دو قدم اور ہٹ گیا۔

’’بات کیا ہے‘ کچھ بتایئے تو۔‘‘

شبو نے لہراتے ہوئے کہا...... مرشد نے محسوس کیا کہ وہ کچھ پردے میں رکھنا چاہتا ہے۔

’’دیکھ شبو میں اس وقت بہت ٹینشن میں ہوں‘ جو

کچھ تو جانتی ہے صاف صاف بتادے۔‘‘

مرشد اور مراد برآمدے کے قریب کھڑے تھے جب کہ شبو اور رانی ان کے سامنے برآمدے میں...... شبو نے ایک ذرا بغور مرشد کے تاثرات دیکھے پھر ایک آہ بھرتے ہوئے چمکیلی اور رانی کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

’’اب کیا کرے شبو...... مرشد باؤ کے ساتھ کیسے آنکھ مچولی سے کام لیوے...... صبح اذانوں کے ٹائم اماں حسن آرا آئی تھیں‘ بس ایسے دس منٹ کے لیے‘ ہم کو پتا نہیں کہ اماں اور خالہ کے درمیان کیا گٹ مٹ ہوئی‘ پھر صبح ہوئی تو خالہ نے چاچا یاسین کو بلالیا...... اسی کی ٹیکسی میں گئی ہیں دونوں‘ اماں بھی اور خالہ بھی‘ اب گئی کہاں ہیں یہ ہمیں بالکل خبر نہیں...... جیسی مرضی قسم لے لو ہم سے۔‘‘

مرشد کو یقین ہوگیا کہ وہ سچ کہہ رہا ہے اور اس سے زیادہ نہیں جانتا...... اس نے سر ہلایا اور واپسی کے لیے پلٹ گیا۔

’’ٹھیک ہے۔‘‘

’’رکیے تو......‘‘

’’چائے بوتل تو پیتے جایئے...... آپ نے کون سا روز روز آنا ہے۔‘‘

’’مرشد باؤ!‘‘

’’ابھی میرے پاس وقت نہیں ہے۔‘‘

مرشد ان کی آوازوں کو نظر انداز کرتا ہوا باہر نکل آیا۔ کچھ تشفی ہوگئی تھی کہ چلو اماں جہاں کہیں بھی گئی ہے‘ کم از کم اکیلی نہیں ہے‘ ساتھ ہی اسے کچھ کچھ شبہ ہونے لگا تھا کہ ہو نہ ہو‘ اماں حجاب کے چکر میں نکلی ہے اور عین ممکن ہے کہ وہ نندی پور گئی ہو۔

دوپہر کا وقت تھا‘ بیٹھک پر واپس پہنچتے ہی مرشد نے ساون اور جعفر کو بھی اپنے کمرے میں بلالیا...... کمرے میں دبیز قالین بچھا تھا۔ ایک طرف عمدہ بستر لگا تھا اور گاؤ تکیے رکھے تھے۔

’’میرا خیال ہے اماں کسی دربار مزار پر نہیں بلکہ نندی پور گئی ہے۔‘‘

مرشد نے بیٹھتے ہی کہا تو مراد فوراً چونکتے ہوئے

بولا۔

''یعنی حجاب کے گاؤں!''

اب کے چونکنے کی باری مرشد کی تھی۔ اس نے حیرت سے مراد کی طرف دیکھا۔

''تو حجاب کو کیسے جانتا ہے؟''

''جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے باغ تو سارا جانے ہے''

میں کیا آدھا محلہ جانتا ہے اسے' بس ایک تو ہی ہے جو بے خبر بنا ہوا ہے۔''

''کیا جانتا ہے آدھا محلہ اور کیسے جانتا ہے؟''

مرشد واقعی حیران رہ گیا تھا۔

''دو تین دن سے سننے میں آ رہا ہے کہ نزہت بائی کے کوٹھے پر کوئی بڑی ہی آفت چیز آئی ہوئی ہے' آگ کا بنا ایسا گلاب ہے کہ جو عنقریب پورے بازار کو جلا کر رکھ دے گا۔''

''ہاشو خان کے کام ہیں۔'' ساون نے سنجیدگی سے کہا۔

''اس نے کہیں اپنی اس شادو ڈائن سے ذکر کیا تھا' وہ دو تین اور چڑیلوں کو ساتھ لے کر حجاب کو دیکھنے جا پہنچی اور واپس آ کر ایک ایک کے کان میں ڈالی کہ واقعی میں لڑکی تو ایسی ہے کہ محلے پر قیامت ڈھا دے گی۔''

''اگر خالہ نندی پور گئی ہے تو یقیناً اس کی وجہ یہ لڑکی ہی ہوگی...... حجاب...... مگر خالہ کو بھلا وہاں جانے کی کیا پڑی تھی؟''

مراد کے اظہار خیال پر مرشد چند لمحے کچھ سوچتا رہا اور پھر فیصلہ کن انداز میں بولا۔

''ایسا ہے کہ مراد یہیں رہے گا' اور ساون' جعفر تم لوگ فوراً نندی پور روانہ ہو جاؤ' مجھے اماں کی طبیعت کی طرف سے پریشانی ہے...... چلنے پھرنے کی تو اس میں سکت نہیں اور وہ کہاں نندی پور جا پہنچی ہے اور...... پھر یہ بھی ہے کہ اگر وہ سچ میں ادھر ہی گئی ہے تو ہوسکتا ہے حجاب کے گھر گئی ہو۔''

مرشد کے ذہن میں جاگیردار اکبر علی کا خیال آیا۔

''اماں کو وہاں نہیں جانا چاہیے تھا...... بہرحال تم لوگ فوراً روانہ ہو جاؤ' اگر ضرورت پڑے تو مائی کے گھر فون کر لینا۔''

سبھی جانتے تھے کہ مائی سے مرشد کی مراد نزہت بیگم ہے۔ اس کے بعد مرشد اٹھ کھڑا ہوا۔

''میں ادھر ہی جا رہا ہوں...... مراد تو یہیں بیٹھک پر رہ۔''

''ٹھیک ہے استاد' تم بے فکر ہو جاؤ' ہم ابھی روانہ ہو جاتے ہیں۔ چل ساون آ جا۔''

جعفر نے پہلے مرشد سے کہا اور پھر ساون سے مخاطب ہوا۔ مرشد خاموشی سے باہر نکل گیا۔

''اور ہاں...... ایک بات اور......'' مرشد واپس پلٹا تھا۔

''تم لوگ صرف اماں کے لیے جا رہے ہو ہمیں کسی دوسرے کے پھڈے میں ٹانگ نہیں اڑانی' البتہ جتنی جان کاری اس پٹولے کے متعلق مل سکے وہ لے لینا۔''

''ٹھیک ہے۔''

پھر وہ تینوں اکٹھے ہی وہاں سے نکلے...... رستے میں دو تین لڑکے بھی انہیں ملے جنہوں نے تا حال اماں کے نہ مل سکنے کی رپورٹ مرشد کے گوش گزاری۔

مرشد ان لوگوں سے الگ ہو کر کوٹھے پر آ گیا۔ رستے میں کسی سے اس کا سامنا نہیں ہوا اور وہ سیدھا اماں کے کمرے تک چلا آیا۔ دروازے پر جھولتا پردہ ہٹاتے ہوئے بے دھڑک اندر داخل ہو رہا تھا کہ اس کے ذہن میں اچانک خیال آیا کہ اسے دروازہ بجا کر اندر داخل ہونا چاہیے مگر صرف ایک ذرا ٹھٹکتے ہوئے وہ اندر داخل ہو گیا۔

پہلے تو اس کمرے میں صرف اس کی اماں ہوا کرتی تھی مگر اس وقت وہاں صرف ایک اجنبی اور غیر لڑکی موجود تھی۔ مرشد کو اندازہ ہوا کہ آج سے پہلے...... محلے کی کسی عورت یا لڑکی کے حوالے سے اسے ایسا خیال نہیں آیا تھا...... شاید اس لیے کہ وہ اس پورے محلے ہی کو اپنا کنبہ مانتا تھا یا پھر یہاں والیوں کو وہ عورتیں اور لڑکیاں ہی نہیں مانتا تھا۔ پلنگ پر کوئی نہیں تھا۔ پلنگ کیا کمرے میں ہی کوئی نہیں تھا۔ کمرہ خالی تھا حجاب وہاں نہیں

تھی...... پورے کمرے میں نظر دوڑانے کے بعد مرشد کونے میں لٹکتے پردے کی طرف بڑھ گیا۔

پردہ ہٹا کر اس نے دروازہ کھولا اور اس سٹور نما حصے میں جھانکا' غسل خانے کا دروازہ اندر سے بند تھا۔ یعنی حجاب غسل خانے میں تھی...... وہ واپس پلٹ آیا...... پہلے ٹہلتے ہوئے سنگھار میز کے سامنے آ کھڑا ہوا' شیشے میں ایک وجیہہ اور پر رعب چہرہ اس کے سامنے تھا' کچھ سنورے' کچھ بکھرے گھنے اور سیاہ بال' پہ بھاری اور غضب ناک سی مونچھیں' چند لمحے وہ اپنی صورت کو گھورتا رہا پھر اچانک جیسے اسے خیال آیا اور وہ دیوار گیر الماری کھول کر کھڑا ہو گیا۔ دواؤں والے حصے میں تمام دوائیں جوں کی توں موجود تھیں اور تو اور بلڈ پریشر اور جوڑوں کے درد والی ٹیبلٹس بھی اماں ساتھ نہیں لے کر گئی تھیں۔ حالانکہ ان کے بغیر اماں کا گزارہ ہی نہیں تھا۔

کمرے میں کسی دوسرے کی موجودگی محسوس کرتے ہوئے اس نے گردن موڑی' وہ حجاب تھی' غسل کر کے آئی تھی...... آسمانی کلر کا یہ سوٹ اور دوپٹہ بھی اس کی اماں ہی کا تھا...... اس رنگ میں حجاب کے چہرے کی رنگت کچھ اور کھلی اور نکھری نکھری سی دکھائی دے رہی تھی اور...... حجاب کے رنگ روپ سے اس سوٹ کا رنگ بھی جیسے چمک اٹھا تھا۔

''السلام علیکم!''

حجاب ہچکچا کر پلنگ سے دو قدم ادھر ہی کھڑی ہو گئی۔ اس کی نظریں جھکی ہوئی تھیں اور اس نے دائیں ہاتھ سے اپنے بائیں ہاتھ کی انگلیوں کو دبوچ رکھا تھا۔ دیوار گیر الماری پلنگ کی سرہاندی کی طرف دو قدم کے فاصلے پر تھی۔

''وعلیکم السلام!''

مرشد نے سرتاپا اس کا جائزہ لیتے ہوئے سلام کا جواب دیا اور الماری کے پٹ بند کرتے ہوئے اس کی طرف پلٹا۔ دل میں پھر کچھ عجیب سا دھڑکا تھا۔

''تجھے اماں نے بتایا نہیں تھا کہ وہ کدھر جا رہی ہیں۔''

''انہوں نے بس یہی کہا تھا کہ کسی مزار پر منت ماننے جا رہی ہیں۔''

''سچ سچ بتا۔''

''میں...... میں بالکل سچ کہہ رہی ہوں' آپ جیسی مرضی قسم لے لیں...... بے شک خالہ کے آنے پر خود ان سے پوچھ لینا آپ۔''

وہ یکدم گھبرا گئی تھی اس نے ایک نظر مرشد کی طرف دیکھا بھی مگر فوراً نظریں جھکا لیں۔ مرشد کو ان آنکھوں میں وہی خوف اور گھبراہٹ دکھائی دی تھی اور لڑکی کے لہجے سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ غلط بیانی سے کام نہیں لے رہی' مرشد ایک گہرا سانس لے کر رہ گیا۔ اچانک اسے اس لڑکی پر ٹوٹ کر ترس آیا تھا۔ اسے احساس ہوا کہ اماں کے ساتھ بھی یقیناً ایسا ہی ہوا ہوگا' وہ تو ویسے بھی کمزوری بیماری کی حد تک دل کی نرم تھیں۔

''وہاں اس طرح کھڑی کیوں ہے تو! بیٹھ جا ادھر۔''

''جی......''

حجاب آگے بڑھ کر پلنگ کی پائنتی کی طرف ہی ٹک گئی۔

''ٹھیک ہو کر آرام سے بیٹھ' میں نے تیرا گلا دبوچنا ہوتا تو اب تک دبوچ چکا ہوتا۔''

مرشد کی بھاری آواز پر وہ مزید تھوڑا پیچھے ہو کر بیٹھ گئی۔

حسن آرا کی وجہ سے اسے مرشد کی طرف سے کسی مجرمانہ حملے کی توقع تو نہیں تھی مگر پھر بھی وہ اس سے قدرے خوف زدہ ضرور تھی۔ آخر تھا تو وہ چھٹا ہوا بدمعاش ہی۔

''صبح سے تجھے کسی نے کچھ کہا تو نہیں؟''

اس نے وہیں کھڑے کھڑے سوال کیا۔

''جی...... نہیں۔''

چند لمحے توقف۔

''کچھ کھایا پیا ہے تو نے؟''

''جی' دس بجے ناشتہ کیا ہے...... وہ...... وہ شازیہ لائی تھی۔''

کمرے میں ایک بار پھر خاموشی بھر آئی۔ مرشد سنگھار میز کے اسٹول پر ٹک گیا۔

’’تو یہاں......اس جگہ تو نہیں رہنا چاہتی ہوگی؟‘‘

’’نہیں۔‘‘

’’کہاں جانا چاہتی ہے؟‘‘

’’اپنے گھر۔‘‘

’’یعنی نندی پور؟‘‘

’’جی۔‘‘

ایک بار پھر دونوں اپنی اپنی جگہ خاموش ہو بیٹھے‘ کچھ دیر بعد پہل مرشد ہی کی طرف سے ہوئی۔ ایک اور سوال تھا‘ مگر یہ سوال ہتھوڑے کی طرح حجاب کی سماعت پر پڑا تھا۔

’’کون کون بچا ہے تیرے گھر میں؟‘‘

’’جی......کک‘ کیا مطلب؟‘‘

’’تیرے بھائیوں کا چوہدریوں کے ساتھ جو پھڈا ہوا ہے‘ اس میں کون کون زندہ بچا ہے۔‘‘

کتنا دوٹوک اور سفاک انداز تھا اس کے سوال پوچھنے کا‘ حجاب تو ایسا کچھ سوچنے سے بھی گریز کرتی آئی تھی۔ اس نے تڑپ کر مرشد کی طرف دیکھا‘ اس بار وہ ڈری جھجکی نہیں‘ نہ ہی اس کی نظریں جھکیں۔

’’ایسے کیا دیکھ رہی ہے......وہ لوگ تجھے تیرے گھر سے اٹھا کر یہاں پھینک گئے ہیں تو وہاں کیا کچھ نہیں ہوا ہوگا......کتنے بھائی ہیں تیرے؟‘‘

مجھے جس وقت ان لوگوں نے اغوا کیا‘ اس وقت......اس وقت سب ٹھیک تھے بس......اماں تھوڑا زخمی تھیں ......گولیاں......گولیاں تو چلی ہوں گی مگر......وہ سب ٹھیک ہی ہوں گے۔ میرا دل کہتا ہے۔‘‘

وہ مرشد کی طرف دیکھتے ہوئے پریقین لہجے میں بولی مگر اس کی شفاف چمکدار آنکھوں میں پانی جھلملا اٹھا تھا۔

’’کتنے بھائی ہیں تیرے؟‘‘

’’تین۔‘‘

آنکھیں جھپکیں تو اس نے دوبارہ سر جھکا لیا۔

’’گھر میں اور کون کون ہے؟‘‘

’’اماں اور بابا سائیں۔‘‘

’’بھائی بڑے ہیں؟‘‘

’’دو بڑے ہیں‘ ایک چھوٹا......بارہویں میں پڑھتا ہے۔‘‘

مرشد کسی سوچ میں پڑ گیا‘ کمرے میں پھر خاموشی پھیل گئی‘ فضا میں صرف حجاب کی بھیگی ہوئی بے ربط سانسوں کی مدھم آواز ڈوب ابھر رہی تھی یا پھر چھت کے ساتھ جھولتے پنکھے کے چلنے کی گونج۔

مرشد نے حجاب کی طرف دیکھا‘ وہ اسی طرح سر جھکائے بیٹھی تھی‘ گود میں رکھے ہاتھوں کو اضطراری طور پر آہستہ آہستہ مروڑتی دباتی ہوئی خاموش روتی ہوئی‘ مرشد اس کے دائیں ہاتھ بیٹھا تھا اور بائیں ہاتھ کچھ فاصلے پر موجود دیوار میں ایک کھڑکی تھی‘ جس کے پار دھوپ چمک رہی تھی‘ حجاب کے چہرے کا دایاں رخ مرشد کے سامنے تھا اور اس وقت اس رخسار پر ایک آنسو ڈھلک رہا تھا......کھڑکی کے باہر چمکتی دھوپ یکبارگی جیسے اس آنسو سے منعکس ہونے لگی اور رخسار سے تھوڑی کی طرف پھسلتا ہوا وہ ننھا سا آنسو ایک پل کے لیے کسی آب دار موتی کی طرح چمک کر معدوم ہوگیا......مرشد کے لیے وہ ایک عجیب نظر خیز نظارہ تھا‘ وہ اپنی جگہ ساکت بیٹھا رہ گیا......نظریں جیسے بے خود ہو کر حجاب کے اس آدھے رخ پر جم کر رہ گئیں......اس کے گال پر......آنکھ سے پھر موتی چھلکا اور اس کے گال پر روشنی نچھاور کرتا ہوا معدوم ہوگیا۔

مرشد نے محسوس کیا کہ اس کی دھڑکنوں کا ربط گڑبڑا رہا ہے......رگ وپے میں یکا یک ایک خوش گوار سی سنسناہٹ پھیلنے لگی تھی‘ اس کے اندر شدت سے یہ خواہش سر اٹھانے لگی تھی کہ کاش وقت اسی جگہ‘ اسی پل ہمیشہ کے لیے رک جائے‘ کاش کائنات کی نبضیں تھم جائیں اور یہ منظر ہمیشہ کے لیے اسی جگہ اسی طرح محفوظ ہو جائے......کاش......کاش یہ لمحے ابدی ہو جائیں‘ اس نے زور سے سر جھٹکا اور پھر ہڑبڑا کر اٹھ کھڑا ہوا......اس بار وہ سچ میں گھبرا گیا تھا‘ یہ جذبات واحساسات اس کے لیے بالکل نئے تھے......آج سے پہلے اس نے کبھی بھی یہ سب محسوس نہیں کیا تھا......احساس کے اس رنگ سے وہ قطعی ناآشنا تھا۔

وہ چند لمحے تو حیران و پریشان سا کھڑا اپنے اندر کی حالت پر غور کرتا رہا پھر تیزی سے بیرونی دروازے کی طرف بڑھ گیا‘ دروازے کے قریب پہنچ کر وہ ٹھٹک کر رکا اور پھر حجاب کی طرف دیکھے بنا اس سے مخاطب ہوا۔

’’کوئی مسئلہ یا پریشانی ہو تو اچھو کو بتا بھیجنا یا پھر کھڑکی سے میرا نام لے کر مجھے آواز دینا‘ مجھ تک اطلاع پہنچ جائے گی۔‘‘ اس کے بعد وہ کمرے سے نکل آیا۔

صدر دالان میں نزہت‘ سندس اور شگفتہ بیٹھی آپس میں کسی بات پر الجھ رہی تھیں۔ مرشد پر نظر پڑی تو تینوں ہی کو چپ لگ گئی مگر نہ کسی نے مرشد سے کوئی بات کی اور نہ مرشد نے کوئی ضرورت محسوس کی۔ وہ خاموشی سے باہر نکل آیا۔

گلی میں بس کچھ مخصوص قسم کی دکانیں تھیں اس لیے غیر متعلقہ لوگ شام سے پہلے تو شاذ وشاذ ہی دکھائی دیتے تھے۔ زیادہ چہرے گلی محلے ہی کے ہوتے جو ایک دوسرے سے بخوبی شناسا تھے۔ البتہ کچھ اردگرد کے بھی آ جاتے تھے اور ہم پیشہ لوگ بھی کسی نہ کسی کام سے آ جایا کرتے تھے۔ اور کچھ نہیں تو فارغ اوقات میں ملنے ملانے اور گپ شپ کے چکر میں آ جاتے تھے۔

مرشد چلتے چلتے دعا سلام کرتے ہوئے بیٹھک پر واپس آ گیا۔ مراد غالباً نیچے ہی تھا‘ کیونکہ کونے والے کمرے سے ٹیپ ریکارڈر کی آواز بلند ہو رہی تھی۔ اس نے غالباً مسعود رانا کی کیسٹ لگا رکھی تھی۔

اچی لمبی کونج جئی مٹیار ملے
تج نہ منگاں ہور جے اوہدا پیار ملے

مرشد خاموشی سے زینے طے کرتا ہوا اپنے کمرے میں چلا آیا۔ اندر آتے ہی وہ اپنے بستر پر لیٹ گیا‘ مگر اسے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ ہنوز اسی اسٹول پہ بیٹھا ہو اور آبدار موتی اس کی آنکھوں کو خیرہ کر رہے ہوں۔

اس نے کروٹ بدلی......کچھ دیر بعد دوسری کروٹ ہو گیا......پھر چت لیٹ گیا۔ کچھ دیر بعد اٹھ کر بیٹھ گیا......ایک بے چینی سی اس کے اندر کہیں آ جمی تھی......اس نے شعوری طور پر اماں کے متعلق سوچنا شروع کیا اور ساتھ ہی اٹھ کر کمرے میں ٹہلنا شروع کر دیا......مگر......لاحاصل‘ حجاب کا خیال تو جیسے کسی تصویر کی صورت اس کے پردہ تصور پر نقش ہو کر رہ گیا تھا۔

وہ کمرے سے نکلا اور زینے اتر کر سیدھا کونے والے کمرے میں پہنچ گیا......کمرے میں دو پلنگ تھے ایک تپائی‘ ایک ٹیبل اور تین پرانے ریگزین پوشش والے صوفے‘ مراد ایک صوفے پر آنکھیں بند کیے نیم دراز تھا اور ٹیبل پر رکھا ٹیپ ریکارڈ چل رہا تھا۔ مرشد نے آگے بڑھ کر ٹیپ ریکارڈ آف کیا تو مراد نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔

’’مراد ایک بوتل چاہیے۔‘‘

مرشد کے چہرے پر کچھ ایسا تھا کہ مراد سنجیدہ چہرے کے ساتھ اٹھ بیٹھا۔

’’سب خیریت ہے نا!‘‘

’’اگر فوری طور پر مجھے بوتل نہ ملی تو پھر خیریت نہیں رہے گی۔‘‘

’’بوتلیں تو دو دو پڑی ہیں یار۔‘‘

مراد نے اٹھ کر ایک دیوار گیر الماری سے بوتل نکالی اور صوفے کے قریب پڑی تپائی پر رکھ دی۔

’’میں لاتا ہوں باقی سامان‘ تو بیٹھ جا‘ کہیں چکر شکر نہ آ جائیں۔‘‘

مراد کمرے سے باہر نکل گیا اور مرشد آگے بڑھ کر صوفے پر بیٹھ گیا۔

مراد دس منٹ بعد ہی واپس لوٹ آیا‘ دو گلاس‘ برف کا کٹورہ‘ ٹیم کی بوتل اور نمکو وغیرہ۔

مرشد کو عادت نہیں تھی شراب کی‘ مگر ان لمحوں میں بے صبری سے اس نے جام بنا کر چڑھایا وہ پیاس کے مارے ہوئے شراب کے دیوانوں جیسی تھی۔ مراد خاموشی سے اسے دیکھتا رہا‘ مرشد کی نظریں بار بار کسی غیر مرئی نکتے پر جم کر رہ جاتی تھیں۔ مراد نے دو گلاس خالی کیے تو مرشد نے پانچ۔

’’کیا رولا ہے؟‘‘

مراد کے مخاطب کرنے پر اس نے نظروں کا زاویہ بدل کر مراد کو دیکھا‘ کچھ دیر دیکھتا رہا پھر ہاتھ میں پکڑے

گلاس پر نظر ڈالی اور ایک بڑا سا گھونٹ چڑھانے کے بعد بولا۔
''کچھ نیا ہے۔''
''کیا؟''
''یہ ابھی ٹھیک سے نہیں پتا۔''
''کب تک پتا چل جائے گا؟''
''کس بات کا پتا؟''
مرشد نے قدرے تعجب سے مراد کی طرف دیکھا تو وہ مشکوک سے انداز میں بولا۔
''استاد جدھر گیا تھا تو......اور کدھر سے آ رہا ہے؟''
''مرشد!''
اسی وقت بیرونی دروازے سے صدا بلند ہوئی اور کسی کونے کھدرے میں دبکے کنکان نے فوراً صدا دینے والے کو دبکا۔
''مرشد!''
صدا پھر سے بلند ہوئی......کنکان نے پھر سے جھاڑ پلائی۔
''یہ بے تکلفی تو موالی ہی رکھتا ہے۔''
''مرشدا......!''
''جا دیکھ اسے۔''
مراد اٹھ کر کمرے سے باہر نکل گیا اور کنکان کی جھاڑ پھنکار میں تھوڑی تیزی آ گئی' مرشد نے ایک اور گلاس تیار کیا اور گھونٹ بھرا' اسی وقت کمرے کے دروازے پر مراد اور موالی نمودار ہوئے۔
''آ موالی! بیٹھ اور لگا ایک گلاس تو بھی۔''
''اسے بہت ضروری کام ہے تجھ سے۔''
مراد نے ایک طرف صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا اور موالی دو قدم مرشد کے قریب ہو کر نیچے ہی بیٹھ گیا۔
''میں نے چائے پینی ہے' جلدی سے منگا۔''
''تو نیچے کیوں بیٹھ گیا ہے' ادھر آ اور صوفے پر بیٹھ۔''
''نہیں' بس تو چائے منگا۔''
''چائے بھی آ جاتی ہے۔''
''منگا لے پھر۔''
موالی کی غالباً چائے پر سوئی اٹکی ہوئی تھی۔ مرشد نے مراد کی طرف دیکھا۔
''جا یار! گلی میں کسی چھوکرے کے ذمے لگا کے آ جا۔''
''موالی! چائے پر مٹی ڈال آج ہمارے ساتھ شراب پی تو بھی۔''
مراد نے موالی سے کہا تو وہ ناگواری سے بولا۔
''مٹی پڑے تیرے منہ پر......چائے پہ کیوں پڑے کوئی مٹی' کوئی وٹا روڑا۔''
پھر وہ مرشد کی طرف متوجہ ہوا۔
''اب منگا رہا ہے یا نہیں؟''
مرشد کے ہونٹوں پہ بے اختیار مسکراہٹ آ گئی۔
''یہ بھی بغیر وقفے کی فلم ہے۔''
مراد موالی کی طرف دیکھتے ہوئے اٹھ کر بیرونی دروازے کی طرف بڑھ گیا۔
''چلا جا کن ملٹے بدمعاش! ایسے پٹ جاوے گا میرے سے۔''
موالی نے فوراً اسے جھاڑ پلائی اور مرشد کی طرف متوجہ ہو گیا۔
''تیرے پیٹ میں کیا تو نج اٹھا ہے جو تو دن دیہاڑے بیٹھا شرابیں چڑھا رہا ہے۔'' موالی کے لہجے میں اپنائیت بھری ناراضگی تھی۔
''اب تجھے کیا سمجھاؤں میں۔''
مرشد مسکرایا تھا۔
''وہی جو تیری سمجھ میں آیا ہے...... یا پھر سمجھ سے فارغ ہے تو بھی......''
موالی پہلے مسکرایا پھر کھلکھلا کر ہنس پڑا۔
''تو مجھے سمجھا بھی کیا سکے ہے...... تجھے تو ابھی خود کوئی سمجھ نہیں ہے...... میرے کو پھر تو کیسے سمجھاوے گا...... ہاں' تو مجھے چائے پلا سکے ہے' اگر پلانا چاہوئے تو......''
موالی اپنی میلی داڑھی کھجانے لگا۔
''مراد تیرے سامنے گیا تو ہے چائے کا کہنے' بے صبرا کیوں ہوتا ہے۔''
''ڈر لگتا ہے نا۔''

''کس سے لگتا ہے۔''
''طلب کے مر جانے سے...... خواہش کے ختم ہو جانے سے......طلب مر جاتی ہے نا' چائے کی طلب ابھی ہے' پھر پتا نہیں ہووے نہ ہووے......ابھی کے ابھی مل جاوے تو اچھا ہے۔ منگا لے پھر چائے۔''
موالی گردن کھجانے لگا' وہ ایسے ہی بولتا تھا ایک دو جملوں کے بعد وہ یونہی پٹڑی سے اتر جایا کرتا تھا' مرشد سالوں سے اسے یونہی دیکھتا سنتا آ رہا تھا' اس کی ذہنی حالت آج بھی ویسی کی ویسی ہی تھی۔
''موالی بابا!''
مرشد کی آواز پر موالی نے اس کی طرف دیکھا تو مرشد اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا۔
''تو کب سے یوں مارا مارا پھر رہا ہے اور کیوں ایسے پھر رہا ہے...... آج مجھے کچھ بتا یار اپنے بارے میں۔''
موالی چپ چاپ مرشد کو تکتا رہا...... مرشد نے پھر اصرار کیا۔
''بتا بھی کچھ۔''
''مجھے گھر کا دروازہ نہیں مل رہا۔''
''کس کے گھر کا؟''
''اپنے گھر کا...... مجھے واپس جانا ہے مگر......سب گھر ایک سے ہو گئے' سب دروازے بھی ایک سے ہو گئے' اتنے دروازوں میں سے سالا میرا دروازہ پتا نہیں کون سا ہے' سمجھ ہی نہیں آوے ہے' اگر چائے مل جاوے تو شاید دماغ بھی کچھ کام کرنے لگ جاوے۔''
موالی ہتھیلی سے اپنی کنپٹی ٹھوکنے لگا تھا۔
''تو گھر سے نکلا کیوں تھا؟''
''تیل لینے نکلا تھا' خوشیے کے کٹے (بچھڑے) کو قبض ہو گئی تھی' اس کے پچھواڑے لگانا تھا اور کچھ؟''
موالی ایک دم چڑ گیا تھا۔
''چائے آتی نہیں ہے' سوال آئے جاویں ہیں۔''
''چل ٹھیک ہے' میرے سوال تجھے اتنے برے لگے ہیں تو میں نہیں بولتا۔''
''میں ایک دن لوٹ جاؤں گا۔''

تاج محل کے بارے میں چند شخصیات کی رائے

☆ میں نے آج تک اتنا حسین خواب نہیں دیکھا (شاہ حسین)
☆ ہر عورت تاج محل کے مزار پر فخر کر سکتی ہے (فرح دیبلہ، پہلوی)
☆ اگر میرا خاوند مجھ سے وعدہ کرے کہ میری موت کے بعد وہ ایسا ہی تاج محل بنوائے گا تو میں ابھی مرنے کو تیار ہوں (ملکہ الزبتھ دوم)
☆ کاش میں وائٹ ہاؤس کی بجائے تاج محل بنوا سکتی (جیکولین کینیڈی)
☆ خدا جانے فورڈ نے امریکہ میں تاج محل جیسی خوب صورت عمارت کیوں نہ بنوائی۔ (مسز ہنری فورڈ)
☆ کاش تاج محل چرایا جا سکتا (ایوا کارٹر)
☆ حیرت ہے کہ امریکہ کی مدد کے بغیر تاج محل کیسے تعمیر ہو گیا (ایل بی جانسن)
☆ ہندوستان میں اور کیا ہے غربت اور تاج محل کے سوا (ماؤزے تنگ)
☆ کاش کہ تاج محل دریائے ٹیمز کے کنارے منتقل ہو سکتا (چرچل)
☆ تاج محل کو چاندنی رات میں مت دیکھو اس سے ذہنی توازن بگڑنے کا خطرہ ہے (مارلن برانڈو)

بقول شاعر
اک شہنشاہ نے دولت کا سہارا لے کر
ہم غریبوں کی محبت کا اڑایا ہے مذاق

انتخاب: ثمرینہ خان...... چیچہ وطنی

موالی بولا تھا مگر مرشد خاموش رہا۔

”واپس پہنچنا ہے میرے کو...... لیکن جو بھی ہوجاوے چائے پیئے بغیر تو میں نہیں جاؤں گا۔“

اسی وقت مراد تام چینی کا بڑا پیالا اٹھائے اندر داخل ہوا۔

”میں خود ہی لے آیا ہوں‘ لے پکڑ موالی۔“

پیالہ اس نے موالی کو تھمایا اور خود واپس اپنی جگہ پر بیٹھ کر گلاس تیار کرنے لگ گیا۔

”اتنا بڑا پیالہ لے آیا ہے جیسے چائے کسی بندے نے پینی نہ ہو بلکہ بے بے جی نے غسل کرنا ہو۔“ موالی چائے کا گھونٹ بھر کر خود کلامی والے انداز میں بولا تو مراد نے اسے گھور کر دیکھا مگر زبان سے کچھ نہ کہا۔

موالی چائے پی کر منہ ہی منہ میں کچھ بد بداتا ہوا باہر نکل گیا اور مرشد کے ذہن میں پھر سے حجاب کی تصویر چمک اٹھی۔ آج ظہر کا وقت بھی نکل گیا تھا اور اس نئی ذہنی الجھن کی وجہ سے اسے نماز کا خیال بھی نہیں آیا تھا۔ مراد کچھ بولتا رہا مگر مرشد ذہنی طور پر غیر حاضر رہا اور اس بات کو مراد نے بھی بخوبی محسوس کیا تھا۔

دل کی بے چینی بڑھتے بڑھتے کچھ زیادہ ہی شدید ہوگئی تو مرشد اچانک اٹھ کھڑا ہوا۔

مراد کو اس نے شغل جاری رکھنے کا کہا اور خود اٹھ کر باہر نکل آیا۔ نشہ تو اچھا خاصا تھا‘ ایسے میں ایک خیال مسلسل اس کے اندر موجود تھا‘ حجاب کا خیال...... اس کی مرضی کے یکسر خلاف...... اس کے نہ چاہنے کے باوجود...... کچھ تھا‘ اس لڑکی میں کچھ تو ایسا تھا......!

مرشد باہر گلی میں نکل آیا اور اس کے قدم خود بخود نزہت بیگم کے کوٹھے کی جانب اٹھتے چلے گئے۔ وہ اپنے اندرونی اتار چڑھاؤ سے شاید جھنجلا گیا تھا سو اس نے ٹھان لی تھی کہ یہ الجھن ابھی سلجھا لیتے ہیں‘ اب ایسا بھی کیا تھا جو سمجھ نہ آتا کہ اس کی دھڑکنوں میں یہ کیسی گھبراہٹ سی آ بیٹھی ہے...... اور کیوں آ بیٹھی ہے‘ ایک بار پھر وہ کمرے کے دروازے پر تھا اور حسب سابق دندناتا ہوا منہ اٹھائے سیدھا کمرے میں گھس آیا تھا۔

حجاب بی بی پلنگ پر پالتی مارے بیٹھی تھی...... دوپٹہ اس نے سر کے گرد یوں لپیٹ رکھا تھا کہ چہرے کا صرف سامنے کا رخ ہی دکھائی دے رہا تھا اور اس کی گود میں کھلے قرآن مجید کی موجودگی سے ظاہر تھا کہ وہ بیٹھی قرآن پڑھ رہی تھی۔

مرشد اچانک کمرے میں داخل ہوآیا‘ تو حجاب نے بے اختیار چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ اندر آتے ہی ٹھٹک گیا تھا اور اس کی موٹی سرخ آنکھیں حجاب کی گود میں موجود قرآن پر جمی ہوئی تھیں‘ حجاب کے دیکھتے ہی دیکھتے مرشد کے تاثرات میں تغیر پیدا ہوا پہلے تو اس کے چہرے کا تناؤ کم ہوا...... اور پھر ختم ہوگیا...... آنکھوں میں بھرا اضطراب بھی دیکھتے ہی دیکھتے غائب ہوا تھا۔ اس کی نظریں قرآن سے اٹھیں اور حجاب کی چہرے پر آ ٹکیں۔

حجاب نے فوراً نظریں جھکالی تھیں البتہ اسے اندازہ تھا کہ مرشد یک ٹک اس کی صورت کو تک رہا ہے‘ وہ اس کی نظروں کی حدت کو بخوبی محسوس کررہی تھی لیکن وہ اسے نظر انداز کرتے ہوئے قرآن مجید کی طرف متوجہ ہوگئی۔ سورۃ رحمٰن کی آخری چند آیات تھیں‘ اس نے وہ پڑھ چکنے کے بعد اطمینان سے قرآن مجید کو بند کیا اور جزدان میں محفوظ کرنے لگی۔ تبھی مجسمہ بنے کھڑے مرشد کے وجود میں جنبش ہوئی...... اس نے سنگھار میز کے سامنے سے اسٹول اٹھایا اور حجاب کے بالکل سامنے محض دو قدم پر رکھ کر بیٹھ گیا...... حجاب کا دل بری طرح دھڑک اٹھا تھا۔

مرشد کے انداز اور آنکھیں کچھ بدلی بدلی سی تھیں۔

قرآن مجید کو اس کی جگہ پر رکھنے کی نیت سے اٹھنے کا ارادہ کرتی حجاب اپنی جگہ بیٹھی کی بیٹھی رہ گئی۔ اس نے ہچکچاہٹ کے ساتھ مرشد کی طرف دیکھا اور بے اختیار اس کی نظریں فوراً جھک گئیں۔ مرشد اسی بے باکی سے اس کی صورت تک رہا تھا۔

حجاب کو شدید الجھن اور ناگواری محسوس ہوئی۔

”آپ مجھے ایسے کیوں دیکھ رہے ہیں؟“ اس نے جیسے سوال نہیں اعتراض اٹھایا تھا‘ جواب چند بوجھل لمحوں کی تاخیر سے ملا۔

”مجھے کچھ جاننا ہے۔“

”جی...... کیا؟“

”کچھ دیر کو خاموش بیٹھ۔“

مرشد کی آواز کی گمبھیرتا سے وہ اندر ہی اندر کسمسا کر رہ گئی۔ مرشد کی آنکھوں کی حدت اس کے چہرے پر پھیلی تھی اور وہ سمجھ نہیں پارہی تھی کہ کس طرح اپنے آپ ہی میں چھپ جائے۔ بیٹھے بیٹھے اپنی جگہ سے غائب ہوجائے...... اسے محسوس ہوا تھا کہ مرشد پوری طرح اپنے حواسوں میں نہیں ہے اس نے شاید شراب پی رکھی تھی۔ حجاب کے دل میں ایک بار پھر سراسیمگی بھر آئی۔

”یااللہ! تو ہی میرا آخری سہارا‘ آخری امید ہے‘ مجھ پر رحم فرما‘ میری مدد کر میرے مالک۔“ قرآن مجید کو اس نے بازوؤں میں بھر کر اپنے سینے سے لگالیا اور دل ہی دل میں خدا کو پکارنے لگی۔ وہ دونوں آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ درمیان میں صرف دو قدم کا فاصلہ تھا اور اس فاصلے میں ان کے بیچ قرآن مجید تھا۔

حجاب نظریں جھکائے خدا سے ہم کلام تھی اور مرشد یک ٹک اس کی صورت تکتے ہوئے خود سے ہم کلام تھا...... وہ اپنے جذبات و احساسات کو جانچنے سمجھنے کی کوشش کررہا تھا‘ پتا نہیں شراب کے خمار کا کمال تھا یا کچھ اور...... حجاب کا چہرہ اسے پہلے سے بھی زیادہ خوبصورت‘ زیادہ پیارا دکھائی دے رہا تھا‘ ایک عجیب کشش‘ عجیب مقناطیسیت تھی اس چہرے میں‘ مرشد کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ آنکھ تک نہ جھپکے بس یونہی پتھرائی ہوئی آنکھوں سے اس من موہنی صورت کو تکتا رہے...... تکتا رہے اور...... یونہی زمانے بیت جائیں۔

”نہیں...... میں نہیں سمجھ پارہا۔“ کچھ دیر بعد مرشد کی بڑبڑاہٹ سنائی دی۔

”جی‘ کیا؟“ یہ دو لفظ جیسے خود بخود اس کی زبان سے پھسل پڑے تھے مگر اسے کوئی جواب نہیں ملا‘ کچھ دیر کی خاموشی کے بعد مرشد خود ہی بولا تھا۔

”تو بھی تو لڑکیوں جیسی لڑکی ہے‘ سب کچھ لڑکیوں جیسا ہی ہے پھر بھلا...... وہ کون سی چیز ہے جو تجھ میں اضافی ہے؟“

”ج...... جی!“

حجاب پریشان ہوگئی تھی۔

”تو کیا سمجھ رہی ہے؟“

”جی‘ کچھ نہیں۔“

”مجھ سے ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے تجھے۔ میں [illegible] ہوں۔“

”جی‘ میں ڈر تو نہیں رہی۔“

”پھر کانپ کیوں رہی ہے؟ بخار ہے کیا؟“

حجاب کو فوراً اندازہ ہوا کہ اس کے وجود پر واقعی خفیف سی لرزش طاری تھی۔

مرشد اچانک اپنی جگہ سے اٹھا اور اسٹول کو اٹھا کر دو قدم مزید پیچھے ہٹ کر بیٹھ گیا۔

”لے...... میں پیچھے ہٹ جاتا ہوں‘ تو ذرا آرام سے بیٹھ اور مجھ کو بتا...... وہ کون سی چیز ہے جو لڑکیوں میں نہیں‘ صرف تجھ میں ہے۔“

”جی‘ میں نہیں سمجھی۔“

”تجھ میں کیا اضافی ہے جو دوسری لڑکیوں میں نہیں ہوتا۔“

”ایسا تو کچھ نہیں ہے۔“

”نہیں...... کچھ تو ہے۔“ مرشد نے پُرزور انداز میں کہا۔

”کچھ تو ایسا ہے کچھ تو ہے جو الگ ہے‘ خاص ہے ...... اور مجھے بس یہی جاننا سمجھنا ہے کہ وہ کیا ہے؟“

حجاب کی پریشانی میں کچھ مزید اضافہ ہوگیا‘ گھبرایا ہوا دل کچھ مزید گھبرا گیا۔

وہ اس کی باتوں کا مفہوم بخوبی سمجھ رہی تھی۔ وہ کیا کہنا چاہ رہا تھا‘ یا اسے کیا سمجھا رہا تھا‘ حجاب کو فوراً ہی اندازہ ہوگیا تھا۔ اور یہ اندازہ ہوتے ہی اس کا حلق خشک ہوگیا‘ اس کی باتیں حجاب کو اپنے لیے ایک نئی مصیبت...... نئے عذاب کا پیش خیمہ محسوس ہورہی تھیں۔

”پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔“ مرشد نے جیسے اس کا ذہن پڑھ لیا تھا۔

”ایسی ویسی کوئی بات نہیں ہے‘ یہ تو بس...... تجھے دیکھ کر میرے ذہن میں کچھ الجھن سی پیدا ہوتی ہے‘ تو اس

کی وجہ سمجھنے کے لیے میں یہ......‘‘

اچانک عصر کی اذان کی آواز بلند ہوئی تھی کہ مرشد کی زبان کو بریک لگ گئے۔ حجاب نے دیکھا کہ اس نے سر جھکالیا تھا‘ اور پھر جب تک اذان ہوتی رہی مرشد خاموش اور پرسکون انداز میں بیٹھا رہا‘ اذان کے ساتھ ساتھ وہ زیرلب کچھ بدبدا بھی رہا تھا‘ پھر اذان کے ختم ہوتے ہی وہ اچانک اپنی جگہ سے اٹھا اور چپ چاپ کمرے سے باہر نکل گیا۔

حجاب اپنی جگہ قرآن سینے سے لگائے حیران پریشان سی بیٹھی تھی۔

☆......☆......☆

نندی پور میں ہونے والے خونی وقوعے کو گزرے دس بارہ روز ہوچکے تھے مگر ابھی تک فضا کا تناؤ سنگینی کا احساس دلاتا تھا۔ فضا میں جیسے ابھی تک خون کی ثقیل اور کچی بورچی ہوئی تھی۔

وقوعے کی صبح گاؤں والوں کے لیے بڑی ہولناک ثابت ہوئی تھی۔ گاؤں والے ابھی تک دہشت زدہ تھے۔ ایک ساتھ کئی لاشیں اٹھی تھیں اس صبح۔

ہر صبح کی طرح اس روز بھی شروعات وڈے شاہ جی کی آواز ہی سے ہوئی تھی‘ مگر اس صبح شاہ جی کی آواز میں گاؤں والوں کو کچھ اور ہی سننے کو ملا تھا اور جس جس نے وہ سب سنا تھا‘ وہ اپنی جگہ سن ہوکر رہ گیا تھا‘ پھر نہر والی سمت سے فائرنگ کے شور نے زور پکڑا اور آہستہ آہستہ وہ شور گاؤں کے قریب چلا آیا۔ دوطرفہ فائرنگ ہورہی تھی‘ گاؤں کے لوگ اپنے اپنے گھروں میں دبکے رہے سنسنی اور خوف دروازوں اور کھڑکیوں کی درزوں سے گھروں کے اندر گھس گھس کر مکینوں کو اپنے نرغے میں لے رہا تھا۔

صبح کی روشنی پھیلنے تک گاؤں کے قریب ہونے والا یہ معرکہ گاؤں کی گلیوں کے اندر پہنچ آیا۔ کچھ دیر تک دوطرفہ فائرنگ ہوتی رہی پھر شدت میں کمی آجاتی اور وقفے وقفے سے اکادکا فائروں کا تبادلہ ہونے لگتا۔

دن چڑھ آیا تھا مگر آج پورے گاؤں میں ویرانی اور موت کا سکوت پھیلا ہوا تھا‘ گھر سے باہر نکلنا تو دور کسی بھی شخص نے اپنے گھر کی کھڑکی تک کھولنے کی ہمت نہیں کی تھی۔

فائرنگ کا یہ ہولناک سلسلہ تقریباً تین گھنٹے تک جاری رہا اور پھر چوہدریوں کی حویلی سے ایک گلی ادھر‘ اپنے انجام کو پہنچ گیا‘ فائرنگ رک گئی اور گلی میں چوہدریوں کے ڈشکروں کی وحشت ناک آوازیں بلند ہونے لگیں۔ کچھ دیر مزید گزرتی ہوگی کہ وہ لوگ گلی میں کھڑے ہوکر باآواز بلند گاؤں والوں کو ڈرانے دھمکانے لگ گئے۔

’’اگر کسی نے بھی اپنی زبان سے کچھ نکالا تو اس کے پورے ٹبر (خاندان) کو گاؤں کی گلیوں میں گھسیٹ گھسیٹ کر مکادیا جائے گا۔‘‘

’’کان کھول کر سن لو سب کے سب۔‘‘ ساتھ ہی انہوں نے ہوائی فائرنگ بھی کی۔

پولیس آئی تو پہلے اس پولیس پارٹی نے حویلی کی چوکھٹ پر حاضری دی اور پھر وقوعے کے جائزے پر نکل کھڑی ہوئی۔

نہر کے اس طرف شاہوں اور چوہدریوں کی برابر برابر زمین تھی اور اسی زمین پر آج صبح قریب پانچ بجے تنازعہ شروع ہوا تھا۔ تو تکرار کے بعد تینوں شاہ بھائیوں نے آپے سے باہر ہوکر چوہدریوں کے دو مزارعوں کو فائرنگ کرکے موقع پر ہی قتل کردیا۔ ان کی لاشیں نہر کنارے پڑی تھیں۔

دو مزارعے جان بچا کر بھاگے تو تینوں بھائیو نے ان کا پیچھا کرکے انہیں بھی موت کے گھاٹ اتاردیا‘ ان میں سے ایک کی لاش کھیتوں کے درمیان پڑی تھی اور دوسرے کی گاؤں کے قریب...... وہیں چوہدریوں کے کچھ مسلح بندے پہنچے تو ان تینوں بھائیوں نے بے دریغ ان پر بھی فائر کھول دیئے اور ان بے چاروں نے بمشکل گلیوں میں گھس کر جانیں بچائیں...... اپنے بچاؤ میں مجبوراً انہیں بھی جوابی فائرنگ کرنا پڑی‘ ان تینوں بھائیوں کے سروں کو تو خون چڑھ چکا تھا۔ دوطرفہ فائرنگ کے اس تبادلے میں چوہدریوں کے دو بندے مزید موت کا شکار ہوئے اور دو بری طرح زخمی ہوئے

...... مرنے والے دونوں بندوں کی خون میں لت پت لاشیں ابھی تک گلی کے بیچ و بیچ پڑی تھیں۔ جن پر اب مکھیاں بھی بھنبھنانے لگی تھیں۔ اور انہی بندوں کی طرح دو بھائی تو گولیوں کا نشانہ بن کر موقع پر ہی دم توڑ گئے جب کہ ان کا تیسرا بھائی کسی طرح نکل بھاگا تھا‘ دونوں بھائیوں کی لاشیں بھی موقع پر موجود تھیں۔

اسی دوران ان کے باپ سید صلاح الدین نے مجرمانہ نیت سے حویلی میں چوری چھپے گھسنے کی کوشش کی تو رکھوالی کے کتوں نے اس پر حملہ کردیا اور جب تک اسے ان کتوں سے چھڑایا گیا تب تک وہ خون خوار کتے اس کا نرخرہ بری طرح ادھیڑ چکے تھے‘ لہٰذا وہ بھی جانبر نہ ہوسکا اور موقع پر ہی دم توڑ گیا۔

یہ تھی وہ کہانی جو منظر عام پر آئی اور پولیس ریکارڈ میں بھی...... مگر لوگ جانتے تھے کہ یہ چوہدریوں کی گھڑی ہوئی کہانی ہے...... زیادہ نہیں تو شاہوں کے آس پڑوس کے دو چار لوگ ایسے تھے جو جانتے تھے کہ پہلے چوہدریوں نے شاہ جی کے گھر پر حملہ کرکے چھوٹی بی بی جی کو گھر سے اٹھایا تھا۔ اس کے بعد فائرنگ کی آوازیں شروع ہوئی تھیں۔ پولیس نے دونوں بیبیوں کے متعلق لکھا تھا کہ اس خونی لڑائی کے دوران خوفزدہ ہوکر ماں بیٹی کو ہمراہ لے کر منہ اندھیرے ہی گاؤں سے نکل گئی تھی اور تاحال وہ دونوں کسی نامعلوم جگہ پر روپوش ہیں اور تو اور پولیس کو ایک چشم دید گواہ بھی مل گیا تھا جس نے دونوں ماں بیٹی کو گاؤں سے باہر والے رستے پر جاتے ہوئے دیکھا تھا۔

خانہ پری اور دکھاوے کے طور پر کچھ گرفتاریاں بھی ڈالی گئی تھیں۔ اپنے تین چار بندے چوہدریوں نے خود پولیس کو مہمانوں کے طور پر سونپے تھے۔ تھانیدار نے ایک دو مزید غیر متعلقہ افراد کو بھی گرفتار کرلیا تھا۔

شاہوں کے آس پڑوس سے سرگوشیاں شروع ہوئیں اور گاؤں سے باہر اردگرد کے دیہاتوں میں بھی کھسر پسر ہونے لگی لیکن چاروں طرف دہشت کی ایک ایسی لہر چھا گئی تھی کہ کہیں سے کوئی آواز بلند نہ ہوئی اور جو آواز بلند ہوئی بھی وہ اتنی دور سے بلند ہوئی کہ جس کی کسی

کوتوقع ہی نہیں تھی۔

یہ آواز سید نظام الدین کی تھی...... سید نظام الدین رشتے میں حجاب بی بی کے اکلوتے پھوپھا لگتے تھے اور مستقبل کے سسر بھی۔ ان کی آواز بلوچستان سے بلند ہوئی اور براہ راست حکام بالا کے کانوں تک جا پہنچی اور نتیجے میں پولیس کے اعلیٰ افسران اٹھ کر نندی پور پہنچ گئے۔ گاؤں والوں کو پولیس افسران کے ساتھ وڈے شاہ جی کے بہنوئی نظام صاحب کی صورت گاؤں میں دکھائی دی تو چوہدری بھی چوکنے ہوگئے۔ کیونکہ وہ بھی جانتے تھے کہ نظام الدین کوئی معمولی شخصیت نہیں ہے۔

کیس کی اب تک کی تفتیش اور رپورٹ کو مشکوک قرار دیتے ہوئے رد کردیا گیا اور نئے سرے سے تفتیش کی غرض سے خصوصی طور پر لاہور سے ایک آفیسر کو کیس انچارج بنا کر متعلقہ تھانے میں چارج دے دیا گیا لیکن تاحال کوئی نتیجہ سامنے نہیں آسکا تھا' اور تو اور ابھی تک نہ تو مفرور اسرار شاہ کے متعلق کسی قسم کی کوئی اطلاع ملی تھی اور نہ ہی ان دونوں ماں بیٹی کا کوئی سراغ مل سکا تھا۔ ان کے متعلق کسی کو بھی کچھ خبر نہیں تھی۔ سوائے جاگیردار اکبر علی اور اس کے دو چار خاص لوگوں کے...... اور ان لوگوں کو بھی صرف حجاب کی خبر تھی کہ وہ بازار حسن کے ایک کوٹھے پر زیر تربیت ہے...... اسرار اور ان کی ماں کے متعلق یہ لوگ بھی باقی سب کی طرح لاعلم ہی تھے۔

چوہدری فرزند تھا تو اس کے کلیجے کی آگ ابھی تک ایک ذرا بھی ٹھنڈی نہیں ہوئی تھی۔ اس کے ہرکارے مسلسل اسرار شاہ کی تلاش میں تھے مگر وہ تو گدھے کے سینگوں کی مثال ہوگیا تھا۔ حجاب تھی تو اسے خود چوہدری فرزند کے باپ نے کہیں غائب کر رکھا تھا' چوہدری فرزند بار بار اس سے پوچھ چکا تھا کہ ''کڑی'' کدھر ہے مگر اکبر علی نے اسے کچھ نہیں بتایا تھا' بلکہ اسے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ جب تک تفتیش والا معاملہ اچھی طرح ٹھنڈا نہیں ہوجاتا' اس کڑی کو دماغ سے نکال دے...... یہ جو تفتیشی افسر یہاں بھیجا ہے' اصغر علی اعوان' یہ کوئی کتے کی پونچھ ہے احتیاط کرلی جائے تو اچھا ہے' کچھ دن صبر کر' بھول جا اسے' وہ بالکل محفوظ جگہ پر ہے۔''

ایک ہفتہ ہوچکا تھا مگر چوہدری فرزند اس محفوظ جگہ کے بارے میں نہیں جان سکا تھا کہ وہ کہاں واقع ہے...... وہ ان بندوں سے بھی پوچھ چکا تھا جو اس روز اکبر علی کے ساتھ تھے جب وہ حجاب کو کسی نامعلوم جگہ پر لے کر گیا تھا مگر یہ بھی بے فائدہ رہا۔

''حکم داد!''

''حکم چوہدری صیب۔''

چوہدری فرزند کی آواز پر حکم داد نے مستعدی سے جواب دیا۔ وہ اس وقت مردان خانے کے دالان میں بیٹھے تھے۔ چوہدری فرزند دھوتی اور بنیان پہنے ایک صوفے پر چوڑا ہو کر بیٹھا تھا' لالا اور گاما نیچے بیٹھے اس کی پنڈلیوں کی مالش کررہے تھے جبکہ حکم داد اور سانگھا تھوڑے فاصلے پر موڑھوں پر بیٹھے تھے۔

''ابا اس دن جب اس کڑی کو وہاں سے لے کر نکلا تھا تو...... یہ انوارا بھی اس کے ساتھ ہی تھا نا؟''

''جی چوہدری صیب!''

''ہوں...... میں نے تین چار بار کہا ہے اس سے کہ بتادے اس شاہنی کو ابا کہاں چھوڑ کے آیا ہے۔ جانتا ہے مگر بتانے کو تیار نہیں ہے کھوتے کا پتر!''

''جی...... آپ پوچھنا چاہو گے تو بتا تو دے گا ہی۔''

''کل وزیر آباد جارہا ہے...... نو بجے نکلے گا ادھر سے۔''

چوہدری نے گمبھیر لہجے میں کہا تو ان چاروں نے ایک دوسرے کی صورت دیکھی۔ جس طرح وہ چاروں چوہدری فرزند کے ذاتی محافظ' ذاتی خدمت گار تھے اسی طرح انوارا بڑے چوہدری صاحب کا ذاتی محافظ تھا' اس پر ہاتھ ڈالنے کا سیدھا سیدھا مطلب تھا بڑے چوہدری صاحب کے ساتھ دشمنی......!

''اس سے شاہنی کا پتا نکلوانا ہے بس...... اس کے بعد بے شک وہ خود ہمیشہ کے لیے لاپتہ ہوجائے...... نہ اس کا پتہ چلے گا' نہ بات کھلے گی۔''

چوہدری فرزند نے ایک نظر ان کی صورت پر ڈالی۔

''مشکل تو نہیں ہوگی؟''

''بالکل بھی نہیں جی! آرام سے ہوجائے گا سب۔''

اسی وقت ایک ستون کے ساتھ سٹینڈ پر رکھے فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ فون سانگھے نے اٹھ کر ریسو کیا پھر ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھتے ہوئے چوہدری فرزند سے مخاطب ہوا۔

''سائیں! ڈسکہ سے نذیرے کا پھون ہے' آپ سے بات کرنا چاہتا ہے۔''

چوہدری کے اشارے پر سانگھا فون سیٹ اٹھا کر اس کے قریب آیا اور ریسیور اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔

''ہاں نذیرے! کیا بات ہے؟''

''چوہدری صاحب' مرید شاہ کے گھر دو عورتیں آئی ہیں ٹیکسی پر اور...... نمبر پلیٹ لاہور کی ہے۔''

''لہور سے...... وہاں ان کا کون سگا ہے۔''

چوہدری نے تعجب سے کہا۔

''یہ تو پتا نہیں جی!''

''اچھا...... جب یہ واپس جائیں تو ایک بندہ ٹور ان کے پیچھے' صرف دیکھو کہ لاہور میں کہاں واپس جاتی ہیں یہ۔''

''ٹھیک ہے جی۔''

چوہدری نے پرسوچ انداز میں ریسیور واپس رکھا تو سانگھا پیچھے ہٹ گیا۔ ڈسکہ میں شاہوں کے دو گھر تھے' ایک صلاح الدین کے سالے مرید حسین کا اور دوسرا اس کی سالی کا...... دونوں گھروں پر چوہدریوں کے نگران مقرر تھے کہ ہوسکتا ہے اسرار کی کوئی خبر مل سکے' اسرار کی تو ابھی کہیں سے کوئی خبر نہیں ملی تھی' ہاں یہ ایک نئی خبر ضرور مل گئی تھی...... دو گھر یہ تھے اور ایک گھر صلاح الدین کی بہن کا تھا مگر وہ گھر بلوچستان میں تھا۔ ان کے علاوہ تو شاہوں کا اور کہیں کوئی نہ تھا۔ پھر بھلا لاہور سے یہ کون عورتیں نکل کے آ گئی تھیں۔ چوہدری فرزند تھوڑی دیر سوچتا رہا مگر کچھ اندازہ نہیں لگاسکا۔ البتہ یہ احساس اسے ضرور ہوا تھا کہ ان عورتوں کی آمد کے پیچھے کوئی نہ کوئی کہانی ضرور ہوگی۔

''اچھا ہماری بات ہورہی تھی...... وہ...... انوارے والی۔''

''جی۔''

''راہوالی یا پھر دھونکل لے آس پاس پہنچ کر ہاتھ ڈالنا...... دونوں جگہ ڈیرے مل جائیں گے۔''

''راہوالی ٹھیک رہے گا جی۔''

حکم داد نے باقی ساتھیوں کی طرف دیکھا تو سبھی نے اثبات میں سر ہلائے۔

'وہاں اپنے ملک الطاف کا ڈیرہ ہے' اسی کو استعمال کرنا۔'' اچانک چوہدری گامے سے مخاطب ہوا۔

''اوگامے۔''

''جی چوہدری صاب!''

''تیرا ایک بیلی ہوا کرتا تھا...... اجو گھوڑا؟ کدھر ہے وہ آج کل؟''

چوہدری نے ٹانگ اٹھا کر گامے کے کندھے پر رکھ دی۔

''لہور میں ہوتا ہے جی! گڑھی شاہو کے آسے پاسے۔''

''کیا کرتا ہے ادھر؟''

'بس جی' ادھر اس کا اچھا ٹھکا بنا ہوا ہے' مزے سے گزار رہا ہے۔''

''بس ٹھیک ہے بہت ہوگیا کپڑا لگادو۔''

چوہدری نے ٹانگیں سمیٹتے ہوئے کہا تو لالے اور گامے نے کندھوں سے صافیاں اتار کر چوہدری کی پنڈلیوں پر چپڑا ہوا تیل صاف کرنا شروع کردیا۔

چوہدری نہانے کی نیت سے اٹھ کر اندر آیا ہی تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی اور حکم داد کی صورت دکھائی دی۔

''چوہدری صیب! ایک گڑبڑ ہوگئی ہے۔''

''کیا ہوا؟''

''گاؤں میں دو اجنبی لوگوں کا اپنے بندوں سے جھگڑا ہوا ہے اور وہ اپنے بندوں سے ان کے پستول اور گاڑی چھین کر فرار ہوگئے ہیں۔''

''دو اجنبی...... اپنے بندے کون تھے؟'' چوہدری متعجب ہوا۔

''وہ جی! گلو' صدیق اور منا تھے' باہر...... دالان میں آئے کھڑے ہیں۔'' چوہدری اسی حلیے میں واپس

دالان میں آ گیا۔ وہ تینوں مجرموں کی طرح سر جھکائے کھڑے تھے اور تینوں کا حلیہ ابتر تھا۔ کپڑے پھٹے ہوئے تھے۔ چہروں پر چوٹوں کے نیل اور گومڑ تھے۔ ان کی حالت زار سے واضح تھا کہ بنانے والوں نے خوب اچھے سے درگت بنائی ہے۔

''کیوں اوئے کتے کے پترو! کیا تماشہ ہے یہ! کن ماں کے یاروں سے لتر کھا کے آئے ہو؟ کون تھے وہ؟''

''وہ کوئی اجنبی لوگ تھے جی...... کہیں باہر کے تھے' پہلے کبھی نہیں دیکھا انہیں۔''

چوہدری نے ایک اچھی موٹی تگڑی گالی سے نوازا انہیں اور ایک گلدان کھینچ مارا جو درمیان والے شخص کے گھٹنے پر جا کر لگا' اور وہ بلبلا کر رہ گیا۔

''تم تین تھے...... وہ دو تھے' پھر بھی جوتے کھا کے آ گئے...... اسلحہ بھی دے آئے' گاڑی بھی تحفے میں دے آئے اپنے بہنویوں کو...... کتے کے تخمو......''

''ہم تو انہیں پکڑ کر حویلی لا رہے تھے چوہدری صاب! انہوں نے اچانک حملہ کر دیا اور ہمیں سنبھلنے ہی نہیں دیا۔ سب سے پہلے انہوں نے ہاتھ ہی ہمارے پستولوں پر ڈالے تھے۔''

''کہاں سے پکڑ کر لا رہے تھے؟''

''بورے کی دکان سے' وہ یہاں لوگوں سے پوچھتے پھر رہے تھے کہ کچ دن پہلے یہاں کے چوہدریوں کا جھگڑا ہوا ہے' اس جھگڑے کے متعلق بتاؤ' ہم وہاں سگریٹ لینے کے لیے رکے تھے۔ میں نے ان سے پوچھا کہ وہ کیوں یہ پوچھتے پھر رہے ہیں تو کہنے لگے کہ ہم اخبار والے ہیں' مگر ان کی تو شکلوں پر لکھا تھا نی' کہ یہ چٹے ان پڑھ ہیں۔ ہم نے انہیں جیپ میں بٹھالیا کہ چلو تم لوگوں کو چوہدری صاب سے ملا دیتے ہیں جو ملوم کرنا ہے ان سے ہی کرلو...... تو انہوں نے...... راستے میں حملہ کر دیا ہم لوگوں پر۔''

''کس طرف گئے ہیں' کتنی دیر ہوئی ہے؟''

چوہدری تیز لہجے میں پوچھتا ہوا ٹیلی فون کی طرف بڑھا تھا۔

''گوجرانوالہ کی طرف جی' گھنٹہ پہلے کی بات ہوگی۔''

''گھنٹہ پہلے!'' چوہدری ٹھٹک کر رک گیا۔

''یعنی انہیں یہاں سے نکلے گھنٹہ ہو چکا ہے تو تم گھنٹے سے کہاں تھے؟''

''وہ جی! ہمارے پستول چھین کر انہوں نے ہمیں جیپ میں ساتھ ہی بٹھالیا تھا اور...... اور ہم لوگوں کو گوجرانوالہ تک ساتھ ہی لے گئے' وہاں جا کر اتارا ہمیں' ہماری جیبوں سے پیسے بھی نکال لیے......ایک......!''

چوہدری فرزند نے اچانک آگے بڑھ کر لات بولنے والے کے سینے میں ماری اور وہ بے چارہ چیختا ہوا ستون سے ٹکرایا اور ڈھیر ہو گیا' اتنے میں چوہدری نے قریب ہی تپائی پر دھرا جگ اٹھالیا تھا۔

''چچ چوہدری صاب! معاف کر دیں۔''

''چچ...... غلطی ہوگئی۔''

باقی دونوں نے بچنے کی کوشش تو کی پھر بھی سٹیل کا جگ ایک کے سر میں لگا اور وہ دھاڑ مار کر ایک طرف لڑھک گیا۔

''حرام خور' حرامی کتے...... خصی سانڈ...... ہٹاؤ ان کو میرے سامنے سے اور ابھی سے ان تینوں کی ڈیوٹی بھاٹے میں لگا دو...... اور کسی کام کے نہیں ہیں یہ بھڑوے۔'' چوہدری فرزند نے شدید غصے اور حقارت سے کہا پھر پلٹ کر دوبارہ کمرے میں آیا اور غسل خانے میں گھس گیا۔

چوہدری فرزند کا دماغ اب الجھن کا شکار ہو گیا تھا۔ اس کے ذہن میں ایک تکون نمودار ہوا آئی تھی...... دو عورتیں...... لاہور...... دو اجنبی آدمی...... پھر وہ نہا کر نکلا ہی تھا کہ نزیرے کی کال آ گئی۔

''ہاں نذیرے! بول۔''

''چوہدری صاحب! میں گوجرانوالہ سے بول رہا ہوں جی' وہ ٹیکسی والی عورتوں کے پیچھے میں خود ہی نکل آیا تھا مگر...... یہاں گوجرانوالہ میں آ کر وہ ٹیکسی اچانک ہی گم ہو گئی ہے۔''

''کیسے گم ہو گئی؟''

''کچھ سمجھ نہیں آئی' یوں لگتا ہے جیسے کسی کوٹھی وغیرہ

کے اندر چلی گئی ہے۔'' چوہدری نے ایک ذرا توقف سے کام لیا پھر دوبارہ بولا۔

''تو اس وقت کس جگہ پر کھڑا ہے۔''

''اسپتال کے سامنے ایک پی سی او پر۔''

''تو وہیں رک' گاما اور سانگھا تیرے پاس آ رہے ہیں۔''

چوہدری نے ریسیور رکھ دیا اور پھر گامے اور سانگھے کو معاملہ سمجھا کر گوجرانوالہ نذیرے کی طرف روانہ کر دیا۔

ابھی تک تو وہ صرف دو افراد کو تلاش کروا رہا تھا' لیکن اب اسے محسوس ہو رہا تھا کہ اسے کچھ اجنبی دشمنوں کی پہچان کی ضرورت بھی آ پڑی ہے۔

چوہدری فرزند کے اندر کوئی چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا کہ شاہوں والے پھڈے کے حوالے سے کچھ ایسے لوگ بھی حرکت میں آ چکے ہیں جو مکمل طور پر اجنبی ہیں اور جن کے متعلق فی الوقت کوئی اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔

چوہدری کو اب شدت سے گامے کی طرف سے رابطے کا انتظار تھا' خلاف توقع گامے کی کال بہت دیر سے آئی' اس وقت رات کے نو بج رہے تھے۔ اس نے اور سانگھے نے ٹیکسی ڈرائیور کو ڈھونڈ کر قابو کر لیا تھا۔

''چوہدری! ڈرائیور کے بقول ان دو عورتوں میں سے ایک تو یہاں...... ہیرا منڈی کا کھسرا تھا اور دوسری یہاں کی ایک طوائف تھی۔'' رابطہ ہوتے ہی گامے نے اپنی کارگزاری کی رپورٹ دی تھی۔

''یہ لوگ مرید شاہ کے گھر کرنے کیا گئے تھے...... کیوں گئے تھے؟''

چوہدری کے لہجے میں سوال سے زیادہ حیرت اور الجھن تھی۔

''یہ بات ڈرائیور تو نہیں جانتا جی۔''

ایک ہیرا منڈی کا کھسرا اور دوسری ایک طوائف...... گاؤں میں دو اجنبی آدمیوں کی آمد اور فرار...... کچھ تو تھا! کوئی نہ کوئی گڑبڑ تو شروع ہو چکی تھی۔ کچھ غیر متعلقہ اور اجنبی لوگ اس معاملے میں دلچسپی لے رہے تھے۔ وہ کون لوگ تھے' اور انہیں اس گزرے ہوئے وقوعے میں کیا دلچسپی تھی یہ جلد از جلد جاننا بہت ضروری تھا۔

''ابھی ہماری لیے کیا حکم ہے جی!'' ریسیور سے گامے کی آواز ابھری تھی۔

''تم ایسا کرو اس کھسرے کو اٹھاؤ اور ملتان روڈ والی کوٹھی پر لے جاؤ' میں بھی آ رہا ہوں اور ہاں...... کوئی شور شرابہ یا ہنگامہ نہیں چاہیے۔''

''ٹھیک ہے جی!''

چوہدری نے ریسیور رکھ دیا...... زیادہ سوچ بچار کا وہ قائل نہیں تھا' لہٰذا کچھ ہی دیر بعد وہ لال دین عرف لالا اور حکم داد کے ساتھ اپنی پراڈو میں بیٹھا تھا اور پراڈو لاہور کی طرف روانہ تھی۔

چوہدری کے کوٹھے پر پہنچنے سے پہلے ہی گاما اور سانگھا' خالہ اقبال کو کوٹھی پر لا چکے تھے اور اس کی خاصی چھترول بھی کر چکے تھے۔ گاما چوہدری کو کوٹھی کے گیٹ پر ملا۔

''چوہدری صاب! اصل بات تو یہ بھی نہیں جانتا جی۔''

اس نے چوہدری کے ساتھ اندرونی طرف بڑھتے ہوئے کہا' حکم داد اور لالا بھی ان کے پیچھے پیچھے تھے۔

''تو کون جانتا ہے؟''

''اس کے بقول کام اس طواف کو تھا' یہ تو صرف اس کے ساتھ گیا تھا۔'' وہ ادھیڑ عمر بھدے وجود والا ہیجڑا لاؤنج ہی میں موجود تھا۔ وہ نیچے فرش پر بیٹھا خوف زدہ نظروں سے سانگھا کی طرف دیکھ رہا تھا اور سانگھا پانی کی ٹیوب کا ایک موٹا ٹکڑا ہاتھ میں لیے اس ہیجڑے کے سامنے کھڑا تھا۔

''کیوں بھئی! کیسی طبیعت ہے تیری؟''

چوہدری فرزند اس کے بالکل سامنے جا کھڑا ہوا۔

''جناب عالی! میں نے کچھ نہیں کیا' میں' میں تو کچھ جانتی بھی نہیں۔''

''یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ تو کچھ بھی نہ جانتا ہو؟''

''میری بات کا یقین کریں' آپ کے بندوں نے مار مار کے میرا سامان سجا دیا ہے' میں جھوٹ نہیں بول رہی سرکار۔'' اس نے کپکپاتے ہوئے دونوں ہاتھ چوہدری کے

اسے باقاعدہ آنسو بہہ رہے۔

”تو اس طوائف کے ساتھ ہی مرید شاہ کے گھر گیا تھا پھر تجھے کیسے معلوم نہیں ہے کہ وہ وہاں کیا کرنے گئی تھی؟“

”وہ شاہ لوگ تھے جناب! مجھے تو انہوں نے جاتے ہی بیٹھک میں بٹھا دیا تھا‘ اندر آپا اکیلی ہی گئی تھی۔ رب سوہنے کی قسم مجھے نہیں پتا وہ اندر کیا کر کے آئی ہے۔“

خالہ اقبال کا خون خشک ہوا پڑا تھا۔ وہ خوفزدہ نظروں سے ان کی شکلیں دیکھ رہا تھا۔

”اور وہ دو بندے جو نندی پور پہنچے تھے وہ......“

”کون جی...... کون دو بندے؟ ہم...... ہم لوگ تو نندی پور نہیں‘ ڈسکہ گئے تھے جناب۔“

خالہ اقبال کو کچھ مزید پریشانی نے آلیا‘ شاید کوئی مزید نامعلوم جرم سر پڑنے والا تھا۔

”ہم لوگ نندی پور نہیں گئے‘ صرف ڈسکہ گئے تھے‘ مگر آپا نے مجھے کچھ بھی نہیں بتایا تھا کہ وہاں کیا کرنا ہے‘ کیا کام ہے؟“

وہ دوبارہ ہاتھ جوڑتے ہوئے جیسے گھگھیایا تھا۔

”تو ساتھ گیا ہی کیوں؟“

”وہ تو آپا کی طبیعت ٹھیک نہیں رہتی تو اس نے مجھے ساتھ چلنے کا کہا کہ چلو آ سرا رہے گا...... ہم تو سیدھے سیدھے روزی روٹی کرنے والے لوگ ہیں جی! ہم مرن جوگے کوئی ایسا ویسا کام نہیں کرتے ہیں...... میں نے بھی کچھ نہیں کیا...... مجھے کچھ پتا نہیں ہے میں نے...... میں نے یہاں سے روانہ ہونے سے پہلے پوچھا بھی تھا مگر آپا نے کہا کہ صرف کسی سے ملنا ہے‘ بس...... اور کچھ بھی نہیں بتایا مجھے۔“

وہ سسک اٹھا۔

”تیری اس آپا کا نام کیا ہے‘ کہاں ملے گی؟“

”حسن آرا‘ جناب! نزہت بیگم کے کوٹھے پر پوری ہیرامنڈی جانتی ہے دونوں کو۔“

”حسن آرا اور نزہت بیگم۔“

چوہدری نے زیر لب دہرایا‘ دونوں نام سنے سنے سے محسوس ہو رہے تھے۔ اسے خود کبھی ہیرامنڈی آنے کی ضرورت نہیں پڑی تھی...... اسے جب بھی ضرورت پڑتی تھی‘ ضرور... سامان یہاں سے اس کے پاس پہنچ جایا کرتا تھا... چند لمحے کھڑا سوچتا رہا پھر لالے سے مخاطب ہوا۔

”لالے!“

”جی......“

”گاڑی نکالو۔“

لالا فوراً باہر نکل گیا‘ چوہدری خالہ اقبال کی طرف دیکھتے ہوئے سانگھے سے مخاطب ہوا۔

”سانگھا! اسے آج رات یہیں آرام کرنے دو‘ صبح چھوڑ دینا...... فی الحال سب میرے ساتھ آؤ۔“

چوہدری پلٹ کر کمرے سے باہر نکل گیا تو باقی سب نے بھی اس کی تقلید کی۔ پھر جب دروازہ لاک ہو گیا تو خالہ اقبال نے ایک گہری اطمینان کی سانس لی اور فرش سے اٹھ کر مطمئن سے انداز میں ایک صوفے پر پھیل گیا۔

چوہدری اپنے چاروں کارندوں کے ساتھ دوبارہ پراڈو میں جا بیٹھا تھا۔

مرید حسین پر اصغر علی اعوان کی نظر بھی ہو سکتی تھی اور اسے چھیڑنے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ ایسے میں اب واحد صورت یہی بچ جاتی تھی کہ براہ راست اس طوائف‘ حسن آرا ہی سے معلوم کر لیا جائے کہ وہ یہاں سے اٹھ کر ڈسکہ میں مرید حسین کے گھر تک گئی تو کیوں؟ چوہدری فرزند کا دل کہہ رہا تھا کہ اس حسن آرا سے نندی پور والے اجنبی بندوں کے بارے میں بھی کچھ نہ کچھ معلوم ہو سکتا ہے...... حسن آرا سے ایک ملاقات تو ضروری ہو گئی تھی...... اور جب ضروری ہو ہی گئی تھی تو پھر دیر کرنے کی کوئی وجہ نہیں تھی۔

رات کے تقریباً ساڑھے گیارہ بج رہے تھے اور چوہدری فرزند کی پراڈو بازار حسن کی طرف دوڑی جا رہی تھی۔

(ان شاء اللہ باقی آئندہ ماہ)

